103

رحمۃ اللہ علیہ

حیات امیر شریعت



گذشتہ ربع صدی کی سیاسی اور مذہبی تحریکات کے

پس منظر میں

حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری (رحمۃ اللہ علیہ)

کی پہلی مکمل اور مستند

سوانح حیات

ناشر	خالد سعید جانباز
پبلشر	مکتبہ تبصرہ لاہور
طابع	ثنائی پریس لاہور
بار اوّل	نومبر ۱۹۶۹ء
تعداد	ایک ہزار (۱۰۰۰)

قیمت :— ۱۳ روپے ۵۰ پیسے

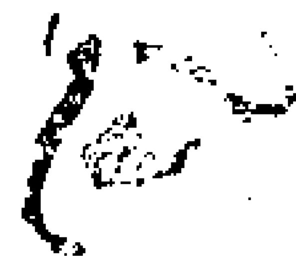
"مکتبہ تبصرہ" ۵/۲ گلشن کالونی، شادباغ، ا

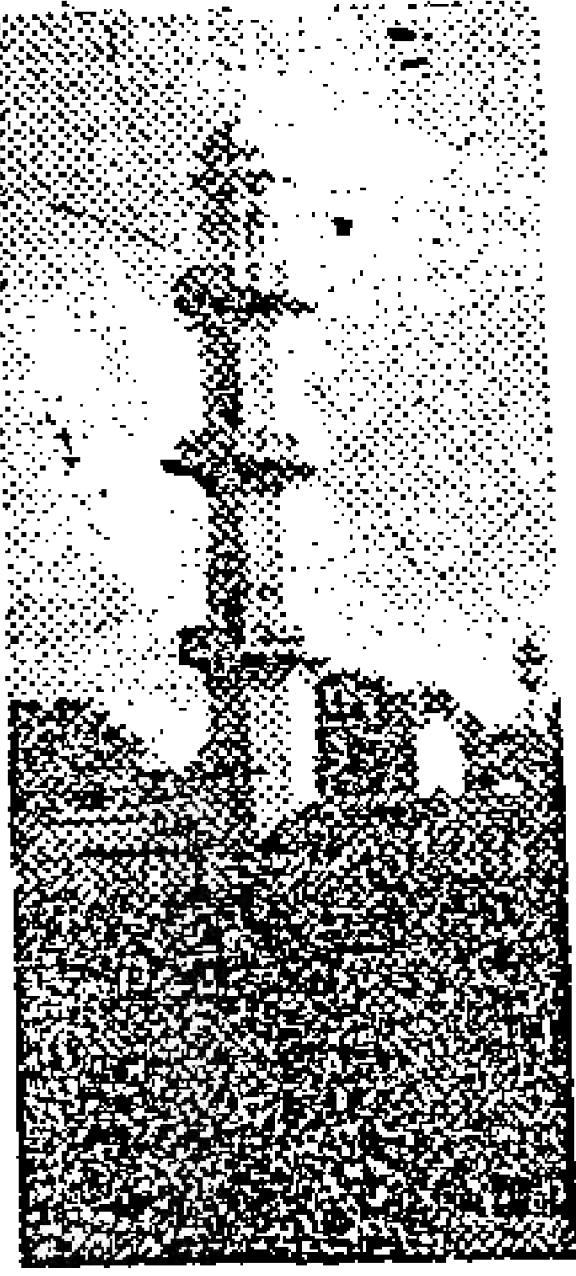
اُس عظیم ماں کے نام



جس کی کوکھ نے ایشیا میں ایک ایسے
خطیب کو جنم دیا، جس کی للکار سے برطانوی
سلطنت کا چراغ ہمیشہ کے لیے گُل ہو گیا









فہرست

ابتدائیہ

۱۹۳۰ء کا زمانہ ہندوستان میں اُن سیاسی سرگرمیوں کا ابتدائی سال تھا جو آگے چل کر غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف پُرامن بغاوت کے حالات کو جنم دینے کا باعث بنیں اس سے پہلے ۱۹۲۹ء کے ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں کے جلو میں دریائے راوی کے کنارے آل انڈیا کانگرس نے برطانوی سامراج سے مکمل گلو خلاصی کے لئے اپنی تاریخی قرارداد منظور کی۔ ورنہ پیشتر ازیں درجہ نوآبادیات کی خواہش تک تمام جد وجہد مرکوز تھیں، شہید اشفاق اللہ بسمل کا یہ شعر اُس دَور کی نشاندہی کرتا ہے

مجھ کو مِل جائے چہکنے کے لئے شاخ میری
کون کہتا ہے کہ گلشن میں نہ صیّاد رہے

تحریکِ خلافت و ترکِ موالات کے بعد مہاتما گاندھی کی قیادت میں غیر مُلکی حکومت کے خلاف حصولِ آزادی کے لئے برصغیر کی یہ دُوسری بڑی تحریک کی تیاری تھی غلاموں کے جذبات اُبھر کر بغاوت کے موڑ پر آن پہنچے تھے۔ ہندوستان کا ہر مرکزی شہر اس تحریک کا کیمپ قرار دیا جا چکا تھا، یہ مکمل ستیہ گرہ کی تحریک تھی۔ اِس سلسلہ میں

گوجرانوالہ میں مولانا ظفر علی خاں کی صدارت میں ستیہ گرہ کانفرنس منعقد ہوئی، ان دنوں میری عمر اٹھارہ اُنیس سال کے آس پاس تھی۔ گو غلام دیس کے نوجوان کے لیے زندگی یہ سِن عقل وشعور سے عاری ہوتا ہے، تاہم فرنگی حکمرانوں کے خلاف میرے جذبات اس سال جوان اور بالغ ہو چکے تھے، اور انہیں تمناؤں کے سہارے مَیں امرتسر سے پیدل گوجرانوالہ پہنچا۔

اس کانفرنس کا آخری اجتماع تھا کہ سرِ شام پنڈال میں خاص قسم کی ہماہمی، چہروں پر رونق، دِلوں میں مسرتوں کا طوفان موجزن تھا کہ مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کیلئے آئے۔ خوبصورت خدوخال کے ساتھ سُرخ وسپید چہرے پر سیاہ داڑھی، گھٹیلا جسم، بُوٹا سا قد، نیم آستین والا گاڑھے کا کُرتہ، ٹخنوں سے اُونچا شرعی قسم کا کھدر کا پاجامہ سر پر گول دیوبند طرز کی ٹوپی، پاؤں میں دیسی ساخت کا چپل، یہ تھے سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری پنڈال سے باہر کثیر ہجوم نے ان کا استقبال کیا، گوجرانوالہ کی زمین نے اُن کے قدم چُومے، آسمان نے بلائیں لیں، فضاؤں نے بہاروں کی بارش کر دی، عوام کی نگاہیں فرشِ راہ ہوئیں، دِل ودماغ نے ہم آہنگ ہو کر ہندوستان کے بہادر سپوت کا خیر مقدم کیا، وہ جیسے جیسے اپنی قیام گاہ کے قریب پہنچتے گئے، چاند۔ ستاروں کے ہجوم میں اُن کی رہنمائی کرتا رہا۔ مَیں اُس اچھوت کی طرح جسے مندر کے دروازے پر کھڑے بھگوان کی مُورتی دیکھنے کی اجازت تو ہے لیکن قریب جا کر اُن کے چرن نہیں چھُو سکتا، دُور سے شاہ جی کو دیکھتا رہا۔

یہ تھی حضرت امیر شریعتؒ سے میری پہلی ملاقات!

"اوے ایہہ کالا کلوٹا کتھوں لے آندا ای عاجز؟"

(یہ کالا سیاہ کہاں سے لے آئے عاجز!)

"اسے کالا لڑے گا، تنے آپے ای پتہ لگ جائے گا!"

(یہ کالا جب ڈسے گا تو خود ہی معلوم ہو جائے گا۔)

امرتسر ریلوے اسٹیشن کے مسافر خانے میں بیٹھے خواجہ عبدالرحیم عاجز اور حضرت امیرِ شریعتؒ کے درمیان میرے متعلق یہ مختصر گفت گو تھی۔

مولانا عبدالرحمٰن نکودری کا سالانہ اجتماع تھا، یہ حضرات اس میں شمولیت کے لیے نکودر ضلع جالندھر جا رہے تھے۔ یہ دوسرا موقعہ تھا کہ میں حضرت امیرِ شریعتؒ کو قریب سے دیکھ رہا تھا، اِس سفر میں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی سے بھی ملنے کا موقعہ ملا ـــــ چار دن کی یہ ہمراہی زندگی بھر کا ساتھ بن گئی۔

اخلاص و محبت کا پیکر، زندہ دلی کا مجسمہ، مسکراہٹوں کا انبار، انجمنِ ہزار داستان لیے جب وہ حلقۂ احباب میں رونق افروز ہوا، تو میرے مستقبل کی ساری کائنات اُس کے تابع ہو کر رہ گئی۔ اِس طرح دِنوں سے ہفتے، مہینے اور سال گزرنے لگے۔ پھر حقائق بھی گواہ ہیں کہ وفاؤں میں کبھی دراڑ نہیں آئی۔ ان راستوں میں پھول اور کانٹے ایک ساتھ ملے، اندھیرے اُجالوں سے بھی گذر ہوا، تو ایک دوسرے کا ہاتھ نہیں چھوٹا جیل اور ریل کے طویل سفر مشترک اثاثۂ حیات بنے رہے۔ مقاصد کی ہم آہنگی نے اِن واقعات پر سے تیئس ۲۳ سال گزار دیے۔

اِس وادیٔ پُرخار سے جب پہلے پہل میرا گزر ہوا، تو بچپنا جوانی کی اِبتدائی سرحدوں پر چھوڑ کر جا چکا تھا، اور اگست ۱۹۶۱ء میں حضرت امیرِ شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) جب اِس جہانِ سے رُخصت ہوئے، تو میرا قدم بڑھاپے کی دہلیز پر تھا۔ حالات کی

ایک لمبی لکیر گزار کر جب رہنما کے بغیر مقاصدِ حیات کی راہوں میں اترنا پڑا، تو اس بازار میں میرا قلم میرے ساتھ تھا۔ یہ ستمبر ۱۹۶۱ء کا ذکر ہے کہ حضرت امیرِ شریعتؒ کی سوانح حیات اپنے قلم کے تعاون سے تاریخ کے دامن میں محفوظ کرنے کی سعی کی۔

یہ دستاویز مکمّل کرنے میں آٹھ سال بیت گئے، تلاش و تجسّس، حقائق و واقعات میں کن لوگوں سے راہ و رسم بڑھانے پڑے، یہ کہانی اس قدر طویل ہے کہ اس کے لیے پھر ایک کہانی کی ضرورت ہے۔

ستمبر ۱۹۶۱ء میں جب کتاب ہذا کا آغاز کیا، اور بہت سی منزلیں طے کرلیں تو فروری ۱۹۶۲ء میں دفتر تحفظ ختم نبوّت لاہور سے تمام مسوّدہ چوری کرلیا گیا۔

سیپ ایک دفعہ موتی اگلنے کے بعد بازیچۂ اطفال بن جاتا ہے۔ اسی طرح قلم سے ایک بار نکلی ہوئی عبارت اگر ضائع ہو جائے، تو دوبارہ اس میں وہ جان نہیں آتی۔ مسوّدہ کیا کھویا، میرا دل کھو گیا۔ آئندہ ہمتیں ہارے ہوئے جواریے کی طرح بیکار ہو کر بیٹھ گئیں، خیالات کی منجمد عمارت ڈھیر ہو کر رہ گئی۔ عزم و ارادے کی پامالی چور کو دعائیں دینے لگی۔ اس طرح ایک سال بیت گیا، کہ میرے عزیز دوست ملک محمد رفیق مالک مکتبہ "ادبستان" جب روزنامہ "کوہستان" لاہور کی ذمّہ داریوں سے سبکدوش ہوئے تو انہیں اپنے پرانے دھندے کو از سرِ نو شروع کرنے کا خیال آیا، اور انہوں نے مجھے حضرت امیرِ شریعتؒ کی سوانح حیات مرتّب کرنے کی دعوت دی، جسے میں نے بغیر کسی کاروباری معاہدے کے قبول کرلیا۔ گری ہوئی عمارت کی نیو پھر سے اٹھانی پڑی، اور میں تاریخ کے اوراق کھنگالنے میں مصروف ہو گیا۔

قریباً دو سو صفحات کی کتابت ہو چکی تھی کہ اچانک ایک روز ملک محمد رفیق نے

معذرت کے ساتھ کتاب کی اشاعتی ذمّہ داریوں سے اِنکار کر دیا، اِس کے لیے اُنہوں نے خانگی پریشانیوں کا عُذر تراشا۔ حقیقت اور افسانے کے درمیان کس قدر فاصلہ ہے، یہ اندازہ مَیں نہیں کر سکا، بہر حال مسوّدہ پوری ہونے کے بعد یہ دُوسرا موڑ آیا کہ بحیثیت مصنّف مجھے پھر مایُوسی اور نامُرادی کا سامنا کرنا پڑا۔

جاسُوسی اور دُوسرے فحاشی لٹریچر کی نہہات نے صاف ذہنوں کے مصنّفین اور پبلشرز کو اپنی راہوں سے دُور کر دیا ہے، اور اس پر کاغذ کی گرانی کوہ ہمالیہ سے کہیں زیادہ بوجھل ہو کر گری ہے، جس کے نتیجے میں پاکستان میں ایسی کُتب کا فقدان ہوتا جا رہا ہے، جس کی اِنسانیت کو خواہش ہے۔

ایسے وقت میں رفیق ملک کا "حیات امیر شریعت" کی اشاعت سے اِنکار میرے ارادوں کی موت کے ہموزن تھا، لیکن اس لاش پر ماتم کرنے کی بجائے مَیں نے کشتی کو اپنے آنسوؤں کے طُوفان میں چھوڑ دیا، اور کناروں کی تلاش میں ایک پتوار کے سہارے چلتا رہا، اور اکثر دفعہ ساحل پر پہنچ کر بھی مایُوسی ہوئی۔

اقتدارِ زر انسان کے دِل و دماغ پر جب قابض ہو جاتا ہے تو اصُولِ آدمیّت ریت کے گھروندے کی طرح گر جاتے ہیں۔ مَیں نے اِس کتاب کی اِشاعت کے لیے ایسے دروازوں پر دستک دی، جہاں دَولت کی فراوانی سے اِنسان ابلیس کے بھی پَر کترتا ہے، لیکن میری صدا، صدا بصحرا ثابت ہوئی۔ اور انہیں دِنوں

سے
باغباں نے آگ دِی جب آشیانے کو میرے
جن پہ تکیہ تھا وہی پتّے ہَوا دینے لگے

یہ آگ پھر ایسی بھڑکی کہ سارا گھر جل کر راکھ کا ڈھیر بن گیا۔

انہیں حالات میں آٹھ برس گزر گئے، اور اُس مردِ درویش کی کہانی جس نے برِّصغیر کے کروڑوں انسانوں کی کہانی کو جلا بخشی تھی، بے رنگ و روغن پڑی رہی، آخر بہار آئی اور نخلِ نومیدی سے ایسے پھول نکلے، کہ بے آب و گیاہ سرزمین کے کانٹوں نے لالہ زار کو شرمندہ کر دیا۔

یہ درست ہے کہ اکثر دانشوروں نے حضرت امیرِ شریعتؒ کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ مُلک بھر کے اخبارات و رسائل نے اُن کی سیاسی اور مذہبی زندگی پر قلم اُٹھایا۔ تاہم اُن کی مکمل زندگی کے ادھورے نقش مُستقبل کے مؤرخ کو بیحد مایوس کرتے رہیے۔

برطانیہ ایسی سلطنت کے پرچم کی دھجیاں بکھیرنے والے انسان کی زندگی کے حالات و واقعات کو اُس کی بعض طبعی کمزوریوں تک محدود کر دینا اُس کی کروڑوں خوبیوں سے ناانصافی ہے۔ اگرچہ زندگی میں اُس کے سیاسی اور مذہبی حریفوں نے اُس کے راستے میں کانٹے بکھیرے، اور اُس کی راہیں مسدود کرنے سے گریز نہیں کیا، تو بعد از مرگ دوست نما دشمنوں نے بھی کمی نہیں کی۔

لاریب کتاب ہذا میں مجھ سے امیرِ شریعتؒ کی تمام زندگی کا احاطہ نہیں ہو سکا اُن کی داستانِ حیات صحراؤں سے صحنِ چمن تک بکھری پڑی ہے، بلبل سے کرگسوں تک کو اُن کی کہانی یاد ہے، شمشیر و سناں کے تیز دھاروں سے چل کر غزل کے مطلع و مقطع تک کے اصول و ضوابط ان سے آشنا ہیں۔ ایسے انسان کی کہانی کاغذ کے دامن میں کیوں کر محیط ہو سکتی ہے۔ اور پھر ماضیٔ قریب کے معماروں نے اِس راہ کے تمام مسافروں کے نقوش اِس بُری طرح مٹائے ہیں کہ بادِ سموم کو بھی

ہدایت کردی کہ ایسے کسی نشان کو باقی نہ رہنے دے جس سے ماضی کے واقعات نمایاں ہو سکیں۔ ایسے میں حقیقت اور افسانے کے مابین امتیاز کے لیے جن دُور رس نگاہوں کی ضرورت تھی، میرا وجُود ہمیشہ اُس سے تہی رہا۔ اِس کے باوجُود امیر شریعتؒ کی بہتّر سالہ زندگی کے تاریک اور روشن پہلو اُجاگر کرنے میں میری عُمر کے آٹھ برس صَرف ہُوئے۔ اِس راستے میں مَیں نے کہاں کہاں ٹھوکر کھائی ہے، اُس کی نشاندہی کے لیے مَیں قارئین کا ممنُون ہوں گا، تاکہ دُوسرے ایڈیشن میں اس کی تصحیح ہو سکے۔

یہ حقیقت ہے، کہ کتاب ہٰذا کی ترتیب میں میری یادداشتوں نے میرا بڑی حد تک ساتھ دیا۔ تاہم مَیں اُن مصنّفوں کا شکر گزار ہوں جن کی تصانیف نے میری اکثر رہنمائی کی۔

ان میں ———

"رئیس الاحرار" ——— کے مصنّف مولانا عزیز الرحمٰن لُدھیانوی

"تحریک مدح صحابہ" ——— کے مصنّف مولانا مظہر علی اظہر

"مارشل لاء سے مارشل لاء تک" ——— کے مصنّف سیّد نور احمد

"رپورٹ تحقیقاتی عدالت فسادات ۱۹۵۳ء" — از مسٹر جسٹس محمّد منیر، مسٹر جسٹس ایم، آر کیانی

(جانباز مرزا)

باسمہٖ تعالیٰ

باب اوّل ——— ۱۸۹۱ء تا ۱۹۲۱ء

امیرِ شریعت

خالق کی ہر تخلیق میں کوئی نہ کوئی مصلحت کارفرما ہوتی ہے۔ انسانی وجود ہو یا حیوانی ڈھانچہ، نگار خانۂ فطرت کے یہ حسین شاہکار کائنات کے لیل و نہار میں آرائش کیے ہوئے ہیں۔

ایک اگر نسیم سحری اور بادِ سموم کے درمیان پنکھ پھیلا کر اپنی زندگی کا مظاہرہ کرتا ہے تو دوسرا فکرِ معاش، عشقِ بتاں اور غمِ روزگار کے تارِ عنکبوت کے اُلجھاؤ میں اُلجھا ہوا ہے اور یہی اُن کی زندگی ہے ——— موت دونوں کی منزل ہے۔ کچھ فاصلے پر چل کر دونوں دم توڑ دیں گے۔ زندگی دونوں سے وفا نہیں کرتی۔ لیکن حواسِ خمسہ کی سرحدوں سے آگے دونوں کی ذمہ داریاں تقسیم ہو جاتی ہیں۔

اگر انسان کا ضمیر زندہ ہے اور اس کا آئینۂ فطرت ٹوٹ نہیں گیا، تو لحد سے مہد تک کی تمام ذمّہ داریوں کی تصویر صاف دکھائی دے گی۔ اُسے اپنے راستے کے پھولوں اور کانٹوں میں کوئی الجھاؤ نظر نہیں آئے گا۔ وہ مستقبل

پر اپنے نشانِ کفِ پا موجود پائے گا۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاری بھی ایسے ہی زندہ جاوید لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ آرائشِ کائنات میں ایسے چراغ کی طرح روشن رہے جس کی لَو میں آسمان کے ستاروں نے اپنی راہیں تلاش کیں اور گم کردہ راہ انسانوں نے انہیں راہِ انسانیت کا سنگِ میل جانا۔

وہ حریت و مساوات کی جنسِ گراں کا بار اٹھائے زندگی کے بازاروں میں رُبع صدی تک لوگوں کو ہر موڑ پر بلاتے رہے۔ انہوں نے گورستانوں میں برسوں اذانیں دیں لیکن غلام رگوں کے منجمد خون کو اپنی گرم گفتاری سے حرکت میں نہ لا سکے۔

اگر وہ پہاڑوں کو پکارتے تو شاید وہ خاکِ راہ بن کر ان کے دامن سے لپٹ جاتے۔ اگر ستاروں کو آواز دیتے تو یقیناً وہ اپنی قندیلیں زمین کے حوالے کر دیتے — مگر آہ! بخاری نے ان دروازوں پر دستک دی جن کے دل خون سے تہی، آنکھیں بینائی سے محروم اور کان صدائے حق سے ناآشنا تھے۔

فرنگی قمار خانوں کی دیواروں پر کھڑے ہو کر اس نے حجازی لَے میں وہ گیت چھیڑا کہ صراحی و جام ٹکرا کر رہ گئے اور ساقی اپنے حواس کھو بیٹھا وہ ایک ایسا قافلہ سالار تھا کہ راستے کا گرد و غبار بھی جس سے اس کی منزل اوجھل نہ کر سکا۔ وہ اپنے پیچھے جو نقشِ پا چھوڑ گیا مستقبل کے مسافروں کے لیے ان میں کئی منزلیں پوشیدہ ہیں۔

زندگی اور موت کے درمیان جب تک کشمکش جاری ہے نظامِ کائنات جب تک متحرک ہے، زمین اور آسمان کے درمیان جب تک بہار و خزاں کی آمد و رفت جاری و ساری ہے ـــ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

سال ۱۸۹۱ء کے لیل و نہار پر فرنگی حکمرانوں کی جلوہ آفرینیاں ہنوز جنم لے رہی تھیں۔ ہندوستان کے در و دیوار ۱۸۵۷ء کے غیر ملکی تشدد کی صدائے بازگشت سے کبھی کبھار کپکپی محسوس کرنے لگتے تھے۔ غلامی کی زنجیریں سارے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھیں۔ ہندوستان کا بخت اقتدارِ فرنگی کے رُوبرو نظریں جھکائے کھڑا تھا۔

وقت نے ہمیشہ بخت کا ساتھ دیا ہے۔ زمانہ شاہی عروج کے جلو میں چلنے کا عادی ہے۔ غلام ہندوستان سے وقت اور بخت دونوں رُوٹھ چکے تھے۔ مغلیہ سلطنت کے آفتاب کو غروب ہوئے ۳۴ برس بیت چکے تھے کہ پٹنہ ضلع بہار کی سرزمین پر ربیع الاول ۱۳۱۰ھ (مطابق ۱۸۹۱ء) چاند رات جمعہ کے دن نور کے تڑکے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس کا نام ددھیال کی طرف سے عطاء اللہ اور ننہال کی جانب سے شرف الدین احمد رکھا گیا۔

خدا کے سوا اس راز سے کون آشنا تھا کہ ایک ماں اپنی کوکھ سے آج جس بچے کو جنم دے رہی ہے وہ خون اور گوشت کا لوتھڑا نہیں بلکہ مستقبل کے ہندوستان کی پیشانی کا ایک جھومر ہے جس کی روشنی سے حکمرانوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی اور دنیائے انسانیت میں وہ اپنے وقت کا عظیم خطیب ہوگا!

سیاسی لحاظ سے ۱۸۹۱ء کا سال بڑا اہم سال تھا۔ اسی سن میں بعض اور لوگ بھی عدم سے وجود میں آئے جنہوں نے آگے چل کر تاریخ آدمیت کو اپنے خون سے جلا بخشی۔ جنون شوق سے عقل و خرد کی راہیں ہموار کیں تاکہ آنے والوں کے لیے راستے کے نشیب و فراز پر اُن کا ہر نقشِ پا سنگِ میل بن کر رہ جائے۔

اس سلسلے میں یوگوسلاویہ کے صدر جوزف بروز ٹیٹو، فرانس کے جنرل چارلس ڈیگال، جاپان کے شاہی خاندان کے شہزادہ گینوئی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

نظامِ فطرت کی بوقلمونیاں دیکھیے کہ ایک ہی وقت، ایک ہی موسم اور ایک ہی سال میں ماں کی کوکھ سے دھرتی کی پیٹھ پر آنے والے یہ چاروں بچے کائنات کے بناؤ سنگار میں کس طرح مصروف رہے۔

آخرالذکر یورپ میں پیدا ہوئے۔ راج سنگھاسن پر بیٹھ کر لوگوں پر حکومت کرتے رہے لیکن اوّل الذکر نے ایشیا کی گود میں جنم لے کر عوام کے دلوں پر حکمرانی کی ــــ!

گھرانا

تاریخ جن لوگوں کو اپنی تکمیل کے لیے منتخب کرتی ہے۔ لازم نہیں کہ ان کی نسبت کسی اونچے اور اعلیٰ خاندان سے ہو، بلکہ ماضی بعید میں جن لوگوں نے تاریخ کے صفحات پر اپنے نقش چھوڑے ہیں اُن کے آبا و اجداد

وقت کے حاکمانہ وقار نے کبھی نظر التفات سے دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ انہیں جھونپڑیوں میں پرورش پانے والوں نے جب محلّات پر کمندیں ڈالیں تو شاہی تاج اُن کے قدم چومنے لگا۔ اور فرماں روائی اُن کی عبائیں اُٹھائے پھری۔ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری رحؒ نے ایک ایسے گھرانے میں جنم لیا جو روحانی دنیا میں رشد و ہدایت کا صدیوں محور رہا۔ انسانی زیست نے فخر و مباحات کے سینکڑوں صنم خانے ویران کر کے انہی مے خانوں سے اپنی آنکھوں کے ڈورے سُرخ کیے۔ ان کے لڑکھڑاتے قدم انہیں آشنانہ مراد تک لے آئے یہیں سے انسانیت اپنی منزل کے لیے سفر شروع کرتی ہے۔

اس صدی کے مشہور کشمیری مؤرخ منشی محمد الدین فوق اپنی تصنیف "تاریخ کشمیر" کے دوسرے حصّہ میں رقم طراز ہیں کہ:-

"حضرت امام حسن مجتبیٰ کی چوبیسویں اور حضرت شیخ سیّد محی الدین عبدالقادر جیلانی رحؒ کی تیرھویں پشت سے ایک بزرگ سیّد عبدالغفار بخاری المشہور قاضی خانقاہی بخارا سے اپنے والد سیّد محمد بخاری کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے۔ یہ اسلامی حکومت کا زمانہ تھا۔ عہدہِ درس و قضا پر فائز ہوئے۔ سرینگر میں اب بھی آپ کی قبر مزار بڈہ شاہ رحؒ میں دیوار سے منفصل شمال کی جانب موجود ہے۔

سیّد عبدالغفار رحؒ کی اولاد کشمیر کے علاوہ پنجاب کے اضلاع گجرات اور امرتسر میں بھی اکثر پھیلی اور اب بھی موجود ہے۔

انہی کی اولاد سے ساتویں پشت میں سیّد عبدالرسولؒ جو کہ سیّد رحمت اللہ کے بیٹے تھے ایک خدا رسیدہ بزرگ گزرے ہیں۔ اُن کا تقویٰ یہاں تک تھا کہ مُرغی کا انڈہ اور مُرغ صرف اس لیے نہیں کھاتے تھے کہ یہ دانہ دُنکا لوگوں کے گھروں میں بھی جاکر کھا لیا کرتے ہیں۔ اسی زمانے میں شاہ عبدالرحمان (جو رحمان شاہ کے نام سے ایک مشہور مجذوب گزرے ہیں) کے اشارے سے سیّد عبدالرسول نے اپنے دونوں بیٹوں سیّد حضور اللہ اور سیّد ولی اللہ کو دستکاری اور عوام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا تھا۔"

اس سلسلے میں آگے چل کر تاریخ اقوام کشمیر کے مصنف شجرہ نسب کو یوں ترتیب دیتے ہیں:-

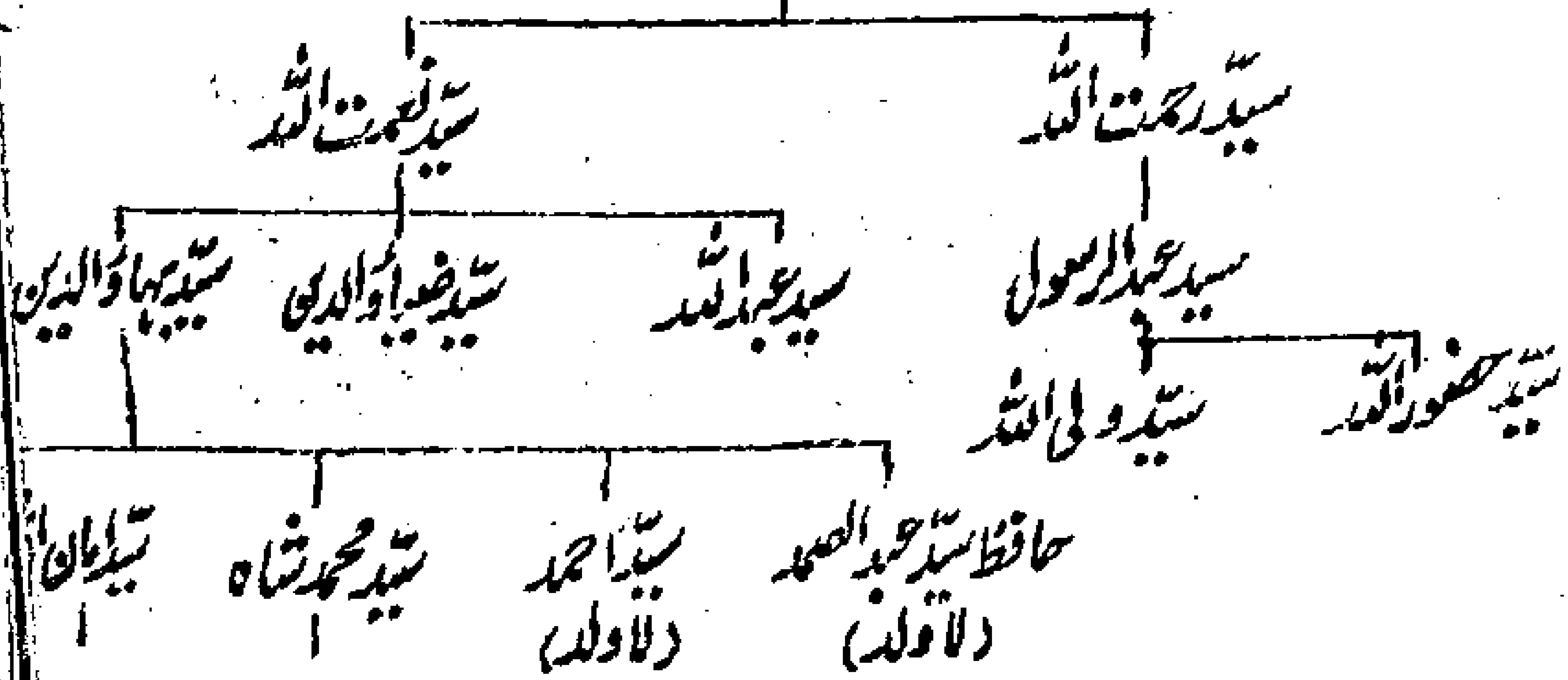
حضرت امام حسن مجتبیٰ

سیّد محمد بخاری (چوبیسویں پشت) — حضرت محی الدین سیّد عبدالقادر جیلانیؒ (تیرہویں پشت)

سیّد عبدالغفار بخاری

چوتھی پشت

سیّد عطاء اللہ شاہ اوّل



سید امان اللہ
- سید امیر شاہ
  - سید محی الدین
    - سید محمد سلیمان
- یوسف شاہ (بلا اولاد نرینہ)
- مصطفیٰ شاہ
  - سید عبدالحمید
- سید حسن شاہ
  - سید فیض اللہ
- سید فضل شاہ (بلا اولاد نرینہ)
- سید نظام شاہ
  - سید عبدالوحید

سید محمد شاہ
- سید نور شاہ
  - سید ضیاء الدین
    - حضرت امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری رحمۃ اللہ علیہ
- سید پیر شاہ (لاولد)
- سید عبدالغنی
  - سید محمد اسحاق
- سید حمید شاہ
  - سید محمد مقیم
- سید حسام الدین
  - بلا اولاد نرینہ

سید عبدالرسول کے والد سید رحمت اللہ کے دوسرے بھائی کا نام سید نعمت اللہ تھا۔ رحمت اللہ اور نعمت اللہ کے والد سید عطاء اللہ شاہ اوّل حضرت سید عبدالغفار بخاری کی چوتھی پشت سے ہیں۔

سید عبدالرسول کے چچا سید نعمت اللہ کے چار فرزند تھے جن میں سے سید عبداللہ اور سید ضیاء الدین لاولد تھے۔ تیسرے لڑکے سید بہاؤ الدین تھے جن کے چار بیٹے تھے۔ ان کے دو بیٹوں سید محمد شاہ اور سید امان اللہ کے ہاں اولاد تھی۔

سید امان اللہ کے چھ بیٹے ہیں جن میں دو اولاد نرینہ سے محروم رہے چار اولاد نرینہ سے سرفراز کیے گئے۔ سید محمد شاہ کے پانچ لڑکے تھے۔ سید پیر شاہ لاولد تھے اور سید حسام الدین کے ہاں عمر بھر نرینہ اولاد نہ ہوئی باقی تین صاحب اولاد تھے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سید نور شاہ کے پوتے اور سید ضیاء الدین کے فرزند تھے۔

اس طرح سے یہ خاندان اب تک پاکستان کے اکثر علاقوں میں پھیل پھول رہا ہے۔ لوگ انہیں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

ننھیال

لاریب آدمی کا سلسلۂ نسب ددھیال سے شروع ہوتا ہے، لیکن عالی نسب ہونے کے لیے اس قدر سند ادھوری معلوم ہوتی ہے۔

ماں کی کوکھ میں اولاد صحیح صالح پرورش پائے گی جب ماں کا اپنا خون شریف النفس والدین کی بنیاد پر ہو گا۔ ورنہ یک طرفہ نیکی کے نتائج اکثر۔۔۔ غیر صالح رہے ہیں۔

بلاشبہ سید عطاء اللہ شاہ کی عالی نسبی جس کے باعث اُن کے ددھیال کی قبائے زندگی ہمیشہ روشن رہی قدرے گہری معلوم ہوتی اگر اس میں ننھیال کا پیوند برابر کا نہ ہوتا۔ چنانچہ سید عطاء اللہ شاہ کی والدہ محترمہ سیدہ فاطمہ اندرابی بنت مولانا حکیم حافظ سید احمد اندرابی کا نسب نامہ حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہؒ کو روحانی دنیا میں بلند مقام حاصل ہے۔ ان کی نواسی سید عطاء اللہ شاہ کی نانی اماں تھیں۔

سید ضیاء الدین

ہنوز غیر ملکی اقتدار کا سورج طلوع ہوئے چند ساعتیں گزری تھیں، ابھی

حالات نے وفا کے دامن کو گرہ نہیں دی تھی، دلوں کے تالے چابی کھو جانے پر بھی زنگ آلود نہیں ہوئے تھے کہ سید عطاء اللہ شاہ کے والد سید ضیاء الدین اپنے تایا سید پیر شاہ صاحب بخاریؒ اور چچا حافظ سید حید ر شاہ صاحب بخاریؒ کے ساتھ پشمینے کی سوداگری کرنے اپنے گاؤں ناگڑیاں ضلع گجرات سے بہار کے مشہور شہر پٹنہ میں اکثر جایا کرتے تھے

ان دنوں یہ اٹھارہ انیس سال کے پیٹے میں تھے۔ انہیں قرآن کریم پڑھنے اور سنانے کا اس قدر شوق تھا کہ ایک دفعہ محلہ چوک بازار (پٹنہ) میں ملک عنبر کی مسجد میں رمضان المبارک کے آخری عشرہ میں شبینہ کے روز نماز عشاء کے وقت پتہ چلا کہ آج تین حافظ باہم مل کر قرآن کریم ختم کریں گے تو غصے میں کہا:

"یہ کیا حرکت ہے، ایک ہی آدمی کو قرآن کریم ختم کرنا چاہیے۔"

اس پر دوسرے حافظ نے طنزاً کہا "تو پھر یہ کام آپ ہی کریں۔"

"بہت اچھا — !" یہ کہہ کر مسجد سے چلے آئے۔

گھر آئے تو چہرے پر تغیر کے آثار دیکھ کر سید حیدر شاہ نے فرمایا

"کیا بات ہے حافظ جی — ؟ کچھ کھوئے کھوئے سے دکھائی دیتے ہو"

اس پر مسجد کا سارا واقعہ کہہ دیا — حیدر شاہؒ نے فرمایا "اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ اللہ کا نام لے کر شروع کر دینا۔"

چنانچہ رات جب قرآن کریم پڑھنے کے لیے کھڑے ہوئے تو پہلی رکعت میں چھبیس [26] پارے ختم کر دیئے۔ اسی طرح مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی رحمۃ اللہ علیہ کے دادا مولانا محمد رحمت اللہ کا بیان ہے کہ:-

"۱۸۵۷ء کے بعد ایک مدّت میں نے پٹنہ (گنگا کے کنارے) مسجد میں گزاری۔ ان دنوں حافظ ضیاءالدّین کی عمر اُنیس سال تھی اور انہوں نے ایک رات مجھے ایک ہی رکعت میں سارا قرآن کریم سُنایا۔"

شادی

نیک سیّدوں کا یہ خاندان ایک عرصہ پٹنہ میں رہ کر اس قدر مقبول ہوا کہ نہ صرف کاروبار میں برکت اور رحمت ہوئی، دنیوی قرابت داری کی خواہشیں بھی پروان چڑھنے لگیں۔ پٹنہ کے متموّل اور دین دار صاحب فکر حکیم حافظ سیّد احمد اندرابی نے جن سے اکثر خاندانی تعلقات استوار ہو چکے تھے اپنی دختر نیک اختر حضرت حافظہ سیّدہ فاطمہ اندرابی کی شادی حافظ سیّد ضیاءالدین سے کر دی۔

فاطمہ اندرابی

۱۸۵۷ء میں فرنگی سامراج کے ہاتھوں دلّی کا جو سہاگ اجڑا اگر جمنا کی لہریں آج تاریخ کے اوراق اُگل دیں اور لال قلعے کی دیواریں اُن خونی حادثات کی گرہ کشائی کریں تو ماضی کی ایک ایک لکیر اُبھر کر سامنے آ جائے ——— شرافت اور تمدّن کی برہنہ لاشیں دہلی کی شاہراہوں پر شرم و حیا کی بھیک مانگ رہی تھیں، آگ کے شعلوں میں لپٹی ہوئی عمارات غیر ملکی حکمرانوں کے ظلم و

جوڑیں رنگ بھر رہی تھیں، گلیاں اور بازار خاندانوں کے بے خانماں ہونے پر ماتم کناں تھے۔

اس پُر آشوب دور میں اُجڑے ہوئے گھروں میں ایک گھرانا حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کی نواسی کا بھی تھا، جو دہلی سے صوبہ بہار کے شہر پٹنہ میں جا کر آباد ہوا۔ سیدہ فاطمہ اندرابی اسی گھر کی نیک سیرت بیٹی تھیں۔

والدہ کی وفات

انسانی ارادے دلوں میں جنم لیتے ہیں، ذہنوں میں پرورش پاتے ہیں اور عمل کی دنیا میں اکثر و بیشتر مات کھا جاتے ہیں۔ یہیں سے قدرت اور انسان کے درمیان حدِ فاصل قائم ہوتی ہے۔ اگر عزمِ انسانی کائنات کی تسخیر کے نقشے سوچتا ہے تو خالقِ کائنات ہر نقشے کو نقشِ فریادی بنا دیتے ہیں کہ آدمی کے تصوّرات کا ہیولیٰ پانی پانی ہو کر رہ جاتا ہے۔ والدین اولاد کے مستقبل کے لیے جو خاکے ترتیب دیتے ہیں کبھی تو وہ ریت کے گھروندے ثابت ہوتے ہیں اور کبھی ان پہ تاجِ شاہی کے گل بوٹے کھلتے ہیں۔

سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ بچپن کی چوتھی بہار میں سے گزر رہے تھے کہ اُن کی والدہ محترمہ کو داعیٔ اجل کا پیام آگیا اور وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں۔ گو آغوشِ پدری میں ماں کا پیار جلوہ فگن نہیں تھا تاہم شفقتِ والد نے انہیں اس

احساس سے دُور رکھا۔

بغیر ماں کے بچے کی زندگی اُس پتے کی طرح ہوتی ہے جو شاخ سے ٹوٹ کر کبھی تو بادِ سموم کی جھولی میں جا گرتا ہے اور کبھی نسیم سحر گاہی اُسے اپنے پالنے میں سنبھال لیتی ہے تاہم شاخ سے محروم زندگی تلخ کامیوں میں بسر ہوتی ہے۔

بن ماں کے بچے باپ کی تربیت کے سہارے پروان چڑھنے لگا ۱۸۵۷ء کی صدائے بازگشت سے کبھی کبھار فضا میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوتا لیکن شاد عظیم آبادی کے نغمے فضا کا رُخ موڑ دیتے۔ ان دنوں پٹنہ میں حضرت شاد عظیم آبادی کا چراغ جل رہا تھا۔ شعر و ادب کی ساری رونقیں اُن کے وجود کے گرد سمٹ کر رہ گئی تھیں۔

سید علی محمد شاد جو آگے چل کر شاد عظیم آبادی کے نام سے معروف ہوئے جنوری ۱۸۴۶ء کو پٹنہ کے محلہ پورب دروازہ میں پیدا ہوئے اور جنوری ۱۹۲۷ء کو انتقال کر گئے۔

محلہ پورب دروازہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے محلہ کے برابر میں تھا۔ پڑوسی اور سید ہونے کے باعث شاد عظیم آبادی کا بچپن اکثر شاہ جی کی نانی اماں کے ہاں گزرتا۔ چونکہ یہ گھرانا بھی پٹنہ میں علم و ادب کا مرکز تھا اس لئے شاد عظیم آبادی نے بھی اس صحبت سے کافی فیض پایا۔ چنانچہ زبان کی نوک پلک اور شعر کہنے کا سلیقہ اسی گھر کا مرہونِ منت ہے۔

شاد عظیم آبادی کی عمر اور شاعری اپنی جوانی کی سرحدیں عبور کر چکی تھی

کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو جھولنے سے نکال کر اُن کی گود میں ڈال دیا گیا اور مستقبل کا خطیب اعظم وقت کے عظیم شاعر کی جھولی میں شعر و ادب کے کھلونوں سے کھیلتا رہا۔

بچپن

بچہ خواہ انسان کا ہو یا حیوان کا عادات و خصائل میں ترازو کے ایک ہی تول تُلتا ہے۔ امتیازِ جنس دوسری بات ہے مگر شوخی دونوں کے خمیر میں ایک سی ہے۔ شرارت دونوں کی گھٹی میں ہے اور پھر جو بچہ یتیم ہو، عزیز و اقارب کا پیار اُس کے بگاڑ میں خاصا معاون ہوتا ہے۔

والدہ کی موت کے بعد شاہ جیؒ کو ماں کا پیار اور اُن کی ذمہ داریاں صرف والد کے پیار میں تلاش کرنی پڑیں۔ چنانچہ باپ نے فرزند کے گرد پیار محبت کا ایک ایسا حصار تعمیر کیا جس میں علم دین کی تکمیل ہو سکے۔ یاد رہے کہ اس دور میں انگریزی تعلیم مذہب سے لگاؤ رکھنے والے لوگوں کے نزدیک اخلاقی طور پر جرم سمجھی جاتی تھی۔ نیز شرفا کے ہاں بچوں کی ابتدائی تعلیم گھر ہی میں تکمیل پاتی تھی۔ چونکہ عربی اور فارسی خود شاہ جی کے اپنے گھر کی تعلیم تھی۔ نانا اور نانی معلم بنے، باپ نے نگرانی کی اور پھر شاد کی ادبی محفلوں نے اس سونے کے نکھار میں سہاگے کا کام کیا۔

والد صاحب کا شوق تھا کہ بیٹا اُن کی طرح حافظ قرآن ہو۔ چنانچہ کاروبار کے علاوہ وقت کا اکثر حصہ شاہ جی کو قرآن پڑھانے میں صرف کرتے۔ اس کا

نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ جی کو قرآن سے عشق ہو گیا اور وہ ہمہ وقت کتاب اللہ کو سینے سے لگائے رکھتے۔

والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت جلالی تھی۔ لہٰذا اُن کے خوف اور قرآن سے لگاؤ کے درمیان کھیل کود کے لیے وقت نکالنا "کارے دارد" تھا تاہم گھر میں ماموں ہم عمر تھے۔ دونوں کی ملی بھگت سے یہ شغل بھی جاری رہتا۔ شاہ صاحبؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ:۔

"مجھے پتنگ اڑانے کا بہت شوق تھا۔ قرآن کریم اور دوسری تعلیم سے ذرا فرصت ملی اور والد صاحب کہیں کام کے لیے گھر سے نکلے تو ماموں کو ساتھ لیا اور جھٹ سے چھت پر جا چڑھے۔ پتنگ کا شغل شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ آمنے سامنے پیچ لڑ رہے ہیں اور دونوں طرف سے ڈور پلائی جا رہی ہے کہ اتنے میں والد صاحب تشریف لے آئے۔ بس پھر کیا وہیں ہاتھ سے ڈور توڑ کر نیچے بھاگ آئے۔ اب ایک طرف پتنگ کٹی جا رہی ہے اور دوسری طرف مدمقابل شکست کی آوازیں لگا رہے ہیں۔ مگر ہو بھی کیا سکتا تھا۔ آنکھیں پتنگ کی طرف، کان دشمنوں کی آوازوں پر اور دل میں یہ خوف کہ کہیں ابا نے نہ دیکھ لیا ہو اور اگر کہیں پتہ چل گیا تو پھر جو پٹائی ہو گی وہ خدا ہی جانتا ہے"

بہرحال تعلیم کے ساتھ ساتھ بچپنے کی روایتی شوخیاں بھی اپنا کام

کرتی رہیں۔

قرأت

جنون شوق اگر خرد کا پاسبان ہو تو ناخن تدبیر دل کی گرہ کشائی میں سہنائی کرتے ہیں۔ شاہ جی کو کتاب اللہ وراثت میں ملی تھی۔ ننہال کا گھرانا دین مبین سے ناآشنا نہیں تھا۔ والدہ محترمہ قرآن کی حافظہ، والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا سینہ بھی اس خزینے سے مالا مال تو پھر بیٹا اس دولت سے کیوں کر تہی دامن رہ سکتا تھا۔ دو سال میں قرآن کریم ازبر کر لیا۔ چنانچہ خود شاہ صاحب فرماتے ہیں:-

"میں اکثر ظہر اور عصر کے درمیان قرآن کریم ختم کر لیا کرتا تھا"

ان دنوں شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اٹھارہ سال کے پیٹے میں تھے۔ محمد عمر عاصم نامی کویت کا ایک شخص جو سلطان عبدالحمید والئے ترکیہ کے بچوں کو قرآن کریم پڑھانے پر مامور تھا، سلطان کی اس سے قدرے ناراضگی ہو گئی اور وہ ترکیہ چھوڑ کر ہندوستان کی سیاحت کے لیے نکل آیا۔ سیر و تفریح کیلیے دوران جب وہ پٹنہ آیا تو یہاں کی آب و ہوا نے اُسے متاثر کیا اور ایک مدت وہ یہیں رہا۔ قدرت نے اس کے گلے میں رس اور آواز میں سوز عنایت کیا تھا وہ جب کبھی موج میں آکر قرآن کریم پڑھتا تو غیر مسلم بھی مسجد کے گرد جمع ہو جاتے۔ شاہ جی کو اخذِ فن میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ وہ اکثر محمد عمر عاصم کے لہجہ میں قرآن کریم پڑھتے اور پھر گھر میں اس کی مشق کرتے۔ چنانچہ ایک دن شاہ جی قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے کہ محمد عمر عاصم کا گزر اس راستے سے ہوا

تو وہ شاہ جی کی آواز اور اپنا ہی لہجہ سن کر بہت متاثر ہوئے۔ اسی شام محمد عمر عاصم نے حضرت شاہ جی کے والد سے درخواست کی کہ آپ اس بچے کو میرے پاس بھیج دیا کریں۔

فن قراءت میں عربی زبان کے تلفظ اور آواز کے زیر و بم کو ایک ساتھ چلنا ہوتا ہے لیکن اکثر قاری قراءت کے سفر پر ایک کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔ شاہ جیؒ کو فن قراءت کی یہ معراج حاصل رہی کہ قرآن کریم تلاوت کرتے وقت ان راہوں سے حزم و احتیاط سے گزرتے۔ حجازی لے میں ان کے گلے کی حلاوت ان کا پورا ساتھ دیتی اور یہی وجہ تھی کہ جب وہ قرآن پڑھتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے آسمان سے ابھی نازل ہو رہا ہے۔ چنانچہ اکثر واقعات ہیں کہ غیر مسلم اُن کے جلسے میں صرف قرآن کریم سننے آیا کرتے تھے۔ اسی طرح کئی خاندان مسلمان ہوئے۔

امرتسر میں

سال ۱۹۱۲ء یورپ اور ایشیائی قوموں کی ہلاکت آفرینیوں کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ بنی نوع انسان کی تباہی کے نشانات اُبھر رہے تھے۔ یورپ کے سیاسی دانشوروں کے غلط فیصلوں نے بر اعظم کو مرگ و زیست کے دوراہے پر لا کھڑا کیا تھا۔ جرمنی اور برطانیہ کی جنگ ایک تہذیب اور ایک ضرورت کی لڑائی تھی۔ آگ اور موت کے اس کھیل میں برطانوی استعمار اقوام ایشیا کو استعمال کرنے کے نقشے بنا چکا تھا۔ غلام قوموں کے مُردہ ضمیر پر کڑے

ہو کر پہلی جنگ عظیم لڑنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ شاہ جی والد کی اجازت لیے بغیر گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

سر پر بھاری قسم کی ریشمی سبز پگڑی، ریشمی اچکن، تنگ پائنچے کی شلوار اور بھاری طرز کی سرخ رنگ کی جوتی پہنے اور چھوٹا سا لوہے کا ٹرنک اٹھائے دن کے چار بجے ہال بازار امرتسر میں سید میر اسد اللہ شاہ بخاری کی دکان پر پہنچے یہ بزرگ شاہ جی کے قرابت داروں میں سے تھے۔ ان دنوں شاہ جی کی عمر قریباً اکیس برس کے پیٹے میں تھی۔

"میرا نام عطا اللہ ہے۔ میں حافظ ضیاء الدین کا بیٹا ہوں اور چپکے سے اُن کی اجازت کے بغیر آیا ہوں"

اس ضمن میں شاہ جی کا اپنا بیان ہے کہ:۔

میں گھر سے نکل کر کچھ مدت بنارس چینے والی مسجد کے زیر سایہ میاں شکر اللہ کے پاس ٹھہرا۔ یہ صاحب چاندی کے ورق کوٹنے کا دھندا کرتے تھے اور پہلوانی بھی۔ اُن کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ میں نے ورزش کرنی اور ڈنٹر پیلنے شروع کر دیئے اور یہ سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا"

میر اسد اللہ بخاری کے برادر نسبتی سید پیر شاہ بخاری جو رشتہ میں شاہ جی کے والد کے چچا تھے، انہیں دینی تعلیم کے لئے مولانا بہاؤ الحق قاسمی کے والد حضرت مولانا مفتی غلام مصطفےٰ قاسمی کے ہاں چھوڑ آئے۔ مفتی غلام مصطفےٰ قاسمی ان دنوں کٹڑہ کمہاراں کی مسجد کے خطیب اور مدرسہ نصرت الحق میں مدرس

تھے۔ ان کا شمار اپنے علم اور تقویٰ کے اعتبار سے امرتسر میں اُس دور کے ممتاز علما میں ہوتا تھا۔

شاہ جی نے ۱۹۱۴ء تک اس درس گاہ میں صرف و نحو، اور فقہ کی کتابوں کی تعلیم مکمل کی۔

ناگڑیاں

گجرات سے قریباً پندرہ میل کشمیر سے ملحق پہاڑ کے دامن میں یہ مختصر سی تاریخی بستی مہاراجہ اشوک کے دور میں "ناگنی" کے نام سے مشہور تھی۔ تاریخ کا دامن اس سے آگے تہی ہے کہ یہ بستی کس نے آباد کی اور اس کا نام کیوں کر بگڑا لیکن تاریخ کی گرہ کشائی سے اس قدر پتہ چلتا ہے کہ ۱۶ مارچ ۱۸۴۶ء میں جب مہاراجہ گلاب سنگھ نے انگریزوں سے کشمیر کا سودا کیا تو وہاں کے چند مسلمان گھرانے کشمیر سے یہاں آکر آباد ہو گئے۔ سیدوں کا یہ گھرانا بھی انہی میں شمار ہوتا ہے۔ جن کے ہاں آگے چل کر سید عطا اللہ شاہ بخاری نے جنم لیا۔ یہ لوگ ہنوز اس گاؤں کی سرزمین کو اپنے نیک اور پاک وجود سے قبروں میں آرام کرنے کے باوجود منور کیے ہوئے ہیں۔

شفقت پدری بیٹے کی جدائی کو زیادہ دیر گوارا نہ کر سکی اور ۱۹۱۴ء کو حافظ ضیاء الدین اپنے بیٹے کو امرتسر سے ناگڑیاں لے گئے۔

شادی

۱۹۱۴ء کا سال پہلی جنگ عظیم کا ابتدائی سال ہے۔ اس سن میں یورپ

کی مہذب قوموں نے ایک دوسرے کے گریبانوں سے کھیلنے کی مشق ستم ایجاد کی تھی اور انہی دنوں تہذیب مغرب عریاں ہو کر ایشیا اور وسط ایشیا کے آزاد رسم و رواج کے گرد غلامی کا حصار تعمیر کرنے کو سامنے اُکھڑی ہوئی تھی۔

۱۸۵۷ء کے بعد گو غلام ہندوستان کا نہ تو کوئی تمدن رہا تھا اور نہ تہذیب کے پاس ایسا کوئی پیرہن تھا جس سے گمشدہ تہذیب کی نشان دہی ہوتی۔ لیکن بجھتی ہوئی قندیلیں ابھی ایسی روشنی دے رہی تھیں جن کے عکس میں چند حُدی خوان دکھائی دیتے تھے، جو ویران صحراؤں میں حجازی لَے پر تہذیب کہنہ کے گیت الاپ رہے تھے۔ اسی دور میں شاہ جی کی شادی کی رسم سیّد میر مرتضٰے شاہ صاحب کی دختر نیک اختر سے ہوئی۔ سیّد میر مرتضٰے شاہ صاحب سیّد ضیاءالدین کے عم زاد بھائی تھے۔

لہلہاتے کھیتوں کے کنارے قدیم وضع کے دیہاتی کنوؤں نے سیّد زادے کی تقریب سعید پر خوشی سے دفیں بجائیں۔ گاؤں کے پیڑ باراتیوں پہ اپنے دامن سے ہوا کر رہے تھے۔ بڑی بوڑھیوں نے دعاؤں کے ساتھ سہاگ کے گیت گائے۔ دیہات کی الھڑ دوشیزائیں اس آئینے میں اپنے مستقبل کی تصویریں دیکھنے لگیں۔ گاؤں کے گھبیلے جوان جذبات کی پگڈنڈیوں پر سفر کرتے ہوئے اس شادی میں شریک ہوئے۔ ان سادہ اور اسلامی رسم و رواج کو دیہات کی سادگی نے اور بھی بخشش دی۔ جسے دیکھ کر تہذیب مشرق زیر لب مسکراتی رہی۔

دوبارہ امرتسر میں

۱۹۱۵ء بھی گزشتہ سال کی طرح یورپ کی بڑی لڑائی کا دوسرا سال تھا

محکوم قومیں یورپ کی نا تھا پائی میں اپنی غلامی کی زنجیریں پختہ ہوتی دیکھ رہی تھیں۔
اس سن میں شاہ جی شادی کی رسم سے فارغ ہو کر نصاب تعلیم مکمل کرتے پھر امرتسر
آ پہنچے ۔۔۔ یاد رہے اسی زمانے میں شاہ جی نے اپنی روحانی تربیت کے
لیے حضرت پیر مہر علی شاہ صاحبؒ گولڑہ شریف کے ہاتھ میں ہاتھ دیا تھا۔

شباب کے دن اور جوانی کی بہاریں ۔۔۔ آدمی کی عمر جب ان دونوں
کے درمیان سے گزرتی ہے تو راستے کی ہر شے دعوت دیتی ہے۔ نیکی
اپنی طرف کھینچتی ہے تو برائی اپنی طرف مائل کرتی ہے۔ اس کھینچا تانی میں کبھی
برائی کا دامن تار تار ہو جاتا ہے اور کبھی نیکی اپنی کم مائیگی کا ماتم کرتی ہے لیکن جسم
میں اگر روح سعید ہو تو برائی کو شکست دے دینا بڑی بات نہیں ہوتی مگر نیکی
کے حصول میں عمر کے اس موڑ سے گزرنا بڑا کڑوا گھونٹ ہے جسے بہت کم
حلق قبول کرتے ہیں۔

یہی کشمکش کے دن تھے جب شاہ جی کو ازدواجی بندھنوں میں باندھ
دیا گیا۔ نیز حالات نے تاکید بھی کر دی کہ "دامن ترمکن ہشیار باش"۔ لہٰذا اس
سال جب دوبارہ شاہ جی امرتسر آئے تو چہرے پر سبزے کا آغاز تھا۔ جسم
اگرچہ اکہرا تھا مگر مضبوط، رنگ گندمی، کشادہ پیشانی، بڑی بڑی چمکدار آنکھیں اور
ان سب پر پانچ فٹ چھ انچ قد نے وہ بہار نکھار رکھی تھی کہ سر پہ زلف دراز لیے
حسن و شباب کا یہ خوبصورت گلدستہ جن راہوں سے گزرتا اپنی مہک چھوڑتا جاتا
شہر کے لوگ انہیں "حافظ جی" کہہ کر پکارتے تھے۔

حضرت مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی کے مدرس میں دوبارہ شامل ہو کر دوسرے

سبق کی تکمیل شروع کردی۔ اُستاد اور شاگرد کے مابین محبت کا ایسا رشتہ قائم ہُوا کہ اعتماد نے دونوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ مولانا قاسمی جمعہ شاہ جی سے پڑھوایا کرتے تاکہ انہیں تقریر کے اپیچ پیچ سے آگاہی ہوتی رہے۔ درحقیقت یہی وہ دن ہیں جب مستقبل کا خطیب اعظم فن خطابت کی ابتدائی منزلوں میں داخل ہوا۔

جب کلی پھول بن کر اپنی پتیاں بکھیرتی ہے تو باغ کے گل بوٹے ہی اس کی مہک سے معطر نہیں ہوتے بلکہ نسیم سحر بھی اپنی جھولیاں بھر کر اڑوس پڑوس میں اپنا رنگ جماتی پھرتی ہے۔

شاہ جی کے قرآن کریم پڑھنے کا انداز جب عام ہُوا تو شہر کے گلی محلوں میں ان کا چرچا ہونے لگا۔ لوگ انہیں شبینوں پر بلانے لگے۔ گھروں سے نکل کر یہ آواز گلی کوچوں اور پھر بازار تک آن پہنچی۔ ع دل سے نکلی در جاناں تک پہنچی۔

آخر وقت آیا کہ مسجد کے اردگرد کے لوگوں نے مولانا غلام مصطفےٰ کو مجبور کیا کہ شاہ جی کو کھلے میدان میں تقریر کرنے کی اجازت دیں۔ چنانچہ پہلی تقریر اندرون گھوالی دروازہ بازار کہاراں میں ہوئی۔ دوسری تقریر کے لئے سید گلاب شاہ نامی شخص جو مولانا غلام مصطفےٰ کے مقتدی تھے، شاہ جی کو امرتسر کی نواحی بستی سلطان ونڈ لے گئے۔ اس طرح سے یہ کلی کھلی، پھول بنا اور اس کی مہک نے ساری فضا کو معطر کر دیا۔

امامت

نکہت باد بہاری نے چمن بردوش ہو کر لالہ و گل سے سرگوشیاں کیں اور

صحن چمن سے بوٹے لالہ و گل اٹھا کر لے گئے۔ شبنم کے آنسو چھینٹتے رہے۔ نسیم صبحگاہی سر پیٹ کر رہ گئی۔ گل بوٹوں نے لاکھ حصار کھینچے مگر بوٹے گل اسیر نہ ہوسکی۔ کوچہ جیل خانہ کے عوام اپنی مسجد کے لئے پیہم اصرار کے ساتھ مولانا غلام مصطفےٰ سے شاہ جی کو لے گئے۔ یہ ۱۹۱۹ء کا واقعہ ہے۔

ہال بازار کے وسط سے شروع ہو کر کوچہ جیل خانہ رام باغ پولیس تھانہ کے سامنے جا ختم ہوتا ہے۔ دوسری طرف میوہ منڈی کی پشت اس کی ہمسایہ تھی۔ اس طرف رام باغ کا بازار بھی اس کے سامنے تھا۔ اس قدر وسیع آبادی کو مسجد کی تنگ دامنی پر ہمیشہ گلہ رہا۔ لیکن شاہ جی کے خطیب منتخب ہونے پر مسجد کی وسعتیں اور مسدود ہو گئیں۔ یہ زمانہ لاسلکی کا نہیں تھا اور نہ آلہ مکبر الصوت کا رواج تھا لیکن شاہ جی کی آواز دل اور کانوں کو مطمئن کرتی رہی گو نمازیوں نے مکان کی چھتوں تک کو اپنی ضرورت کے لیے اپنا لیا تھا۔

استاد کا اصرار تھا کہ سبق یہاں آ کر پڑھا کریں لیکن کوچہ جیل خانہ اور بازار کمہاراں کے درمیان کا فاصلہ طے کرنے میں خاصی دقت رہتی۔ کچھ دنوں تو یہ سلسلہ رہا آخر استاد محترم کی اجازت سے شاہ جی نے ہال بازار کی مسجد خیرالدین میں مولانا نور احمد اور مفتی محمد حسن سے پڑھنا شروع کر دیا۔ مولانا نور احمد سے قرآن کی تفسیر اور مفتی محمد حسن سے مشکوٰۃ شریف کا سبق لیتے رہے۔

غیر اسلامی رسمیں

اِنسانی حرکات سے انسانیت کی قدریں جس بری طرح ہلاک ہوئی ہیں

زمانہ کے موجودہ چلن کے پاس اس کا کوئی مداوا نہیں ہے۔ وقت جیسے جیسے اپنا سفر طے کر رہا ہے ان پگڈنڈیوں پر کانٹے ہی کانٹے بکھرتے چلے جا رہے ہیں اس میں زیادہ مجرم وہ ہیں جن پر اسلام کا لیبل چسپاں ہے۔ مذہب کا ماضی جس قدر شفاف ہے مسلمان کا کردار اتنا ہی گدلا اور داغدار ہے۔ تاریخ کا سینہ ان زخموں سے اٹا پڑا ہے۔

صراطِ مستقیم سے ٹھوکر کھانے کے بعد مسلمان جن غلط راستوں پر گامزن ہوا اُن میں اسلام سے انحراف کی راہ اُسے زیادہ پسند آئی۔ سماج کے غلط رسم رواج اسی راستے کے خوبصورت پھول تھے جن سے مسلمان نے اپنی جھولیاں بھریں لیکن بعد میں انہی پھولوں نے کانٹے بن کر اس کے سارے کردار کو زخمی کر دیا۔ ۱۹۱۹ء سے پہلے کا امرتسر خلافِ اسلام رسوم کی آماج گاہ تھا۔ گھر کے ہر طاقچے میں رسم و رواج کے بت نصب تھے۔ برادری میں برتری حاصل کرنے کی دوڑ دھوپ میں مصروف مسلمان نے اپنا اثاثۂ حیات داؤ پر لگا دیا تھا۔

کسی کے ہاں بچہ پیدا ہوا تو اُس کے ختنوں پر گھوڑی اور باجا آنا لازمی تھا کیونکہ برادری میں "زید" نے ایسا کیا تھا۔ گرہ اس کی متحمل ہے یا نہیں لیکن سنت کے اس موقع پر خلافِ سنت حرکات لازمی تھیں

اگر کسی کے ہاں موت واقع ہو جائے تو میت کے آخری مقام پر پہنچنے سے پہلے ماتم پرسی کرنے والے عزیزوں کی خاطر داری برادری کا ضروری قانون تھا اور یہ سلسلہ چار دن تک جاری رہتا۔ جہلا کی ان حماقتوں کے باعث ملاؤں کے ہاں چالیس روز تک گھی کے چراغ جلتے۔

عورت بیوہ ہو جائے۔ بچے یتیم رہ جائیں لیکن رسومات کے آئین میں سقم نہیں آنا چاہیئے۔ مرنے والے کے کفن دفن پر خرچ ہو اور سارا برادری چٹ کر جائے گویا گھر کا ایک فرد کیا مرا سارا گھر مر گیا۔

لحد سے مہد تک کے درمیان ایک اور حادثہ گزرتا ہے جسے بیاہ شادی کا نام دیا جاتا ہے بلاشبہ ابن آدم کے لیے یہ منزل ضروری ہے لیکن یہ کہاں ضروری ہے کہ ایسے موقع پر برادری میں ناک رکھنے کے لئے آدمی خاک ہو جائے مگر امرتسر کے مسلمان نے زمانہ سازی کے لیے اس تقریب پر اپنی چادر سے زیادہ پاؤں پھیلائے۔ چند سالوں کے بعد قرض لی ہوئی رقم کے سود در سود میں مسلمانان امرتسر کی بیشتر جائداد غیر مسلموں کے قبضے میں چلی گئی۔ ان حالات نے مسلمانوں کو ملکیت سے محروم کر کے یا ہندو کا کرایہ دار بنا دیا یا پھر انہیں شہر سے باہر کی طرف رُخ کرنا پڑتا۔ اس طرح امرتسر پر ہندو کا قبضہ ہوتا چلا گیا پہلو میں دل آگاہ رکھنے والے مسلمان کے لیے خون کے آنسو رونے کے سوا اور چارہ ہی کیا۔ انہی دنوں شاہ جی نے کوچہ جیل خانہ کی مسجد سے نکل کر محلہ وار تقریروں کا آغاز کیا۔ قبیح رسوم پر یہ پہلی یلغار تھی جو مسجد کے ایک مولوی نے کی جس کے پاس زبان اور قرآن کی قوت کے سوا تیسری طاقت نہیں تھی کہ وہ مسلم کو غارت گری کے راستوں پر چلنے سے منع کرتا۔

وہ دل بھرا اساتذہ سے جو پڑھتے شام ہوتے ہی کسی نہ کسی مسجد میں وعظ کی صورت میں سنا آتے۔ ان دنوں مولانا ثناءاللہ کا امرتسر پر خاصا اثر تھا لیکن مخصوص عقیدت کی بنا پر وہ بات پیدا نہ ہو سکی جو شاہ جی کے طرز تکلم نے کی۔

علم محض پڑھائی سے نہیں طلب اور خدمت سے ملتا ہے۔ شاہ جی کا علم اگرچہ ہنوز خام تھا لیکن اساتذہ کی محبت اور کتاب اللہ کی برکت سے وہ جاہلوں میں عالم اور عالموں میں عزت کی نظروں سے دیکھے جانے لگے۔ امرتسر کے در و دیوار انہیں سننے اور دیکھنے کو چشم براہ رہتے۔ قبیح رسموں کے خلاف جہاد نے شاہ جی کو وہ احترام دیا کہ جس محلے میں وہ وعظ فرماتے انسانوں کے سمندر اُمڈ آتے۔

اس طرح شہر کے اندر ایک نئی تحریک نے جنم لیا۔ رسم و رواج کے محرک اور علماء سوء کے درمیان راہ و رسم بڑھنے لگی۔ مذہب کے گرد حصار کی نئی استوار ہونے والی دیوار کو گرانے پر روز و شب مشورے ہونے لگے اور شاہ جی کے خلاف ایک ایسے گروہ کی تنظیم ہوئی جس کے رزق کا انحصار جھوٹ کے چراغ روشن کرنا اور کذب کو حقیقت ظاہر کرنا تھا۔

یہ تحریک ابھی اپنے پر پرزے نکال رہی تھی کہ یورپ کے سیاسی اُفق پر پہلی جنگ عظیم میں موریوں کے ڈوبتے ہوئے سورج کی سرخیاں دکھائی دیں

جلیانوالہ باغ کا حادثہ

۱۹۱۴ء کی لڑائی کے ختم ہوتے ہی اتحادی طاقتیں فتح و نصرت کے علم لئے سمندر کی چھاتی پر رقص و سرود میں محو گئیں۔ اس محویت میں وہ یہ بھول گئیں کہ انہوں نے غلام ہندوستان کے ساتھ کسی رشتۂ اتحاد کو گرہ دی تھی، کسی وعدہ کی وفا اُن کے ذمے ہے۔

۱۹ اگست ۱۹۱۸ء کو برطانوی حکمرانوں نے ایک اعلان کیا کہ ہندوستانیوں کو آئندہ فوجی کمیشن میں اعلیٰ عہدے دیئے جائیں گے حالانکہ جنگ کے اختتام پر ہندوستان کو ذمے دار گورنمنٹ دیئے جانے کا وعدہ تھا۔ اس آئینہ میں ہندوستان کو اپنے حکمرانوں کی نیت صاف دکھائی دی اور ان کا شبہ نکھر کر سامنے آگیا۔ چنانچہ وہ زنجیر ٹوٹ گئی جس سے برطانوی سامراج نے اپنے غلاموں کو باندھ رکھا تھا۔

ہندوستان کی پریشان قومیں پھر سے متحد ہوئیں اور انہیں اپنے مقدر کا ازسرنو جائزہ لینا پڑا۔ دسمبر ۱۹۱۸ء کو مولوی اے، کے فضل حق کی زیر صدارت دہلی میں مسلم لیگ کا اجلاس ہوا جس میں استقبالیہ کی صدارت ڈاکٹر مختار احمد انصاری نے کی۔ گو ڈاکٹر صاحب کا خطبۂ استقبالیہ حکومت نے ضبط کر لیا لیکن اس اجلاس میں مطالبہ کیا گیا کہ ۱۹۱۴ء میں ہندوستان نے انگریزوں سے وفاداری کا عہد پوری ذمہ داری سے نبھایا ہے۔ لہذا برطانوی حکمرانوں کا فرض ہے کہ وہ اپنے وعدوں کی روشنی میں ہندوستان کو درجہ نو آبادیات دیں۔ اس قرارداد کی تائید میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا عبدالباری فرنگی محل (لکھنؤ) مولانا آزاد سبحانی (لکھنؤ) مولانا ثناء اللہ امرتسری نے تقریریں کیں۔ اس طرح پورے ملک میں انگریز حکمرانوں کے خلاف وعدہ شکنی کی آگ بھڑک اٹھی۔ اندریں یورپ ترکوں سے صلح کے بعد بھی برطانوی دانشوروں نے ایسا ہی سلوک کیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محکوم و حاکم کے درمیان دلوں کی بھٹیاں اس قدر شعلہ فشاں ہوئیں کہ ہندوستان کا امن و دود چراغ محفل بن کر رہ گیا۔

حادثات وواقعات کی مسلسل کڑیاں کچھ اس ترتیب سے پیہم ہوئیں کہ ایوانِ افرنگ کی دیواریں اسی سلاسل میں جکڑی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔

آخر انگلینڈ کی سپریم کورٹ کے جج مسٹر ایس، اے، ٹی رولٹ کی زیر کمان ایک کمیٹی نے (جو برطانیہ کے یہودی وزیر اعظم مسٹر لارڈ جارج نے مقرر کی تھی۔) اپنی دانست میں بغیر تحقیق کے ہندوستان پر تشدد اور دہشت انگیزی کے ایسے الزامات تراشے کہ جنہوں نے جلتی پر تیل چھڑکا (مسٹر رولٹ کی یہی رپورٹ ماضی کی سیاسی تاریخ میں رولٹ ایکٹ کے نام سے مشہور ہے) اس رپورٹ کے نتیجے میں ہندوستان نے ایک نئی سیاسی کروٹ لی اور کانگریس کی باگ ڈور جو پہلے مسٹر تلک راج گوکھلے کے ہاتھوں میں تھی مہاتما گاندھی کے سپرد کر دی گئی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مہاتما گاندھی ہندوستانی سیاست میں براہ راست دخیل ہوئے تھے۔ انہوں نے آتے ہی رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاجاً ۶ راپریل ۱۹۱۹ء کو ہندوستان بھر میں ہڑتال کا اعلان کر دیا۔ اس موقع پر آریہ سماجی رہنما مسٹر شردھانند جیسے کٹر ہندو نے دہلی کی جامع مسجد میں ہندو مسلم اتحاد پر تقریر کی اور امرتسر میں ہندو مسلمانوں نے ایک برتن میں پانی پیا۔ یہ رام نومی کے تہوار کا دن تھا۔

دو مختلف قوموں کے درمیان انگریز کی نفرت نے ایسا میلہ لگایا کہ فرنگی سامراج کا وقار کھلونے کی طرح ٹوٹ کر رہ گیا۔ ہڑتال جاری تھی مگر انگریز راج کا تشدد شہر بھر میں اپنا کام کرتا رہا۔ اس ظلم وجور کے خلاف شہریوں کا ایک جلوس ڈپٹی کمشنر امرتسر کی کوٹھی پر جاتے ہوئے جب ریلوے کے بڑے پل پر سے گزرا تو انگریز سپاہیوں نے بغیر وارننگ دیئے اس ہجوم پر گولی چلا دی جس کے

نتیجے میں چھ ہندوستانی شہید ہوئے۔

خدمت خلق

شاہ جی اس زمانے میں حصول تعلیم، کوچہ جیل خانہ کی امامت اور خلاف شرع رسوم کے خلاف جہاد میں مصروف تھے۔ فرنگی تشدد کے شہداء کی لاشیں موقع واردات سے اٹھا کر ہال بازار خیرالدین کی مسجد میں لائی گئیں تو شاہ جی نے ان سب کو غسل دیا، کفن پہنائے، مسلمانوں کا جنازہ پڑھایا اور تمام لاشوں کو خود مسجد سے رخصت کیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ شاہ جی نے غیرارادی طور پر خدمت خلق سے مرنے والوں کی تجہیز و تکفین کی۔ اتنے سے کام نے شاہ جی کا نام غیرمسلموں کے دلوں میں نقش کر دیا۔ حالانکہ ان دنوں وہ سیاسیات سے قطعاً ناآشنا تھے۔ انہیں صرف یہی دھن تھی کہ امرتسر کا مسلمان فضول رسم ورواج سے باز رہے لیکن ان کی اتنی ہمدردی نے انہیں کافی شہرت دی۔ اپنے اور پرائے انہیں احترام کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔

مارشل لاء

امرتسر کے عوام انگریز سامراج کے خلاف اپنا امن برباد کر چکے تھے دلوں کی سلگتی ہوئی بھٹیوں کے الاؤ اس قدر روشن ہو چکے تھے کہ غلامی کی زنجیریں صاف پگھلتی دکھائی دے رہی تھیں بنکوں اور دوسری سرکاری عمارات کی جلی

ہوئی تھا کہ سے بغاوت کی بُو پھیل رہی تھی۔

۱۰ اپریل کو طلوع ہونے والے آفتاب نے امرتسر کو ماتمی لباس میں دیکھا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو گرفتار کر لیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد غلاموں پر آقاؤں کا تشدد اور نکھرا۔ شہر پر فوج نے قبضہ کر لیا اور مارشل لاء کا اعلان کر دیا گیا۔ امرتسر کے شب و روز فوجی آئین کے تحت سفر کرنے لگے۔ شہر میں گورکھا سپاہیوں کا راج تھا۔ ہر موڑ پر ٹکٹکی باندھ دی گئی۔ صرف ہندوستانی ہونے کے جرم میں بید زنی کی سزائیں عام دی جانے لگیں۔ ہر راہگیر کو پیٹ کے بل چلنے پر مجبور کیا جانے لگا۔ ان واقعات نے خوف و ہراس کو جنم دیا۔ بازار اور گلیاں ویران صحرا کی طرح نظر آنے لگیں۔ گھروں کے دروازوں اور کھڑکیوں پر جالوں نے رین بسیرے بنا لیے۔ اس جمود کو کبھی کبھار فوجی سپاہیوں کے بوٹوں کی ٹاپ توڑ دیتی تھی لیکن دلوں پر جمود بدستور رہا۔

جلیانوالہ باغ

۱۳ اپریل کا دن تاریخ کے دامن میں ایسی گرہ دے چکا ہے کہ یہ گرہ جب بھی کھولی جائے گی۔ ناکردہ گناہ انسانوں کا خون اپنے قاتل پر مسکراتا نظر آئے گا۔

مرحوم پنجاب میں یکم بیساکھ دیہاتی عوام کی خوشیوں کا دن ہوتا تھا۔ اس تہوار پر گاؤں کے جیالے جوان کندھوں پر لاٹھیاں لیے رنگا رنگ لباس پہنے دیہاتی گیت گاتے امرتسر کی سڑکوں پر سے گزرتے تو شہری عوام کو بھی اپنی برہیوں میں

شامل کر لیتے : ماجھے واجسٹ پنجاب کے صحت مند حسن کا ہراول دستہ تھا۔ بیاس اور دریائے ستلج کے پانی نے مل کر اس کی پرورش میں رنگ بھر دیا تھا۔

۱۳ر اپریل ۱۹۱۹ء کا یہی دن تھا جب دیہاتی اور شہری لوگ اپنے رہنماؤں کی گرفتاری کے خلاف احتجاجاً جلیانوالہ باغ میں جمع ہوئے تو جنرل ڈائر نے اچانک اُن پر گولی چلا دی۔ اس کے نتیجے میں پانسو سے زائد بے گناہ ہندوستانی شہید ہوئے اور زخمیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔

۶ر اپریل کو جس کہانی کا آغاز ہوا تھا ۱۳ر اپریل کو جب مکمل ہوئی تو تاریخ اور انسانیت کے سینے پر گہرا گھاؤ چھوڑ گئی۔ اب جب کبھی یہ زخم رِستے ہیں تو انسانوں کے دل اور تاریخ کے اوراق فرنگی حکمرانوں کے لیے نفرین کیے بغیر نہیں رہتے۔

احساس اُبھر آیا

چوٹ کھایا ہوا دل جب سنبھالا لیتا ہے تو وارفتہ انتقام کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ خرد لاکھ آڑے آئے مگر جنون اپنا کام کر جاتا ہے۔ جلیانوالہ باغ کا حادثہ اہل دل پر بادِ سموم کی طرح گزر گیا جس سے وہ سانپ کی طرح بل کھا کر رہ گئے۔ مگر وقت کے ساتھ ساتھ یہ درد گھاؤ بنتا چلا گیا۔

شاہ جی انہی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں۔ ۶ر اپریل کو جن ہاتھوں نے شہدائے وطن کو کفن پہنائے تھے وہی ہاتھ حکمرانوں کے لئے کفن سینے کی تیاری میں لگ گئے۔ شاہ جی ان واقعات سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ چنگاری

ہوا کی منتظر تھی۔ مگر
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

آغازِ سفر

پہلی جنگِ عظیم میں ہندوستان سے کیے گئے وعدوں سے انحراف کے بعد انگریز حکمرانوں نے ترکوں سے بھی عہد وفا توڑ دیا۔ اس کی صدائے بازگشت جب ہندوستان پہنچی تو مسلمان خلافت کے مسئلہ کو مذہب کی بنیاد پر سوچنے لگے۔ چنانچہ نومبر ۱۹۱۹ء کو دہلی میں موتمر اسلامی کے عنوان سے مسلمان رہنما جمع ہوئے۔ ان کے علاوہ مہاتما گاندھی اور سوامی شردھانند کو بھی دعوت دی گئی۔ اس اجلاس میں "ترکِ موالات" اور سودیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک کی بنیاد رکھی گئی۔

مولانا سید محمد داؤد غزنوی (رحمۃ اللہ علیہ) پنجاب میں پہلے عالم دین تھے جنہوں نے تحریکِ خلافت کو ہوا دی اور محلہ وار تقریروں سے عوام پر یہ مسئلہ روشن کیا۔

شاہ جی ان دنوں صرف مذہبی واعظ تھے لیکن کبھی کبھار ان کی مڈبھیڑ مولانا داؤد غزنوی سے ہو جاتی۔ یہاں تک کہ مولانا داؤد غزنوی کسی جگہ تقریر کرتے تو دوسرے دن شاہ جی اسی جگہ جلسہ کر کے اُن کی تردید کر دیتے۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ مولانا داؤد غزنوی نے شاہ جی کو دعوت دی کہ یا تو مجھے اپنے مکان پر بلائیں یا میرے مکان پر تشریف لائیں۔ میں آپ سے مسئلہ خلافت پر گفتگو کرنا چاہتا

ہوں۔ آخر مولانا داؤد غزنوی خود شاہ جی کے دولت کدہ پر پہنچ کر گئے اور خلافت عثمانیہ کا خاتمہ، ترکوں سے انگریزوں کی عہد شکنی اور عالم اسلام پر فرنگی حکمرانوں کی چیرہ دستیاں کچھ اس انداز سے بیان کیں کہ انور شاہ جی مولانا داؤد غزنوی کے ہم آہنگ ہو گئے۔ اس گفتگو کے بعد شاہ جی نے روزانہ اخباروں کا مطالعہ شروع کر دیا۔ جس سے حالات اور واضح ہو کر سامنے آ گئے۔

پھر کیا تھا، آبگینے کو ٹھیس لگنے کی دیر تھی، وہ ساری مستی بہہ نکلی۔ بزم عشاق جس کی منتظر تھی وہ آتش فشاں پھٹ گیا جس کی راکھ اندر ہی اندر سلگ رہی تھی۔ وہ لاوا بہہ نکلا جو فرنگی سامراج کو تنکے کی طرح بہا کر لے گیا۔

پہلی سیاسی تقریر

بعض دفعہ فرد کی برائی پوری قوم کو لے ڈوبتی ہے۔ جنرل ڈائر کی حرکت نے صرف جلیانوالہ باغ کو ہی بے گناہوں کے خون سے رنگین نہیں کیا بلکہ یہ چھینٹے اقوام یورپ کے دلوں تک بھی پہنچے جس سے ان کی نگاہیں انسانیت کے روبرو ہمیشہ شرمندہ رہیں گی۔ اس زخم پر مرہم کے لیے یورپین جراحوں نے نسخہ تجویز کیا کہ تمام ہندوستانی رہنماؤں کو جیلوں سے رہا کر دیا اور ساتھ ہی ہندوستان کو آزادی کی چوتھی قسط دینے کا اعلان کیا۔ ان اصلاحات کا نمایاں پہلو یہ تھا کہ صوبوں کی عنانِ حکومت ہندوستانی وزیروں کو سونپ دی جائے گی مگر مالیات کا محکمہ انگریز گورنروں کے پاس رہے گا۔

اس برطانوی تجویز پر غور کرنے کے لئے دسمبر ۱۹۱۹ء میں کانگریس کا

سالانہ اجلاس امرتسر میں پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں منعقد ہوا۔ علی برادران
بھی رہا ہو کر سیدھے امرتسر پہنچے۔ مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بھی اسی موقع پر امرتسر
میں حکیم محمد اجمل خان (رحمۃ اللہ علیہ) کی صدارت میں منعقد ہوا۔ خلافت کانفرنس
بھی انہی تاریخوں پر امرتسر (گول باغ) میں مولانا شوکت علی کی صدارت میں منعقد ہوئی
جس میں پہلی دفعہ شاہ جی نے سیاسی تقریر کی۔ اور حاضرین کو اس قدر متاثر کیا کہ
خلافت کمیٹی کے لیے دس لاکھ روپے کے چندے کی اپیل کی۔ مولانا محمد علی
جوہر نے پہلی مرتبہ اس اجتماع میں شاہ جی کو سنا اور دیکھا تو قافلہ میں نئے ساتھی
کی شرکت پر خوش ہوئے اور ساتھی بھی ایسا کہ نہ صرف سالارِ کارواں رشک کرنے
لگے بلکہ غبارِ کارواں نے بھی قدم لیے اور خوش آمدید کہا۔

ترکِ موالات

۱۹۲۰ء کا سال حریت پسند عوام کے لیے جدوجہد کا اہم سال تھا۔ اس
سال مئی میں کانگریس نے اپنے بنارس سیشن میں برطانوی سامراج سے ترکِ موالات
کا فیصلہ کیا۔ اسی ہفتے ناگپور میں مسلم لیگ نے بھی ترکِ موالات کی قرارداد منظور
کر کے کانگریس اور خلافت کمیٹی کی تائید کی۔ اس قرارداد کی مزید تشریح جب کلکتہ
کانگریس کے سیشن میں فروری ۱۹۲۱ء میں مہاتما گاندھی نے کی تو مولانا ابوالکلام آزاد
اور مولانا شوکت علی کے سوا ساری ورکنگ کمیٹی گاندھی جی کے خلاف ہو گئی۔
کانگریس کے کھلے اجلاس میں مولانا آزاد نے قرارداد کے حق میں تقریر کی
تو شاہ جی اس اجلاس میں موجود تھے۔ وہ تقریر سے بے حد متاثر ہوئے اور آخر

میں جب اُنہوں نے قرارداد کے مؤید کے طور پر تقریر کی تو سارا ہال ترکِ موالات کے حق میں ہو گیا۔

یہ پہلا موقع تھا کہ شاہ جی اور گاندھی جی ایک دوسرے سے متعارف ہوئے۔ اس تحریک کے نتیجے میں بچوں نے سکول، نوجوانوں نے کالج اور وکلاء نے عدالتوں میں حصّہ لینا چھوڑ دیا۔ ولائتی مال کے بائیکاٹ کی تحریک زور پکڑ گئی

لاہور خلافت کمیٹی

ان دنوں سارے ملک میں خلافت کمیٹیاں قائم کی جا رہی تھیں۔ لاہور کے اعتدال پسندوں نے بھی خلافت کمیٹی کی بنیاد رکھی۔ چنانچہ ڈاکٹر محمد اقبال (جو ان دنوں "سر" نہیں تھے) اور میاں محمد شفیع (جو بعد میں سر شفیع کے نام سے مشہور ہوئے) دونوں بالترتیب صدر اور سکریٹری منتخب ہوئے۔

اس زمانہ میں جنرل سر مائیکل اوڈوائر پنجاب کے گورنر تھے۔ ان کے اشارے پر لاہور کے ڈپٹی کمشنر نے دونوں کو بلا کر کچھ کہا سنا تو دوسرے دن یہ خلافت کمیٹی توڑ دی گئی۔

ان دنوں شاہ جی کے جذبات اور انگریز کا تشدّد دونوں شباب پر تھے دونوں کے ٹکراؤ نے نوجوانوں کے ہاتھ فرنگی سامراج کے گریبان تک پہنچا دیئے۔ حکیم عبدالمجید عتیقی اپنی یادداشتوں میں لکھتے ہیں کہ:۔

"جب پہلے کی خلافت کمیٹی انگریز حاکموں کے خوف سے دم توڑ گئی تو میں امرتسر میں مولانا ثناء اللہ کے ہاں پہنچا۔ عرض حال

کہا تو انہوں نے شاہ جی کو میرے ساتھ لاہور جانے کا حکم دیا"

شاہ جی لاہور پہنچے تو لاہور ان سے نا آشنا تھا۔ موچی دروازے کے شمال کی جانب باغ میں دن کے گیارہ بجے جلسے کا اعلان کیا گیا ایسے وقت پر باغ میں موسم سرما کے باعث اوباش قسم کے لوگ دھوپ تاپ رہے تھے لیکن جلسہ کے شائق بہت کم تھے۔ کوئی اسٹیج کا انتظام نہیں تھا۔ تین چار سو کے قریب حاضری تھی۔ شاہ جی نے ایک گھنٹہ تک صرف قرآن کریم پڑھا اور ظہر تک تقریر کی۔ نماز کے بعد دوبارہ جلسہ کا اعلان کیا گیا۔ اب کے حاضری پہلے سے زائد تھی۔ اس جلسے میں فیروز کاڑے والا (یہی شخص بعد میں میاں فیروزدین احمد کے نام سے مشہور ہوا) کہیں سے ایک کرسی اور میز اٹھا لایا۔ یہ اجلاس عصر کی نماز کے لیے ملتوی کیا گیا اور جب دوبارہ جلسہ شروع ہوا تو حاضری پانچ ہزار کے قریب تھی۔ شاہ جی قرآن حکیم کی آیات پڑھتے اور ساتھ ساتھ ان کی تفسیر بیان کرتے جاتے اور لوگ یوں کہ اس طرح بیٹھے تھے جیسے کسی نے سحر پھونک دیا ہو۔ مولانا سید حبیب (روزنامہ سیاست کے مالک و مدیر) اس اجلاس میں شریک تھے۔ یہ اجلاس مغرب اور عشاء کی نماز کے لیے ملتوی ہوا۔

اب نافہ کی خوشبو لاہور کی گلیوں اور بازاروں میں پھیل چکی تھی۔ ایک نے سنا دوسرے کو سنایا "کوئی ڈنڈے والا پیر آیا ہوا ہے" (شاہ جی اس زمانہ میں اپنے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا رکھتے تھے اور ایک مدت تک اسی نام سے مشہور رہے)

"وہ قرآن پڑھتا ہے تو ایسا معلوم دیتا ہے جیسے ابھی آسمان سے

نازل ہو رہا ہے۔ اس کی آواز میں جادو ہے۔ آج اس نے سارے لاہور کو پاگل کر دیا ہے۔"

پھر کیا تھا۔ عشاء کی نماز کے بعد جو اجلاس ہوا۔ اس میں بیس ہزار سے زائد لوگوں نے شرکت کی۔ شاہ جی نے صبح تین بجے تک عوام سے خطاب کیا اور آخر میں کہا:

"کون ہے جو کہتا ہے لاہور میں خلافت کمیٹی نہیں بن سکتی۔ میں بتاتا ہوں کس مائی کے لال میں ہمت ہے کہ اس کو توڑ کر دکھائے۔"

اسی اجلاس میں سید حبیب کو خلافت کمیٹی لاہور کا صدر اور میاں فیروز دین احمد کو جنرل سیکرٹری منتخب کیا۔ نیز چندے کی اپیل کی تو لوگوں نے دل کھول کر روپیہ دیا۔ عورتوں نے اپنے زیور تک اتار کر بھیج دیئے۔ آخر شاہ جی کو اعلان کرنا پڑا کہ آپ اور روپیہ نہ دیں۔ کل صبح جب خلافت کمیٹی کا دفتر قائم ہو جائے گا تو آپ اس روپیہ کی رسید بھی لے لیں اور دوسرا روپیہ جو دیں اس کی بھی۔

چنانچہ دہلی دروازہ کے باہر میاں سراج دین پراچہ کے مکان میں خلافت کمیٹی کا دفتر قائم ہوا اور مدت تک یہی دفتر رہا۔

مرزا بشیر الدین محمود سے پہلی ٹکر

حکومت سے ترکِ موالات کی تحریک نے سارے ہندوستان کو اپنے گرد جمع کر لیا تھا۔ بچے، جوان، بوڑھے اور مستورات غیر ملکی غلامی سے نجات کے

لئے ایثار و قربانی کے تمام ارادوں سے مسلح ہو کر حالات سے مقابلے کے لیے تیار تھے۔ گرفتار ہونے والے رہنماؤں سے جیل خانے کی وسعتیں تنگ ہو چکی تھیں۔ فرنگی سامراج اپنے اقتدار کے ڈھلتے ہوئے سورج کا تماشا کر رہا تھا۔ کہ قادیانی مذہب کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود انگریزوں سے اپنی جنس وفاداری کا بھاؤ بڑھانے اور انگلستان کی منڈیوں میں اس سودے کو مزید چلا دینے کے لیے ہندوستان کے اتحاد میں زہر گھولنے کو آموجود ہوئے۔

آریہ سماجی لیڈروں کے خلاف اسلام کی آڑ میں جھگڑا مول لیا اور ساتھ ہی مسلمانوں سے اعتقادی لڑائی بھی چھیڑ دی۔ قادیانیوں نے یہ حرکت ایسے موڑ پر کی جب حکمرانوں کے تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ قریب تھا کہ یہ آگ پھیل کر اتحاد آزادیٔ وطن کو راکھ کر ڈالے کہ شاہ جی نے آگے بڑھ کر اپنے آپ کو اس آگ میں جھونک دیا۔

۱۹۲۵ء کے وسط کی بات ہے کہ بندے ماترم ہال امرتسر میں دن کے گیارہ بجے مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے جلسے کا اعلان کیا اور شہر کے مسلمانوں کو شمولیت کی دعوت دی۔ عوام کے ساتھ شاہ جی بھی اس اجتماع میں شامل ہوئے جلسے کے گرد مرزائیوں نے انتظام کا پورا جال پھیلا رکھا تھا سی، آئی، ڈی انتظامی امور سے لیس تھی۔

مرزا بشیر الدین محمود نے تقریر کے دوران کسی حدیث کے الفاظ غلط پڑھ دیئے۔ اس پر شاہ جی نے مجمع سے اٹھ کر بشیر الدین محمود کو حدیث کے الفاظ غلط پڑھنے پر ٹوکا لیکن مرزائی لیڈر اپنی ضد پر اڑا رہا اور شاہ جی اپنے موقف پر قائم

رہے۔ یہ ہنگامہ آرائی تقریباً بیس منٹ تک جاری رہی تو مرزائیوں نے پولیس کو طلب کر لیا۔ اس پر شاہ جی نے عوام سے کہا کہ جس قدر مسلمان جلسہ میں ہوں وہ ہال سے باہر آ جائیں۔ چنانچہ مرزائیوں کے سوا مسلمان شاہ جی کے حکم کی تعمیل میں ہال سے باہر نکل آئے۔ باہر شاہ جی نے مرزائیوں کے خلاف تقریر شروع کر دی۔ اس پر بشیر الدین محمود کو اپنی پارٹی سمیت ہال کے عقبی دروازہ سے پولیس کی حفاظت میں نکلنا پڑا لیکن شاہ جی بدستور بازار میں تقریر کرتے رہے۔

• اس ایک ہلکی سی چپقلش کا اثر یہ ہوا کہ مرزائیوں کے منصوبے ختم ہو گئے اور ان کے حوصلے اس قدر پست ہوئے کہ تحریک ترک موالات کے دوران مرزائیوں کا نام بھی سننے میں نہ آیا اور نہ ہی ملک کے سیاسی حالات اس قسم کی تحریکات کی اجازت دیتے تھے۔

خلافت اور ترک موالات کی مشترک ایجی ٹیشن نے سارے ہندوستان کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ایک کر دیا تھا۔ غیر ملکی قانون اپنی ساری قوت کے باوجود کمزور اور بیکار سمجھا جانے لگا۔ اسی زمانہ میں ۲۲ مئی ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رح حضرت مولانا حسین احمد مدنی رح مولانا عزیر گل رح مالٹا سے رہا ہو کر ہندوستان پہنچ گئے۔ ان کی رہائی سے تحریکات آزادی وطن کو مزید تقویت ملی۔ خلافت کمیٹی کی شاخیں ہر شہر اور قصبہ میں قائم ہونے لگیں۔

آزاد ہائی سکول گجرات

اسیران مالٹا وطن واپس پہنچ کر اپنے اپنے مقاصد میں مصروف ہو گئے

حضرت مدنیؒ تحریک خلافت میں شامل ہو گئے اور حضرت شیخ الہندؒ کو جمعیۃ العلمائے ہند نے اپنا صدر منتخب کر لیا۔ انہی دنوں مولانا محمد علی جوہر نے دہلی میں جامعہ ملیہ کی بنیاد رکھی جس کے تحت ملک کے اکثر شہروں میں تعلیمی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ جس میں وہ بچے داخل ہوتے جنہوں نے تحریک ترک موالات کے سلسلے میں سرکاری سکول چھوڑے تھے۔

شاہ جی نے گجرات میں آزاد ہائی سکول کی بنیاد رکھی جس کا افتتاح مولانا ابوالکلام آزاد نے کیا۔ چوہدری فیض محمد ایم اے ہیڈ ماسٹر اور ملک نصر اللہ خاں عزیز سیکنڈ ماسٹر مقرر ہوئے۔

آزاد ہائی سکول کی تمام تر ذمہ داری شاہ جی پر تھی۔ وہ ضلع گجرات میں خلافت کمیٹیاں قائم کرتے اور آزاد ہائی سکول کے لئے روپیہ فراہم کرتے تھے۔ شاہ جی کو ضلع بھر میں اس قدر مقبولیت ہوئی کہ ۱۳۰۰ خلافت کمیٹیاں اسی ایک ضلع میں قائم ہوئیں۔ بیس ہزار کے قریب طلبا کی حاضری تھی۔ عورتوں نے اپنے زیور اور مردوں نے اثاثہ حیات تک ان کے قدموں میں ڈھیر کر دیا۔

شب و روز کی محنت اور شاہ جی کی تقریروں نے ضلع بھر کے مرد و زن کو ستاروں کی طرح ان کے گرد جمع کر دیا۔ ضلع گجرات کا ڈپٹی کمشنر کنور دلیپ سنگھ جس نے عیسائیت چھوڑ کر سکھ مذہب اختیار کر لیا تھا، لباس تبدیل کر کے شاہ جی کی ہر تقریر میں شامل ہوتا۔ آخر اسے حکومت نے مجبور کیا کہ وہ شاہ جی کو گرفتار کر لے لیکن اس نے ہمیشہ پہلو تہی کی۔ اس کی رائے تھی کہ عطاء اللہ شاہ بخاری نے ضلع گجرات کے عوام پر جادو کر رکھا ہے۔ وہ اگر

کے دل و دماغ پر قابض ہے۔ اگر اُسے ان دنوں گرفتار کیا گیا تو ضلع بھر میں حکومت کے خلاف بغاوت پھیل جانے کا ڈر ہے۔

ضلع گجرات باقی ہندوستان کی طرح بغاوت کی سلگتی ہوئی آگ کو ہوا دے رہا تھا۔ آزاد ہائی سکول کے طلباء کے دلوں میں انگریز حکمرانوں کے خلاف نفرت کی تخم ریزی اندر ہی اندر اپنا کام کر رہی تھی۔ اس دوران میں شاہ جی کبھی کبھار پنجاب کے دوسرے اضلاع میں جاتے رہے لیکن گجرات اُن کی سرگرمیوں کا محور تھا جس کے باعث ہزاروں طلباء نے تعلیم حاصل کی اور گجرات کے عوام آزادیٔ وطن کے لئے کفن بردوش ہو کر میدان کارزار میں نکل کھڑے ہوئے۔

تحریکِ ہجرت

جیسے جیسے دن گزرتے گئے تحریک خلافت اور ترک موالات کے منہ زور گھوڑے برطانوی سامراج کا نظم و نسق روندتے ہوئے آگے بڑھتے گئے۔ انگریزی راج کے تشدد نے وقت اور حالات میں ایسا زہر گھولا کہ ۱۷۶۵ء میں شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فتویٰ کہ

"انگریزی حکام اگر ان (مسلمانوں) کے کسی معاہدے کو توڑ ڈالیں یعنی نماز باجماعت یا جائز شرعی رسومات یا مسجد کی تعمیر یا ادارۂ حج یا اسلامی قانون میں دخل انداز ہوں تو پھر ان سے جہاد فرض ہو جائے گا لیکن اگر جہاد نا قابلِ عمل ہو تو پھر ہر دین دار مسلمان پر ہجرت لازم آتی ہے۔"

علمائے ہند کی آنکھوں میں تیرنے لگا۔ چنانچہ مولانا عبدالباری (فرنگی محل لکھنؤ) نے اپریل ۱۹۲۰ء کو فتویٰ دیا کہ

"فرنگی حکومت نے اپنی مسلمان رعایا سے جو وعدے کیے تھے وہ ان سے منحرف ہو چکی ہے نیز ہندوستان کی نہتی رعایا پر اُن کا تشدد بڑھ کر مذہب میں بے جا مداخلت کرنے لگا ہے۔ بدیں حالات ہندوستان دارالحرب ہو چکا ہے۔ لہٰذا مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے کسی ایسے ملک میں چلے جائیں جہاں کی قدریں اسلام سے ملحق ہوں۔"

اس فتوے کا شائع ہونا تھا کہ والیٔ افغانستان غازی امان اللہ خان نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ افغانستان ہندوستانی مہاجروں کو اپنے ہاں پناہ دینے کے لیے تیار ہے۔

خلافت اور ترکِ موالات، ایسی تحریکات کی موجودگی میں ہجرت کی تحریک نے علماء اور دوسرے رہنماؤں کو پریشان کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر مختار احمد انصاری ان دنوں لندن میں ہندوستانی وفد کی قیادت کر رہے تھے ــــ مولانا شوکت علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور خود مہاتما گاندھی تحریکِ ہجرت کو آزادیٔ وطن کے لئے مضر خیال کر رہے تھے۔ ان کی رائے تھی کہ آزادی کی لڑائی ملک کے اندر بیٹھ کر لڑی جانی چاہیے وطن چھوڑ کر چلے جانا مفید نہیں۔ دوسری طرف علمائے فرنگی محل اور شاہ جی

تحریک ہجرت کو کامیاب کرنے میں سرگرم عمل تھے۔ پنجاب میں مولانا مولا بخش خطیب جامع مسجد راولپنڈی، مولانا احمد علی لاہوری، عزیز ہندی، خان عبدالغفار خان، علامہ حسین میر کاشمیری، اقبال شیدائی اور دوسرے رہنما عوام کو ہجرت کی دعوت دے رہے تھے۔

انہی دنوں ترکیہ، جرمنی اور روس کے فوجی جرنیل غازی امان اللہ سے افغانستان میں گفتگو کر رہے تھے کہ اگر ہندوستان میں برطانیہ کے خلاف وہاں کے عوام بغاوت کریں تو ان کی فوجی امداد کی جائے تاکہ ہندوستان انگریزی تسلط سے آزاد ہو جائے۔

اس مشورے کے پس منظر میں عبید اللہ سندھی کا ہاتھ تھا جو پہلی جنگ عظیم کے شروع میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن کے حکم پر افغانستان چلے گئے تھے۔

اس تحریک کی موجودگی میں برطانوی حکومت نے ہجرت کی تحریک کو خلافت اور ترک موالات سے زیادہ خطرناک سمجھا اور اس کی روک تھام میں حیلے بہانے تراشے۔ چنانچہ کئی قسم کے لوگ اس تحریک کے راستے کے روڑے بنے۔ ان میں لاہور کے مولوی عبدالحق اور عبدالرحمن نامی شامل تھے۔ جنہوں نے غیر ملکی حکومت کی جاسوسی کی اور ہجرت کے رہنماؤں پر بداعتمادی کا اظہار کیا۔ بعد میں یہ دونوں خود فرنگی کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔

تحریک ہجرت خوفناک قسم کے دو گروہوں کے درمیان چلنے لگی۔ اوّل وہ جو دیانت داری سے اس تحریک کو آزادئ وطن کے لیے غیر مفید

سمجھتے تھے۔ دوسرے وہ جنہیں حکومت وقت کی خرید کردہ جنس کہا جا سکتا ہے۔ اس گروہ کے پاس دلائل اوّل الذکر گروہ سے مستعار لیے ہوئے تھے۔ پانچویں جن کی پشت پر رائج الوقت سکے کی جھنکار تھی۔

علمائے فرنگی محل کے فتویٰ اور شاہ جی کی آواز کو اپنوں اور پرایوں کے درمیان سے گزر کر عوام تک پہنچنا مشکل ہو رہا تھا۔ تاہم مئی جون کے مہینوں میں ہجرت کی تحریک اپنے جوبن پر تھی۔ لوگ گھر اور سامان چھوڑ کر اللہ کے راستے پر وطن عزیز کے لیے ہجرت کر کے افغانستان پہنچ رہے تھے۔ مولانا احمد علی لاہوری (رحمۃ اللہ علیہ) عزیز ہندی، خان عبدالغفار خاں اور ان کے ساتھ ہزاروں مسلمان کابل پہنچ چکے تھے کہ ۱۱ جولائی ۱۹۲۰ء کو کراچی خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں مولانا حسین احمد مدنی نے ذیل کی قرارداد پیش کی۔

"حکومت برطانیہ کی فوج میں ملازمت کرنا، کسی کو بھرتی کرانا، کسی کو بھرتی ہونے کی تلقین کرنا اور ہر قسم کی دوسری اعانت کرنا شرعاً حرام ہے۔ ہر مسلمان پر فرض ہے کہ یہ بات ہر مسلمان فوجی تک پہنچا دے۔"

یہ قرارداد منظور ہوتے ہی انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ شعلہ فشاں ہوئی۔ رہنماؤں کی گرفتاریاں شروع ہوئیں۔ کراچی کا مشہور مقدمہ چلایا گیا جس میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا حسین احمد مدنی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو شامل تھے۔ اس مقدمہ میں رہنماؤں کو دو دو، تین تین برس کی سزائیں ہوئیں۔
اس وقت تک چالیس ہزار کے قریب مسلمان افغانستان جا چکے تھے۔

اور دوسری طرف ہندوستان کے جیل خانے عوام اور لیڈروں سے بھر چکے تھے۔ ملک کے اندر افراتفری کا عالم تھا۔ انگریزی قانون اپنی عافیت کے لیے ہر طرح لیس ہو کر غلاموں کے مقابلے پر صف آراء ہو چکا تھا۔

لوہے کی زنجیریں، بندوقوں کی سنگینیں، جیل خانوں کی کوٹھریاں، عدالتوں کے کٹہرے اور پھانسی کے رسّے سب کے سب اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ غلام اور آقاؤں کے درمیان جنگ کے بادل اس تیزی کے ساتھ برسے کہ سارا ملک لہو سے داغدار ہو گیا۔ آسمان اور زمین کے درمیان خونِ بے گناہ کی لکیر کھینچ گئی جس کے دونوں جانب قانونِ فرنگی کے زنجیر تڑپتے نظر آنے لگے۔ راعی اور رعایا کے مابین اعتماد کی ساری گرہیں ڈھیلی پڑ گئیں۔ قریب تھا کہ غلاموں کے ہاتھ آقاؤں کے گریبان نوچ ڈالتے اور تار گریبان کی دھجیاں اُڑ کر ایوان فرنگی پر برق بن کر گرتیں کہ فرنگی دانشوروں نے نئی نہج پر سوچنا شروع کیا اور تحریک ہجرت کی موت کے اسباب پر فکر و نظر کی طرح ڈالی۔

جیسے کہ اوپر بیان کیا گیا افغانستان ان دنوں ایک ایسی بساط تھی جس پر مختلف حکومتوں کے مہرے کام کر رہے تھے۔ ہر کھلاڑی اپنے داؤ پر تھا۔

ترکیہ، جرمنی اور روس، برطانیہ کے خلاف ایک محاذ پر جمع تھے۔ گو برطانیہ کے ہاتھ اپنی رعایا پر اٹھ رہے تھے لیکن اس کی نگاہیں اور کان افغانستان کے پہاڑوں پر مرکوز تھے جس کے دامن میں اس کی موت کیلئے منصوبے ہو رہے تھے۔

غازی امان اللہ نے ہندوستانی مہاجروں کو جس جذبے کے تحت دعوت دی تھی بلاشبہ وہ جذبہ ایک محبِ ملّت مسلمان بادشاہ کا جذبہ تھا جس میں خلوص کی

سینکڑوں بہاریں جلوہ فرما تھیں لیکن افغانستان کے اقتصادی اور سیاسی حالات چالیس ہزار مہاجروں کے بوجھ کے متحمل نہیں تھے۔ انگلستان ان واقعات و حالات سے ناآشنا نہیں تھا۔ افغانستان کی اس کمزور اور ریتلی دیوار کا سہارا لے کر اُس نے کابل کو ایک ایسی نظر سے دیکھا کہ غازی امان اللہ اپنے عزم کی سیڑھیوں سے پھسلتا دکھائی دیا:-

"اگر والیٔ افغانستان چاہے تو اُس کا تمام ملک پابندیوں سے آزاد کر دیا جائے گا بشرطیکہ انگریزوں کے خلاف افغانستان سے غیر ملکی اڈے ختم کر دیے جائیں اور ہندوستانی مہاجروں کو واپس کر دیا جائے۔"

افغانستان نے بغیر کسی تردد کے ۲۰ جون ۱۹۲۰ء میں انگریزوں کی یہ دونوں شرطیں منظور کر لیں۔ اگرچہ اس مسودے کی تصدیق انگلستان نے ۲۲ نومبر ۱۹۲۲ء کو دی لیکن حالات کی آنکھیں جون ۱۹۲۰ء سے سُرخ ہونی شروع ہو چکی تھیں۔ جو مہاجروں کی آمد پر افغانستان فرشِ راہ تھا آج اُن مہاجروں کے لیے کابل کے بام و در، کوچہ و بازار اپنا دامن سکیڑ رہے تھے۔ کل جن پہاڑوں نے پھول برسائے تھے آج انہیں پتھر اُٹھانا مشکل نہیں ہو رہا تھا۔ افغانستان کے دل و نگاہ میں کل کے مہمان آج کے مجرم تھے۔

افغانستان کے حکمران اور عوام کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر جرمنی، روس اور ترکیہ کے نمائندوں کو اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ وہ اپنے ہی بنائے ہوئے نقشوں کو روندتے ہوئے اپنی چھوڑی ہوئی راہوں پر پلٹ گئے۔ مولانا عبید اللہ

بنفسِ نفیس خود غازی امان اللہ کے تعاون سے روس پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔

ان حالات میں تحریک ہجرت کے رہنماؤں کو اپنے ماضی پر غور کرنا پڑا قدم رُک رُک کر اٹھنے لگے، راستے کی تھکاوٹ محسوس ہونے لگی۔ حالات شرمندہ کر رہے تھے۔

اس مسافر کی محرومیٔ دل کا اندازہ کون کر سکتا ہے جسے منزل پر پہنچ کر بھی منزل نہ ملے۔ وہ نگاہیں کتنی بدنصیب ہیں جنہیں آستانۂ یار پر جا کر بھی دیدار کی سعادت سے محروم رہنا پڑے۔

شاہ جی اور دوسرے زعمائے ملت جنہیں تحریک ہجرت کا خضرِ راہ کہا جا سکتا تھا، تحریک کی ناکامی اور چالیس ہزار مہاجر مسلمانوں کی کابل سے نامراد واپسی پر سکونِ دل کھو بیٹھے۔ دوستوں کے گلے اور دشمنوں کے طعنے نے شاہ جی کو دل برداشتہ کر دیا۔ اور وہ اپنی تمام سرگرمیاں چھوڑ کر پھر آزاد ہائی سکول کی دیکھ بھال کے لیے گجرات واپس چلے گئے۔

پہلی گرفتاری اور سزا

تحریک ہجرت کی ناکامی کے بعد خلافت اور ترک موالات کی ہنگامہ آرائیوں میں پھر سے توانائی پیدا ہونے لگی۔ انگریز بھی افغانستان کے خوف سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ ۵۔ نومبر ۱۹۲۰ء کو دہلی میں مہاتما گاندھی کی رہنمائی میں بدیشی مال کا بائیکاٹ اور فوج میں بھرتی کے حرام کے تحت برطانوی حکومت کے خلاف عام لڑائی کا اعلان کر دیا گیا۔

ہندوستان کی ان دونوں تحریکوں میں انگریزوں کو اپنی موت دکھائی دینے لگی۔

ہر شہر میں روزانہ ڈھیروں کے ڈھیر ریشمی کپڑے بازاروں میں نذر آتش ہونے لگے۔ ہندو مسلمان عورتیں اپنا قیمتی لباس خوشی سے جلانے کے لیے رضا کاروں کے سپرد کر دیتیں، مرد گرم کپڑوں کو اپنے ہاتھ سے آگ لگاتے۔

بدیشی مال کے بائیکاٹ کی تحریک نے انگلستان کی ملوں اور کارخانوں کو مقفل کر دیا۔ یورپین مال سے ایشیا کی منڈیاں خالی ہو گئیں۔ روزانہ ہزاروں رضا کار گرفتار ہونے لگے۔

سال ۱۹۲۰ء کی عمر اسی ہاہاکار میں تمام ہوئی۔ اس سال کے غروب ہونے والے آفتاب کی کرنیں شفق کی سرخیوں پر ایک ایسا عنوان چھوڑ گئیں جس سے ظلم و جبر کی سینکڑوں کہانیاں مرتب ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی اس سال کی سب سے بڑی کہانی ہے کہ افسانہ ہائے جور و سزا کے رنگ و روغن کو کائنات کے دامن میں محفوظ کرایا۔ تاریخ کے اوراق پریشان ہو کر بھی اس سال کے واقعات کو ضائع نہیں کر سکتے۔

۱۹۲۱ء کے شروع میں آزاد ہائی سکول میں پھر سے بہار آ گئی۔ شاہ جی نے دوسری جدوجہد سمیٹ کر سکول کی طرف توجہ دی۔ دلوں کے دروازوں پر از سر نو دستک دی کر عوام باہر نکلے۔ حالات پر خوف و ہراس کا عالم تھا۔ حکومت نے شاہ جی کی سیاسی سرگرمیوں کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ سکول کی نگرانی بھی شروع کر دی تھی۔ بظاہر سکول کی عمارت تعلیم تک محدود تھی لیکن حکومت کو ہر طالب علم کا بستہ خلافت کمیٹی کا دفتر معلوم ہوتا تھا۔

شاہ جی کی شخصیت اب امرتسر اور گجرات سے نکل کر راوی اور چناب

کی لہروں پر تیرنے لگی ۔ بیاس اور ستلج کی موجوں نے انہیں اپنے کندھوں پر اٹھالیا پنجاب کی آب و ہوا نے شاہ جی کے مزاج میں نکھار پیدا کیا۔ پھول کی خوشبو نے چمن سے نکل کر گیسوئے یار کو بھی بہار آفریں کر دیا۔

دہلی سے اٹک کے کنارے تک شاہ جی کے چرچے ہونے لگے۔ دل و نظر کے احترام نے دوستوں کے حلقے کو وسعت دی۔ انہی دنوں شاہ جی کا سیاسی مزاج بھی پختہ ہوا اور اُن کی تقریروں میں مذہب کے ساتھ برطانوی سامراج پر کھلی تنقید ہونے لگی۔ غلامی کا احساس جوان ہو کر حاکموں سے متصادم ہوا۔

خلافت اور ترک موالات کی تحریکات کے باعث انگریزوں کے خلاف ہندوستان میں نفرت پھیل چکی تھی۔ انگریزوں کی فوج میں بھرتی کو شرعاً حرام قرار دیا جا چکا تھا۔ گجرات چونکہ افواج فرنگی کا مرکز تھا اس کی حفاظت سلطنت برطانیہ کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ لہٰذا شاہ جی کو باغی قرار دے کر اُن کی سرکاری نگرانی میں لیل و نہار کی تمیز اٹھا دی گئی۔ انگریزی قانون شکاری کتے کی طرح اُن کے نقش پا کی تلاش میں مصروف ہو گیا۔

پنجاب خلافت کانفرنس منعقدہ ۱۸ مارچ ۱۹۲۱ء راولپنڈی میں شاہ جی کی تقریر کی جو ۲۰ مارچ کے "زمیندار" میں شائع ہوئی۔ یہ شاہ جی کی پہلی تقریر تھی جو اخبارات میں شائع ہوئی:۔

"برادرانِ ملت! میں آج تقریر کرنے کے لیے نہیں آیا تھا، بلکہ آپ کی طرح سننے والوں میں سے تھا۔ سخت ہی تحیر اور تعجب کا مقام ہے کہ کوہاٹ کے حضرت پوش تو اس جلسہ میں شریک ہوں

اور باشندگان راولپنڈی جلسے میں دکھائی نہ دیں۔ کیا ان ہی میں نورِ ایمان زیادہ ہے؟ کیا وہی قرآن کریم پر عمل پیرا ہیں؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ عدالتوں میں تو الو بول رہا ہے۔ وکالت پیشہ احباب اپنی وکالت کیوں ترک کرنے لگے۔ دراصل وہاں کے باشندوں نے عدالتوں کا بائیکاٹ کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وکالت پیشہ احباب کو اپنی وکالت ترک کرنی پڑی۔ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سنو۔ بدمستی چھوڑ دو۔ جن کے صدقے میں تمہیں آرام تھا وہ بے آرام ہیں۔ جن کی وجہ سے تم عیش و عشرت کرتے تھے وہ آج کل نہایت کس مپرسی کی حالت میں ہیں لیکن تم ہو کہ ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ تم ہی کوئی تجویز بتاؤ کہ ہم تمہارے قائل ہو جائیں۔

ترکوں نے خلافت اسلامیہ کے لئے اپنا تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا لیکن تم ہندوستانیوں پر قرآن اور کعبہ لعنت بھیجتا ہوگا۔ فرشتے ترکوں کو ذبح کرنے کے لیے آسمانوں سے نہیں اتر رہے۔ حرمین شریف کے ان محافظوں کو اگر قتل کیا تو تم نے ہندوستان میں سب سے بڑا مرکز راولپنڈی کا ضلع ہے جس نے انگریزی فوج میں بھرتی دی۔ جنگی قرضے میں تم نے اپنا سب کچھ دے دیا۔ ارے تم میں تو اتنی غیرت بھی نہیں۔ اگر تمہاری لڑکیوں کو یورپین مانگیں تو تم ان کو بھی دینے میں آمادہ تھے۔ اب

بھی تم مصطفیٰ کمال کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو۔ سفید خداؤں سے ڈرتے ہو۔ جس کعبہ کی طرف تم منہ کر کے نماز پڑھتے ہو، اسی پر ہاتھ صاف کرتے ہو۔ ارے تم میں تو شمہ بھر بھی غیرت نہیں۔ تم تماشا دیکھتے ہو گے کہ ابوالکلام آزاد، محمد علی، شوکت علی جیل چلے جائیں تو کام بند ہو جائے گا۔ ارے آزادی کس چیز کا نام ہے، قید کس چیز کا نام ہے۔ قید اور آزادی میں کیا فرق ہے؟ اگر ہمارا گھر آزاد ہے تو ہم آزاد ہیں۔ اگر وہ آزاد نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ کیا ترک مٹ جائیں گے تو مکہ اور مدینہ کو بچا لو گے؟ کیا کالا غلاف جس میں اس وقت سوراخ ہے اسے بچا لو گے؟

ارے دیکھو! ترکوں کا جو بچہ پیدا ہوتا تھا وہ حرمین شریفین پر بھینٹ چڑھا دیا کرتے تھے۔

میں تم سے ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں ہم انشاء اللہ ضرور کامیاب ہوں گے۔ (اس پر اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوئے)

تمہارے لیے سکھ اپنی جانیں دے رہے ہیں، غیر نوحہ خوانی کر رہے ہیں لیکن تم ہو کہ شادمانی کر رہے ہو۔ تم کہتے ہو محمد علی نہیں آئے، شوکت علی نہیں آئے، صدر صاحب نہیں آئے۔ ارے سنو اور غور سے سنو! کہ اللہ ہمارا صدر ہے اور قرآن کریم ہمارا دستور العمل ہے۔ تمہارا قافلہ بہت دور جا چکا ہے اور تم پھر اس قافلے کو واپس لا رہے ہو جہاں سے چلا ہے۔ تم اللہ کی مدد

نہ کرو گے۔ اللہ تم پر عذاب نازل کرے گا۔ تمہارا دل پتھر کا ٹکڑا ہے گوشت کا لوتھڑا نہیں۔ اگر تم ان باتوں سے منحرف ہو تو نیا خدا بنالو، نیا قرآن لے آؤ۔ تم اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہو تو میرے دل پہ چوٹ لگتی ہے۔ تمہارے نعرے بے روح ہیں۔

مولوی ظفر علی خاں، مولانا فاخر، مولوی ثناءاللہ کے لیے تم نے کیا کیا؟ تم نے ان سے کون سی ہمدردی کی؟ تمہارے مولوی تو سی۔ آئی۔ ڈی کے اندر موجود ہیں۔ تم نے ہی ان تک اطلاعیں پہنچائیں۔ اگر یہ نہ ہوتے تو میں دیکھ لیتا کہ انگلستان یا آئرلینڈ کے لوگ اس قسم کی اطلاعوں کے پہنچانے میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔

تم نے مولانا محمود الحسن کے کہنے پر عمل کیا؟ اس بزرگ کے اقوال کا اتباع کہاں تک کیا؟ ارے مسلمانو! تمہاری اس حالت پر مجھے افسوس آتا ہے اور حسرت بھی۔ مجھے سیال شریف کے پیر ضیاء الدین سے پچھلے دنوں ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس نیک بخت بزرگ نے اپنے مریدوں کے نام یہ حکم صادر فرمایا ہے" کہ جو شخص میری حلقہ مریدی میں رہنا چاہتا ہے اس کے لیے لازم ہے کہ وہ افواج یا گورنمنٹ انگلیشیہ کی نوکری ترک کر دے، ورنہ وہ میرا مرید نہ ہوگا۔"

اخبارات کے ذریعے عوام میں ابھی اس تقریر کے چرچے ہو ہی رہے تھے کہ ۲۵ مارچ کو نماز جمعہ کے بعد امرتسر خلافت کمیٹی کے جلسہ عام میں جو خیرالدین کی مسجد میں ہوا شاہ جی نے دوسری تقریر کی۔ اس تقریر کے بعد حکومت نے شاہ جی کو مزید ڈھیل دینا نامناسب سمجھ کر ۲۷ مارچ ۱۹۲۱ء کو رات کو دو تین بجے کے درمیان کوچہ موہر کنداں کو موں ڈیوڑھی امرتسر سے دفعہ ۱۲۴ الف کے تحت گرفتار کر لیا۔

شاہ جی ان دنوں گجرات سے اپنی ہمشیرہ[1] کی شادی کے سلسلے میں امرتسر آئے ہوئے تھے۔

امرتسر میں ہڑتال

طلوع آفتاب سے پیشتر سارے شہر میں شاہ جی کی گرفتاری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ دکانیں کھلنے سے پہلے بند ہونے لگیں۔ گلی کوچوں نے ماتمی لباس پہن لیا۔ گھروں میں جلتے ہوئے چولہوں کی آگ سرد کر دی گئی۔ یہاں تک کہ سارا شہر امڈ کر یہاں آن پہنچا۔ حکومت برطانیہ مردہ باد! سید عطاء اللہ شاہ بخاری زندہ باد! کے پیہم نعروں نے پولیس افسروں کو مجبور کر دیا کہ وہ عوام کی مرضی دریافت کریں ——"ہم شاہ صاحب سے ملنا چاہتے ہیں یا انہیں ہمارے سامنے لاؤ!" ہجوم کا یہ مطالبہ افسران بالا تک پہنچا۔ آخر طے پایا کہ ہجوم اپنے چند آدمی منتخب

[1] شاہ جی کی یہ ہمشیرہ باپ کی طرف سے حقیقی اور والدہ کی طرف سے سوتیلی تھی لیکن شاہ جی اُن سے ہمیشہ حقیقی بہن کا سا پیار کرتے رہے

کرے۔ چنانچہ ہندو، مسلمان کوتوالی کے اندر حوالات میں شاہ جی سے ملنے
گئے۔ واپسی پر اُن کا بیان ہے کہ "یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی شیر کچھار میں
ٹہل رہا ہے۔ اُنہیں اپنی گرفتاری کا ذرّہ برابر خوف نہیں چہرہ اسی طرح سُرخ اور
آنکھیں اسی طرح مسکرا رہی ہیں۔ زبان پر قرآن کریم کی آیات جاری ہیں"
نیز وفد نے کہا ہم نے ضمانت کے لیے عرض کیا تو ناراض ہو کر فرمانے
لگے: "آپ نے مجھے بزدل یا وطن کا غدار سمجھا ہے۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا اگر
آپ نے ایسا کیا تو میں کوتوالی سے باہر آتے ہی وہی کچھ کروں گا جس کی پاداش
میں یہاں لایا گیا ہوں"
پھر شاہ جی کے والد ملنے آئے تو دیکھا "سورۂ یوسف" کی تلاوت کر
رہے ہیں۔ حوالات کے آس پاس پولیس افسروں کی آنکھیں آنسوؤں سے تر تھیں
والد صاحب کو دیکھ کر شاہ جی نے "السلام علیکم" کہا۔ والد صاحب نے جواب
میں "وعلیکم السلام" کے بعد کہا،
"میں اس دن کا منتظر تھا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں استقامت دے۔ آمین!"
پھر شاہ جی نے کہا،
"اباجی! میں آپ کی دعائیں اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی چاہتا ہوں اور بس!"
گرفتاری کی خبر جب دوسرے شہروں میں پہنچی تو ہر جگہ برطانوی حکومت کے
خلاف جلسے ہوئے۔ شاہ جی کو حق گوئی کی پاداش میں گرفتاری پر مبارکباد کی قراردادیں
منظور کی گئیں۔
تحریکاتِ آزادیٔ وطن کے چلتے ہوئے اناؤ میں شاہ جی کی گرفتاری نے

ایسا تیل چھڑکا کہ اس آگ کے شعلے ایوانِ فرنگی تک جا پہنچے جن سے غلامی کی زنجیریں پگھلنے لگیں۔ ان دنوں شاہ جی کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔

مقدمہ کی سماعت

۱۲ اپریل ۱۹۲۱ء پہلی دفعہ شاہ جی کو مسٹر ایف اے کانمر (F.A. Camen) ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ کچہری میں عوام کی اس قدر بھیڑ تھی کہ باقی عدالتوں کو اپنا کام جاری رکھنا مشکل ہو گیا۔ دس بجے سے ذرا بعد شاہ جی کو پولیس کی لاری میں کچہری لایا گیا۔ شاہ جی کو دیکھتے ہی عوام نے برطانوی راج مردہ باد کے نعرے لگائے۔ انتظام کے لئے گورکھا فوج کا دستہ پہلے سے متعین تھا لیکن ان دنوں عوام کے جذبات فوج اور پولیس کے رعب سے بے نیاز تھے۔ عدالت کا کمرہ وکلاء اور دوسرے معززین سے بھرا پڑا تھا

مجسٹریٹ (شاہ جی سے مخاطب ہو کر) آپ نے ۲۵ مارچ کو خیر الدین کی مسجد میں تقریر کی تھی؟

شاہ جی۔ میں نے وہاں بھی قرآن کریم پڑھا تھا اور یہاں بھی قرآن کریم کی ایک آیت پڑھتا ہوں۔

مجسٹریٹ۔ آپ لکھ کر دے دیں۔

شاہ جی۔ جس نے وہاں میرا قرآن نوٹ کیا ہے وہی لکھے۔ اگر یہاں درست نہیں نوٹ کر سکتے تو وہاں کس نے درست نوٹ کیا ہو گا۔ میں لکھنا نہیں جانتا پڑھنا جانتا ہوں۔

مجسٹریٹ : آپ کا بیان ؟
شاہ جی : میرا بیان وہی ہے ۔
سرکاری وکیل نے استغاثہ پڑھ کر سنایا ۔
" مولوی عطا اللہ صاحب ایک ذی عزت آدمی ہیں ۔ آپ کے والد بھی ذی عزت آدمی ہیں ۔ انہیں معلوم تھا کہ جو لفظ میرے منہ سے نکلتے ہیں اُن کا اثر ہوگا ۔ اُن کو علم تھا کہ ایسی تقریروں کا کیا اثر ہوتا ہے ۔
پہلے بھی اُن کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے ایسی تقریروں سے منع کیا تھا ۔ یہ تقریر جو اُنہوں نے جمعہ کے دن کی وعظ کی صورت میں تھی ۔ قرآن شریف کی آڑ میں اُنہوں نے اپنی سیاسی خواہش کو پورا کرنا چاہا تھا ۔ اُنہوں نے جو کچھ کہا اس سے اُن لوگوں کے دلوں میں جو سننے والے تھے بُرے خیالات پیدا ہونے کا احتمال ہے ۔
اُنہوں نے مسجد میں قسم کھا کر کہا کہ مکہ معظمہ پر گولیاں چلائی گئیں ۔ اس طرح ان لوگوں کے دلوں میں مذہبی نفرت اور جوش پیدا کیا گیا ۔
اُنہوں نے کہا کہ عورتوں کی بے حرمتی کی گئی اور وہ بطور راشن کے سپاہیوں کو دی گئیں ۔ دس دس آدمیوں کو ایک عورت دی گئی اور ہم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کے دلوں میں عورت کی عزت و حرمت بہت بڑی ہے ۔
اُنہوں نے کہا جو روپیہ لڑائی کے لیے ہم سے لیا گیا تھا اُس سے گولیاں خریدی گئیں اور ہمارے اپنے بھائی ان سے مارے گئے ۔
یہ ایسی تقریر تھی جو بے علم لوگوں پر جن کو واقفیت نہ ہو اُن پر بُرا اثر پیدا

کر سکتی تھی اور گورنمنٹ کے خلاف تھی۔

جب وعظ کے طور پر جمعہ میں یہ لفظ کہہ رہے تھے۔ وہ یہ نہیں کہہ سکتے کہ مبالغہ قابلِ معافی اور جھوٹ بولنا واجب اور جائز ہے۔ ان کو معلوم تھا کہ وہ کس قسم کے آدمیوں کو سُنا رہے ہیں۔ ایسی بات سُن کر وہ فساد کرنے لگتے ہیں جس سے قتل وغیرہ کا احتمال ہے۔

لہٰذا حسب ذیل امور اس تقریر میں جرم تحت ۱۲۴ الف تعزیراتِ ہند عائد ہوتے ہیں۔

۱ــــ فرعون اور حکومت کے مابین مقابلہ کیا گیا۔ یہ کہ انگریز چاہتے ہیں کہ کل دنیا کو عیسائی بنائیں "انگریز" کا لفظ استعمال کیا گیا "یہ" برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کے لیے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ لارڈ کچنر وغیرہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

۲ــــ موسیٰؑ اور فرعون کا ذکر کیا گیا۔ موسیٰؑ نے فرعون کی سلطنت کو تباہ کر دیا تھا۔ وہ بچوں کو قتل کرتا تھا۔ یہ حکومت طریقۂ تعلیم سے وہی بات کرتی ہے۔

۳ــــ پولیس والے نو نو روپے لے کر اپنے بھائیوں کے گلے کاٹتے ہیں۔ فرعون کے مخبر بھی تھے لیکن اُنہیں تنخواہ زیادہ ملتی تھی۔ موسیٰؑ نے ایک شخص کو مارا۔ خدا کو غصہ پسند ہے۔ سُرخ رنگ، سُرخ چہرے، سُرخ کپڑے بھی خدا پسند کرتا ہے۔ میری تعلیم بھی یہی بتاتی ہے کہ سُرخ کپڑے ہوں اور میں حسینؑ کی گود میں چلا جاؤں۔

۴ــــ ہمارے بھائی برطانوی فوج میں بھرتی ہو کر مدینہ منورہ گئے اور

اپنے ہی بھائیوں کو مارا۔ خانہ کعبہ کے خلاف بیں جہید کیے۔ حج کے لیے عزت کا عذر پیش کیا جاتا ہے لیکن مذکورہ بالا کام قلیل تنخواہ پر کر رہے ہیں۔

۵۔۔۔۔ زنانہ مدارس لڑکیوں کو تباہ کرتے ہیں۔ چائے، انڈے اور انگور کھلا کر خراب کرتے ہیں۔ وہ گھر کے کام کے قابل نہیں رہتیں۔ وہ بے شرم ہو جاتی ہیں۔ ملیشیا میں عورتوں کو راشن کے طور پر تقسیم کیا گیا۔

۶۔۔۔۔ انگریز مکھیوں کی طرح ہیں۔ اگر تم ان سے لڑو گے تو وہ تمہیں ڈنک ماریں گی۔ ان کو ہڑتال کی دھونی دو اور اس طرح وہ بوریا بستر اٹھا کر چل دیں گے اور بمبئی کی بندرگاہ سے سوار ہو کر چلے جائیں گے اور ہم کنارے پر کھڑے ہو کر غرق ہونے کی دعا کریں گے اور شہد کھائیں گے۔

۷۔۔۔۔ افسوس ہے کہ ہمارے بچے ابھی تک انجمن اسلامیہ کے سکول میں پڑھتے ہیں جس نے پچھتر ہزار روپیہ انگریزوں کو دیا جس سے گولیاں خریدی گئیں اور یہ گولیاں ہمارے ہی بھائیوں پر چلائی گئیں۔

۸۔۔۔۔ انگریزوں نے جس طرح دباؤ میں رکھنا چاہا بھرتی کیا، لڑائی میں مروایا، جلیانوالہ باغ میں گولیاں چلائیں، قید کیا، پھانسیاں دیں، لڑائی کا چندہ لے کر ہم کو لوٹ لیا۔ چونکہ سٹریشن میٹنگ ایکٹ (Stration Meeting Act) نافذ ہے مسجد ہی امن کی جگہ ہے۔

۹۔۔۔۔ منتروں وغیرہ کا حوالہ دیتے ہوئے ملزم نے انگریزوں کو شیطان کی نانیاں کہا ہے۔

یہ تمام الفاظ تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۴ الف کی زد میں آتے ہیں۔

فردِ جرم

مجسٹریٹ (شاہ جی سے)۔ آپ نے ۲۵ مارچ کو ایک تقریر کی جس کی رپورٹ بعجلہ میں درج ہے کہ آپ نے حکومت کے خلاف نفرت یا حقارت پیدا کی یا اس کا اقدام کیا یا دشمنی کے خیالات پھیلائے اور برٹش گورنمنٹ آف انڈیا کے خلاف لوگوں کے دلوں میں حقارت پیدا کی۔ کیا آپ نے یہ جرم کیا ہے؟

شاہ جی۔ میں نے جرم ہرگز نہیں کیا۔ قرآن کریم پڑھا ہے، قرآن کریم پڑھنا جرم نہیں۔

مجسٹریٹ۔ مقررہ جرح کے لیے گواہ بلانے ہیں یا صفائی کے گواہ۔

شاہ جی۔ میں ترکِ موالات کا حامی ہوں۔ قرآن میری صفائی ہے قرآن میرا گواہ ہے قرآن ہی مذہب ہے اور قرآن ہی میرا دین ہے، اس کے علاوہ میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

فیصلہ مقدمہ

مقدمے کی یہ کارروائی مسلسل جاری رہی۔ آخر ۲۰ اپریل ۱۹۲۱ء کو حسب ذیل فیصلہ دیا گیا۔

"قیصرِ ہند بنام مولوی عطاء اللہ ولد حافظ ضیاء الدین، قوم سید سکنہ ناگڑیاں جرم زیر دفعہ ۱۲۴ الف مجموعہ تعزیرات ہند۔ تاریخ اجراء مقدمہ ۲ اپریل ۱۹۲۱ء اس مقدمہ میں امرتسر شہر کا ایک مولوی عطاء اللہ ملزم ہے۔ یہ شخص زیر

دفعہ ۱۲۴ ؤ تعزیرات ہند ایک وعظ کی بنا پر گرفتار کیا گیا ہے، جو اُس نے شیخ خیرالدین کی مسجد واقع ہال بازار امرتسر بروز جمعہ مورخہ ۲۵ر مارچ ۱۹۲۱ء کثیرالتعداد جماعت کے سامنے بیان کیا تھا۔ استغاثہ کا بیان ہے کہ اس وعظ سے اس حکومت کے خلاف جو بروئے قانون قائم ہے، نفرت اور حقارت پھیلنے کا احتمال ہے۔

یہ استغاثہ حکومت کی منظوری لینے کے بعد دائر کیا گیا ہے۔ استغاثہ کے دس گواہوں نے یہ وعظ سُنا۔ ان میں سے ایک غلام محی الدین ہیڈ کانسٹیبل گواہ استغاثہ نمبر ۴ تھا، جو وعظ سننے کے بعد کوتوالی پہنچا اور اُس نے وعظ کے نوٹ تیار کر کے اپنے حکام کے پاس بھیجے۔ وعظ کا ترجمہ مختصر درج ذیل ہے:۔

الف ـــــ ہندوستان کی موجودہ حکومت کا مقابلہ فرعون سے کیا گیا اور مسٹر گاندھی کی مثال موسیٰؑ سے دی گئی۔ فرعون کی سلطنت برطانیہ کی نسبت بڑی اور طاقتور تھی۔ فرعون منجموں سے صلاح اور مشورے کیا کرتا تھا اور انگریز ڈاکٹروں سے مشورے لیتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر اتنا کہہ دے کہ فلاں جگہ رہنا صحت کے لیے مضر ہے تو انگریز اس جگہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ خدا انگلستان میں کوئی ایسا ڈاکٹر پیدا کر دے جو ہندوستانیوں سے تین چار لاکھ روپیہ لے کر انگریزوں کو یہ مشورہ دے کہ ہندوستان کی آب و ہوا اُن کے لیے ٹھیک نہیں۔

ب ـــــ فرعون تو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ وہ کائنات کا خدا ہے اور انگریز یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں امن و امان پھیلانے کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ تمام نسلِ انسانی کو عیسائی بنا لیا جائے۔

ج ـــــ ان انگریزوں کے صلاح کار لارڈ، جج، کمشنر، گورنر اور اسی طرح کے دوسرے لوگ ہیں

ح ـــــ فرعون کے نجومیوں نے پیش گوئی کی تھی کہ ایک لڑکا پیدا ہوگا جو فرعون کی سلطنت کو تباہ کر دے گا۔ اس پر فرعون نے موسیٰؑ کو تباہ کرنے کے لیے یہ تجویز سوچی کہ جو لڑکا پیدا ہو اُسے مار ڈالا جائے۔ فراعنۂ یورپ (ہندوستان کی انگریزی حکومت سے مراد) نے اخلاق کو تباہ کرنے اور غلام بنانے والے نظامِ تعلیم سے ہندوستانیوں کی قومی رُوح اور مذہبی سرگرمی کو برباد کر دیا نتیجہ یہ ہُوا کہ ہمارے بھائیوں نے نو نو روپے کی ذلیل تنخواہ پر فوج میں بھرتی ہو کر مکّہ اور مدینہ میں نیز خانہ کعبہ میں اپنے ہی بھائیوں کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کیا لیکن جب حج کا سوال پیدا ہو تو مفلسی اور ناداری کا عذر پیش کرتے ہیں۔

لڑکیوں کے لیے سکول کھول رکھے ہیں۔ یہ سیاہ بختیں دشیطان کی نانیاں کہ سفید لباس میں دیہات کی لڑکیوں کو انگور کھلاتی ہیں اور بسکٹوں کی چائے پلاتی ہیں اور بیٹنوں کی پلیٹ میں لا کر گھر کے کام کاج کے ناقابل بنا دیتی ہیں۔ یہاں کی ابتدائی تعلیم اور کالج کی پڑھائی انسان کو غلام بنا دیتی ہے۔ یورپ کا فرعون ہندوستانی عورتوں کو ذلیل کرنا چاہتا ہے تا کہ اُن کی اولاد غلام بنی رہے۔

الیشیا میں ہماری عزت و حرمت کو اس طرح ذلیل کیا گیا کہ ایک ایک مسلمان عورت دس دس سپاہیوں کو داشتہ کی طرح تقسیم کی گئی۔

ط ـــــ فرعون کو خبر نہ تھی کہ وہ بچہ جس کی تباہی کو اُس نے اپنا مقصد قرار دے رکھا ہے خود اُسی کے شاہی محل میں پرورش پائے گا۔ اور اُسی کی آدمی

نو بجے گا۔ اسی طرح مہاتما گاندھی بھی برطانوی ہند میں پیدا ہوئے یہیں تعلیم پائی یہیں کے تعلیمی اعزازات حاصل کیے۔ اب انگریزوں کو ہی برباد کرنے پر کمربستہ ہیں۔۔!

۲۔۔۔۔ فرعون نے سی آئی ڈی کی مدد سے ایک ایسی دایہ تلاش کی جسے شیرخوار موسیٰ نے پسند کیا۔ موجودہ سی آئی ڈی کے آدمی نو روپے کی ذلیل رقم کے لیے اپنے ہی بھائیوں کا گلا کاٹتے ہیں۔ خدا کرے ان کے ہاتھوں میں جذام ہو جائے۔ قیامت کے دن ان کا سیاہ نامۂ اعمال ان کی گردنوں میں لٹکایا جائیگا (اس موقع پر ملزم نے پولیس کے ان سفید پوش آدمیوں کی طرف اشارہ کیا، جو اس وقت مجمع میں موجود تھے) اگر یہ لوگ اس قسم کا کام چھوڑ دیں تو انگریزوں کو یہی کام خود کرنا پڑے۔

۳۔۔۔۔ جب موسیٰ جوان ہوئے تو انہوں نے ایک مصری کو جوش جلالت میں مار ڈالا۔ خدا ایسے جلال کو پسند کرتا ہے۔ خدا سرخ رنگ، سرخ کپڑے، سرخ چہرے اور سرخ گریبان پر خوش ہوتا ہے۔ میری تمنا ہے کہ میں بھی اپنے کپڑوں پر سرخ چھینٹے دیکھوں تاکہ مجھے جنت الفردوس میں جگہ ملے۔"

ملزم کے وعظ میں مندرجہ ذیل اشارات بھی تھے:۔

۱۔۔۔۔ جرمنوں نے چالیس سال تک جنگ کی تیاری کر کے بالآخر شکست کھائی۔ کاش! انگریزوں کو بھی کسی کے ہاتھوں شکست کھانی پڑے۔ ہندوستانی جرمنوں کی طرح جنگ کی تیاری نہیں کر سکتے۔ اس لیے انہیں چاہیئے کہ ناک دھونی کا طرزِ عمل اختیار کریں۔ انگریز شہد کی مکھیوں کی مانند ہیں۔ ان پر کوئی چیز نہ پھینکو

ورنہ یہ مکھیاں کاٹنے دوڑیں گی۔ اگر تمہارے پیچھے پولیس لگ جائیں تو انہیں ہٹا سکتے ہو اور دو ایک کو مار بھی سکتے ہو۔ لیکن یہ بڑی طاقتور ہوتی ہیں۔ انسان کا خون پی لیتی ہیں۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ انہیں عدم تعاون اور ہڑتال کی دھونی دو۔ بس پھر یہ اپنا بوریہ بستر باندھ کر بمبئی سے روانہ ہو جائیں گے اور ہم کہیں گے غرقنا آل فرعون۔

۲۔۔۔۔ اگر ہندوستانی صرف کھدر کا کپڑا پہننا شروع کر دیں تو انگریزوں کا دیوالہ نکل جائے۔

۳۔۔۔۔ نہایت افسوس کی بات ہے کہ مسلمانوں کے بچے اب تک انجمن اسلامیہ کے سکول میں جاتے ہیں حالانکہ اس انجمن نے سرمایہ جنگ میں پچھتر ہزار روپیہ دیا تھا تاکہ اس روپے سے گولیاں خریدی جائیں جو کہ مسلمانوں ہی کے سینے چھلنی کریں۔

۴۔۔۔۔ انگریزوں نے ہر ممکن طریق سے ہندوستانیوں کو تباہ کرنے کی کوشش کی۔ بہت سے فوج میں بھرتی کر لیے گئے تاکہ مارے جائیں۔ بعض جلیانوالہ باغ میں ذبح کر دیے گئے۔ بعض مارشل لاء میں قید کر دیے گئے اور پھانسی پر لٹکائے گئے۔ جو باقی رہ گئے ان کا مال و متاع سرمایۂ جنگ کے لیے لوٹ لیا گیا اور انہیں افلاس کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔

۵۔۔۔۔ جب سے قانون امتناع مجالس باغیانہ نافذ ہوا ہے صرف مسجد ہی ایک مقام امن ہے۔ لہذا عوام کو چاہیئے کہ مسجدوں کی مرمت کے لیے دل کھول کر چندہ دیں۔

یہ اقتباسات کافی ہوں گے۔ میرے رُوبرو ملزم نے بیان کیا ہے
کہ اُس نے محض قرآن کریم پڑھا ہے۔ ملزم نے کوئی جواب استغاثہ اس بنا پر
پیش نہیں کیا کہ وہ عدم تعاون کا پابند ہے۔
فیصلہ کے لیے پہلا سوال یہ ہے کہ آیا ملزم نے یہ وعظ کہا تھا جو اُس
کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ گواہان استغاثہ نے جو کچھ سُنا اُس کو مبالغہ کے
ساتھ بیان کرنے میں اُن کا کوئی مقصد نہیں اور جس طریق میں اُنہوں نے اپنے بیانات
دیے ہیں اُن سے صاف ظاہر ہے کہ وہ دانستہ ایک ناگوار فرض انجام دے
رہے ہیں۔ گواہ استغاثہ نمبر ۱ مولوی نور احمد جو ملزم کا ہم پیشہ مولوی بھی ہے
حتی الامکان ملزم کو مدد دینے کی کوشش کی اور اس واقعہ پر از خود زور دیا کہ
سامعین کی جماعت دوران وعظ جوش سے بھری ہوئی معلوم نہ ہوتی تھی لیکن یہ
امر خارج از بحث ہے کیونکہ جرم زیر غور یہ نہیں کہ تقریر کا اثر کیا ہوا بلکہ سوال
یہ ہے کہ الفاظ سے کس قسم کا جذبہ پیدا کرنا مقصود تھا۔ گواہ مذکور اس امر کو تسلیم
کرتا ہے کہ سامعین مولوی عطا اللہ کا وعظ توجہ سے سُن رہے تھے۔ ملزم نے
قرآن کریم سے چند آیات پڑھیں اور حاضرین مسجد کو اُس کی تشریح اور تفسیر کر کے
سُنائی۔ گواہ نے یہ بھی تسلیم کیا کہ وعظ کا مضمون فرعون اور موسیٰؑ سے متعلق تھا
نیز ملزم نے کہا تھا کہ مہاتما گاندھی کا نام بھی موسیٰؑ کی طرح سے شروع ہوتا ہے
گواہ نے تسلیم کیا کہ ملزم نے حکومت کا مقابلہ شہد کی مکھیوں سے کیا تھا۔ گواہ
نے سودیشی وصوفی کے الفاظ بھی سُنے ہیں۔ اس کے علاوہ گواہ مذکور نے ڈاکٹروں
کی رشوت کے متعلق بھی کچھ سُنا تھا۔ گواہ نے یہ خود بیان کیا ہے کہ اُس نے

کوئی ایسی بات نہیں سنی جس سے بدنظمی پیدا ہونے کا احتمال ہو۔ لیکن ساتھ ہی گواہ نے بیان کیا کہ وہ ملحق کمرے میں پچھلی طرف بیٹھا تھا اور وعظ کے پہلے حصے میں موجود نہ تھا۔ سب سے آخر میں وہ کہتا ہے میں بیمار ہوں اور مجھے طاقتِ سماعت ہے۔ اس کا بیان دورانِ تحقیقات اوّل درجہ کے مجسٹریٹ نے قلم بند کیا تھا وہ کہتا ہے میں انگریزوں کا لفظ زبان پر نہیں لایا ہوں۔ جیسے کہ بیان مذکور میں درج ہے وہ بیان صحیح ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ اس بیان میں گواہ نے کہا کہ ملزم نے فرعون کے ہمراہیوں کی غرقابی کا تذکرہ کیا مگر چونکہ گواہ مولوی ہے یہ قدرتی بات ہے کہ اُسے اس قسم کی شہادت خلاف مرضی دینی پڑی ہو اور ممکن ہے اُسے ڈرایا دھمکایا بھی گیا ہو۔ چونکہ وہ وعظ میں موجود تھا، استغاثہ نے مناسب نہیں سمجھا کہ اُسے شہادت میں پیش نہ کرے۔ شہادت دیتے ہوئے اُسے جو روحانی کوفت ہوئی وہ بھی اس طرزِ عمل اور اس بات سے بخوبی ظاہر تھی کہ اُس نے کئی مرتبہ برقاب کے جُرعے پیئے اور گواہوں کے کٹہرے میں ایک خادم بھی ساتھ رکھا۔ بہ حالت نیز گواہ کا یہ عذر کہ میری سماعت میں فرق ہے۔ میں بیمار ہوں اور مسجد میں دیر سے پہنچا تھا بہت کچھ معنی خیز ہیں۔

میں بلا تامّل اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ملزم نے اسی طرح وعظ کیا جس طرح سے نقشہ جات ای، بی اور سی میں درج ہے اور گواہانِ استغاثہ نمبر ۲ سے دس تک نے بیان کیا۔ پس یہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے۔

دوسرا تصفیہ طلب امر یہ ہے کہ ملزم نے جو کلمات کہے وہ باغیانہ ہیں یا نہیں؟ ان سے نفرت و حقارت کے جذبات پھیلتے ہیں یا نہیں؟ ان سے

اُس حکومت کے خلاف جو بردئے آئین برطانیہ ہند میں قائم ہو چکی ہے بد دلی پھیلتی ہے" یا نہیں؟ وہ جذبات نفرت و حقارت جو برانگیختہ کیے گئے بغیر حکومت پر معقول نکتہ چینی کی حد میں آ سکتے ہیں یا نہیں؛ فرعون کے ہاتھوں بچوّں کے اتلاف کا جو مقابلہ حکومت کے مروجہ طرز تعلیم کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس سے بظاہر حکومت کی حقارت مقصود ہے۔ پھر اس کا یہ کہنا کہ انجمن نے سرمایہ جنگ میں جو چندہ دیا تھا اُس سے گولی یا بارود خرید کر ہمارے بھائیوں کو ہلاک کیا گیا اور مقامات مقدسہ کی بے حرمتی کی گئی۔ اُس غلط بیانی اور دروغ بافی کی مثال ہے جو اس شخص نے مذہب کی آڑ میں منبر سے تلقین کی تاکہ حکومت کے خلاف نفرت اور بد دلی پھیلائی جائے۔ اس طرح وہ اپنے مسلمان سامعین سے استدعا کرتا ہے جن کے نزدیک عورت کی عزت اور حرمت سب چیزوں سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ اس غلط بیانی سے کام لیتا ہے کہ ہندوستانی عورتوں کے اخلاق بگڑتے جا رہے ہیں تاکہ اُن کی اولاد حلقہ بگوش عیسائیت ہو۔

نیز وہ کہتا ہے کہ مسلمان عورتیں شہوت رانی کے لیے سپاہیوں کو مہیا کی جاتی ہیں۔ سامعین میں زیادہ تر جاہل لوگ تو اس کا یہی مطلب سمجھیں گے کہ حکومت نے نہایت ہی مذموم کارروائی کی ہے اور چونکہ ملزم یہ باتیں وعظ میں کہہ رہا تھا اس لئے وہ یہ عذر بھی پیش نہیں کر سکتا کہ مبالغہ قابل عفو اور دروغ بیانی جائز ہوتی ہے۔

پولیس کے متعلق بھی اس کے الفاظ عیاں طور پر ایسے ہیں جن سے پولیس کے دلوں میں حکومت کی طرف سے بد دلی پھیل سکتی ہے اور اس کا اثر خود غلام محی الدین ہیڈ کانسٹیبل نے محسوس کیا ہے۔ پھر اس نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش

کی کہ حکومت ہر ممکن ذرائع سے ہندوستانیوں کا استیصال چاہتی ہے یعنی اُن کو مروانے کے لئے فوج میں بھرتی کرتی ہے۔ جلیانوالہ باغ میں کشت و خون گرم کرتی ہے۔ مارشل لا کے تحت قید کرتی ہے۔ پھانسیاں دیتی ہے اور روپے پیسے سے محروم کرتی ہے۔

یہ باتیں بھی صریحاً غلط بیان کی گئی ہیں جن سے حکومت کے خلاف نفرت اور بد دلی پیدا کرنا اور سامعین کو عمل کے لئے ابھارنا مقصود ہے۔

مسٹر گاندھی اور موسیٰؑ کے تقابل سے متعلق اس شرمناک اشارے کی بابت کچھ لکھنا غیر ضروری ہے جس سے اُس نے یہ بات واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسٹر گاندھی کس طرح حکومت کو دق اور پریشان کر رہا ہے۔ یاد رکھنے کے قابل بات یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کی حکومت کا تختہ الٹ دیا موسیٰؑ کا ایک مصری کو مار ڈالنا اور سُرخ رنگ کا حوالہ دینا صاف طور پر خونریزی اور اشتعال انگیزی کی طرف اشارہ ہے اور اس کے وعظ کے دوسرے مضمون کی طرح یہ باتیں بھی اس ملک کی موجودہ حکومت کے خلاف کہی گئی ہیں۔ اس کی یہ آرزو کہ انگریزوں کو جرمنوں کی طرح شکست ہو اور "اغرقنا آل فرعون" کی بد دعا جو بقول ملزم کے اُس وقت زبان پر لائی جائے جس وقت انگریز ساحل ہند سے روانہ ہوں گے، حقارت اور بد دلی کی حقیقی مثالیں ہیں جو اُس نے سامعین کے دلوں میں پیدا کیں۔

ملزم کا اپنے برادرانِ دین کو یہ ملامت کرنا کہ جب حج کے لیے کہا جاتا ہے تو غربت کا عذر پیش کرتے ہو حالانکہ ملزم نے خود حج نہیں کیا۔

اپنے بھائیوں کے ساتھ خلوص کی ایک اور مثال دی ہے۔ اس کا
مرمت مسجد کے لیے چندے کی درخواست کرنا جس میں وہ خود وعظ کر رہا تھا۔
اور یہ کہنا کہ قانونِ مجالس با غیانہ کی وجہ سے مسجد ہی ایک پناہ کی جگہ رہ گئی ہے۔
ظاہر کرتا ہے کہ وہ قرآن شریف کی تعلیمات کو سیاسی اغراض کے لئے برتتا تھا
ہے اور یہی نیت اس کی اُس کے وعظ سے مترشح ہوتی ہے۔ تخیل کو خواہ کتنی
ہی وسعت کیوں نہ دیں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ملزم کا وعظ محض سوراج کے حصول
کی خواہش پر مبنی تھا اور نہ ملزم نے خود اس کی طرف اشارہ کیا۔

چنانچہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ ملزم نے جو تقریر کی ہے اُس سے ایک
ایسی حکومت کے خلاف جو برطانوی ہند میں بروئے قانون قائم ہو چکی ہے
نفرت وحقارت اور بد دلی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ وعظ مذکور حکومت
یا کسی سرکاری افسر کے خاص فعل یا کارروائی کے خلاف نہ تھا بلکہ اس کے ذریعے
سے کوشش کی گئی تھی کہ لوگوں کے دلوں میں اس نظامِ ترکیبی کے خلاف نفرت
پیدا کی جائے جس کے ماتحت وہ رہتے ہیں اور اُسے بدل دیا جائے۔

موجودہ نازک ساعت میں مذہب کے نام سے ایک غیر تعلیم یافتہ
اور اشتعال انگیز مجمع کے سامنے کوئی تقریر کرنا ایسا ہے کہ اس سے بحیثیت
مجموعی دلوں میں ایسی تلخی پیدا ہو سکتی ہے اور ایسے جذبات برانگیخت ہو سکتے ہیں
کہ لوگ فوراً عملی کارروائی شروع کر دیں۔

سامعین میں سے اگر کوئی شخص ملزم کا وعظ سننے کے بعد باہر آتا اور
پہلا انگریز جو اُسے ملتا اُس پر وہ سربازار حملہ کر دیتا تو یہ امر چنداں باعثِ تعجب نہ تھا

میں بلا تامل ملزم کو زیر دفعہ ۱۲۴ الف تعزیرات ہند مجرم قرار دیتا ہوں جون ۱۹۲۰ء میں اُسے تنبیہ ہو چکی ہے۔ اس لیے وہ اس قسم کی تقریر کرنے کے نتائج و عواقب اور سزا سے بخوبی آگاہ تھا۔ قانون کی رُو سے زیادہ سے زیادہ سزا حبس دوام عبور دریائے شور کی ہو سکتی ہے لیکن میں ملزم کو تین سال قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں جس میں تین ماہ کی قید تنہائی ہو گی۔

دستخط ——— ایف اے کارنر

۸ اپریل ۱۹۲۱ء ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ

عدالت کا فیصلہ سننے کے بعد شاہ جی نے مجسٹریٹ کی طرف دیکھتے ہوئے فی البدیہہ کہا۔

دار کے حق دار کو قید سہ سالہ ملے
ہائے مشکل آساں ہوتے ہوتے رہ گئی

کمرہ عدالت سے باہر نکلے تو ہجوم میں سے اکثر احباب کے رونے کی آواز آئی سنتے ہیں آگرہ کہا،

"کون بزدل رو رہا ہے؟ تعلق بخاری سے اور رونا عورتوں کی طرح ——— پینگلے کہیں کے!"

اس کے بعد السلام علیکم کہا اور پولیس کی لاری میں سوار ہو گئے۔

امرتسر جیل سے روانگی

۱۱ اپریل کو حسب دستور ڈسٹرکٹ جیل امرتسر سے شاہ جی کو لاہور سنٹرل

جیل میں تبدیلی کا حکم ملا۔ یہ کام پولیس اور دوسرے حکام نے بڑی رازداری سے کرنا چاہا لیکن نہ جانے اہل شہر کو کس طرح پتہ چل گیا کہ سینکڑوں کی تعداد میں لوگ ریلوے سٹیشن پر شاہ جی کی آمد سے پہلے پہنچ گئے۔

گاڑی چلنے میں کچھ منٹ باقی تھے کہ پولیس کی بھاری معیت میں شاہ جی کو اسٹیشن پر لایا گیا۔ پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑی۔ اس حالت میں یہ مرد درویش جب اسٹیشن کی عمارت میں داخل ہوا تو پتھر بھی آبدیدہ ہو گئے۔ برطانوی سامراج کا مجرم، وطن کا سپاہی، قرآن کا مبلغ، آزادی وطن کے جرم میں آہنی زنجیروں میں جکڑا ہوا پرزنر ویگن (Prisoner Wagon) کی طرف یہ کہتے ہوئے بڑھا۔ ع

عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا

آخر سینکڑوں انسانوں نے آنسوؤں کے ہار، دل کی دعائیں اور حسبنا اللہ و نعم الوکیل کہہ کر تین سال کے لیے اپنے سے جدا کیا۔

گاڑی نے منزل کی طرف سفر شروع کیا تو شاہ جی نے کھڑکی سے باہر منہ نکال کر کہا ؎

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

باب دوم ——— ۱۹۲۱ء تا ۱۹۳۰ء

فرنگی عہدِ اقتدار کی داستان حقیقت کے اس قدر قریب ہے کہ واقعات کسی بھی زمانے کے مورخ کے لیے الجھاؤ پیدا نہیں کرتے۔ آئینہ ہر تصویر کو وقت کے چوکھٹے میں محفوظ کیے ہوئے ہے۔ ماضی کی راہوں سے گزرنے والا ہر مسافر اپنے پاؤں کی ٹھوکریں نہ جانے کس قدر نشان پا لیے ہوئے ہے کہ جن پر زمانے کی بے اعتنائیوں کا گلہ ثبت ہے۔ زمانہ اپنے قلم سے جن کہانیوں کو رقم کر رہا ہے غروبِ آفتاب کی ہر شام انہیں شفق کی سرخیوں سے دھانپتی چلی جا رہی ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہر کہانی کو اپنے عنوان کے لیے کسی عطا اللہ کے خون کی ضرورت ہو گی لیکن مستقبل کا دامن تہی ہو گا۔

ماضی نے جس عطا اللہ کو جنم دیا تھا۔ اپنے اور پرائے سامراج نے اُسے اسی طرح روند ڈالا کہ شاید نصف صدی کے بعد دلوں سے اس کی یاد محو ہو جاتی۔ لیکن رات کے بعد دن طلوع ہوتا ہے یا جس طرح خزاں کے بعد بہار جنم لیتی ہے۔ بھولے ہوئے دلوں کو اسی طرح عطا اللہ کے کارنامے

آزادیٔ وطن کے لئے اُن کی مساعیٔ جمیلہ، تبلیغ دین میں اُن کے مصائب کو اُجاگر کرنا پڑے گا۔ ورنہ زمانے کو اپنی تہی دامنی پر تا حشر گلہ رہے گا۔

لاہور سنٹرل جیل

قومیں اپنے راہنماؤں کی یادگاریں قائم کرتی ہیں زمانہ جن پر گرد و غبار ڈال دیتا ہے۔ وہ انہیں تلاش کرنے میں کھو جاتی ہیں لیکن عہدِ رواں کے نئی اساس ہاتھوں نے بنے بنائے نشان مٹا دیئے۔ لاہور سنٹرل جیل بھی ایک ایسا ہی نشان تھا۔ اس جیل کی ایک ایک اینٹ پر غلامی کے خلاف لڑنے والوں کے نام ثبت تھے۔ اس جیل کی ہر کوٹھڑی اسیرانِ فرنگ سے واقف تھی۔ اس جیل کے پھانسی کے تختے شہیدانِ وطن کے خون سے ہر صبح ناشتہ کرتے رہے ہیں۔ اس چشم دید گواہوں کو مٹانے میں وقت کے عاجلانہ فیصلے نے بڑی جانبداری سے کام لیا ہے۔ کاش وہ سالات کا انتظار کرتا۔

شاہ جی کو اس جیل کی گورا وارڈ میں رکھا گیا۔ یہ وارڈ سیاسی قیدیوں کے لئے مخصوص تھی۔ اس دور میں سیاسی قیدیوں کے لیے کوئی امتیازی کلاس متعین نہیں تھی تاہم دو قسم کے قیدیوں کو امتیاز حاصل تھا۔ اوّل جو انکم ٹیکس گزار تھے دوسرے سٹوڈنٹس۔ لیکن شاہ جی پہلے سیاسی قیدی تھے جنہیں شہرت کی بنا پر کلاس دی گئی۔

معافی کی درخواست

شاہ جی کو لاہور سنٹرل جیل میں آئے ہوئے دو ہفتے ہوئے تھے کہ

اچانک ایک دن، انہیں جیل کے دفتر میں بلوا کر ان کے سامنے انگریزی میں لکھی ہوئی ایک درخواست پیش کی جس میں درج تھا کہ "اگر اس دفعہ حکومت مجھے معاف کر دے تو میں یقین دلاتا ہوں کہ آئندہ میری کوئی حرکت ایسی نہیں ہوگی جس سے حکومت کو کسی قسم کی شکایت پیدا ہو۔"

اس درخواست کے نیچے کسی کا نام درج نہیں تھا اور نہ تحقیق پر کسی کا نام مل سکا۔ شاہ جی نے اس درخواست کا ترجمہ سن کر اُسے سپرنٹنڈنٹ کے ہاتھ سے لے لیا اور ہزار ٹکڑے کر کے اپنے پاؤں تلے روندا اور تین دفعہ اس پر تھوکا، پھر غصّے کی حالت میں واپس چلے گئے۔ اس واقعہ کے تھوڑے دنوں بعد شاہ جی کو میانوالی ڈسٹرکٹ جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس دَور میں اور آج بھی میانوالی جیل عادی مجرموں کے لئے مخصوص ہے۔ یہاں کی آب و ہوا اور موسم گرما کی تپش کی بنا پر یہ جیل پنجاب کا "کالا پانی" کہلاتی ہے۔ ترک موالات اور تحریک خلافت کے قیدیوں کے لیے یہی جیل مناسب سمجھی گئی۔ چنانچہ ہندوستان بھر کے سیاسی رہنماؤں کو آہستہ آہستہ اسی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ جن میں یہ نام قابل ذکر ہیں: مولانا محمد داؤد غزنوی ۲۔ مولانا احمد سعید دہلوی ۳۔ مولانا ثناءاللہ پانی پتی ۴۔ صوفی محمد اقبال ۵۔ اختر علی خاں (زمیندار لاہور) ۶۔ عبدالمجید سالک (ایڈیٹر روزنامہ انقلاب لاہور) ۷۔ مولانا عبداللہ چوڑی والے (دہلی) ۸۔ مولانا سید حبیب (ایڈیٹر روزنامہ سیاست لاہور) ۹۔ پنڈت نیکی رام شرما ۱۰۔ ڈاکٹر ستیہ پال ۱۱۔ لالہ ترلوک چند محروم ۱۲۔ دیش بندھو داس گپتا (ایڈیٹر روزنامہ تیج دہلی) ۱۳۔ بابا گوردت سنگھ ۱۴۔ سردار منگل سنگھ ۱۵۔ سردار

سردول سنگھ کوئشر (لاہور) ۱۶۔ باباکھڑک سنگھ (سیالکوٹ) ۱۷۔ سوامی شردھانند (دہلی) ۱۸۔ منشی احمد دین (امرتسر) ۱۹۔ خواجہ عبدالرحیم عاجز امرتسر ۲۰۔ راجہ غلام[1] قادر (وزیرآباد) یہ وہ لوگ ہیں جو آگے چل کر صحافت اور ملکی سیاسیات میں غیر ملکی حکمرانوں کے باغی اور متحدہ ہندوستان کے رہنما بنے۔

جیل خانے کے شب و روز باہر کی دنیا سے مختلف ہوتے ہیں۔ گھر بار اور اولاد سے لاتعلق ہو کر قیدی یہاں رہ کر اپنی دنیا آپ آباد کرتا ہے۔ خیالات میں کچھپنا اور جذبات میں جوانی لوٹ آتی ہے۔ اونچی دیواروں کے سائے میں رہنے والے سیاسی قیدی بہار و خزاں کے موسم کو اپنے ماحول میں آپ ڈھالتے ہیں۔ بلاشبہ میانوالی جیل کا ہر سیاسی قیدی اپنے اندر جوہر قابل کا خزانہ لیے بیٹھا تھا۔ لیکن آزادیٔ وطن کی پاداش میں برطانوی سامراج کا باغی قرار دیئے جانے پر اُس کا جسم قید تھا۔ تاہم رُوح کی افتادگی اُسی طرح آزاد تھی۔ اُس کی سوچ اور فکر میں کوئی دیوار یا لوہے کا دروازہ حائل نہیں تھا۔

اسیرانِ افرنگ جنہیں رائج الوقت قانون نے اپنا دشمن قرار دے کر تین تین برس، دو دو برس اور ایک ایک برس کے لیے یہاں ڈال دیا تھا قفس کی تیلیوں میں بیٹھ کر شاخِ گل کی بہاروں کے گیت الاپنے شروع کیے چنانچہ مشاعرے، قوالیاں، جلسے اور علمی بحثوں کا آغاز ہوا۔ اگر ان لوگوں کے وجود سے جیل کے باہر فرنگی حکمران پریشان تھے تو جیل کے اندر حکام جیل اور دوسرے قیدی عاجز آچکے تھے۔ آخر میانوالی ڈسٹرکٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر رام جی داس اور ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ چوہدری فرید احمد کو اپنی سخت گیر پالیسی کو تبدیل کرنا

[1] مولانا ظفر علی خاں کے چچا تھے۔

پڑا ورنہ باغیوں کا یہ گروہ اپنے ساتھ دوسرے قیدیوں کو بھی خراب کر دیتا۔

شاہ جی ان ہنگامہ آرائیوں کے باوجود جیل میں بھی اپنے تبلیغی مشن سے غافل نہیں رہے۔ راجہ غلام قادر، اختر علی خاں، منشی احمد دین، خواجہ عبدالرحیم عاجز نے قرآن کریم انہی دنوں شاہ جی سے پڑھا۔

آزاد ہائی سکول کا خاتمہ

شاہ جی کی گرفتاری نے اگر گجرات کی سیاسی زندگی کا رُخ تبدیل کیا تو آزاد ہائی سکول کی حالت بھی اپنی ساری بہار ضائع کر بیٹھی۔ حکومت نے فوراً سکول کا نام اسلامیہ ہائی سکول رکھ کر اسے پنجاب یونیورسٹی کے تحت کر دیا۔ یہ سکول آج بھی اسی نام سے چل رہا ہے لیکن اب اس کا جامعہ ملّیہ یا شاہ جی سے کوئی تعلق نہیں۔

تحریکِ ترکِ موالات کا خاتمہ

ترکِ موالات اور خلافت کی مشترک تحریکات نے ہندوستان بھر کو پُرامید کر دیا تھا کہ اب غیر ملکی حکمران یہاں سے رُخصت ہو جائیں گے۔ ہندوستان سے باہر بھی یہی چرچا تھا۔ حالات کی بُو سونگھنے والے سیاست دان اور خود انگریز بھی اپنے قدموں کے نشان گن رہے تھے۔ پرنس آف ویلز نے اپنا دورۂ ہندوستان ملتوی کر دیا تھا کہ صوبہ یوپی کے ضلع گورکھپور کے دیہاتی عوام نے اپنے گاؤں "چورا چاری" کے پولیس تھانہ پر حملہ کر کے اُسے آگ

لگا دی۔ جس میں پولیس کے سپاہی اور افسر جل کر راکھ ہو گئے۔ اس واقعہ نے گاندھی جی کو اس قدر متاثر کیا کہ انہوں نے ۵۔ فروری ۱۹۲۲ء کو تحریک ترکِ موالات بلا کسی مشورہ کے بند کر دی۔ تحریک کا بند ہونا تھا کہ سارا ہندوستان گاندھی جی کے خلاف ہو گیا۔

۵ر نومبر ۱۹۲۱ء کو جو آگ لگی تھی۔ ۵ر فروری ۱۹۲۲ء کو جب یہ بجھائی گئی تو مغربی طاقتیں اپنی کامیابی پر مسکرائیں۔ اُن کے بجھتے ہوئے چراغوں میں پھر سے روشنی آ گئی۔ وقت نے بخت کو مبارک باد دی۔ یونین جیک کی اڑائیں نیشنل فلیگ پر غالب آئیں۔

جیل خانوں میں سیاسی قیدیوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ مقصد کی ناکامی نے شاخِ ثمر کی بہاروں کو آگ لگا دی۔ قفس کی تیلیاں پاؤں کی بوجھل بیڑیاں بن گئیں لیکن عزم نے ہمت نہ ہاری۔ ناکامیوں نے ارادوں کے آنسو پونچھے تو آنکھیں چمک اٹھیں۔ دل اور زبان نے ہم آہنگ ہو کر کہا "ہم پھر لڑنے کا عہد کرتے ہیں" اسی طرح ایک سال چار ماہ کی جدوجہد آزادی ایک موڑ پر آ کر رک گئی۔

تحریکِ خلافت کا حشر

قوموں کی زندگی کا انحصار ہمیشہ ان کی اپنی ہمت پر رہا ہے۔ جو قومیں اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتی ہیں تو زمانہ ان کے ساتھ انصاف نہیں کرتا۔ "ترک" اقوام یورپ سے اگر اپنی زندگی کی بھیک مانگتے تو شاید اس مردِ بیمار کو بھیک سے

بھی مجرم دکھا جاتا ہے یعنی تلوار کی نوک سے حاصل کیا ہوا نرکی آج بھی زندہ ہے اور زندہ رہے گا۔

پہلی جنگ جیت کر اتحادی قوموں نے اپنی نوآبادیات سے جو سلوک کیا اور پھر ترکیہ کو مرد بیمار سمجھ کر قسطنطنیہ کے بازاروں میں خلیفۃ المسلمین کے حرم کو رسوا کیا۔ اگر اس وقت مصطفٰے کمال کی تلوار بے نیام ہو کر درہ دانیال پر سامنے نہ آتی تو شاید یورپ کا یہ مرد بیمار مدت سے دم توڑ چکا ہوتا۔ غازی عصمت انونو نے برطانوی وزیر اعظم لائیڈ جارج کو ٹھیک کہا تھا کہ "جو فیصلے تلوار کی نوک سے نہیں لکھے جاتے اُن کی کوئی قیمت نہیں ہوتی"

ترک اپنی تاریخ آزادی خون سے مرتب کر رہے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے خون نے جوش مارا مسلمان مسلمان کی امداد کے لئے نکل آیا ہندوستان کا مسلمان غلامی کی حالت میں جو کر سکتا تھا، اُس نے کیا۔ آخر ۲۴ نومبر ۱۹۲۲ء کو جزیرہ لوزان میں برطانیہ اور ترکیہ کے درمیان صلح کانفرنس ہوئی جس میں برطانیہ نے ترکوں کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔ اس کے ساتھ ہی تحریک خلافت نے ہندوستان میں دم توڑ دیا۔

تحریکِ شدھی

افراد، قومیں اور سلطنتیں ایک دوسرے کو کبھی معاف نہیں کرتے۔ انتقام کی آگ پہلے دلوں میں سلگتی ہے پھر انسانوں کو جلاتی اور عمارتوں کو خاک کا ڈھیر بناتی ہے ۔ ہندوستان کی سیاسی تحریکات دم توڑ چکی تھیں۔ افغانستان سے انگریز

مطمئن تھا۔ روس کی اندرونی خلفشار بھی انگریز سیاستدانوں کے لیے مفید تھی ترکوں سے معاہدہ لوزان کے بعد کوئی مزید جھگڑا نہیں تھا۔ ہندوستان کے رہنماؤں میں انگریز سامراج کا مخالف عنصر ہنوز جیل خانوں میں تھا۔

انگریز دانشوروں کا ذہن وقتی طور پر فارغ ہوا اور انہیں ہندوستان سے انتقام کی سوجھی۔ ماضی قریب میں جس ہندوستان نے ایوان برطانیہ میں آگ لگادی تھی غلامی سے نجات کے لئے جن قوموں نے متحد ہو کر آزادی کی لڑائی لڑی تھی، دشمن اب ان دوستوں کی لڑائی کا تماشہ دیکھنا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۲۲ء کے وسط میں میانوالی جیل سے سوامی شردھانند کو اُن کی میعاد اسیری سے پیشتر رہا کرکے دہلی وائسرے کے لاج میں لایا گیا۔ سوامی شردھانند کا اصل نام منشی رام تھا۔ ایک مدت تک یہ پنجاب پولیس میں بطور تھانیدار ملازم رہ چکے تھے۔ دوسری طرف پنڈت مدن موہن مالوی کو یہ خوف تھا کہ سرحد کا پٹھان ہندوستان پر حملہ کردے گا۔ اُس نے سوامی شردھانند سے مل کر ایک ایسی فرقہ وارانہ تحریک کو ہوا دی جس نے آگے چل کر خوفناک صورت حال پیدا کر دی۔

پہلا ہندو مسلم فساد

یوں تو سارے ہندوستان کی فضا مکدر ہو چکی تھی۔ نگاہوں میں میل اور دلوں میں کدورت بیٹھ گئی۔ لیکن ستمبر ۱۹۲۲ء کو ملتان میں محرم کے موقعے پر ہندو مسلم فساد نے سارے پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یہ فساد جس مقام پر ہوا اُس کے ایک طرف مسجد، دوسری طرف مندر اور تیسری طرف پولیس تھانہ ہے۔ تعزیہ حرم گیٹ

سے شہر میں داخل ہو کر چوک بازار مسجد کے سامنے رکھا گیا۔ اچانک اس پر ایک اینٹ لگی۔ چونکہ تحریک شدھی کے باعث شہر کی فضا پیشتر ہی مسموم تھی لہٰذا بغیر تحقیق کے کہ اینٹ مندر سے آئی ہے یا تھانہ کی طرف سے ماتم گساروں نے تعزیہ کی بے حرمتی کے سلسلہ میں ہنگامہ کر دیا۔ تیاری دوسری طرف سے بھی مکمل تھی۔ مقامی ڈپٹی کمشنر مسٹر ایمرسن[۱] خود تھانہ میں موجود تھا۔ یہ اینٹ خود اس نے پھینکی تھی (غیر سرکاری تحقیقات میں اس کی تصدیق ہو گئی تھی)

غلامی میں صرف آزادی ہی سلب نہیں ہوتی بلکہ عقل انسانی بھی اپنی صلاحیتوں سے محروم ہو جاتی ہے اور مذہب کی پاکیزگی غلامی کے گناہوں سے آلودہ ہو کر اپنا دامن داغدار کر لیتی ہے۔ غلام ہندوستان اپنا وقار تو کھو چکا تھا، لیکن فرقہ وارانہ فضا میں کھو کر عقل و دانش سے بھی دور چلا گیا۔ آخر حکمران قوم کا جادو سر چڑھ کر رہا۔ نسیم سحرگاہی کا ہر جھونکا باد سموم بن گیا۔ چمن کا ایک ایک پتا صیاد کا معاون بن کر لالہ و گل کی پتیاں بکھیرنے لگا۔

سوامی شردھانند جو کبھی دہلی جامعہ مسجد کے منبر پر ہندو مسلمان کو اتحاد کی دعوت دیتے تھے آج غلامی کی رسیاں مضبوط کر رہے تھے۔

جیل سے رہائی

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا — وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

باغبان جب پودوں کی تخم ریزی اور پھر آبیاری کرتا ہے۔ تو ان کے

---

۱ یہی مسٹر ایمرسن ۱۹۳۵ء میں پنجاب کا گورنر ہوا اور مسجد شہید گنج گرانے میں اس کا پورا ہاتھ تھا۔

جوان ہونے تک بیل و نہار کی محنت اُسے مجبور کرتی ہے کہ وہ روز و شب کی ستم ظریفیوں سے انہیں محفوظ رکھے۔ موسم کے نشیب و فراز بھی پھول آنے تک سدِ راہ ہوتے ہیں۔ باغبان کی تمنائیں موسم سے بھی دست و گریبان ہوتی ہیں۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۱۹۲۰ء میں ہندوستانی رہنماؤں نے جشن بہار کی آرزو کے لیے لالہ و زار کو اپنا خون دیا تھا۔ نرگس کی رنگت سورج مکھی کو بانٹ دی تھی اور خزاں سے بہار چھین کر گل و گل چیں کے رشتے کی نیو اٹھائی تھی جب قفس کی تیلیاں ٹوٹیں تو بہار اُن سے روٹھ چکی تھی۔ شبنم کے آنسو ہچکیاں لے رہے تھے پھر باد نسیم نے موت کی مضراب سے آنے والوں کا استقبال کیا۔ اس بھیانک منظر نے غلامی کی عمر بڑھا دی۔ وقت نے غیر ملکی حکمرانوں کا ساتھ دیا اور حالات اس قدر ناگفتہ بہ ہوئے کہ آس ٹوٹ گئی اور مقدر روٹھ گیا۔ ایسے حالات میں شاہ جی کوٹھی کے پانچ ماہ دس کم دو سال سات ماہ اسیرِ فرنگ رہ کر ۱۲ اکتوبر ۱۹۲۱ء کو میانوالی جیل سے رہا ہوئے۔ پنجابی کے مشہور شاعر محترم خواجہ عبدالرحیم عاجز بھی شاہ جی کے ساتھ میانوالی جیل سے رہا ہوئے۔ اُنکی پنجابی نظم کا ایک مصرع ابھی زمانے کی یاد ہے۔

واہ عاجز قسمت دیاں لیا
پکی گھر نے ہو گیا دلمیا
پھڑ دیاں پھڑ دیاں پڑیاں نوں   نوں ہتھوں باز گوا لیا

رہائی کے بعد شاہ جی امرتسر میں محلہ کوچہ حارث ٹوار چوک فرید میں رہائش پذیر ہوئے۔ مالک مکان بابا رحیم خاں کو شاہ جی سے دلی عقیدت تھی۔ جتنی دیر شاہ جی اس مکان میں رہے مالک مکان خادموں کی طرح سلوک کرتا رہا۔

۱۹۲۱ء اور ۱۹۲۳ء کے حالات میں نمایاں فرق آچکا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں جب شاہ جی جیل گئے تو ہندوستان کے عوام انگریزوں کے خلاف بغاوت کی آگ کو ہوا دے رہے تھے اور جب واپس آئے تو وہی عوام آپس کی آگ میں جل رہے تھے۔ ہندو مہاسبھا اور آریہ سماج کے افتراک نے شدھی و سنگھٹن کی تحریک کو ایسی ہوا دی کہ سارے نقشے ہی مٹ گئے۔

شدھی کا عملی پہلو

ضلع آگرہ کے ملکانہ تامی گاؤں کے راجپوت مذہباً مسلمان تھے لیکن رسم و رواج اور شکل و صورت میں ہندو نظر آتے تھے۔ ایسے مسلمانوں کو ہندو بنا لینا کوئی دشوار نہیں تھا چنانچہ شدھی کے بانیوں نے اس گاؤں کو اپنا مرکز بنا لیا مسلمان رہنما ان دنوں عجیب الجھاؤ میں تھے۔ وہ اپنی شہرت جو انہیں غیر مسلموں میں حاصل تھی ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسری طرف شدھی کی تحریک کو انگریز کی سازش سمجھ رہے تھے۔ ان دو گونہ مشکلات میں پھنسے ہوئے مسلمان رہنماؤں کے دو حصے ہو گئے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کی پارٹی گوشۂ تنہائی میں چلے گئے۔ پنجاب میں شاہ جی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، میر غلام بھیک نیرنگ، اور مولانا ظفر علی خاں الگ الگ شدھی کا مقابلہ کرتے رہے

موضع ملکانہ کے راجپوت بھی ان دنوں عجیب الجھن میں تھے۔ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کا آپس کا کردار انہیں مطمئن نہ کر سکا لیکن ہندوؤں کی دولت قریباً بیس ہزار راجپوتوں کو ہندو بنانے میں کامیاب ہو گئی۔

۹ اور ۱۰ ستمبر ۱۹۲۴ء کی درمیانی رات کو کوہاٹ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا۔ یہ ملتان اور دوسرے شہروں میں فسادکی صدائے بازگشت تھی جس نے سیاسی رہنماؤں کو پریشان کر دیا۔ مہاتما گاندھی جو ان دنوں دہلی میں مولانا محمد علی جوہر کے ہاں مہمان تھے، اکیس دن کے مرن برت کا اعلان کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی مولانا محمد علی جوہر کے مشورے سے ۲۶ ستمبر ۱۹۲۴ء کو اتحاد کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ کیا گیا۔

بگڑے ہوئے تیور اور بدلی ہوئی نگاہوں نے دل و دماغ کے درمیان کانٹے ہی کانٹے بچھا دیئے تھے جس سے اتحاد کا دامن الجھتا ہی چلا گیا۔ گاندھی جی نے ۱۸ ستمبر کو اپنا برت شروع کیا۔ یہ برت ہندوؤں کے طرزِ عمل کے خلاف بطور احتجاج تھا۔

۲۶ ستمبر کی مجوزہ اتحاد کانفرنس میں دوسرے رہنماؤں کے ساتھ شاہ جی بھی شریک ہوئے۔ دو دن کی بحث کے باوجود تمام رہنما بغیر کسی فیصلہ پر پہنچے دہلی سے چلے گئے مگر گاندھی جی نے اپنا برت ۸ اکتوبر تک جاری رکھا۔ شاہ جی ان حالات اور واقعات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے بغیر کسی مشورے کے ملک کے موجودہ بگاڑ کی ساری ذمہ داری انگریز حکمرانوں کے سر ڈال دی اور سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر سامنے اکھڑے ہوئے اور اپنی

شعلہ بیانی سے سارے ہندوستان کو اس پس منظر سے آگاہ کیا۔

شردھانند کی اچانک رہائی، پنڈت مالوی کا پٹھانوں کے خوف سے ہنگامہ، ملتان کا فساد، یہ ایسی چیزیں تھیں کہ عوام انہیں سن کر اپنی حرکتوں پر شرمندہ ہو گئے۔ برطانوی حکومت کو شاہ جی نے ایسا ننگا کیا کہ جب اُس سے کوئی جواب بن نہ آیا تو جنوری ۱۹۲۵ء میں شاہ جی کو دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔ یہ مقدمہ دہلی کی ایک تقریر پر چلایا گیا۔ اس میں مسٹر آصف علی وکیل تھے۔ دوران مقدمہ شاہ جی نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا اور مقدمہ میں بھی کوئی دلچسپی نہ لی۔ دو ماہ کی مسلسل کارروائی کے بعد مسٹر عبدالصمد کی عدالت سے شاہ جی کو چھ ماہ قید بامشقت یا پانچ سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔

جرمانہ کی یہ رقم اہل محلہ نے ادا کر دی اور شاہ جی رہا کر دیئے گئے۔ رہائی کے بعد گھر آئے تو جرمانے کی ادائیگی پر سخت ناراض ہوئے کئی دن محلہ کے کسی دوست سے علیک سلیک نہیں کی۔ آخر انہوں نے ایک جگہ جمع ہو کر شاہ جی سے معافی مانگی۔ شاہ جی کو گلہ تھا کہ آپ نے حلال کی کمائی فرنگی خزانے میں کیوں دی۔ ان دنوں شاہ جی کٹڑہ مہاسنگھ کوچہ نگریزاں میں میاں محمد شریف ٹھیکیدار کے مکان میں رہتے تھے۔

بہار کے دنوں میں پھولوں سے لگاؤ مشکل نہیں ہوتا لیکن خزاں کے موسم میں کانٹوں سے گزر کر منزل کو حاصل کرنا دشوار ہوتا ہے۔ شاہ جی جیل سے رہا ہوئے تو ہندوستان گیر شہرت نے اُن کے قدم لیے۔ زمین کے ذرات آسمان کے ستاروں کی طرح اُن کے پاؤں چومنے لگے۔ محبت بھری نگاہوں کے آنسو

پھولوں کی طرح نچھاور ہوتے تھے۔ شاہ جی نے یہ گراں قدر دولت اپنے ہاتھوں ضائع کر دی۔ وقت کا یہی تقاضا تھا۔ اُمڈتے ہوئے طوفانوں اور تیز و تند آندھیوں کے درمیان شاہ جی تمناؤں کا چراغ لے کر نکلے تھے اور جب لوٹ کر گھر آئے تو یہ چراغ ہنوز روشن تھا۔

شدھی سنگھٹن کی تحریکات نے خلافت اور کانگریس کے تمام رہنماؤں کو چادر میں لپیٹ کر گوشۂ عافیت میں چھپا لیا۔ ہندو رہنما مسلمانوں میں اور مسلمان ہندوؤں میں اپنی عزت و وقار کا جنازہ دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ حالانکہ سمجھ دار رائے دروںِ پردہ اُن ہاتھوں کو جھانک رہے تھے جنہوں نے فرقہ وارانہ آگ روشن کی تھی لیکن زبانیں گنگ اور ہاتھ سمٹ کر رہ گئے تھے۔ ایسے میں شاہ جی نے انگریز اور ہندو دونوں کے خلاف بڑے استقلال کے ساتھ اپنا کام جاری رکھا۔ ۱۹۲۳ء میں جیل سے رہا ہو کر ۱۹۲۵ء کے وسط تک تحریک شدھی و سنگھٹن کے خلاف شاہ جی نے جس جوشِ ایمانی سے اسلام اور مسلمانوں کی وکالت کی وہ وقت کا عظیم کارنامہ ہے۔

حالانکہ شدھی کوئی تحریک نہیں تھی لیکن غیر ملکی حکمرانوں کی ضرورت نے اُسے ایسے سانچوں میں ڈھال دیا تھا کہ اگر یہ سانچے اس وقت توڑ نہ دیئے جاتے تو ممکن تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے راستے میں کفر حائل ہو جاتا۔ ہندو مسلمان رہنما جو حال ہی میں جیلوں سے رہا ہو کر آئے تھے اس قسم کی تحریک سے وابستگی پسند نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ مولانا محمد علی جوہر، مہاتما گاندھی، ڈاکٹر انصاری، پنڈت موتی لال نہرو ایسے لوگ دہلی میں بیٹھ کر ہندو مسلم

لی حرکات کے خلاف تجویزیں تو کرتے رہے لیکن بالعموم کے تھپیڑے ان کے
دامن کو اس قدر اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی دھجیاں بکھیرنے کے لئے صحن
چمن میں قدم رکھتے۔ لیکن شاہ جی نے اپنی شہرت کو شدھی کے مقابل کام کرکے
ضائع کر دیا۔ پنجاب کے مسلم اخبارات میں سے صرف زمیندار نے اس تحریک میں
شاہ جی کی پوری معاونت کی۔

فرقہ وارانہ تحریکات نے ہندوستان کا متحدہ قومیت کا تصور نہ صرف
دلوں سے بلکہ ذہنوں سے بھی زائل کر دیا۔ ہندو مسلم اتحاد کی چلتی ہوئی گاڑی ایسی
جگہ آکر ٹھہری کہ غیر ملکی حکمرانوں کو گھی کے چراغ جلانے کا موقع ملا۔ اس کی تمام
ذمہ داری ہندو قوم پر ڈالنا انصاف سے بغاوت کے مترادف ہوگا اور جن
غیر مسلم راہنماؤں نے انگریز کو خوش کرنے اور غلامی کی عمر بڑھانے کی سعی کی،
انہیں ہندو قوم سے الگ کرنا بھی اپنے کو فریب دینا ہے۔ تاہم سوامی
شردھانند، پنڈت مدن موہن مالوی اور پنجاب کے مہاشئی لالہ لاجپت رائے
نے ۲۴ء۱۹ میں شدھی و سنگھٹن کی پرورش کر کے متحدہ قومیت سے غداری کی۔
اگر ایسی زہریلی تحریکات کے مقابل میں شاہ جی کی پُرجوش تقریریں اور مولانا
ظفر علی خاں کی ہنگامی تحریریں نہ ہوتیں تو من حیث القوم مسلمان سخت خسارے
میں رہتے۔

تحریکِ قبہ

۱۹۲۵ء سے ایک سال پیشتر جب کہ ہندوستان کے مذہبی اور سیاسی

رہنما انگریز اور ہندو کے پیدا کردہ طور واطوار میں اُلجھے ہوئے تھے، برطانوی حکومت نے ایک نیا کھیل شروع کیا۔

ہندوستان کے تمام مسلمان والئی عرب سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوئے جنہوں نے مکہ اور مدینہ میں بزرگانِ دین کے مزارات سے عمارات (قبّے) گرا کر انہیں زمین سے ہموار کر دیا تھا۔

شریف مکہ کے زوال کے بعد جب نجدیوں نے اس پاک سرزمین پر قدم جمائے تو ترکوں کی دی ہوئی مذہبی آزادی کے پیش نظر عوام نے اپنی عقیدت کی بنا پر بزرگوں کے مزارات کو دینی اور دنیوی ضرورتوں کا حاجت روا بنا کر انہیں سجدوں کی آماج گاہ بنا لیا تھا لیکن نئے حکمران سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے اپنے عقیدہ کی بنا پر ان تمام حرکات کو خلاف دین اور بدعت سمجھ کر مزارات سے قبے گرانے کا حکم دے دیا۔ اس کی صدائے بازگشت جب ہندوستان کے ساحل سے ٹکرائی تو مذہبیت سے دیوانہ مسلمان آپے سے باہر ہوگیا۔

ہوا سازگار نہ ہو تو موسم کا چلن بھی درست نہیں رہتا۔ بادل اٹھتے ہیں تو پھاگن کے دنوں میں بھی ساون بھادوں کا سا گمان ہوتا ہے۔ رہنمایانِ ملک و ملت تین تین برس کی سزا کاٹ کر ابھی جیل خانوں سے رہا ہوئے ہی تھے کہ برطانوی سامراج نے ان کے لئے ایسی فضا پیدا کر دی کہ وہ دل و دماغ کے تصادم میں اُلجھ گئے۔ شدھی و سنگھٹن کے ہنگامے ہنوز جاری تھے کہ برطانوی سیاستدانوں نے مکہ اور مدینہ کی حرمت کا واسطہ دے کر مسلمانوں کو سلطان ابن سعود کے خلاف بغاوت پر ابھارا اور ہندو سرمایہ دار نے مسلمانوں کا رُخ بدلا ہوا دیکھ

کر فائدہ اُٹھایا لیکن دیو بند مدرسۂ فکر کے علماء نے آگے بڑھ کر سلطان عبدالعزیز کی حمایت کی۔ چنانچہ شاہ جی نے ان دنوں اپنا مؤقف واضح کرتے ہوئے کہا:

"میں حنفی العقیدہ مسلمان ہوں۔ میرا ایمان ہے کہ نفع و نقصان کی وارث صرف اللہ کی ذات ہے۔ حالات کا تغیر بھی اُسی کے اختیار میں ہے۔ اولاد دینا نہ دینا، دے کر چھین لینا اسی کو زیبا ہے۔

اگر مکہ اور مدینہ کے مقدس مزارات پر جا کر مسلمان سجدہ کرتا تھا، اُن مزارات سے مرادیں مانگتا تھا یا انہیں حاجت روا خیال کرتا تھا تو میری رائے ہے کہ سلطان عبدالعزیز نے ان قبروں کو گرا کر اُن میں آخری نیند سونے والوں کی رُوح کو آرام پہنچایا ہے۔ یہی وہ نیک لوگ تھے جنہوں نے لات و ہبل اور عزیٰ کی پوجا سے بنی نوع انسان کو منع کر کے صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پر تکیہ کرنے کا درس دیا تھا۔ اگر آج اُنہی کے مزارات کی پرستش ہونے لگ جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُن کے مشن سے یا مقصد سے انحراف کر کے توحید باری تعالیٰ سے بغاوت کرنا ہے۔"

شاہ جی نے اس طرزِ استدلال پر سارے ہندوستان میں تقریریں کیں۔ قرآن کریم، حدیث نبوی اور اپنی قوتِ بیان سے کروڑوں انسانوں کو اسی عقیدے کا درس دیا۔

پنجاب کے پیرانِ عظام نے بدیں وجہ شاہ جی پر "وہابی" ہونے کے علاوہ دوسرے مختلف اقسام پر فتوے لگائے۔ حضرت پیر جماعت علی شاہ کا فتویٰ اس سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ مولانا سید حبیب اور اُن کا اخبار روزنامہ سیاست پیروں کے مؤید تھے۔ دوسری طرف مولانا ظفر علی خان اور "زمیندار" شاہ جی کے ہمنوا تھے۔ مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، جمعیت العلمائے ہند، چودھری افضل حق، مولانا عبداللہ قصوری، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی نے بھی سلطان عبدالعزیز ابن سعود کی حمایت میں شاہ جی کا ساتھ دیا۔

ایک سوال

اسی تحریک کے دوران لاہور میں ایک اجتماع ہوا جس میں مجمع سے ایک سوال کیا گیا۔

"آپ کے نزدیک اگر قبر پر قبہ بنانا بدعت ہے تو پھر نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کے مزار مبارک پر گنبدِ خضرا سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟"

جواب

اس سوال پر سارے مجمع میں ایک ارتعاش پیدا ہوا۔ دوستوں کی پریشانی بڑھی۔ دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ مخالفین نے تالیوں سے اس سوال کا استقبال کیا لیکن شاہ جی کو قدرت نے ذہن رسا عطا کیا تھا۔ سوال پر ذرا مسکرائے اور ارتجالاً فرمایا۔

"اگر ان معماروں نے جرأت کر لی ہے جنہوں نے نبی کریمؐ کی

آخری آرام گاہ سے بھی اُونچے ہو کر اُس پر قبہ تعمیر کیا ہے تو
پھر میری رائے ہے کہ گنبد خضراء کے مقابلے میں دوسرا کوئی
گنبد تعمیر نہیں کرنا چاہیئے۔ اس سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
کی توہین ہوتی ہے۔"

شاہ جی کا یہ جواب سُن کر مجمع نعروں سے گونج اٹھا۔

علی برادران کا روحانی تعلق مولانا عبدالباری فرنگی محل (لکھنؤ) سے تھا اور
وہ تحریک قبہ میں سلطان ابن سعود سے اختلاف رکھتے تھے حالانکہ اُن کی جماعت
"خدام حرمین" سے عوام کو توقع تھی کہ وہ تحریک قبہ کی حمایت کریں گے لیکن اُن کے
ساتھ ہی علی برادران بھی اس تحریک سے تعاون نہ کر سکے تاہم شاہ جی سے متعلق
اُنہوں نے اپنے اخبار "ہمدرد" میں مندرجہ ذیل رائے کا اظہار کیا:۔

"بھائی! میں تمہاری تقریر سے بہت خوش ہوا مگر اپنا فرض سمجھتا
ہوں کہ جو رنج ہوا اس کا بھی ذکر کر دوں۔ تم نے سامعین کو بالکل
مسحور کر دیا تھا اور اگر اس کے بعد تم اُن سے کوئی غلط کام بھی
کرانا چاہتے تو وہ تمہاری تقریر کے کیف سے اس قدر بے خود
ہے کر ڈالتے۔ جو قدرت تم کو اپنی زبان پر ہے وہ خداداد
ہے اور خدا کی ایک بڑی نعمت ہے مگر ایک بڑی خطرناک
نعمت ہے۔

تمہاری مقبولیت بہت بڑھ گئی ہے جب تک تم اسے
حق کی راہ میں استعمال کرو گے فلاح دارین حاصل کرو گے لیکن اگر

کبھی یہ باطل کی راہ میں استعمال کی گئی تو ہزاروں بندگانِ خدا کو بھی گمراہ کرنے کے لیے کافی ہو گی۔

میرا منصب نصیحت کرنے کا نہیں مگر تم سے جو محبت مجھے اور مجھ سے تم کو ہے اس کی بنا پر اس قدر کہنے کی جرأت کرتا ہوں کہ لوگوں کو مسحور کرنا اچھا نہیں۔ سحرکاری میں نہ ساحرکاروں کے لیے نہ مسحوروں کے لیے فلاح ہے۔ ضرورت اس کی ہے کہ ہر مسئلے کے دونوں پہلو سامعین کے سامنے پیش کر دو اور ان ہی سے اس مسئلہ کا حل اور فیصلہ کراؤ۔ اس طرح تم عوام کی قوتِ فیصلہ کو ترقی دے سکو گے ورنہ کالانعام "مشہور ہیں۔ آج تم نے انہیں مسحور کر دیا تو کل اسی چرب زبانی اور ظرافت کے باعث ان پر کسی دوسرے کا جادو بھی چل سکے گا اور اس طرح حق و باطل کی تمیز تا قیامت نہ اٹھے گی۔ کبھی تمہارے ساتھ ہو گی اور کبھی تمہارے مخالفین کے۔ آج تمہیں تخت پر بٹھائیں گے کل تمہیں اتار کر کسی دوسرے کو سر پر آرا بنا دیں گے۔

شدھی اور سنگھٹن کے دوران اگرچہ قبوتی کی تحریک بڑی خطرناک تھی، اس تحریک نے مسلمانوں کو آپس میں الجھا دیا تھا لیکن چند ماہ کی ہمت اور اتحاد ذہنی نے برطانیہ اور اس کی ایجنٹ طاقتوں کو شکست دے دی۔

مرزائیت کے خلاف فتویٰ

غیر ملکی دورِ اقتدار کو اپنی زندگی کے لیے جن افراد یا جماعتوں کا سہارا

لینا پڑا اُن میں آریہ سماج اور قادیانی نمایاں نظر آتے ہیں۔ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء کے دوران ہندو مسلم کشیدگی نے متحدہ فوقیت کا جو حلیہ بگاڑا۔ یورپین سیاست گروں نے اس بساط پر کس کس طرح اور کون کون سے مہرے آگے بڑھائے گذشتہ اوراق ان واقعات کی گواہی دے رہے ہیں لیکن ہنوز اس مقدمے کا ایک اہم گواہ باقی ہے جس کے بغیر یہ روئداد نامکمل رہے گی اور شاہ جی کی جدوجہد میں ان کے اس کردار کی تعبیر بھی ادھوری سمجھی جائے گی۔

آریہ سماج جب شدھی کی تحریک میں سرگرم تھے اور مسلمان اُن کا دفاع کر رہے تھے اُنہی دنوں مرزائیوں نے بعض ایسی کتب شائع کیں جن میں آریہ سماج کے بانی سوامی دیانند کی زندگی پر ایسے حملے کیے جس کے جواب میں آریہ سماج نے قادیانیوں کی بجائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو ہدفِ تنقید بنایا۔ آریہ سماج اور قادیانیوں کی ان مقابلے کی عبارتوں نے طرفین میں جلتی پر تیل چھڑکا اور حالات بد سے بدتر ہو گئے۔

آخر ہندوستان کے علماء نے حکومت سے آریہ سماج کی کتب کی ضبطی کا مطالبہ کیا تو ساتھ ہی مرزائیوں کی کتب کا از سرِ نو مطالعہ کے بعد حسب ذیل فتویٰ دیا:۔

"مرزا غلام احمد قادیانی نے علی الاعلان دعویٰ نبوت کیا اور دیگر انبیاء کرام کی توہین کی ہے۔ نیز بعض کو گالیاں دیں اور بعض ایسے دعوے کیے کہ جن کی بنا پر وہ خود کافر ہو کر مرا اور اسی طرح اس کے ماننے والے بھی کافر اور مرتد ہیں۔ لہٰذا ان (مرزائیوں

سے ہر قسم کا قطع تعلق کیا جائے۔ خواہ وہ دنیوی ہو یا دینی۔"

امرتسر رسالہ "الفیض" ایڈیٹر مولانا محمد داؤد

۱۹۲۵ء ——— پسر مولانا نور احمد

اس پر شاہ جی کے علاوہ اڑھائی سو سے زائد علماء نے دستخط کیے جن میں علمائے فرنگی محل، علمائے دیوبند، علمائے بریلی قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۲۰ء کے بعد یہ دوسرا موقع تھا کہ شاہ جی نے مرزائیت کے خلاف اپنے دلی احساسات کھلم کھلا اجاگر کر کے مرزائیوں کو بھی اپنے دشمنوں کی صف میں شامل کر لیا۔

پنجاب کے پیروں سے ٹکر

پنجاب کے بعض روحانی پیشواؤں کی گزشتہ تاریخ اس قدر میلی ہے کہ ان کے گندے چھینٹے مذہب کی پاک اور صاف چادر کو بھی داغدار کر گئے۔ بزرگان دین کے مزارات پر بیٹھ کر ان مہنتوں نے نہ صرف اسلام کی متعین راہوں کے درمیان گڑھے کھودے بلکہ دنیوی جاہ وحشمت کے لیے اپنے درباروں کی رونق بھی کفر سے مستعار لی۔ اپنے طرۂ دستار کی جوانی ترکوں کے خون سے قائم رکھی۔ اس کے پیچ وخم میں عرب کے یتیم اور معصوم بچوں کی آہ و بکا زینت بنی۔ ان کی دعائیں اور تعویذ ہمیشہ کفر کے ساتھ رہے۔

مقامات مقدسہ کی بربادی، جزیرۃ العرب پر برطانیہ کا بالواسطہ قبضہ اور خلافت اسلامیہ کی تباہی کے بعد ۱۹۲۸ء میں جب انگریز کو فتح ہوئی اور وہ بغداد کی گلیوں اور قسطنطنیہ کے بازاروں میں محو رقص تھا ان دنوں پنجاب کے پیران عظام

تحریکِ شاتمِ رسولؐ

غلامی کا ہر سال جدوجہد "آزادی" کے لیے مصائب و آلام کے کوہ گراں لے کر آیا۔ ان دنوں ہر صبح طلوع ہونے والا آفتاب اپنی کرنوں میں محبان وطن کے لیے ایسے فیصلے لے کر طلوع ہوتا کہ جن میں دار و رسن کے فیصلے جلی طور پر رقم ہوتے

لیکن ۱۹۲۶ء کا سورج عجب انداز سے اُبھرا کہ غیر ملکی استعمار اگر ایک طرف آتشیں اسلحہ سے لیس تھا تو دوسری طرف سیاسی بساط کے مہرے اس رُخ پر چلائے کہ اُن کی ہر چال شہ کو مات دیتی ہوئی چلی گئی۔

سائمن کمیشن میں ہندوستان کی عدم شمولیت، لارڈ برکن ہیڈ کا چیلنج اور ہندوستانی رہنماؤں کے فیصلے ہنوز منصادم تھے کہ آریہ سماج اور مرزائیوں کی چپقلش نے ہندوستان میں تحریک شاتم رسول کو جنم دیا۔

۱۸۷۵ء میں پنڈت دیانند کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" پہلی بار بنارس میں شائع ہوئی۔ قادیانی مذہب کے بانی مرزا غلام احمد نے "ستیارتھ پرکاش" کے شائع ہوتے ہی کتاب ہذا کے مصنف اور دوسرے ہندوؤں کو چیلنج کیا کہ "جو کتاب میں (مرزا غلام احمد) مستقبل قریب میں لکھنے والا ہوں اگر ہندو اور سوامی دیانند مجھے اس کا جواب دیں تو میں انہیں دس ہزار روپیہ انعام دوں گا" ——— اس کے بعد مرزا غلام احمد کی کتاب "براہین احمدیہ" کا سلسلہ شروع ہوا جس میں ہندو دھرم، وید، آریہ سماج، پنڈت دیانند پر اعتراضات و الزامات تراشے گئے۔

اکتوبر ۱۸۸۳ء میں پنڈت دیانند کی موت واقع ہوئی اور ۱۸۸۴ء میں براہین

احمدیہ" کی چوتھی جلد شائع ہوئی۔ اس میں پنڈت دیانند کی موت پر اُس کے خلاف زورِ قلم کا مظاہرہ کیا گیا۔ اُسی سال ستیارتھ پرکاش کا دوسرا ایڈیشن شائع ہُوا تو اضافی طور پر جن دو ابواب کو شامل اشاعت کیا، ان میں داعیِٔ اسلام حضور خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر براہ راست حملے کیے گئے جنہیں مسلمان برداشت نہ کر سکا اور کتاب ہذا کے خلاف ہندوستان بھر میں احتجاجی مظاہرے اور جلسے ہوئے نیز حکومت سے اس کتاب کی ضبطی کا مطالبہ کیا گیا۔

انہی دنوں قاسم علی احمدی (مرزائی) کی کتاب "انیسویں صدی کا مہارشی دیانند" شائع ہوئی، جس میں پنڈت دیانند کو ہدف تنقید بنایا گیا تھا۔ اس کتاب کے بازار میں آتے ہی ہندو مسلمان پھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آکھڑے ہوتے۔ قاسم علی احمدی کے جواب میں آریہ سماجی لیڈر پنڈت چمپا وتی ایم اے پروفیسر ڈی اے وی کالج لاہور نے (نعوذ باللہ) "رنگیلا رسول" ایسی رسوائے عالم کتاب لکھی۔

یہ سارا تماشہ اُن دنوں ہُوا جب لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند کا چیلنج قبول کرتے ہوئے رہنمایانِ ہند نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ نیز باہم مل بیٹھنے کی تجویزیں پاس کی تھیں۔

ان واقعات کے یہاں پہنچنے تک ۱۹۲۷ء کا سال اپنے سفر کی ایک نہائی منزل طے کر چکا تھا۔ لیکن آریہ سماجی ہندو اور مرزائیوں کی باہم تلخ نوائی نیز اُن کی تحریری جنگ نے ہندوستان کے سنبھلتے ہوئے حالات کو از سر نو پلٹا دیا گو شدھی و سنگھٹن کی بادِ سموم کے باعث صحن چمن کی ہر روش اپنی نگاہوں کے

دور سے ٹمرخ کیے بیٹھی تھی تاہم احساس ہو رہا تھا کہ شبنم کے آنسو اور باد نسیم گاہی کے معانقے سے فضاؤں میں انقلاب رونما ہوگا اور صیاد کے ظلم و جور کی بجلیوں سے جلتے ہوئے آشیانوں کو پھر سے تنکے جمع کرنے کا موقع ملے گا مگر بکھرے ہوئے زہر نے دریا کے ہر قطرے کو مسموم کر دیا۔

شاتم رسولؐ واجب قتل ہے

اس مسموم فضا میں امرتسر کے ایک ہندی رسالہ "ورتمان" نے بھی شاتم الانبیاء علیہ السلام کی ذات گرامی پر کیچڑ اچھالا جسے رائج الوقت قانون نے چھ ماہ کی سزا دی لیکن (نعوذ باللہ) کتاب "رنگیلا رسول" نے حالات کو بد سے بدتر کر دیا۔ علمائے دین کی توجہ جب کتاب ہذا کی طرف ہوئی تو جمیعۃ العلمائے ہند نے شاتم رسول کو واجب القتل قرار دیا۔ اس فتویٰ کے شائع ہوتے ہی عبدالعزیز نامی شخص نے کتاب ہذا کے ناشر مہاشہ راجپال پر، جس نے کہ مصنف کی ذمہ داری بھی خود قبول کر لی تھی، لاہور میں قاتلانہ حملہ کیا۔ جس سے راج پال زخمی ہوا اور حملہ آور کو چودہ سال کی سزا ہوئی۔

اس کے بعد خدا بخش نامی (المعروف اکو بھیا) نے حملہ کیا، مگر یہ وار بھی جان لیوا ثابت نہ ہوا۔ خدا بخش کو چھ سال کے لیے جیل بھیج دیا گیا۔

ہندوستان کے مسلمانوں نے حکومت ہند سے مطالبہ کیا کہ راج پال کو گرفتار کر کے اس پر مقدمہ چلایا جائے۔ آخر مسلسل قاتلانہ حملوں اور مسلمانوں کے اضطراب کے ردعمل پر حکومت نے مہاشہ راج پال کو گرفتار کر لیا۔ عدالت

نے تین سال قید اور جرمانے کی سزا دی لیکن سیشن جج نے جرمانہ معاف کر دیا اور سزا بحال رکھی۔ ہائی کورٹ میں اپیل پر جسٹس کنور دلیپ سنگھ (عیسائی) نے راجپال کو بری کر دیا۔ اس فیصلے پر لاہور کے انگریزی روزنامہ "مسلم آؤٹ لک" نے تبصرہ کیا تو اسے توہین عدالت پر سزا ہوئی جسٹس کنور دلیپ سنگھ کے اس رویّہ پر عوام کا احتجاج اس قدر عام ہوا کہ حکومت کو عدالت عالیہ کی پوزیشن محفوظ کرنا مشکل ہو گئی۔

شاہ جی کا موقف

۴ر اور ۵ر جولائی ۱۹۲۷ء کی درمیانی رات کو مسلمانان لاہور کی طرف سے دہلی دروازہ کے باغ میں ایک جلسے کا اعلان کیا گیا، جس میں شاہ جی، مولانا احمد سعید، مولانا مفتی کفایت اللہ، چودھری افضل حق، خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے تقریریں کرنی تھیں لیکن اسی روز لاہور کے ڈپٹی کمشنر مسٹر اوگلوی نے دفعہ ۱۴۴ لگا کر جلسے کو ممنوع قرار دے دیا۔ مگر شاہ جی کی تجویز پر یہ جلسہ میاں عبدالرحیم کے احاطہ میں منعقد کیا گیا (یہ احاطہ موجودہ مزار حضرت شاہ محمد غوثؒ بیرون دہلی دروازہ کے بالمقابل واقع ہے) اس وسیع احاطہ میں ہزاروں لوگ جمع ہو گئے اور جلسے کی صدارت چودھری افضل حق نے کی۔ فوج اور پولیس کے علاوہ مسٹر اوگلوی ذاتی طور پر بھی احاطہ کے باہر موجود تھے اور اندر آ کر اعلان کیا کہ

"دفعہ ۱۴۴ کے باعث یہ مجمع خلاف قانون ہے۔ آپ لوگ پانچ منٹ

کے اندر یہاں سے چلے جائیں ورنہ مجھے گولی چلانے کا حکم دینا پڑے گا۔"
ڈپٹی کمشنر کے اس اعلان پر خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے ڈپٹی کمشنر کو انگریزی میں کہا،

"ہم اس قانون کو اپنے پاؤں تلے روندتے ہیں۔ جو قانون ہمیں ناموس پیغمبرؐ کی حفاظت کی ضمانت نہیں دیتا۔ تم جو چاہو کرو ہم یہ جلسہ کریں گے۔"

اس کے بعد شاہ جی نے تقریر کرتے ہوئے کہا،

"آج ہم سب فخر رسل صلے اللہ علیہ وسلم کی ناموس کو برقرار رکھنے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ بنی نوع انسان کو عزت بخشنے والے کی عزت خطرے میں ہے۔ آج اس جلیل القدر ہستی کا ناموس معرض خطر میں ہے جس کی دی ہوئی عزت پر تمام موجودات کو ناز ہے۔

آج مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کے دروازے پر اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور اُم المومنین حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا آئیں اور فرمایا کہ ہم تمہاری مائیں ہیں۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کفار نے ہمیں گالیاں دی ہیں؟ ـــــ ارے دیکھو تو! اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا دروازے پر تو کھڑی نہیں؟"

یہ سُن کر حاضرین میں کہرام مچ گیا اور مسلمان دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔
شاہ جی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا،

"تمہاری محبت کا نوریہ عالم ہے کہ تمام حالتوں میں کٹ مرتے ہو، لیکن کیا تمہیں معلوم نہیں کہ آج سبز گنبد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تڑپ رہے ہیں اور خدیجہؓ اور عائشہؓ پریشان ہیں۔ بتاؤ! تمہارے دلوں میں اُمہات المومنینؓ کی کیا وقعت ہے؟ آج اُم المومنین عائشہؓ تم سے اپنے حق کا مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہی جنہیں رسول اللہ حمیرہ کہہ کر پکارتے تھے۔ جنہوں نے سید دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو رحلت کے وقت مسواک چبا کر دی تھی۔

اگر تم خدیجہؓ اور عائشہؓ کی ناموس کی خاطر جانیں دے دو تو کچھ کم فخر کی بات نہیں ہے۔ یاد رکھو! یہ موت آئے گی، تو پیامِ حیات لے کر آئے گی۔"

(روزنامہ زمیندار، ۷ رجولائی ۱۹۲۷ء)

یہ تقریر اس قدر مؤثر اور جذباتی تھی کہ تمام مجمع میں حشر بپا تھا۔ شاہ صاحب کی تحریک پر لوگوں کے جتھے باغ میں جلسہ گاہ جاتے اور گرفتار ہو جاتے۔ اُن پر لاٹھی چارج بھی کیا جاتا۔ یہ سلسلہ تھوڑی دیر جاری رہا۔ بعد ازاں شاہ جی نے عوام کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی اپیل کی اور کہا،

"ہمارا مؤقف قتل و غارت گری نہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ برطانوی حکومت تعزیرات ہند میں ایک ایسی دفعہ کا اضافہ کرے جس کی رُو سے بانیانِ مذاہب کے خلاف تقریر و تحریر کی پابندی ہو اور اس کی خلاف ورزی کرنے والا مجرم قرار پائے۔"

اس قرارداد کے بعد جلسہ برخاست کر دیا گیا لیکن عوام کو پُرامن طور پر احاطہ سے باہر نکالنے کے لیے شاہ جی خود دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ اُن کے سامنے مسٹر اوگلوی کھڑا تھا۔ شاہ جی اپنے مخصوص انداز میں لوگوں کو پُرامن رہنے کی تلقین کر رہے تھے اور ساتھ ہی مسٹر اوگلوی سے پنجابی میں کہا کہ

"اوگلوی! او کھے گھر نیوندرہ پا یا ای!"

تیسری گرفتاری

ڈپٹی کمشنر لاہور نے قانون کی اوٹ میں اپنی شکست کا انتقام لیتے ہوئے ۱۰ر جولائی ۱۹۲۷ء اڑھائی بجے بعد دوپہر شاہ جی اور خواجہ عبدالرحمان غازی کو دفتر پنجاب خلافت کمیٹی حجازی بلڈنگ بیرون دہلی دروازہ سے زیر دفعہ ۱۰۷ گرفتار کر لیا۔ گرفتاری سے پیشتر شاہ جی دہلی، لاہور، امرتسر اور لدھیانہ کے اضلاع میں تقریریں کر کے پنجاب کے مسلمانوں کو توہین پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم کے انتقام پر آمادہ کر چکے تھے۔

دفعہ ۱۰۷ کے تحت قانون کا منشا ادھورا دیکھ کر شاہ جی پر دفعہ ۱۰۸ کے تحت بھی مقدمہ چلایا گیا۔ اُنہیں حکم ہوا کہ تین ہزار کی ضمانت اور تین ہزار کا مچلکہ دے کر دورانِ مقدمہ رہا ہو سکتے ہیں لیکن شاہ جی نے نہ صرف فرنگی قانون کی یہ رعائیت ٹھکرا دی بلکہ عدالت میں اپنا بیان اور مقدمہ میں صفائی دینے سے بھی انکار کر دیا۔ سماعت مقدمہ تک شاہ جی اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی لاہور بورسٹل جیل میں رہے لیکن مقدمہ کی کارروائی لاہور سنٹرل جیل میں ہوتی رہی مسلسل چار روز کی یکطرفہ

کارروائی کے بعد شاہ جی اور خواجہ عبدالرحمٰن غازی کو ایک ایک سال کی قید بامشقت کی سزا دے کر شاہ جی کو رہتک جیل منتقل کر دیا گیا۔

مولانا ظفر علی خان کی ایک نظم کا شعر انہی دنوں کی یادگار ہے ؎

بنو غازی کی غیرت لاج رکھ لی جس نے ملت کی
عطاء اللہ کا ہیبت رُبا ایمان ہو جاؤ

(مولانا ظفر علی خان)

سوامی شردھانند کا قتل

شاہ جی کی گرفتاری اور سزا کے بعد فرنگی اور ہندو کے خلاف نفرت کو مزید ہوا ملی اور یہ تحریک سارے ہندوستان میں پھیل گئی۔ ان دنوں مسلمانانِ ہند کے حسب ذیل مطالبات تھے:۔

۱۔ حکومت برطانیہ ایک ایسا قانون وضع کرے جس سے بانیانِ مذاہب کی عزت محفوظ ہو۔

۲۔ جسٹس کنور دلیپ سنگھ کو اُن کی ذمہ داریوں سے فوراً علیحدہ کر دیا جائے

۳۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور اُن کے دوسرے ساتھیوں کو جیلوں سے رہا کیا جائے۔

اس ہنگامی تحریک کے نتیجہ میں والیٔ افغانستان غازی امیر امان اللہ خان نے حکومت برطانیہ کو حسب ذیل مفہوم کا ایک خط لکھا:۔

"اگر برطانوی ہند میں نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی عزت محفوظ

نہیں رہ سکتی تو ہمیں برطانیہ کے ساتھ کیے گئے معاہدوں پر
از سر نو غور کرنا پڑے گا۔"

مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کو بھی انہی دنوں گرفتار کیا گیا۔

شدھی و سنگھٹن کے برگ و بار پھر اُبھر کر سامنے آئے۔ سوامی شردھانند نے اپنے اخبار "تیج" میں یہ جذباتی نعرہ لگایا کہ میں عنقریب دہلی جامعہ مسجد کے منبر پر شدھی کا جھنڈا لہراؤں گا۔ اس اعلان پر مسلمانوں میں اضطراب بڑھا۔ آخر مولوی عبدالرشید نے جو جامعہ مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر پرانی کتب فروخت کیا کرتا تھا، سوامی شردھانند کو قتل کر دیا اور اسی جرم میں اُسے ۱۴ نومبر ۱۹۲۷ء کو دہلی جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

الغرض واقعات نے ہندوستان کو ایسی ڈگر پر ڈال دیا جہاں کے شاد منیلاں بھی خون انسانی سے لالہ و گل کو رنگت بخشتے رہے اور اس راہ کی ہر شے نے خاتم الانبیاءؐ کے ناموس کی حفاظت کی۔

تعزیرات ہند میں ترمیم

غیر ملکی نظام حکومت غلام رعایا کو باہم دست و گریباں دیکھ چکا، آدمی کے لہو سے آدمیت کی ذلت چھلکنے لگی، دلوں کے انگارے لو دینے لگے، تو شاطران فرنگ نے محکوم رعایا پر دستِ کرم کیا کہ تعزیرات ہند میں ترمیم کرکے دفعہ ۲۹۵ کا اضافہ کیا جس کی رو سے ہر ایسی تحریر و تقریر قانوناً جرم قرار دے دی گئی، جس سے کسی مذہب کے بزرگ یا بانی (REFORMER) کی اہانت کا

پہلو نکلتا ہو لیکن پہلے کی متنازعہ فیہ کتب کو ممنوع قرار نہ دیا گیا۔

نہرو رپورٹ

۱۲ فروری ۱۹۲۸ء کو لارڈ برکن ہیڈ اور سائمن کمیشن کے جواب میں ہندوستانی رہنما دہلی میں جمع ہوئے۔ پنجاب کی نمائندگی چودھری افضل حق، مولانا داؤد غزنوی اور مولانا ظفر علی خان نے کی۔ اس اجتماع میں سر علی امام، مسٹر شعیب قریشی، مسٹر اینے، مسٹر جیکر، سردار منگل سنگھ، سر تیج بہادر سپرو پر مشتمل ایک کمیٹی ترتیب دی گئی۔ جس کے صدر پنڈت موتی لال نہرو مقرر ہوئے۔ اس کمیٹی کی رپورٹ آگے چل کر نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔

اگرچہ سائمن کمیشن کی آمد پر مسلم لیگ اور کانگریس کے اتحاد سے ہندوستانی رہنماؤں کی مساعی جمیلہ نے بگڑے ہوئے ماحول کو سنوارنے کی شب و روز سعی کی لیکن فضا میں تلخی بدستور زہر گھول رہی تھی۔ انہی دنوں مئی ۱۹۲۸ء میں شاہ جی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور غازی عبدالرحمٰن امرتسری ایک ایک سال میعاد اسیری گزار کر رہا ہوئے۔ ان کی آمد پر امرتسر کو دلہن کی طرح سجایا گیا۔ مسلمانوں کے دلوں کے آئینوں میں شوق و محبت کی تصویریں اتر آئیں۔ سقف و بام پر خوشی کے آنسوؤں کی جھالریں لٹکا دیں۔ کوچہ و بازار محبوب رہنماؤں کی آمد پر مسکراہٹ کے موتی بکھیرنے لگے۔ گھروں میں عید اور دکانوں پر میلے لگ گئے۔ اس استقبال کی تیاریوں کی اطلاع نہ جانے کس طرح شاہ جی کو ملی کہ وہ اچانک یوں غائب ہوئے کہ ان کے ساتھی بھی انہیں تلاش نہ کر سکے۔ شاہ جی رات کے اندھیرے میں چھپ

کر گھر پہنچ گئے۔

امرتسر ریلوے اسٹیشن پر استقبال کرنے والے ہجوم کو شاہ جی کی یہ بے اعتنائی پسند نہ آئی۔ وہ مایوس بھی ہوئے اور ناراض بھی۔ اس کے باوجود مولانا حبیب الرحمٰن اور غازی عبدالرحمٰن کا جلوس اپنے پورے وقار سے نکلا۔ ناموسِ رسالت کے محافظ جن راستوں سے گزرتے نگاہیں فرشِ راہ اور دلوں نے عقیدت کے پھول برسائے۔

شاہ جی کی جلوس سے غیر متوقع غیر حاضری نے اُن کے حلقۂ احباب پر بھی اثر کیا۔ چنانچہ عام دوستوں نے باہم فیصلہ کیا کہ شاہ جی سے تعلقات منقطع کر لیے جائیں۔ اس فیصلے کے تحت احباب نے رُخ پھیر لیا۔ شاہ جی جس دوست کے مکان پہ جاتے وہ خدمت تو کرتے، آؤ بھگت بھی کرتے لیکن خاموشی سے۔ چاہے گھنٹوں اُن کے پاس بیٹھے رہیں بازار سے گھر میں اور سارے حلقۂ احباب میں بھی بے رُخی اور بے نیازی کا عالم رہا۔ بازار سے گزرتے تو السلام علیکم کا جواب نہ ملتا۔ گھر سے نکل کر محلے میں آتے تو بچوں اور بوڑھوں تک میں مقاطعہ کی فضا پاتے۔

اسی طرح پندرہ دن گزر گئے لیکن لبوں پہ مہرِ خاموشی بدستور رہی۔ گو یہ غصہ، ناراضگی، بے نیازی و بے رُخی احباب کی ایک سازش کا نتیجہ تھی لیکن شاہ جی ایسے باغ و بہار آدمی کے لیے وبالِ جان ہو گئی اور وہ اس قدر پریشان ہوئے کہ مرنے مارنے پر اُتر آئے۔ جن دوستوں سے زیادہ قرابت تھی وہاں زیادہ رنج ظاہر کرتے۔ آخر دوستوں نے بھی اتنی ہی سزا کافی سمجھ کر کٹڑہ مہاں سنگھ کے

میونسپل کمشنر میاں محمد شریف ٹھیکیدار کے گھر دعوت کا انتظام کیا اور اس مجلس میں شاہ جی نے جلوس سے غیر حاضری کے لیے حلقۂ احباب سے معذرت چاہی۔ یہ رنگین محفل جس میں اردو اور پنجابی کے شعراء، بذلہ سنج حضرات شامل تھے، رات دو بجے تک جاری رہی۔

حیدر پہلوان کا مقدمہ

باوجودیکہ نہرو رپورٹ کے ذریعے حسب ذیل فرقہ وارانہ فیصلے ہوئے

۱۔ جداگانہ انتخاب کو ہندوستان سے ختم کر دیا جائے۔

۲۔ مخلوط انتخاب کے ساتھ نشستوں کا تعین غیر مفید قرار دیا جائے۔

۳۔ پنجاب اور بنگال میں انتخاب کھلا رکھا جائے۔ نیز کسی فرقہ کے لئے نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔

۴۔ مرکز میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دینے سے انکار کیا گیا۔ البتہ اس نسبت پر فیصلہ ہوا جو صوبہ جاتی نشستوں کے فیصلے کی رُو سے مرکز میں مسلمانوں کو حاصل ہو سکیں گی۔

لیکن ہندو مسلم کشیدگی برابر بڑھتی رہی اور سائمن کمیشن اپنا کام کرتا رہا۔ یہ دور قانونی موشگافیوں کا دور تھا۔ شاہ جی ان دنوں کچھ دیر کے لئے خانگی معاملات کی دیکھ بھال میں مصروف رہے۔

متحدہ ہندوستان میں مسلمان قومی کارکنوں کی زندگی ہمیشہ ایک المیہ رہا ہے بشرطیکہ وہ کارکن ہوس سوداگر نہ ہوں۔ گو پروان وہی لوگ چڑھے جنہوں نے دماغ

اور ضمیر کا سودا کیا، اور وقت نے بھی اُنہی کو حقیقت جانا۔ حالانکہ وہ افسانہ تھے لیکن آئینہ ٹوٹ کر بھی دیکھنے والے کو مایوس نہیں کرتا۔

انسان کا اگر اپنا ضمیر مطمئن ہو تو حالات کا بگاڑ راستے کی دیوار نہیں بنتے کانٹے لاکھ سر پھوڑیں پھول نکل ہی آتے ہیں۔ شاہ جی اگر مقبول ہو رہے تھے، یا شہرت اُن کی پیشوائی کر رہی تھی تو اُن کے سہارے تعلیم، دولت یا کوئی دوسرا طلسم نہیں تھا، بلکہ خلوص، جذبۂ ایثار اور ایمان کی پختگی یہ ایسی چیزیں تھیں، جو انہیں زمانہ پر فوقیت دے رہی تھیں۔ درویش کی زندگی کا مدار اُس کی گودڑی تک ہوتا ہے شاہ جی نے گھریلو حالات کو بھلا دینے کے لئے وقت سے عارضی مہلت مانگی اور امرتسر پرانی گندم منڈی والی مسجد میں صبح کا درس اور جمعہ کے خطبہ پہ متعین کر دیئے گئے۔ یہ گاڑی ایک معتینہ مدت تک چلی۔

امرتسر میں زرگر سونا چاندی یا گوٹا کناری خرید نے محلوں میں عام گشت کیا کرتے تھے۔ اسی طرح ایک غیر مسلم زرگر کوچہ حیدر پہلوان میں پھر رہا تھا کہ امرتسر کے مشہور حیدر پہلوان کے بھائی محمد سرور نے اُس کے سر پر اچانک لوہے کا ہتھوڑا دے مارا۔ آدمی کمزور تھا، ضرب کاری لگی اور ہلاک ہو گیا۔ ملزم محمد سرور کا دماغی توازن گزشتہ کئی برسوں سے درست نہیں تھا۔ اُس کی اس حرکت نے سارے شہر کا توازن خراب کر دیا۔ ملزم موقع پر گرفتار کر لیا گیا۔ واقعہ سے تیسرے روز ہمسایہ قوم نے حیدر پہلوان کو ملزم قرار دے کر گرفتار کرا دیا۔

حیدر پہلوان سیرت اور صورت کے لحاظ سے اپنے فن کی برادری میں منفرد پہلوان تھا۔ پنجاب مرحوم اپنے اکھاڑے کے اس جیالے جوان پر جی جان سے

فریضہ تھا۔ ہندوؤں نے جیسے ہی حیدر کو قاتل ٹھہرا کر قانون کے حوالے کیا، امرتسر کا مسلمان فریق بن کر سامنے آ گیا۔ عید کا تہوار بھی قریب تھا اور عید کے دوسرے روز حیدر نے کشتی لڑنی تھی۔ مقامی حکام اس حادثے کے باعث تعطل میں تھے۔ ہندو قوم کی دولت نے قانون کے سارے راستے مسدود کر دیئے۔ پولیس کی ابتدائی رپورٹ میں حیدر پہلوان کا نام درج نہیں تھا اور یہی ایک راستہ ایسا تھا، جہاں ہندوؤں کی دولت کوئی رکاوٹ نہ کر سکی۔

مقدمے کی سماعت ڈپٹی کمشنر نے خود سنبھالی۔ ہمسایہ قوم نے لندن کے مشہور بیرسٹر مسٹر پٹ مین کو وکالت کے لئے پیش کیا اور مسلمانوں نے میاں سر محمد شفیع کو پیش کرنے کا فیصلہ کیا، مگر تہی دامنی اور خالی ہاتھ سر شفیع کے اونچے محل تک پہنچنے سے قاصر تھے۔ غریب جان تو دے سکتا ہے مگر ایثار زر اس کے بس کا روگ نہیں۔ ایثار پیشہ مسلمان جب دنیوی سرمائے سے عاری ہو جاتا ہے تو جذبات کا سودا کرنے لگتا ہے۔ کٹڑہ مہا سنگھ کے لوگوں نے شاہ جی سے گزارش کی کہ

حیدر پہلوان کے مقدمہ میں مسلمانوں کی عزت کہیں اسلام کی شکست کا نشان نہ بن جائے۔"

تو شاہ جی آبدیدہ ہو کر چندہ مانگنے محلے میں نکل کھڑے ہوئے۔ شام تک امید نے ڈھارس بندھائی لیکن دریا خشک ہو جائے تو آنسوؤں کی روانی اس کی پیاس ختم نہیں کر سکتی۔ اگلے روز باغبانپورہ لاہور میں میاں سر محمد شفیع کے مکان کے سامنے چوک میں تقریر کرنے کا ارادہ لے کر شاہ جی لاہور پہنچے۔ منادی ہوئی

ہزاروں کی تعداد میں مجمع تھا۔ شاہ جی نے عشاء کی نماز کے بعد تقریر شروع کی اور صبح کے چار بج گئے۔ اس دوران حیدر پہلوان کی شخصیت، مقدمے کی نوعیت، مسلمانوں کی بے بسی، ہندوؤں کے اتحاد اور دولت پر تبصرہ کیا لیکن سر شفیع کا نام تک نہ لیا۔ آخر اذان کے وقت میاں سر شفیع بے اختیار ہو کر شاہ جی کے قدموں پر آ گرے اور اسی وقت امرتسر جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ دوسرے روز مقدمے کی پہلی پیشی تھی اور اس مقدمے کی چشم دید گواہ محلے کی لکھی دھوبن نامی ایک عورت تھی جس نے اپنی شہادت میں حیدر پہلوان کو موقع واردات پر غیر حاضر قرار دیا۔

ولایت سے آئے ہوئے مسٹر پٹ مین اور میاں سر محمد شفیع بیرسٹرایٹ لا آمنے سامنے کھڑے تھے۔ عدالت سے باہر ہزاروں مسلمان جمع تھے کہ حیدر پہلوان ہتھکڑی کے ساتھ عدالت میں لائے گئے جسے دیکھتے ہی مسلمانوں کی چیخیں نکل گئیں اور ساتھ ہی ہندوؤں نے اپنی پہلی کامیابی پر "ہر ہر مہا دیو" کے نعرے بلند کیے۔

شاہ جی عدالت میں نہیں آئے بلکہ اُن کا کہنا ہے کہ "میں اپنے اللہ کے حضور سر بسجود ہو کر روتا رہا اور مسلمانوں کی کامیابی کے لئے دُعا کرتا رہا۔"

لکھی دھوبن کی گواہی کے بعد میاں سر محمد شفیع نے عدالت سے کہا کہ استغاثہ کی ابتدائی رپورٹ اور چشم دید گواہ کے بعد میرا عدالت سے صرف ایک ہی سوال ہے،

"کیا عدالت کے نزدیک پولیس زیادہ معتبر ہے یا کوئی دوسرا گواہ؟"

عدالت: "پولیس!"

سر شفیع تو پھر پولیس کی ضمنی یا ابتدائی رپورٹ میں حیدر پہلوان کا نام بطور ملزم کے درج نہیں بلکہ محمد سرور کا نام ہے۔ لہذا میری عدالت سے درخواست ہے کہ ملزم حیدر پہلوان نہیں بلکہ محمد سرور ہے۔ بس ــــ!"

استغاثہ کے ایک گواہ کی شہادت اور سر محمد شفیع کے دلائل سننے کے بعد عدالت نے دوسرے فریق کے دلائل سنے بغیر حیدر پہلوان کو مقدمے کی پہلی پیشی پر با عزت بری کر دیا اور محمد سرور کو پاگل قرار دے کر غیر معینہ عرصہ کے لئے پاگل خانے بھیج دیا۔

حیدر پہلوان کو عدالت سے بری ہوتے ہی پچھلے دروازے سے نکال کر گھر بھیج دیا گیا۔ جب مسلمانوں کو یہ خوش خبری ملی تو وہ دیوانے ہو گئے لیکن اس دیوانگی میں انہوں نے کوئی غیر قانونی حرکت نہیں کی۔

شاہ جی اور مسلمانان امرتسر اپنی اس کامیابی پر بہت مسرور ہوئے۔ یہ ستمبر ۱۹۲۸ء کا واقعہ ہے۔

پیر کرم شاہ

جب قوموں کا گزر انحطاط کے دور سے ہوتا ہے تو راستے کی ہر پگڈنڈی انہیں منزل کا نشان دکھائی دیتی ہے حالانکہ پگڈنڈی نہ تو راستہ ہوتا ہے اور نہ ہی منزل۔ لیکن بھٹکے ہوئے راہی ہر موڑ کو سنگ میل سمجھتے ہوئے اپنے قیاس میں کھو جاتے ہیں۔

اس دور کا مسلمان عقیدے کی پختہ چٹان سے پھسل کر ان پتھروں پر آ گرا

ہے جن سے تراشے ہوئے صنم خدائی کے دعویدار ہیں۔ مخلوق اپنے خالق سے انحراف کر کے بغاوت کے اُس دستور کو اپنا رہی ہے جس کی ہر تجویز انسانیت سے ماورا معلوم ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر شعبدہ باز صرف ہاتھ کی صفائی سے دل و نظر کو فریب دینے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

۱۹۲۸ء کی نبضیں چھوٹ رہی تھیں کہ امرتسر کا مسلمان پیر کرم شاہ کے آستانے پر سجدہ ریز تھا۔ مسلمان عورت کا آبگینۂ عصمت اس دہلیز سے ٹکرا کر چور چور ہو چکا تھا۔ ایمان و توحید کی قدریں وند کر کفر کے تارِ عنکبوت میں اُلجھ رہا تھا۔

تیس بتیس کا سن، سرو قد، سُرخ و سپید رنگت جیسے میدے میں سندھور گوندھ کر بنایا گیا ہو، کشادہ پیشانی، چشم آہو میں بلا کی چمک، جیسے کسی نے موتی کوٹ کر بھر دیئے ہوں، تیکھی ناک جیسے تلوار کی دھار، عناب کی طرح سُرخ سُرخ ہونٹ، سر پہ لمبے اور سنہری بال، ایسا جال تھے جن میں راہ چلتی جوانیوں کا پھنس جانا معجزہ نہیں تھا ان سب پر سیاہ ریشم کے عربی کاٹ کے لباس کی سج دھج۔ یہ تھا پیر کرم شاہ! جس کی شہرت نے گھروں کے گھرانوں کے قدموں پر لا ڈالے تھے۔ یہ اکثر چہرے پر نقاب رکھتا اور ملنے والوں کو دیدار کی ہوس رہتی تھی۔ امرتسر قلعہ بھنگیاں کوچہ سناریاں میں رہائش کے دنوں اُس کا چرچا خوشبو کی طرح پھیل گیا۔ امرتسر کا سرکاری خطاب یافتہ طبقہ، شال مرچنٹ، پشمینہ کے سوداگر اُس کے میزبان تھے۔ لباس، گفتگو، نقش و نگار اور ظاہری رکھ رکھاؤ نے کرم شاہ کے متعلق مختلف قیاس آرائیوں کو ہوا دی۔ کمزور اعتقاد مسلمان روحانی پیر سمجھ کر پوجا کرنے لگا۔ اور اکثر کی رائے تھی کہ کرم شاہ درحقیقت وہی کرنل لارنس ہے جس نے عربوں میں انقلاب

برپا کیا تھا۔ دوسری رابطے کے باعث سرکاری خطابات کی چاہت کے لوگ کرم شاہ کے گرد زیادہ تعداد میں جمع ہوئے۔

امیروں کی بھیڑ دیکھ کر غریبوں کے ایمان بھی متزلزل ہو گئے۔ فریب خوردہ عوام نے آستانہ کرم شاہ پر جبہ سائی کی انتہا کر دی۔ اولاد سے محروم عورتوں کی ٹولیاں صف باندھے شب و روز کھڑی رہتیں۔ اس طرح سبب سادا امرتسر سوا اس لکھو بیٹھا تو شاہ جی خواجہ عبدالرحیم عاجز کی ہمراہی میں کرم شاہ سے ملنے گئے۔ معلوم ہوا آج یوم خواتین ہے مردوں کے لیے اجازت نہیں۔ گو شاہ جی کا ماتھا یہیں سے ٹھنکا لیکن با دل نخواستہ دوسرے دن کا قصد کر کے واپس لوٹ آئے۔ دوسرے روز گئے تو موصوف سے دو گھنٹے تنہائی میں سیر حاصل گفتگو کے بعد شاہ جی مسکراتے ہوئے باہر آئے اور اگلے دن چوک خراسیاں (متصل ڈیرہ کرم شاہ) میں اہل امرتسر کو خطاب کرتے ہوئے شاہ جی نے کہا:۔

"راہ مستقیم سے بھٹکے ہوئے مسلمانو! ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی۔ جس آدمی کو تم نے روحانی پیشوا یا انگریزی جاسوس خیال کر لیا ہے یہ دونوں میں سے کچھ نہیں۔ برطانوی جاسوس نہ تو گلی محلوں میں قیام کرتے ہیں اور نہ اس طرح کی بھیڑ انہیں راس آتی ہے اور یہ روحانی آدمی بھی نہیں۔ یہ محض نفس پرست انسان ہے۔ ممکن ہے آج میری باتیں تمہیں کڑوی معلوم ہوں، لیکن عنقریب سنو گے کہ یہ کسی معصوم لڑکی کو اغوا کر کے لے بھاگا۔ اگر تم اپنے ایمان نہیں بچا سکتے تو گھروں کی عزت کی حفاظت

گرد عورتوں کو وہاں جانے سے منع کردو۔
مجھ سے پوچھتے ہو تو میری نظروں نے فسق و فجور کے
علاوہ وہاں اور کسی چیز کا اندازہ نہیں لگایا۔ وہاں روحانیت
کی نہیں معصیت کی تربیت دی جاتی ہے۔ جس شخص کو تم
نے پیر بنا رکھا ہے، یہ بہت بڑا بدمعاش ہے۔ انشاء اللہ
میں بہت جلد اس کا یہ سارا طلسم ختم کر دوں گا۔ تم چاہے آج
میرا ساتھ نہ دو لیکن کل میرے ساتھی ضرور بنو گے۔"
شاہ جی کی یہ تقریر رات دو بجے تک جاری رہی اور دوسرے دن اس
بے غیرتی و زنا چوک کی گزشتہ شدید پر جلسے کا اعلان کیا گیا۔ اس جلسے میں حاضرین
کا اندازہ دو لاکھ سے اوپر بیان کیا جاتا ہے۔ پنجابی کے مشہور انقلابی شاعر خواجہ
عبدالرحیم عاجز نے "دو سہیلیوں کے باہم تکرار" کے عنوان سے ایک پنجابی نظم اس
جلسہ کے آغاز میں پڑھی جس کے دو شعر یاد ہیں ۔

چل درشن کر یئے نی اج رل کرم شاہ پیر دے
ہائیں گھر گھر وچ اڈ یئے اج چرچے جس بے پیر دے

مردو تگھن او سنجے بچہ کے اندر
اتے تینویاں لنگھدیاں کھلیاں
اساں سنیا او تھے انج کھیڈاں
جیویں سے ڈنڈے نال گلیاں
او تھے نقشے دسدے نیں اساں سنیا رانجھن ہیر دے چل درشن کریئے نی اج رل کرم شاہ پیر دے

شاہ جی کی تقریر صبح اذان کے وقت ختم ہوئی (افسوس ہے کہ تلاش کے باوجود یہ تقریر نہ مل سکی)

ان تقاریر کے بعد کرم شاہ نے اچانک امرتسر چھوڑ دینے کا فیصلہ کر لیا اور بمبئی چلا گیا۔ وہاں اس نے چند تجارت پیشہ لوگوں پر اپنا وار کیا۔ لیکن بہت جلد شراب نوشی اور دوسری بدمعاشیوں کا انکشاف ہونے کے بعد یہ لاہور چلا آیا۔ یہاں اسکے گرد اسی تماش کے لوگوں کا ہجوم رہنے لگا۔ پھر یہ اس قدر بدنام ہوا کہ لاہور میں لالہ لاجپت رائے کی ارتھی کے جلوس کے موقع پر (جو کہ سائمن کمیشن کے خلاف احتجاجی جلوس میں لاٹھیوں سے زخمی ہو کر فوت ہوئے تھے) کرم شاہ کو عوام نے کار میں دیکھ لیا اور اس قدر پٹائی کی کہ بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگا۔ اس ہنگامے کے بعد یہ کشمیر بھاگ گیا۔

کرم شاہ کون تھا؟ کہاں سے آیا تھا؟ کہاں چلا گیا؟ یہ خاک کہاں سے اڑی اور کہاں جا کر بیٹھ گئی۔ اس اندھیر گردی میں کتنی عصمتیں لٹیں؟ کتنے ایمان ضائع ہوئے؟ انسانیت کو کہاں کہاں شرمندہ ہونا پڑا، زمانے کے پاس اس کی کوئی فائل نہیں۔ حالات و واقعات پر اسی طرح خندہ زن رہے۔ لیکن شاہ جی کی آواز سے جو گونج پیدا ہوئی تھی، اس کی صدائے بازگشت ہنوز سنائی دے رہی ہے۔ "مسلمانو ــــ! ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نہیں ہوتی!!"

۱۹۲۹ء

زندگی کے سن وسال جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں، آدمی کی ذمہ داریاں

بھی اسی قدر ترقی پذیر ہوتی ہیں۔ انسانی شعور کے بالغ ہونے تک گزشتہ زندگی کے راہ و رسم احساس کے سہارے پروان چڑھتے ہیں۔ اگر یہ کڑی درمیان میں نہ ہو تو ساری زنجیر ٹوٹ کر رہ جائے۔

اس سال شاہ جی کی عمر اڑتیس سال کے قریب تھی لیکن تبلیغی اور سیاسی ذمہ داریوں کا بوجھ اس شدت سے اُن پڑا کہ اُن کے احساس نے انہیں جوانی کی سرحدوں سے دور کر دیا تھا۔ حالانکہ یہی دن ایام بہاراں کہلاتے ہیں۔ جو راستہ روزِ ازل سے اُنہوں نے منتخب کیا تھا وہاں بہاروں کا گزر ممکن نہیں تھا۔ اگر ۱۹۲۹ء کے سیاسی اور مذہبی واقعات میں سے شاہ جی کے کردار کو الگ کر لیا جائے، تو اس سال کی تاریخ رنگ و روغن سے تہی معلوم ہوتی ہے۔ یہی سال دراصل شاہ جی کی شہرت کو کابل کی دیواروں سے اس کماری تک لے گیا ورنہ اس سے پیشتر پنجاب، سرحد اور یو۔ پی کے چند اضلاع تک ہی متعارف تھے۔

شاتمِ رسولؐ کا قتلِ عام

ایک طرف سائمن کمیشن کے ارکان ہندوستان کی سیاسی فضا میں ایسی بُو سونگھ رہے تھے جس سے انہیں اپنے لیے سکون میسّر نہیں تھا، دوسری طرف مہاشہ راج پال کے بری ہونے پر فرقہ پرست ہندوؤں نے منظم سازش کے تحت تحریک شاتمِ رسول کو ہندوستان میں ہوا دی جس سے آریہ سماجی ہندوؤں کے حوصلے بڑھے اور اُنہوں نے پیغمبرِ آخرالزماں حضور نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم

کے خلاف پہلے سے زیادہ تحریریں اور تقریریں شروع کر دیں۔

ہندوستان کے سیاسی حالات گو ان حرکات پر تعزیں بھیج رہے تھے۔ مگر ہندو اکثریت کے رہنما مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔ اور ان دنوں اس قسم کی گفتگو کھلم کھلا سننے میں آ رہی تھی۔

۱ ——— جب مسلمانوں کا تعلق عرب سے ہے تو یہ کیوں وہاں نہیں چلے جاتے۔ یہاں ان کا کیا رکھا ہے۔

۲ ——— ہندو جاتی نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ان مُسلوں کو سمندر پار بھیج کر ہی دم لے گی۔

۳ ——— شدھی کا جھنڈا اب دہلی کی جامعہ مسجد پر لہرائے گا۔

۴ ——— (شہنشاہ) اورنگ زیب عالمگیر نے جس تلوار سے یہاں کے ہندوؤں کو بھرشٹ (مسلمان) کیا تھا ہم پرماتما کی سوگند (قسم) کھا کر کہتے ہیں کہ وقت آنے پر اسی تلوار سے مُسلوں کو شدھ (ہندو) کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ!

دوسری طرف مسلمان رہنما چودھری افضل حق، مولانا داؤد غزنوی، مولانا ظفر علی خاں سکھ رہنماؤں کو ناراض کر کے نہرو رپورٹ پر لکھنؤ میں دستخط کر چکے تھے جس کے نتیجے میں پنجاب کا مسلمان ان پر ناراض تھا۔ روزنامہ "سیاست" کے ایڈیٹر مولانا سید حبیب مخالفت میں پیش پیش تھے۔ گو یہ تحریک صرف لاہور تک محدود رہی لیکن صحافت کا مرکز ہونے کے باعث اس کے اثرات سارے ہندوستان میں پھیلے۔ چودھری افضل حق، مولانا ظفر علی خاں، مولانا داؤد غزنوی، شیخ

حسام الدین، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور شاہ جی نے سارے پنجاب میں نہرو رپورٹ کے اثرات سمجھا دیے۔

مسلمانوں کے وہ گروہوں میں یہ تبلیغ جاری تھی کہ مہاتما گاندھی اور پنڈت مدن موہن مالویہ نے ایک مشترکہ اعلان میں کہا:۔

"نہرو رپورٹ کے فیصلے سے سکھوں سے ناانصافی ہوئی ہے۔"

اس اعلان سے سکھوں اور ہندوؤں میں اتحاد کی ایک نئی لہر اٹھی اور سارے ملک میں ہنگامہ ہوا۔ انہی دنوں مسلمان رہنماؤں نے بھی جو نہرو رپورٹ پر دستخط کر آئے تھے، اعلان کیا:۔

"چونکہ مسلمان قوم نہرو رپورٹ کے فارمولے کو قبول نہیں کرتی لہٰذا ہم اس کی ذمہ داری سے دستبردار ہوتے ہیں۔"

گاندھی جی اور مالویہ کے اعلان کے بعد پنجاب کے رہنماؤں کے نہرو رپورٹ سے انکار پر سائمن کمیشن کا منشا پورا ہوا لیکن وہ ہندوستانیوں کا مزید تماشا دیکھنے کے لیے یہاں ٹھہرے رہے۔ ان واقعات سے ایک طرف ہندوستان کے مشترک مقصد کو نقصان پہنچا، دوسری طرف انگریز حکمرانوں کی سیاست گری کامیاب رہی۔

ایسے حالات میں اوّل الذکر گروہ (آریہ سماج) نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے کا فیصلہ پختہ کر لیا۔ اس سلسلے میں وہ ایسی ایسی تحریریں سامنے لائے کہ مسلمانوں کے دل بیٹھ گئے۔ غلامی کا جوا ان کی گردنوں پر کوہ ہمالیہ سے بھی بوجھل معلوم ہونے لگا۔ غم اور غصے کے ملے جلے جذبات سے جو ہندوؤں

کا مقابلہ کرتے رہے۔ آخر انہی دنوں شاہ جی نے عصمت انبیاء کے تحفظ کا فیصلہ کیا۔ درویش اپنی گودڑی سنبھال کر بے سروسامانی کے عالم میں نکل کھڑا ہوا قانون فرنگ اور دولت ہنود اس کے ارادوں میں نہ تو کانٹے بکھیر سکے اور نہ ہی اس کے قدموں کی رفتار مدھم ہو سکی۔

"مسلمانو! میں تمہاری سوئی ہوئی غیرت کو جھنجھوڑنے آیا ہوں آج کفار نے توہین پیغمبر کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انہیں شاید یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ مسلمان مر چکا ہے۔ آؤ اپنی زندگی کا ثبوت دیں۔ عزیز نوجوانو! تمہارے دامن کے سارے داغ صاف ہونے کا وقت آ پہنچا ہے۔ گنبد خضرا کے مکین تمہاری راہ دیکھ رہے ہیں۔ آپ کی آبرو خطرے میں ہے۔ آپ کی عزت پر کتے بھونک رہے ہیں۔ اگر قیامت کے دن محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کے طالب ہو تو پھر نبیؐ کی توہین کرنے والی زبان نہ رہے یا سننے والے کان نہ رہیں۔"

ان خیالات کو شاہ جی نے برصغیر کے مسلمانوں میں بیان کیا۔ وہ شب و روز دیوانوں کی طرح تقریریں کرتے۔ گاؤں، قصبات، شہر اور بستیاں اپنے پاؤں تلے روند ڈالیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے منجمد خون میں حرارت پیدا ہوئی۔ بس پھر تھا، شیر کی طرح بپھرا ہوا مسلمان گستاخ ہندوؤں کی تلاش کرنے لگا۔ نگاہیں جنت کی تلاش میں موت سے ہمکنار ہونے کو بے قرار نظر آنے لگیں۔ دلوں میں شوق شہادت کی لذت محسوس ہونے لگی۔ خرد مسکراتی رہی مگر عشق منزل کی جانب رواں

رواں ہوا۔ اس طرح شاہ جی نے مسلمان نوجوانوں کو ابھار کر ایسے مقام پر لا کھڑا کیا کہ اس کے آگے دو ہی راستے تھے۔ یا تو ہندوستان میں داعیٔ اسلامؐ کی عزت ہمیشہ کے لئے نابود ہو جاتی یا پھر غیر مسلموں میں آئندہ جرأت نہ ہوتی کہ حضورؐ کی ذات گرامی پر زبان طعن دراز کرتے۔

دلوں کے اس فیصلہ کن مقام پر پہنچ کر سب سے پہلے ۶ اپریل ۱۹۲۹ء کو لاہور کے ایک بڑھئی نوجوان غازی علم الدین نے دوپہر کے وقت لاہور میں کتاب "رنگیلا رسول" (نعوذ باللہ) کے ناشر مہاشہ راج پال کو اس کی دکان (ہسپتال روڈ) میں قتل کر دیا۔

اس مقدمہ میں شاہ جی کی خواہش پر علم الدین نے راج پال کے قتل کا اقرار کر لیا تھا۔ حالانکہ وکیلوں کی خواہش تھی کہ علم الدین ایسا نہ کرے۔

ایک خوفناک دھماکہ

غازی علم الدین کی گرفتاری سے ابھی اخبارات کی سرخیاں ماند نہیں پڑی تھیں کہ ۸ اپریل ۱۹۲۹ء کو دہلی سنٹرل اسمبلی میں بم کا ایک خوفناک دھماکہ ہوا جب اس دھوئیں کے بادل چھٹے تو اسمبلی ہال کی گیلری پر دو نوجوان کھڑے تھے۔ سردار بھگت سنگھ اور بنگال کے مسٹر بی۔کے۔ دت۔ اسمبلی ہال کی عمارت کو کافی نقصان پہنچا۔ کھڑکیوں کے شیشے ٹوٹ گئے۔ ممبران حواس باختہ ہو کر کچھ تو فرنیچر کے نیچے پناہ گزین تھے اور باقی ہال چھوڑ کر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

۸ر اپریل ۱۹۲۹ء کو سنٹرل اسمبلی میں جس کی صدارت مسٹر وٹھل بھائی پٹیل کر رہے تھے، پبلک سیفٹی بل پیش ہونے والا تھا کہ یہ حادثہ پیش آیا۔ دونوں ملزم گرفتار کر لیے گئے۔

ان کے بعد دیگرے مذہبی اور سیاسی قسم کے تشدد آمیز واقعات نے ہندوستان کے رہنماؤں اور عوام کو الگ الگ دھڑوں میں تقسیم کر دیا۔ عدم تشدد کی پالیسی کالعدم قرار دی جانے لگی اور عوام جو سیاسی رہنماؤں کی نرم پالیسی سے تنگ آ چکے تھے آتشیں اسلحہ کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔

ہندوستان کے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر ہر انگریز کو جان کے لالے پڑ گئے۔ چنانچہ ۱۳ر اپریل کو سائمن کمیشن کے ارکان حالات کا مزید انتظار کیے بغیر لندن واپس چلے گئے۔

خلیفہ قادیان کا خطبہ

انہی افراتفری کے دنوں خلیفہ قادیان مرزا بشیر الدین محمود کو بھی سوجھی کہ انہوں نے جمعہ کے خطبہ میں غازی علم الدین سے متعلق حسب ذیل خطبہ دیا۔

"وہ خبیث الفطرت اور گندے لوگ جو انبیاء کو گالیاں دیتے ہیں ہرگز اس قابل نہیں کہ ان کی تعریف کی جائے۔ ان کی قوم اگر اپنے اندر دین داری اور اخلاق رکھنے کی مدعی ہے تو اس کا فرض ہے کہ ایسے افعال کی پورے زور کے ساتھ مذمت کرے۔ اسی طرح اس قوم کا بھی کہ جو ایسے آدمی قتل کرتے ہیں"

خواہ انبیاء کی توہین کی وجہ سے ہی وہ ایسا کریں ، فرض ہے کہ
پورے زور کے ساتھ ایسے لوگوں کو دبایا جائے اور اُن سے
اظہار برأت کرے ۔ انبیاء کی عزت کی حفاظت قانون شکنی کے
ذریعہ نہیں ہو سکتی ۔ وہ نبی بھی کیسا نبی ہے جس کی عزت کو
بچانے کے لیے خون سے ہاتھ رنگنے پڑیں جس کو بچانے
کے لیے اپنا دین تباہ کرنا پڑے ۔ یہ سمجھنا کہ محمد رسول اللہ
(صلے اللہ علیہ وسلم) کی عزت کے لیئے قتل کرنا جائز ہے ،
سخت نادانی ہے ۔ وہ لوگ جو قانون کو ہاتھ میں لیتے ہیں وہ
بھی مجرم ہیں اور اپنی قوم کے دشمن ہیں اور جو اُن کی پیٹھ ٹھونکتا
ہے وہ بھی قوم کا دشمن ہے ۔ میرے نزدیک تو اگر یہی شخص راجپال
کا قاتل ہے جو گرفتار ہوا ہے تو اُس کا سب سے بڑا خیر خواہ
وہی ہو سکتا ہے جو اُس کے پاس جائے اور اُسے سمجھائے کہ
دُنیوی سزا تو اب تمہیں ملے گی ہی لیکن قبل اس کے کہ وہ ملے تمہیں
چاہیئے کہ خدا سے صلح کر لو ۔ اُس کی خیر خواہی اسی میں ہے کہ
اُسے بتایا جائے کہ تم سے غلطی ہوئی ہے ۔"

(۱۹ اپریل ۱۹۲۹ء اخبار الفضل قادیان)

ان دنوں جب کہ مسلمان نوجوان تحریک شاتم رسول کی بیخ کنی کے لیے کفن بردوش ہو کر میدان عمل میں آ چکا تھا خلیفہ قادیان کا مندرجہ بالا بیان اُن نوجوانوں کی پیٹھ میں چھرا گھونپنے کے مترادف تھا جو توہین رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی

باقاعدہ سازش کو بے نقاب اور ختم کرنا چاہتے تھے۔

اپریل کا پورا مہینہ اسی ہماہمی میں گزرا اور مئی کے شروع میں غازی علم الدین کا مقدمہ زیر دفعہ ۳۰۲ عدالت میں پیش ہوا۔ استغاثہ کی ابتدائی شہادتوں کے بعد غازی علم الدین نے اپنے بیان میں کہا،

"میں اس عدالت میں اپنے جرم کا اقرار کرتا ہوں۔ میں نے کتاب رنگیلا رسول کے ناشر راج پال کو قتل کیا ہے۔ اس لیے کہ کتاب مذکور سے میرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سخت توہین ہوئی تھی۔ راج پال کو اپنے اس فعل پر نہ ندامت تھی اور نہ افسوس!
اگر میں اس مقدمے میں بری کر دیا گیا تو میں توہین رسول کرنے والے کو پھر قتل کروں گا۔"

اس اقبال جرم کے بعد ۲۲ مئی ۱۹۲۹ء کو سیشن جج کی عدالت سے غازی علم الدین کو سزائے موت کا حکم ہوا۔

۱۵ جولائی کو ہائی کورٹ نے بھی اپیل خارج کر دی۔ پھر پریوی کونسل نے بھی فیصلہ بحال رکھا۔ آخر ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو میانوالی جیل میں غازی علم الدین کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

مسلمانان لاہور کے مطالبے پر ۷ نومبر کو لاش لاہور لائی گئی اور لاکھوں مسلمانوں نے نماز جنازہ کے بعد اشکبار آنکھوں سے عاشق رسولؐ کو قبرستان میانی صاحب میں سپرد خاک کیا۔

شردھانند کے بعد راج پال کے قتل نے گستاخ زبانوں کو قدرے لگام دی۔

مگر کفر کے منظم فیصلے میں کوئی لچک نہ آئی۔ غازی علم الدین کی شہادت نے قتل کے واقعات کو ہندوستان بھر میں مسلسل ہوا دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قصور میں محمد صادق نے پالے شاہ کو، کلکتہ میں محمد عبداللہ اور عبدالعزیز نے لاہور سے جا کر کھبولارام کو، کراچی میں عبدالقیوم نے نتھورام کو، جہلم میں غلام محمد نے اُپل سنگھ کو، چکوال میں (نام معلوم نہ ہو سکا) نے پلول کے سکنہ ڈاکٹر کو، اور کیمبل پور میں عبدالمنان نے پیارے لال کو قتل کیا۔

مندرجہ بالا نوجوانوں کو سزائے موت ہوئی اور آخرالذکر عبدالمنان کو سیشن جج مسٹر ڈی، جی، کھوسلہ نے سات سال کی سزا دی اور فیصلے میں لکھا کہ کوئی مسلمان توہین رسول برداشت نہیں کر سکتا۔

تحریک شاتم رسول میں قتال کا یہ سلسلہ ۱۹۳۴ء تک جاری رہا۔ ان مسلسل اور پیہم واقعات نے کفر کو اپنے فیصلوں پر نظر ثانی کے لیے مجبور کر دیا۔ شاہ جی کی یہ تحریک کہ "توہین رسول کرنے والی زبان نہ رہے یا توہین رسول سننے والے کان نہ رہیں" ۱۹۲۹ء سے ۱۹۳۴ء تک گاہے گاہے اپنا کام کرتی رہی۔ یہاں تک کہ گستاخ زبانیں ہمیشہ کے لیے خاموش کرا دی گئیں۔ وہ پھانسی کے رستے اور دار کے تختے چوم لینے کے قابل ہیں جن کے ذریعے اُن نوجوانوں کو موت کی سزا دی گئی جنہوں نے شاتم رسول کے ناپاک جسم کو ہمیشہ کے لیے خاک میں ملا کر اپنے لیے شہادت کا مقام حاصل کیا۔ ع

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ڈیرہ غازی خان

تحریک شاتم رسول اندر اندر اپنا کام کر رہی تھی کہ شاہ جی کو ڈیرہ غازی خان جانے کا اتفاق ہوا۔ یہ ۱۹۲۹ء کے وسط کی بات ہے۔ شاہ جی اس علاقہ کے اندرونی حالات سے ناواقف اور بے خبر تھے۔ غیر ملکی اقتدار کے باعث اس ضلع کی غریب مسلم آبادی ایک طرف تمن داروں اور دوسری طرف ہندو ساہوکاروں کے جنگل میں پھنسی ہوئی تھی۔

سردار احمد خاں لغاری (مرحوم) اس ضلع کے مشہور زمیندار اور اہلِ دل مسلمان تھے۔ اللہ کا دیا بہت کچھ تھا لیکن اپنے ضلع کے مذہبی حالات سے غیر مطمئن تھے۔ جب انہیں شاہ جی کی آمد کا علم ہوا تو اپنے گھر (راجن پور ڈیرہ غازی خان) سے چند مخلص نوجوانوں کا ایک وفد لے کر شاہ جی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا۔

۱۔۔۔۔ اس ضلع کی دور افتادہ بستیوں میں رواج پڑ چکا ہے کہ غریب مسلمان اپنی دینوی ضرورتوں کے لئے ہندو ساہوکار کے پاس معمولی رقم کے عوض اپنی بیٹیاں رہن رکھتا ہے اور قرض مع سود کی واپسی تک لڑکی ہندو ساہوکار کے پاس رہتی ہے اور اکثر ایسا ہوا کہ وہاں اس کے ہاں اولاد بھی پیدا ہوئی۔

۲۔۔۔۔ ڈیرہ غازی خاں کے مسلمانوں نے ۱۸۶۲ء کے بندوبست میں فرنگی عدالتوں میں اپنے آپ کو قرآن کریم کی بجائے رواج کا پابند لکھوایا جس کے باعث انہوں نے بیٹیوں کو جائداد سے محروم قرار دیا ہے جب کہ قرآن کریم

سورۃ نساء میں بیٹی کو بھی باپ کی جائداد کا وارث قرار دیتا ہے۔

۳ــــــ ضلع کے تمن داروں نے اپنی تفریح طبع کے لیے کتے اور سوٗر پال رکھے ہیں۔ جب یہ لوگ موج میں آتے ہیں تو ان جانوروں کے درمیان لڑائی تماشہ دیکھتے ہیں۔ اگر کتا جیت جائے تو اس کا جلوس نکالتے ہیں اور سوٗر کو مار کر اُس کے گوشت میں بہترین قسم کے بیگمی چاول ڈال کر پلاؤ پکا کر کتے کو کھلاتے ہیں۔

(شاید یہی وجہ ہے کہ اس علاقے میں ایک مدّت سے اچھی قسم کے چاول کی پیداوار ناپید ہو چکی ہے)

مندرجہ بالا واقعات کے بعد سردار احمد خان پتافی نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دل کے ساتھ زبان اور نظر بصیرت عطا کی ہے۔ اگر آپ نے اس ضلع کی ناگفتہ بہ حالت کی طرف توجہ نہ کی تو عنداللہ آپ مجرم ہوں گے۔ میری دولت اس کام کے لیے آپ کی پوری طرح معاون ہو گی۔

شاہ جی حالات سن کر زار و قطار رونے لگے اور سردار احمد خان سے وعدہ کیا کہ میں جب تک زندہ رہوں گا، اس علاقہ کے مسلمانوں کی اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ چنانچہ شاہ جی ہر سال جون اور جولائی کے تپتے ہوئے موسم میں جب کہ یہاں کا کسان اور مزدور پیشہ طبقہ فصل کی کٹائی اور چھائی سے فارغ ہوتا تھا، اس ضلع میں تشریف لے جاتے۔ شہری آبادیوں سے دور آبادکاروں کی بستیوں میں دوپہر کے وقت ان کی زبان میں خطاب کرتے۔ دس دس اور بیس بیس کوس سے آئے ہوئے دیہاتی شاہ جی کی باتیں سنتے۔ گھنٹوں

خطاب کرنے کے بعد شاہ جی اُن سے سوال کرتے ۔

"بیلندا کوئی گال سمجھ گئی ہا؟" (میری کوئی بات آپ کی سمجھ میں آئی ہے؟)

اگر جلسے میں سے ایک دیہاتی نے بھی کہہ دیا،

"سائیں کوئی" — یعنی کوئی نہیں؛

تو شاہ جی پھر اُس ایک دیہاتی کو سمجھانے کے لیے سارے مجمع سے اُسی طرح گھنٹوں خطاب کرتے ۔ جب تک پورا مجمع بات سمجھ نہ لیتا تقریر ختم نہ کرتے ۔

اس طرح زندگی کے تیس برس مسلسل ڈیرہ غازی خان کے عوام کو مختلف اوقات میں خطاب کیا ۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمن داروں نے کتّے اور سؤروں کی پرورش سے توبہ کر لی ۔ اس علاقہ کے وڈیروں سے روپیہ لے کر غریب مسلمان لڑکیوں کو ہندو ساہوکاروں کے چنگل سے نجات دلائی ۔ شہری اور دیہاتی مسلمان کو مجبور کیا کہ شریعت کی رُو سے اپنی جائداد میں سے لڑکیوں کو بھی حصّہ دیں ۔ قانون تو تبدیل نہ ہو سکا لیکن ڈیرہ غازی خان اور ضلع مظفر گڑھ کے اکثر لوگوں نے شریعت کے اس قانون کی پیروی شروع کر دی ۔ شاہ جی جن دنوں اس علاقے کا دورہ کرتے ، گرمی کی شدت سے ان کے تمام جسم پر پھوڑے پھنسیاں نکل آتیں اس کے باوجود دور دراز ایسی بے آب و گیاہ بستیوں میں جاتے جہاں کے لوگ پانی کی قلت کی وجہ سے مجبور ہو کر جوہڑ کا پانی پیتے اور کھانے کے لیے انہیں پیاز ، اچار یا مسور کی دال میسّر تھی ۔ جن گھروں میں گوشت یا دوسری بہتر

خوراک میسر آ سکتی تھی، شاہ جی نے اُن گھرانوں سے یہ کہہ کر ہمیشہ اجتناب کیا،
"میں جن لوگوں کو سمجھانے آیا ہوں اگر اُن کے ساتھ گھل مل نہ جاؤں
تو اُن پر میری بات کا اثر نہیں ہو سکتا۔"
حالانکہ یہ ضلع پیر پرستی میں پنجاب کے تمام ضلعوں پر سبقت رکھتا ہے
اور شاہ جی چاہتے تو یہاں کی عزت اور عوام کی سادگی سے پورا فائدہ اٹھا سکتے
تھے۔ علاقے کے تن دار انہیں سونے کے برابر وزن کرتے لیکن وہ دیہاتیوں
کے ساتھ کھاتے پیتے اور اُنہی کے گھروں میں ٹھہرتے، جہاں ایک طرف ڈھور
ڈنگر بندھے ہوتے اور تمام کمرہ گوبر کی بدبو سے اٹا ہوتا مگر شاہ جی کی پیشانی
پر کبھی شکن نہ پڑتی۔ تیس برس اسی جدوجہد میں گزرے جس نے اسلام اور انسانیت
کے حق میں بہتر نتائج پیدا کیے۔

ایک واقعہ

ڈیرہ غازی خاں سے چالیس میل دور حاجی پورہ نامی گاؤں میں ایک
بزرگ کی خانقاہ پر عُرس کے دنوں لوگ بُرے افعال کے مرتکب ہونے تھے۔
اتفاقاً اسی سال شاہ جی کا گزر ڈیرہ غازی خان سے ہوا، تو آپ نے مذکورہ
گاؤں میں جانے کا فیصلہ کیا۔ اس ارادے کی اطلاع جب ضلع کے انگریز ڈپٹی
کمشنر مسٹر ایل اے اگل کو ہوئی تو اُس نے شاہ جی پر پابندی عائد کردی کہ وہ
حاجی پورہ نہیں جا سکتے۔ شاہ جی نے ڈپٹی کمشنر کا یہ حکم مان لیا لیکن شہر میں اپنی
تقریر کی منادی کرادی اور رات جلسے میں ڈپٹی کمشنر بھی مع اپنی بیگم کے شاہ جی

کی تقریر سننے آیا۔ شاہ جی کو اس کا پتہ چل گیا۔ دورانِ تقریر ڈپٹی کمشنر کو خطاب کرتے ہوئے کہا:

"مسٹر ڈپٹی کمشنر! اگر آپ نے مجھے حاجی پورہ جانے سے روک دیا۔ اگر میں وہاں جاتا تو لوگوں کو بھنگ، چرس اور اسی قسم کی دوسری منشیات سے منع کرتا کہ بزرگوں کے مزارات فاتحہ خوانی کے لئے ہوتے ہیں اس قسم کی بُری چیزوں کے لیے نہیں ہوتے خیر اب میں تمہیں اسلام سمجھاتا ہوں۔ اگر تم مع اپنی بیوی کے مسلمان نہ ہو جاؤ تو میرا نام بخاری نہیں۔"

یہ سُن کر ڈپٹی کمشنر فوراً جلسہ گاہ سے چلا گیا۔

ہتھکڑی

۱۹۳۹ء میں شاہ جی ڈیرہ غازی خان گئے تو حلقۂ احباب سے پوچھا کہ یہاں مستری دوست محمد لوہار کون ہیں؟ میں اُنہیں ملنا چاہتا ہوں۔ دوستوں نے وجہ پوچھی تو کہا، اُن کے ہاتھ کی بنی ہوئی ہتھکڑی نے مجھے ہمیشہ آرام پہنچایا اور وہ میرے ہاتھ میں پوری اُترتی ہے۔ جنوب مغربی پنجاب پولیس کے لیے ہمیشہ مستری دوست محمد نے ہتھکڑیاں مہیا کی ہیں اور ہر ہتھکڑی پر انگریزی کے حروف ایم۔ ڈی، ایم کندہ ہوتے ہیں جنہیں پڑھ کر شاہ جی نے انہیں ملنے کی خواہش کی۔ چنانچہ بڑی مشکل سے مستری صاحب کو تلاش کیا گیا۔ شاہ جی اُن سے ملے تو وہ بہت خوش ہوئے اور شاہ جی ہتھکڑی کے موضوع پر اُن سے

گھنٹوں گفتگو کرتے رہے۔

"ہتھکڑی کے لئے کس قسم کا لوہا استعمال ہوتا ہے؟ اس کے رانچے کیسے تیار کیے جاتے ہیں؟ اس پر کوئی سرکاری پابندی ہے یا نہیں؟ بعض مجرم پولیس کی موجودگی میں ہتھکڑی اتار کر فرار ہو جاتے ہیں، یہ کیسے؟"

ان سوالات میں شاہ جی نے اس قسم کا مزاح پیدا کیا کہ تمام محفل کشتِ زعفران بنی رہی۔

ملتان کا محرم

سانحۂ کربلا انسانیت کے دامن پر اس قدر عظیم داغ ہے کہ دنیائے فرات، دجلہ اور نیل مل کر بھی اس داغ کو دھونا چاہیں تو اپنا سا منہ لے کر رہ جائیں اسلام نے جو اصول وضع کیے تھے خانوادۂ نبوت نے اپنے خون سے ان اصولوں کی پاسداری اور قیامت تک کے لئے ضابطۂ حیات میں ایسا سنگِ میل نصب کیا کہ آنے والا ہر مسافر اسی پگڈنڈی پر گامزن رہ کر منزلِ حیات کا نشان پا سکتا ہے۔

صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ بنی نوع انسان نے اس جانکاہ حادثہ کو شدید رنج و غم سے محسوس کیا لیکن دو قسم کے عوام نے واقعہ کربلا کو بظاہر زیادہ محسوس کیا۔ اول وہ جنہیں احکام شریعت سے ناآشنائی رہی اور اس طرح سے وہ نمائشی جذبات کا مظاہرہ کرنے میں زیادہ کامیاب ہو گئے۔ دوسرے وہ جنہوں نے امام حسین علیہ السلام کی قربانی کو بطور پیشہ کے اپنایا یا محرم الحرام کے دنوں میں،

تعزیہ داری میں جو لوگ نالہ وشیون کے طریقے اختیار کرتے ہیں ان میں بعض ایسے افراد بھی شامل ہوتے ہیں جن کے پیش نظر مندرجہ بالا مقصد کے سوا دوسرا کوئی اصول کارفرما نہیں ہوتا۔

سال ۱۹۲۹ء کی آخری ششماہی میں جب شاہ جی ملتان گئے تو محرم کی رسم تعزیہ داری دیکھ کر بے چین ہو گئے۔ تیرہ روز تک شہر کے مختلف محلوں میں اس رسم کے خلاف تقریریں کیں۔ جس کی بنا پر مخصوص عقائد رکھنے والے لوگ اس قدر مشتعل ہوئے کہ شاہ جی کے خلاف شہر میں باقاعدہ محاذ قائم کر لیا گیا اور اس قدر اشتعال پھیلایا کہ آخری دن جب "عام خاص باغ" میں جلسے کا اعلان ہوا تو شہر کے خان بہادر، آنریری مجسٹریٹ اور سرکاری قسم کے دوسرے لوگوں نے انگریز ڈپٹی کمشنر سے کہا کہ اگر آج عطاء اللہ شاہ نے ملتان میں تقریر کی تو وہ قتل ہو جائے گا۔ تو اس پر ڈپٹی کمشنر نے خان بہادر سید حسن بخش گردیزی آنریری مجسٹریٹ سے کہا،

"اگر تمہارے اس اشارے کے بعد عطاء اللہ شاہ قتل ہو گیا تو میں تمہیں بطور مجرم کے گرفتار کر لوں گا۔"

ملتان کی فضا شیعہ سنی منافرت سے گدلی ہو چکی تھی اور واقعی اُس دن یہ خوف تھا کہ شاہ جی قتل کر دیئے جائیں گے۔ جماعتی دوستوں نے بھی شاہ جی کی خدمت میں درخواست کی کہ آج شہر میں آپ کے خلاف حالات اس قدر زہریلے کر دیئے گئے ہیں کہ آپ کی جان خطرے میں ہے۔ لہٰذا آپ اگر آج جلسہ میں کوئی ایسی بات نہ کہیں تو بہتر ہے۔ اس پر شاہ جی نے کہا:۔

"میرا جواب وہی ہے جو حضرت ابو بکر صدیق رضؓ نے زکوٰۃ کے معاملہ
میں حضرت عمر فاروق رضؓ کو دیا تھا۔ اگر تم سب ڈرتے ہو تو میں
آج اکیلا جلسے میں جاؤں گا اور وہی بات کہوں گا جو میرا ضمیر
کہے گا۔"

ملتان کی عوامی تاریخ میں اس قدر اجتماع دوبارہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ پولیس جلسہ کے چاروں طرف ہر طرح کے کیل کانٹوں سے لیس کھڑی ہے۔ تمام فرقے اپنی اپنی حفاظت کے لئے تیار ہیں۔ دلوں میں جذبات، آنکھوں میں خون، سینوں میں انتقام کے شعلے موجزن ہیں، کہ شاہ جی اپنے حلقہ احباب کی معیّت میں جلسہ گاہ پہنچے۔

دن کی روشنی مستقبل قریب میں ایک بار کہ ایمان کے امتحان کا پھر سے تماشہ دیکھنا چاہتی ہے۔ شاہ جی نے اسٹیج پر آتے ہی کلام پاک کی تلاوت شروع کی۔ قریباً پون گھنٹہ قرأت کے بعد داستان کربلا اس انداز سے بیان کی کہ سارا مجمع آہ و فغاں کرنے لگا۔ جیسے جیسے دھوپ کی تمازت بڑھتی جاتی، شاہ جی کا زورِ بیان نکھرتا جا رہا تھا۔ دوران تقریر آپ نے کہا،

"ان پاک شخصیتوں کے دن ضرور مناؤ! جو قومیں اپنے آباؤاجداد
کے نشان چھوڑ دیتی ہیں، اُن کی تاریخ بے نشان ہو کر مٹ
جاتی ہے۔"

شیعہ حضرات سے خطاب کرتے ہوئے کہا،

"کون بدبخت تمہیں اپنے عقیدے سے منع کرتا ہے لیکن میرے

عزیزو! میں تو صرف یہ کہتا ہوں کہ امام حسینؓ، فاطمۃ الزہرہؓ، بی بی زینبؓ اور معصوم سکینہؓ کے ماتم کے لئے تمہیں بازاری عورتیں ہی ملتی ہیں؟ اس طاہر خاندان کے پاک اور صاف لباس پر گندی نالی کے چھینٹے اڑاتے ہو؟ تم کیسے حسینؓ کے نام لیوا ہو؟ اپنے ہاتھ سینوں پر نہیں اللہ کے آگے پھیلاؤ کہ وہ ہمیں اُن پاک رُوحوں کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔ میں تو تمہیں نیکی کی بات سنا رہا ہوں اور تم ہو کہ میرے قتل کا سامان کر رہے ہو۔ اگر واقعی عطا اللہ شاہ قتل کے قابل ہے تو یہ سینہ حاضر ہے؟"

اس موقع پر شاہ جی نے جذبات سے اپنا گریبان چاک کر لیا۔ بس پھر کیا تھا، سارا مجمع بے اختیار چیخیں مارنے لگا۔ اور شاہ جی بار بار کہہ رہے تھے۔

"نکالو! اپنے اپنے خنجر! سیّد کا سینہ حاضر ہے۔ تم نے پہلے بھی ایک سیّد مسافر کو قتل کیا تھا، آج پھر اُس سنت کو تازہ کرو! میں سیّد بھی ہوں اور مسافر بھی!!"

شاہ جی اس وقت قرآن کریم کی بار بار تلاوت کر رہے تھے۔ آخر جب سارا جلسہ اپنے آنسو ختم کر چکا تو آپ نے جلسہ ختم کرنے کا اعلان کر دیا۔

جلسہ کے اختتام پر خان بہادر چودھری ناظر خان ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ملتان اور حاجی رانجھا خان مال آفیسر ملتان نے آگے بڑھ کر شاہ جی کے گھٹنوں کو چھُوا اور کہا،

"آج شہر کا امن آپ کے ایک ایک بول کا محتاج تھا۔ اللہ آپ کو جزائے

شکریہ ادا کرے کہ آپ نے امن بحال رکھنے میں ہماری امداد کی۔"

اس جلسہ کے بعد کئی سال تک تعزیہ داری کے جلوس میں "امس بازار" کا سلسلہ بند رہا۔

شاردا ایکٹ

عیسائی قومیں عالمِ اسلام کے خلاف ابتدائے آفرینش سے عجیب وغریب حربے استعمال کرتی آئی ہیں۔ کہیں اپنی اکثریت کے سہارے اور کہیں حکمرانی کے زور پر۔ لیکن اسلام باوجود مظلوم ہونے کے صرف اپنی حقانیت کی بنا پر پروان چڑھتا رہا۔

متحدہ ہندوستان میں عیسائی حکمرانوں نے نئے نئے حیلے بہانوں سے اسلام اور مسلمانوں کو دوسری اقوام کی نظر میں اپنی غلامی کے زور پر رسوا کرنے میں ایسی حرکتیں کیں کہ جن کی وجہ سے خطرہ ہونے لگا تھا کہ مسلمان اپنی قدریں مٹا کر کفر کی آغوش میں اماں ڈھونڈنے جا رہے ہیں، لیکن دیوبند اور علی گڑھ کالج سے فارغ التحصیل رہنماؤں نے فرنگی حکمرانوں کی قلبی کیفیت کا اندازہ کرتے ہوئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح سامنے آکر حکمران جماعت کے تمام ہتھیار بیکار کر دیئے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد تو اکثر قانون ہندوستان میں ایسے وضع کیے گئے جن کی براہ راست زد اسلام پر پڑتی رہی۔ لیکن غیر ملکی نظامِ حکومت ان سے بیگانہ رہ کر اپنا کام کرتا رہا۔

۲۳ ستمبر ۱۹۲۹ء کو دہلی سنٹرل اسمبلی کے ہندو ممبر مسٹر ہربلاس شاردا نے

ایک مسودۂ قانون پیش کیا جو آگے چل کر شاردا بل اور شاردا ایکٹ کے نام سے مشہور ہوا۔

شاردا بل بظاہر ہندو سوسائٹی کی اصلاح سے متعلق تھا لیکن اس کے پس منظر میں ایک ایسا اوچھا وار تھا کہ جس کی ضرب سے احکام شریعت براہِ راست متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ بل پر بحث سے قبل یہ سوال سامنے آیا کہ یہ بل صرف ہندو عوام تک رہے گا یا ہندوستان کے تمام مذاہب اس سے متاثر ہوں گے۔ اور اکثر مسلمان ارکان نے بغیر علماء کے مشورہ کے اس بل کی تائید کر دی۔ ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء کو یہ بل پاس کر دیا گیا نیز یکم اپریل ۱۹۳۰ء سے اس پر عملدرآمد ہونا منظور کیا گیا۔

جمعیتہ العلمائے ہند نے قرآن کریم کے واضح ارشاد کی روشنی میں شاردا بل کو مداخلت فی الدین قرار دے کر اس کے نفاذ سے پیشتر اس قانون کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ انبالہ سے پرلی طرف مولانا احمد سعید اور پنجاب سے سرحد تک کے اضلاع شاہ جی کے سپرد کیے گئے۔

۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء سے یکم اپریل ۱۹۳۰ء تک دونوں رہنماؤں نے اپنی اپنی ذمہ داریوں کے پیش نظر ہزاروں نابالغ بچوں کے نکاح پڑھا کر اور عوام کو اس کی ترغیب دے کر انگریز کے اس قانون کو ہمیشہ کے لئے دفن کر دیا۔ آج بھی پنجاب اور سرحد میں سینکڑوں گھرانے ایسے ملیں گے جنہیں شاہ جی نے اُس زمانے میں آباد کیا تھا۔

شاردا ایکٹ جس کا محرک بظاہر غیر مسلم تھا۔ جس کی رُو سے اٹھارہ سال

سے کم عمر لڑکی اور اکیس سال سے کم عمر لڑکے کی شادی قانوناً جرم قرار دے دی گئی تھی عیسائی حکومت کی قانونی قوت نے اسے ایسی زندگی بخشی کہ اگر اس پر عمل درآمد ہوتا تو اسلام کے اصول بُری طرح مجروح ہوتے۔

سرگودھا، میانوالی، گجرات، جہلم، پنجاب میں ایسے اضلاع ہیں کہ انگریزی عملداری میں یہ علاقے فوجی مرکز سمجھے جاتے تھے۔ ان پر کسی انگریزی قانون کا عاجلانہ اطلاق مشکل نہیں تھا، مگر شاہ جی نے شب و روز کی تقریروں سے ان علاقوں میں شاردا ایکٹ کو ناکارہ بنا دیا۔ ہر فرد نے شاہ جی کی آواز پر لبیک کہا اور شاردا ایکٹ کی دھجیاں بکھیر دیں۔

مجلسِ احرار کی صدارت

نہرو رپورٹ کی ناکامی کے باعث ہندوستان کے سیاسی افق پر واقعات کے نئے بادل اُمڈ آئے۔ ہواؤں کا رُخ اس انداز سے تبدیل ہوا کہ سارا ہندوستان تلخی محسوس کرنے لگا۔ سائمن کمیشن کی ناکام واپسی کے بعد گاندھی جی نے انگریزوں کو چیلنج کیا کہ اگر ۱۹۲۹ء کے آخر تک نہرو رپورٹ کے فارمولا کو منظور نہ کیا گیا، اور اسے سرکاری حیثیت نہ دی گئی تو میں عدم تشدد کی لڑائی شروع کر دوں گا۔ برطانوی حکومت گاندھی جی کی اس تجویز کو ہواؤں میں اُڑا کر مستقبل کا انتظار کرنے لگی۔ انگریزی حکومت کی اس بے اعتنائی کے سبب دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں دریائے راوی کے کنارے آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر گاندھی جی نے نہرو رپورٹ کو دریائے راوی کی لہروں کے سپرد کر دیا۔

۱۵۱

مسلمان رہنماؤں نے گاندھی جی اور کانگریس کی اس حرکت کو سکھوں کی بے جا حمایت اور مسلمانوں سے ناانصافی قرار دے کر اپنی علیحدہ تنظیم کا فیصلہ کیا چنانچہ مولانا ابوالکلام آزاد کی تجویز پر نیشنلسٹ مسلمانوں نے آل انڈیا کانگریس کے پنڈال میں چوہدری افضل حق کی زیر صدارت ایک اجلاس منعقد کیا جس میں شاہ جی کے علاوہ مولانا ظفر علی خان، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، شیخ حسام الدین، خواجہ عبدالرحمان غازی، مولانا مظہر علی اظہر اور دوسرے مسلمان رہنما شامل ہوئے اس اجلاس میں مجلس احرار کی بنیاد رکھی گئی اور شاہ جی کو پہلا صدر منتخب کیا گیا۔

نمکین ستیہ گرہ

مجلس احرار کی بنیاد کے ساتھ ہی کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس میں مکمل آزادی کی قرارداد منظور کر کے اقوام ہند کو آزادی وطن کے لیئے ایثار و قربانی کی نئی دعوت دی مسلمان جس نے سلطان حیدر علی ٹیپوؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ رانی آف جھانسی اور ۱۸۵۷ء جیسی تحریکات میں فرنگی سامراج کے خلاف جہادِ آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا، کانگریس کی اس دعوت کو نظرانداز کرنا مناسب نہ سمجھ کر قبول کر لیا۔ مجلس احرار کے رہنماؤں نے بھی نئی عمارت کی تعمیر کو عارضی طور پر روک دیا اور سب کے سب کانگریس کے ہمنوا ہو کر آزادی کی نئی جدوجہد میں شامل ہو گئے۔

۱۹۲۹ء کے ڈوبتے ہوئے آفتاب کی آخری شعاعوں نے شفق کی سرخیوں میں ایسا رنگ بھرا کہ ۱۹۳۰ء کا سال غلام ہندوستان کے لیئے مصائب

د آلام کی بے شمار آزمائشیں اپنے ساتھ لایا۔ شدھی اور سنگٹھن، تحریک شاتم رسول، شاردا ایکٹ ایسی فرقہ وارانہ تحریکات ہنوز ہندوستان میں اپنے کام میں مصروف تھیں۔ شاہ جی اُن کے فیصلوں سے فارغ نہیں ہوئے تھے کہ مجلس احرار کی صدارت نے شاہ جی کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کر دیا۔ جماعت نے جنگ آزادی میں کانگریس کے دوش بدوش لڑائی لڑنے کا فیصلہ کر کے شاہ جی کو مزید اُلجھا دیا۔

غلام ہندی غیر ملکی آقاؤں سے آزاد ہونے کے لیے زندگی کا آخری اثاثہ لے کر میدان کارزار میں اپنی صفیں درست کرنے لگے۔ کفن بردوش مجاہد شہادت کی نَے پر خون کے گیت چھیڑ کر شہادت گاہِ اُلفت کی طرف رواں دواں ہوئے جیل خانے، ہتھکڑیاں، پھانسی کے تختے ہشیں گئیں، بیدزنی، لاٹھی چارج، پولیس فوج، انگریزی سامراج اپنے ظلم وجود کی یہ ساری پونجی جمع کرنے میں مصروف ہو گیا۔ یہ وہی دن تھے جب لاہور میں سردار بھگت سنگھ اور مسٹر بی کے دت کو موت اور عبور دریائے شور کی سزائیں سنائی جا چکی تھیں۔ اور پورا ملک انگریزی حکومت کے خلاف اپنی ناراضگی کا اظہار کر رہا تھا۔ مہاتما گاندھی نے ۱۲ مارچ ۱۹۳۰ء کو ڈانڈی ضلع گجرات (کاٹھیاواڑ) میں نمک بنا کر انگریزی قانون کی خلاف ورزی کرنے کا اعلان کیا اور بہتر آدمیوں کا جتھہ لے کر اپنے مرکز سے روانہ ہوئے اور گرفتار کر لیے گئے۔ اس گرفتاری کے ساتھ ہی سارے ہندوستان میں نمک ستیہ گرہ کی تحریک شروع ہو گئی۔

امیرِ شریعت کا اعزاز

پیشتر ازیں تحریر کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی اور مذہبی ابتری نے ملک کا امن و سکون تہہ و بالا کر دیا تھا اور یہ خانہ ویرانی اسلام کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں تھی۔ ہندو کے طرزِ عمل نے مسلمانوں کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اپنے لیے شہادت کی صورت تلاش کریں تا کہ ہندوستان میں خاص کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو محفوظ رہ سکے۔ شدھی و سنگھٹن، شاردا ایکٹ، تحریک شاتمِ رسول کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے کمزور اور قلیل تعداد مسلمانوں کو اس قدر ہراساں کر دیا تھا کہ علمائے کرام کی اپنی ذمہ داریاں بھی مخدوش نظر آنے لگی تھیں۔ خطیبِ شہر کی اذان بے اثر ہو رہی تھی۔ صحنِ حرم اور مسجد کے مینار اپنی رونق کی تلاش میں سرگرداں تھے کہ مارچ ۱۹۲۷ء کے آخری ہفتے میں لاہور میں انجمن خدام الدین کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا جس کی صدارت دیوبند کے شیخ الحدیث حضرت علامہ مولانا انور شاہ صاحب کاشمیری نے فرمائی۔ وقت اور حالات کی موجودگی میں علمائے ہندوستان کا یہ تاریخی اجتماع تھا۔ دوسرے علماء کے ساتھ شاہ جی بھی اس جلسے میں شریک ہوئے۔ ہزاروں کا اجتماع تھا صدارتی تقریر ہو رہی تھی کہ شاہ جی جلسہ گاہ میں پہنچے۔ حضرت انور شاہ صاحب فرما رہے تھے:۔

"دین کی قدریں بگڑ رہی ہیں۔ کفر چاروں طرف سے یلغار کر چکا ہے اس وقت مسلمانوں کو اپنے لئے ایک امیر کا انتخاب کرنا چاہیئے میں اس کے لیئے سید عطا اللہ شاہ بخاری کو منتخب کرتا ہوں۔ وہ نیک بھی ہیں اور بہادر بھی۔ اس وقت تک انہوں نے فتنہ شاتمِ رسول اور

ختارداایکٹ کے سلسلے میں جس جرأت اور دلیری سے دین کی خدمات
انجام دی ہیں، آئندہ بھی اُن سے ایسی ہی توقع ہے۔"
یہ کہہ کر حضرت انور شاہ صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ شاہ جی کی طرف
بڑھائے اور شاہ جی نے اپنے دونوں ہاتھ حضرت انور شاہ صاحب کے ہاتھوں
میں دے کر فرمایا:۔
"آپ یہ نہ سمجھیں کہ حضرت نے میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے بلکہ
حضرت نے مجھے اپنی غلامی میں قبول فرما لیا ہے۔"
یہ جملے کہہ کر شاہ جی زار وقطار رونے لگے اور اُن کا سارا جسم کانپنے لگا۔ اس
کے بعد باقی علماء نے جن کی تعداد اُس وقت پانچ سو کے قریب تھی شاہ جی کے
ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی،
مولانا احمد علی لاہوری سرِفہرست تھے۔
حصولِ زندگی میں مذہب ایسے جذبات کا مجموعہ ہے جس کا عقلِ انسانی احاطہ
نہیں کر سکتی اور نہ ہی فکر وتدبر میں اُن کا وزن کیا جا سکتا ہے۔ جنونِ شوق ہی البتہ
اس کسک کو محسوس کرتا ہے۔ پھر نمرود کی آگ ہو یا دریائے نیل کی موجیں وہ ان تمام
خطرات کی دعوت پر لبیک کہتا ہے۔ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۰ء تک فرنگی عملداری
میں کفر وارتداد نے اصولِ اسلام، داعیٔ اسلام اور مسلمانوں پر وقت کے مختلف موڑوں
سے جس طرح بے محابا خشت باری کی حضرت امیرِ شریعت نے سینہ سپر ہو کر اُن سے
ٹکراؤ لیا اور بامراد ہوئے۔ حضرت انور شاہ صاحبؒ اور دیگر پانچ سو مقتدر علماء کا

---

[1] آئندہ شاہ جی کی بجائے امیرِ شریعت کا لفظ آئے گا۔

سید عطا اللہ بخاری کو امیر شریعت کا اعزاز بخشنا انہی خدمات کا صلہ تھا اور مستقبل کی کئی امیدیں اُن سے وابستہ تھیں۔

امروہہ میں جمعیتہ علمائے ہند کا اجلاس

مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد ستیہ گرہ کی تحریک میں خاصا ہیجان پیدا ہو سول نافرمانی کے ذریعے رضا کار، کارکن، رہنما جیل خانوں میں جا چکے تھے مجلس احرار کے سوا باقی مسلم جماعتیں اور خاص کر جمعیتہ علمائے ہند جو نہرو رپورٹ میں اختلاف کے باعث کانگریس سے الگ ہو چکی تھی ابھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچی تھی۔ مولانا حسین احمد مدنی آزادیٔ وطن کی تحریکات میں کانگریس سے اشتراک کے حامی تھے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی الگ اپنی رائے رکھتے تھے۔ نہرو رپورٹ سے علیحدگی کے باعث علی برادران نے بھی جمعیتہ العلماء علیحدہ بنالی تھی جسے دوسرے گروہ کی تائید حاصل تھی۔

ہندوستان میں اس کشمکش نے مسلمانوں کو من حیث القوم کسی فیصلے پر پہنچنے کے لئے مجبور کر دیا تھا۔ چنانچہ اوّل الذکر گروہ نے ۳ مئی ۱۹۳۰ء کو امروہہ ضلع مراد آباد میں اپنا ایک اہم اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔ جمعیتہ علماء کا یہ تاریخی اجتماع تھا جس میں جمعیت کی آئندہ پالیسی پر غور ہونا تھا۔

امیر شریعت پنجاب میں سول نافرمانی کا آغاز کر چکے تھے۔ حکومت ان کے مدِّ مقابل آچکی تھی اور گرفتاری کی تیاریوں میں تھی کہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے جو ان دنوں گرفتار ہو کر لدھیانہ جیل میں تھے، امیر شریعت کو کسی طرح جالندھر سے

لدھیانہ بلا بھیجا۔ امیر شریعت لدھیانہ ڈسٹرکٹ جیل کے سپرنٹنڈنٹ پنڈت من موہن موٹر میں لدھیانہ پہنچے اور نصف رات گئے سپرنٹنڈنٹ جیل کے ذریعے ہی وہ مولانا حبیب الرحمٰن سے ملے۔ وہیں فیصلہ ہوا کہ امیر شریعت راتوں رات پنجاب کی حدود سے نکل کر امروہہ پہنچنے کی کوشش کریں تاکہ جمعیت علمائے ہند کو مجبور کیا جائے کہ وہ لاشرط آزادی وطن کی تحریک میں کانگرس سے اشتراک کرے۔ چنانچہ ۱۲ مئی کو امیر شریعت امروہہ پہنچ چکے تھے۔

علی برادران کی جمعیۃ العلماء کا اجلاس بھی انہی تاریخوں دہلی میں ہو رہا تھا۔ دونوں جماعتیں اپنی اپنی جگہ بند تھیں۔ جمعیۃ علمائے ہند کے خلاف امروہہ کے عوام میں مخالفین نے مشہور کر دیا تھا کہ یہ ہندوؤں کے زرخرید ہیں، وہابی ہیں، نجدی ہیں، پیروں کے دشمن ہیں۔ انگریزوں سے لڑ کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں وغیرہ وغیرہ! اس پروپیگنڈے سے گمراہ ہو کر مقامی رضاکاروں نے جمعیت کے جلوس کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا لیکن امیر شریعت نے امروہہ پہنچ کر حکم دیا:

"آج ہم مفتی ہیں۔ جلوس کے نکالے جانے میں ہمارا فتویٰ چلے گا۔
لہٰذا امروہہ کے بازاروں میں جلوس نکلے گا اور اس کی رہنمائی ہم
خود کریں گے۔"

جلوس عربی لباس میں جمعیۃ علماء کے رضاکاروں نے اونٹوں پر نکالا اور ہراول دستے میں امیر شریعت کا اونٹ سب سے آگے تھا۔ یہ ۱۲ مئی کا واقعہ ہے۔ اسی رات امروہہ میں امیر شریعت کی تقریر کا بھی اعلان کیا گیا جس میں مخالفین نے اپنی پوری قوت کا مظاہرہ کیا۔ لیکن امیر شریعت کی تقریر جو بعد نماز عشاء شروع ہو کر رات تین بجے

تک جاری رہی ہیں کسی کو لب کشائی کا موقع نہ ملا۔ دورانِ تقریر دو آدمی بے ہوش ہو گئے۔ یہ دونوں رائے میں اختلاف رکھتے تھے لیکن امیر شریعت کی تقریر سے متاثر ہوئے کہ اُن کے اعضا شل ہو گئے۔

۳ مئی کو جمعیۃ علمائے ہند کا تاریخی اجلاس مولانا سید معین الدین اجمیری کی صدارت میں شروع ہوا جس میں مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تجویز پر بحث شروع کہ جمعیۃ علمائے ہند کو کانگریس کی تحریک سول نافرمانی میں شامل ہو جانا چاہیے۔ اس تجویز کی تائید مولانا حسین احمد مدنی نے کی۔ اس قرارداد کی مزید تائید میں حضرت امیر شریعت نے تین دن (۷ گھنٹے) تقریر کرتے ہوئے دلائل و براہین کے انبار لگا دیئے۔ اس تاریخی تقریر کے مختصر جملے ملاحظہ کیے ہیں جو حسب ذیل ہیں:-

"علمائے کرام! خلافت کی تحریک کے بعد ایک اور وقت آیا ہے کہ ہم عالمِ اسلام کے دشمن فرنگی سے جس کی حکومت میں سورج غروب نہیں ہوتا مگر اسلام کے غروب ہونے کا خطرہ بڑھ رہا ہے ایسی جنگ لڑیں کہ وہ ہندوستان کو چھوڑنے پر مجبور ہو جائے۔ اگر ہم بحیثیت مسلمان انگریز کو یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے تو یاد رکھیں اس سے نہ صرف عرب ریاستیں بلکہ تمام بلادِ اسلامیہ ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائیں گے۔

میں ہندو کو بھی اپنا دوست قرار نہیں دیتا لیکن اُس کی دشمنی ساحل سمندر تک محدود ہے مگر انگریز تو سمندر پار تک اسلام کا تعاقب کر رہا ہے۔

اگر میں اپنے چھوٹے دشمن (ہندو) کے ساتھ مل کر انگریز ایسے
اسلام کے بڑے دشمن کو شکست دے سکوں تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ
سودا کوئی مہنگا نہیں ہوگا۔

علمائے کرام! اگر میرا بس چلے تو میں انگریزوں کو مارنے کے
لئے سوروں سے اتحاد کرنے میں بھی گریز نہ کروں۔ کیوں کہ اس کی
زندگی سے اسلامی تہذیب و تمدن اور انسانیت کی موت ہو جائے
گی اور اس کی موت سے اسلام اور مسلمان زندہ ہو جائیں گے اسلامی
ممالک میں اتحاد بڑھے گا۔ مسلمانوں میں روح جہاد جاگ اٹھے گی۔
جو مسلمان انگریزی فوج میں بھرتی ہو کر خانہ کعبہ پر گولی چلاتا
ہے اور پیران پیر کے روضہ پر حملہ آور ہوتا ہے وہ پھر اپنے
مقامات مقدسہ کی حفاظت کرے گا۔ لہذا میری درخواست ہے
کہ آپ دین اسلام کے لیئے مسلمانان عالم کی آزادی کے لیے
کانگرس سے تعاون کریں۔

ہندو اتنا طاقتور نہیں ہے کہ ہم اس سے خائف ہو کر عالم
اسلام کی امداد کو نظرانداز کر دیں۔ یار لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مسلمان کو
کھا جائے گا۔ حضرات! یہ کس قدر جھوٹ ہے۔ یہ مرغی کی ایک
ٹانگ تو کھا نہیں سکتا وہ میرے اپنے مسلمانوں کو کیسے ہضم کر سکتا ہے
ہندو تہذیب یا اس کی دشمن گنگا سے کاشی تک ہے لیکن
اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے جس کی بنیاد سمندر کی اتھاہ گہرائیوں

سے انسانوں کے آخری پیمانوں تک ہے۔ اگر اس بنیادی اور سچے مذہب کی حفاظت چاہتے ہو تو عیسائی حکمرانوں سے ہندوستان کو نجات دلاؤ۔"

اپنی تقریر کے دوران امیر شریعت قرآن کریم سے سورۂ بقرہ کے اکثر حصے تلاوت کرتے رہے۔ آخر تین دن کی مسلسل بحث کے بعد ۶ مئی کو جمعیۃ علمائے ہند نے مولانا حفظ الرحمٰن کی قرارداد کو بغیر کسی اختلاف کے منظور کر لیا۔

وارنٹ گرفتاری

پنجاب پولیس امیر شریعت کے وارنٹ لے کر امروہہ پہنچی۔ دوسری طرف امروہہ میں امیر شریعت نے جو تقریر کی قانون نے اسے بھی پسند نہ کیا۔ چنانچہ ایک وارنٹ یہاں بھی تیار ہو گیا۔ چنانچہ اطلاع ملی کہ امروہہ کی پولیس آج کسی وقت امیر شریعت کو گرفتار کرے گی۔ یہ سن کر مقامی کارکنوں نے ۷ مئی کی رات کو امیر شریعت کی تقریر کا اعلان کر دیا۔

پولیس اس خیال میں رہی کہ دن کی گرفتاری سے عوام میں ہنگامہ نہ ہو۔ رات جب وہ جلسہ سے فارغ ہو کر قیام گاہ پر آئیں گے گرفتار کر لیں گے۔

جلسے کی ابتدائی تقریر مولانا احمد سعید دہلوی کی تھی لیکن لوگ امیر شریعت کی تقریر کے منتظر تھے۔ پولیس اپنی جگہ مطمئن تھی۔ رات دو بجے مولانا احمد سعید نے اپنی تقریر کے دوران گھڑی دیکھ کر کہا،

"اوہو! کافی رات جا چکی ہے اور آپ لوگ سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر

کے انتظار میں ہوں گے۔ پولیس پھر سن لینا۔ اب میں جلسہ برخاست کرتا ہوں۔"

اس اعلان کے بعد پولیس امیر شریعت کی تلاش میں نکلی تو معلوم ہوا کہ وہ جلسہ شروع ہوتے ہی امروہہ سے نکل گئے تھے۔ ہاتھ آیا ہوا شکار ضائع ہونے پر شکاری کس قدر شرمندہ ہوتا ہے ــــ امروہہ کی پولیس اپنے اقدام کی ناکامی پر سخت شرمندہ ہوئی۔

دوسرے دن اطلاع ملی کہ امیر شریعت الہ آباد سوراج بھون میں پنڈت موتی لال نہرو کے ہاں مہمان ہیں۔ پنڈت جی امیر شریعت کی تقریر اور تلاوت قرآن کریم سے متاثر تھے۔ رات الہ آباد میں امیر شریعت کی تقریر ہو رہی تھی کہ پولیس نے چاروں طرف سے جلسے کا محاصرہ کر لیا۔ پولیس کی اس حرکت سے امیر شریعت کی گرفتاری کا شبہ ہوا تو دیکھتی نظروں نے جلسہ گاہ میں جو ایک منٹ پہلے روشنی سے بقعۂ نور تھا تاریک اندھیرا دیکھا اور آن کی آن میں معلوم ہوا۔ کہ امیر شریعت اپنے میزبان کی کار پر الہ آباد سے جا چکے ہیں حالانکہ وہ سوراج بھون ہی میں مقیم تھے۔

دوسرے روز جب پولیس کو اطمینان ہو چکا کہ امیر شریعت اُن کی حدود سے نکل گئے ہیں تب امیر شریعت پنڈت موتی لال نہرو کی ہمراہی میں آگرہ پہنچے۔ جلسے کا اہتمام پیشتر سے ہو چکا تھا۔ پروگرام کے مطابق عین وقت پر امیر شریعت کی کار قلعہ کے میدان میں پہنچی۔ لوگ ہزاروں کی تعداد میں فرشِ راہ تھے۔ خطبہ مسنونہ کے بعد حسب عادت مجمع پر ایک طائرانہ نظر ڈالی تو ایک کونے سے آواز آئی:

"تم نے اگر حکومت کے خلاف یا کانگرس کے حق میں کوئی بات کہی تو قتل کر دیئے جاؤ گے۔"

جیسے ہی امیر شریعت نے آواز کی طرف توجہ دی تو شہر کے قصاب ہاتھوں میں چھرے اور کلہاڑیاں اٹھائے ایک کونے میں کثیر تعداد میں کھڑے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے مجمع چیر کر امیر شریعت کے سامنے آ کھڑے ہوئے۔ بلوائیوں کی اس حرکت سے جلسے پر خوف و ہراس طاری ہو گیا۔ خود پنڈت موتی لال نہرو پریشان ہوئے۔ پولیس بطور تماشائی کے سامنے کھڑی یہ کھیل دیکھتی رہی۔ اتنے میں امیر شریعت نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کی اور سورۂ بقرہ کے دو رکوع پڑھ کر ترجمہ کرنا چاہا لیکن مفسدوں نے اس کی بھی اجازت نہ دی۔ اسی کشمکش میں رات نصف ہو چکی تھی۔ شاہی قلعہ اور تاج محل کی پرشکوہ عمارتیں مسلمان کے انحطاط کی مانند قابل غور دیواروں کو گرتے دیکھ کر اور خاموش ہو گئیں جیسے جیسے رات بھیگتی جا رہی تھی جلسے پر نیند کا غلبہ بڑھ رہا تھا مگر امیر شریعت اور ان کے قاتل آمنے سامنے کھڑے تھے۔

ملک الموت کو ضد ہے کہ جاں لے کے ٹلوں گا
چھوڑا ہے صد ہے کہ میری بات رہے

اسی کھینچا تانی میں مرغ سحر نے اذان دی اور امیر شریعت نے سورۂ یوسفؑ کی تلاوت شروع کر دی۔ رات کی موت پر طلوع سحر کی پیدائش کا نغمہ الاپتے ہوئے زندگی نے انگڑائی لی۔ آگرہ کے عوام نے رات بھر تماشہ دیکھا کہ قاتل اور مقتول مقتل میں اپنی ذمہ داریوں کے تول مول رہے ہیں مگر نہ قاتل کے ہاتھ اٹھے اور نہ مقتول کی گردن جھکی۔

کلام اللہ اور امیر شریعت کی زبان، نسیم صبحگاہی، ان سب نے قاتلوں کے عزائم پر نیند کا بوجھ ڈال دیا۔ امیر شریعت نے تقریر شروع کی جو دن کے نو بجے

تک جاری رہی۔ گو سامعین کی تعداد میں بدستور کمی آتی گئی، مگر معرکۂ حق و باطل میں ثقلیں کرنے والے عشاق بدستور جمے رہے۔ اس دوران مخالفین کو زبان درازی کی جرأت نہ ہوئی تا آنکہ صبح سب کے سب امیر شریعت کے قدموں میں آ گرے اور رات بھر کی گستاخیوں کی ہزار بار معذرت چاہی۔

قاتلانہ حملہ

نمک کی ستیہ گرہ کے دنوں حکومت کی طرف سے ہر ضلع کی پولیس کو اختیار تھا کہ جس مقرر کو چاہے گرفتار کر سکتی ہے۔ ہندوستان بھر کے سیاسی کارکن کچھ تو گرفتار ہو چکے تھے اور کچھ روپوش ہو کر تحریک کی رہنمائی کر رہے تھے۔ کانگرس کی سرگرمیاں خلافِ آئین قرار دی جا چکی تھیں لیکن امیر شریعت کی سرگرمیاں گورنمنٹ آف انڈیا کے لئے قابل اعتراض ہی نہیں، ناقابل برداشت حد تک پہنچ چکی تھیں۔ اس وقت تک پنجاب اور صوبہ یو پی سے امیر شریعت کے خلاف بیس وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے تھے اور انگریزی قانون کے محافظ نشان پائے امیر شریعت کی تلاش میں سرگرداں تھے امروہہ اور آگرہ کی شکست کے بعد حکومت اور حکومت پرست نئے منصوبے باندھنے لگے جس سے وہ بڑھتے ہوئے طوفان کا رستہ روک سکیں۔

صوبہ یو پی سے فارغ ہو کر امیر شریعت بمبئی پہنچے۔ حالات فرنگی قانون سے بغاوت کا علم تھامے کھڑے تھے۔ واقعات کے ہاتھ سامراج کے خلاف جلتی آگ کو دامن دل سے ہوا دے رہے تھے۔ ساحل سمندر سے ٹکراتی ہوئی موجوں نے آگے بڑھ کر امیر شریعت کے قدم لئے۔ رات بندر روڈ پر جلسے کا اعلان کر دیا گیا۔ لاکھوں کی آبادی کا شہر بندر روڈ پر

پر اُمڈ آیا۔ آگرہ کی شکست کا انتقام لینے خواجہ تاشانِ برطانیہ اپنے ارادوں سے مسلح جلسے کی صفِ اوّل میں جگہ سنبھال چکے تھے۔

قانون اور وقت جب ایک دوسرے سے متصادم ہوں تو دلوں سے بغاوت کا پھوٹ نکلنا اچنبھے کی بات نہیں۔ آزادیٔ ہند کی تحریک میدانوں سے نکل کر پہاڑوں اور سمندروں تک جا پہنچی تھی۔ بغاوت کے الاؤ اس قدر روشن تھے کہ برطانوی راج کا وجود خطرے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ایسے وقت میں برطانوی باغی کا بمبئی پہنچنا حکومت کے لئے ناپسندیدہ تھا۔ فیکٹریوں کا شہر جہاں چمنیوں کے دھوئیں سمندر کی وسعتوں کو بادلوں کا فریب دیتے ہیں۔ یہاں کے انسان دولت کے انبار پہ کھڑے ہو کر انسانیت کو بہت اونچائی سے دیکھتے ہیں۔ کاخِ امراء کی بلند و بالا چوٹیاں آدمی کو دیکھنے میں جہاں ہمیشہ فریب خوردہ ہوں وہاں انگریز کے خلاف بات کرنا اپنے بخت کو بگڑے ہوئے سانچے میں ڈھالنا ہے۔ لیکن امیرِ شریعت نے بمبئی کے عوام کو خطاب کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ انگریزی سامراج کے خلاف جلتی ہوئی بھٹی میں مزید ایندھن کا اضافہ ہو سکے۔

امیرِ شریعت نے خطبۂ مسنونہ کے بعد تقریر شروع کی۔ وہ کہہ رہے تھے:۔

"غلامی سب سے بڑا گناہ ہے اگر اس گناہ سے نکلنا ہے تو اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ ہم انگریزوں کے خلاف پُرامن لڑائی میں شریک ہو جائیں۔"

یہ فقرہ ابھی نامکمل تھا کہ مجمع میں سے کسی نے تیز دھار کی چھُری امیرِ شریعت کی طرف زور سے پھینکی جسے ایک نوجوان نے بھاری سے آگے بڑھ کر اپنے سینے

پر روک لیا اور یہ ضرب اس قدر شدید لگی کہ تھوڑی دیر بعد نوجوان کا انتقال ہو گیا مقتول نور خاں نامی کوہاٹ کا رہنے والا اکیس سالہ پٹھان نوجوان تھا۔ نور خاں کی موت سے امیر شریعت کی جان بچی لیکن نور خاں کے خون سے غیر ملکی سامراج کا وقار آخر کو مٹ کر رہا۔ گو نور خاں کا قاتل گرفتار نہ ہو سکا مگر تحقیق پر معلوم ہوا کہ چھری زہر آلود تھی اس افراتفری میں امیر شریعت پولیس کی گرفت سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔

گرفتاری

آگرہ اور ممبئی کے قاتلانہ حملوں کے بعد امیر شریعت نے اس ضلع کو فوراً چھوڑ دینا مناسب سمجھا چنانچہ ایک ماہ کے پیدل اور سنگلاخ راستوں پر خاموشی سے سفر کرنے کے بعد کلکتہ پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہندوستان بھر میں ہر ضلع سے گرفتاری کے وارنٹ جاری ہو چکے تھے۔ حالات کے غیر مطمئن ہونے کے باعث امیر شریعت کے لیے ایک جگہ قیام غیر ممکن تھا۔ کلکتہ کے عوام جو ۱۹۰۵ء (تقسیم بنگال) سے انگریزوں کے خلاف دہشت پسندی اختیار کر چکے تھے، کانگرس کی تحریک سے بھی تعاون کر رہے تھے۔ امیر شریعت کے اس صوبہ میں دورہ سے سیاسی حالات کو اور جلا مل گئی آپ نے دیہات قصبات اور شہری عوام کو انگریزوں کے خلاف بغاوت پر ابھارا۔ آخر ۲۴ اگست ۱۹۲۳ء کو دیناج پور (بنگال) میں دفعہ ۱۰۸ کے تحت گرفتار کر لیے گئے گو وارنٹ تو بہت تھے لیکن مقدمہ صرف ضلع جلی پور کی ایک تقریر پر چلا۔ چونکہ کانگرس نے انگریزی عدالتوں سے عدم تعاون کا حکم دے رکھا تھا لہذا امیر شریعت نے عدالت کی تمام کاروائی سے عدم تعاون کیا۔ آخر ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۳ء کو چھ ماہ قید بامشقت کی

سزا ہوئی۔
علی پور جیل سے آپ کو ڈم ڈم جیل میں تبدیل کر دیا گیا۔ جہاں تمام ایام اسیری گزارے۔

باب سوم —— ۱۹۳۰ء تا ۱۹۴۰ء

ڈم ڈم جیل

جیل باوجود اس متحرک دنیا میں ہونے کے اپنے آئین کی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے ہر گوشے میں ظلم و انصاف کے درمیان ٹکراؤ رہتا ہے اجنبی حکمران جیلوں میں سیاسی قیدیوں سے بعض ایسے ضابطے منوانتے۔ ہے جسے نہ ضمیر پسند کرتا تھا اور نہ ہی دماغ اس پر رضامند ہوتا تھا۔ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو امیر شریعت جب ڈم ڈم جیل میں داخل ہوئے تو سپرنٹنڈنٹ جیل مسٹر سیمسن (جو بعد میں بنگالی دہشت پسندوں کے ہاتھوں مارا گیا) نے امیر شریعت کو حکم دیا کہ اپنے سر سے گاندھی کیپ اتار دیں۔ یورپین سپرنٹنڈنٹ کے مطالبہ پر امیر شریعت نے کہا:

"اوّل تو یہ گاندھی کیپ نہیں، اجمل کیپ ہے۔ اور یوپی کے اکثر شرفاء اسے پہنتے ہیں۔ دوسرے میں اے کلاس کا قیدی ہوں۔ مجھے اپنا ہر طرح کا ذاتی لباس پہننے کا قانونا حق ہے۔"

سپرنٹنڈنٹ نے جواب میں کہا:

علماء کی رائے ہے کہ یہ گاندھی کیپ ہے لہذا آپ اسے جیل کے اندر نہیں لے جا سکتے ۔"

امیر شریعت:"میں خود عالم ہوں اور میں جانتا ہوں کہ دیو بند کے علماء عام طور پر یہی کیپ پہنتے ہیں ۔ لہذا میں اسے نہیں اتاروں گا۔"

یہ بحث تمام دن رہی ۔ آخر امیر شریعت کامیاب ہو گئے ۔ لیکن ابتداء کی یہ لڑائی سزا کے اختتام تک وجہ نزاع بنی رہی ۔ جیل مینول نے سپرنٹنڈنٹ جیل کو لامحدود اختیارات سونپ رکھے ہیں ۔ تڑپتے ہوئے جانور کی طرح قیدی کا تماشہ تو کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن بسمل کے زخموں پر مرہم کا رواج اس مقتل میں نہیں ۔ امیر شریعت گو بڑی حیثیت کے قیدی تھے لیکن تھے تو قیدی ۔ زنجیر سونے کی ہو اور خوراک میں یاقوت استعمال ہوں تب بھی قفس قفس ہے ۔ قفس آشیاں نہیں ہوتا ۔

رستمِ زماں سے ملاقات

دنیا کے شہ زور اور فن پہلوانی میں اپنے وقت کے رستم زماں غلام حسین عرف گاما پہلوان نون والے کے آباؤ اجداد آج سے قریباً ڈیڑھ صدی پیشتر مہاراجہ گلاب سنگھ والئی کشمیر کے تشدد کے باعث کشمیر چھوڑ کر امرتسر آباد ہو چکے تھے ۔ اُن کے والد عزیز بخش پہلوان سیتا پور نامی ریاست کے سرکاری پہلوان تھے ۔ اور یہیں اُن کی شادی ریاست کے نامی گرامی نون پہلوان کی لڑکی سے ہوئی جس کے بطن سے غلام حسین نے جنم لیا ۔ والد کی موت کے باعث غلام حسین کی

پرورش اُن کے نانا فیروز الدین کے سپرد ہوئی۔ چونکہ ابتدائی زندگی فنونِ پہلوانی کی گود میں پروان چڑھی تھی، لہٰذا ساری زندگی گاما پہلوان نوازی والے کی روایت سے نسلی انگیزی کی آگ ایسے دلوں میں بھی روشن ہوتی ہے جن کے نزدیک یہ انتہائی گناہ کی آخری منزل قرار دی گئی ہے۔ امیرِ شریعت اور رستم زماں گاما پہلوان کے درمیان بظاہر کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن ڈوگرہ شاہی کے تشدد سے کشمیری تنگ آئے جب پنجاب آکر آباد ہوئے تو جہاں جہاں ان کا یہ طبقہ ایک ایسی برادری اور خاندانی عصبیت اپنے ساتھ لایا کہ مقامی باشندوں کے رسم و رواج انہیں اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ امیرِ شریعت کشمیری، رستم زماں کشمیری، دونوں امرتسر میں مقیم اس کے علاوہ امیرِ شریعت کی یہ ہابی (Hobby) تھی کہ چڑیا گھر یا سرکس میں شیر کو اور اکھاڑوں میں پہلوانوں کو دیکھنا بہت پسند کرتے۔ ان وجوہ کی بنا پر امیرِ شریعت اور رستم زماں کے درمیان گہرے رشتے استوار تھے۔ چنانچہ جب کبھی فرصت ہوتی امیرِ شریعت رستم زماں سے ملنے جاتے اور اکثر رستم زماں بھی لاہور یا امرتسر میں انہیں ملنے آتے تھے۔

ان دنوں رستم زماں گاما کے دورے پر گئے تھے کہ انہیں امیرِ شریعت کے ڈسٹرکٹ جیل میں قید ہونے کی اطلاع ملی۔ ملاقات کا قصد لیے کر پہلوان جیل پہنچے تو امیرِ شریعت اور سپرنٹنڈنٹ کے درمیان کھینچا تانی آڑے آگئی۔ امیرِ شریعت کی خواہش تھی کہ پہلوان اندر آکر ملاقات کریں، اس میں ان کا احترام تھا لیکن سپرنٹنڈنٹ کا تقاضا تھا کہ امیرِ شریعت عام قیدیوں کی طرح جنگلے میں ملاقات کریں۔ اس میں امیرِ شریعت کی توہین تھی کہ وہ اے کلاس کے شاہی قیدی تھے۔ سارا دن اسی

کھینچا تانی میں گزر گیا۔ آخر سپرنٹنڈنٹ کو ہار ماننی پڑی اور رستم زماں نے جیل کے اندر امیر شریعت سے ملاقات کی۔ اس موقع پر بنگالی قیدیوں نے خواہش کی کہ پہلوان کپڑے اتار کر اپنے بدن کی نمائش کریں۔ قیدیوں کے تقاضے پر دونوں مسکرائے اور رستم زماں نے لنگوٹا کر کے اپنے جسم کی نمائش کی تو بنگالی قیدیوں نے بے ساختہ کہا ——— "ہے مانس!" (ارے یہ انسان!)"

امیر شریعت نے ایام اسیری ضائع نہیں کیے بلکہ سوشیل کمار نامی بنگالی قیدی سے آپ نے انگریزی پڑھنی شروع کی اور سوشیل کمار امیر شریعت سے قرآن کریم پڑھتا رہا۔ تبادل تعلیم کی دو نشستیں ہوتیں۔ صبح سوشیل کمار قرآن کریم پڑھتا تھا اور شام کو امیر شریعت انگریزی پڑھتے۔ وقت اسی طرح گزرتا گیا۔

رہائی

(آخر جنوری ۱۹۳۱ء میں "گاندھی ارون پیکٹ" کے تحت تحریک ستیہ گرہ کی لڑائی بند کر دی گئی۔ تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے۔ امیر شریعت بھی اسی موقع پر رہا ہوئے۔

بہادر بہرحال بزدل نہیں ہوتا۔ امیر شریعت کے چچا سید مقیم شاہ پولیس آفیسر تھے اور ان دنوں کلکتہ میں تعینات تھے۔ جیل سے رہا ہو کر امیر شریعت چند دنوں کے لئے انہی کے ہاں ٹھہرے تو خطرات نے احاطہ کر لیا لیکن وہ پولیس آفیسر نے انگریز کے باغی کو پناہ دینے میں کسی قسم کی آر محسوس نہ کی۔ نفا اتین اور فرائض کے درمیان دل و دماغ متصادم رہے لیکن خاندانی شرافت نے مہمان سمجھتے ہوئے کہ

لئے پیشانی کو شکن آلود نہیں ہونے دیا۔

مجلسِ احرار کی تشکیلِ نو

۱۱ر جولائی ۱۹۳۱ء کو اسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں احرار کانفرنس کا پہلا اجلاس مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں حضرت امیر شریعت، چودھری افضل حق، خواجہ عبدالرحمان غازی، مولانا ظفر علی خان، شیخ حسام الدین، مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا مظہر علی اظہر اور دوسرے مسلمان رہنما شامل ہوئے۔ اس اجلاس کی آخری قرارداد میں جداگانہ انتخاب کی پُرزور حمایت کی گئی جس سے کانگریس اور ہندو پریس خصوصاً حواس باختہ ہو گئے۔ اجلاس کے اختتام پر پنجاب بھر میں احرار کے دفاتر قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ کام حضرت امیر شریعت کے سپرد ہوا اور آپ اپنے رفقاء کو لے کر اس پروگرام کو سرانجام دینے کے لیے پنجاب کے دورہ پر روانہ ہو گئے۔

گاندھی جی سے ملاقات

اسی سفر کے دوران پنجاب کی حدود سے نکل کر جب امیر شریعت دہلی اور یو پی کے اضلاع میں پہنچے تو گاندھی جی کی لندن روانگی کا پتہ چلا۔
گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس میں شمولیت کے لیے لندن روانہ ہونے والے تھے۔ احرار رہنماؤں کی رائے تھی کہ انگریز کی میز پر بیٹھ کر ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ غلام ملک کا لیڈر نہیں بلکہ غیر ملکی حکومت کا اقتدار ہی کر سکتا ہے۔

۲۰ اگست ۱۹۳۱ء کو گاندھی جی جب بمبئی پہنچے تو امیر شریعت بھی اپنے رفقاء کے ساتھ انہیں ملنے کے لئے بمبئی پہنچ گئے۔ آپ نے گاندھی جی کو گول میز کانفرنس میں شمولیت سے منع کیا۔ گاندھی جی نے احرار رہنماؤں کی رائے کو وزن تو دیا لیکن لندن جانے کا ارادہ ترک نہ کیا۔

میکلیگن کالج کا حادثہ

ستمبر ۱۹۳۱ء کے آخر کا واقعہ ہے کہ میکلیگن کالج لاہور کے انگریز پرنسپل مسٹر ڈیکیر نے مسلمان طلباء کی دلآزاری کرتے ہوئے کلاس میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی پر ایسے رکیک حملے کیے جس سے مسلمان طلباء آپے سے باہر ہو اٹھے اور کالج سے سٹرائیک کر دی۔ محمڈن ہال میں طلباء نے مرکزی کیمپ بنا لیا اور پرنسپل کے خلاف باقاعدہ ایجی ٹیشن شروع کر دی۔ اس سلسلہ میں طلباء کا وفد شاعر مشرق علامہ اقبال کی قیام گاہ پر پہنچا۔ واقعات سن کر ڈاکٹر صاحب نے انہیں احرار رہنماؤں سے ملنے کا مشورہ دیا۔

بمبئی سے واپسی پر دفتر مجلس احرار میں امیر شریعت گاندھی جی سے ملاقات کی رپورٹ اپنے ساتھیوں کے سامنے پیش کر رہے تھے کہ طلباء کا وفد انہیں ملنے کے لیے آن پہنچا۔ حالات اور واقعات سے تحریک کے زیادہ پھیلنے کا احتمال ہوا۔ اسی رات موچی دروازہ کے باغ میں امیر شریعت کی تقریر کا اعلان کر دیا گیا۔ لاکھوں کا مجمع تھا۔ حکومت پنجاب انگریز پرنسپل کی پشت پناہ تھی۔ رات دس بجے امیر شریعت نے تقریر شروع کی اور دو بجے رات تمام مجمع کو ساتھ لے کر

راتوں رات میکلیگن کالج کے دروازے پر پہنچ کر ڈیرہ ڈال دیا۔ صبح ہونے تک سارا لاہور میکلیگن کالج کے دروازے پر تھا۔ پولیس کے انتظامات کے باوجود حالات ہر آن بگڑتے جا رہے تھے لیکن امیر شریعت معہ اپنے رفقاء مولانا محمد داؤد غزنوی، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی عوام کو ہر قسم کی قانون شکنی سے روکتے رہے۔ گرفتاریاں شروع ہوئیں تو مولانا محمد داؤد غزنوی اور مولانا احمد علی گرفتار کر لیے گئے۔ دن بھر کی ہنگامہ آرائی نے شام ہونے تک جھگڑے کو اس قدر مختصر کر دیا کہ پرنسپل نے طلباء سے معافی مانگ لی اور کالج سے خارج شدہ طلباء دوبارہ داخل کر لیے گئے۔ گرفتار ہونے والے رات ہوتے تک رہا کر دیئے گئے۔ اس طرح حضرت امیر شریعت اور جماعت کی ایک دن کی ہمت نے انگریز پرنسپل کو پچھاڑ دیا۔

تحریک کشمیر

تحریک کشمیر میں مجلس احرار اور حضرت امیر شریعت کی شرکت کا سبب سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس تحریک کا مختصر پس منظر بیان کر دیا جائے۔

مہاراجہ ہری سنگھ والی کشمیر نے ریاستی نظم و نسق سنبھالتے ہی غریب عوام اور کسانوں پر ٹیکسوں کی بھرمار کر دی۔ اس مظلوم طبقہ کی کمائی کی ساری پونجی مالیہ اور آبیانہ کی نظر ہو جاتی۔ یہی وجہ تھی کہ کشمیر کے غریب عوام موسم سرما میں کشمیر سے نکل کر پنجاب کے میدانی علاقوں میں محنت مزدوری کے لیے پھیل جایا کرتے تھے۔ یہ حالات تھے کہ عوام نے اپنے جائز حقوق منوانے کے لئے باقاعدہ تحریک

کا آغاز کر دیا۔ انہی دنوں ریاست جموں میں ایک ایسا حادثہ پیش آیا جس سے ہندو حکمران اور مسلمان رعایا کے تعلقات خاص طور پر الجھ گئے اور آخر کار یہ تحریک ریاست سے باہر بھی پھیل گئی۔

حادثہ یہ تھا کہ جموں میں ریاستی پولیس کا ایک مسلمان سپاہی اپنی بیرک میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہا تھا کہ بغیر کسی نزاع کے ایک ہندو سنیاسی نے سپاہی کے ہاتھ سے قرآن کریم چھین کر زمین پر دے مارا۔ کتاب اللہ کی توہین نے تمام نظم و نسق کو پریشان کر دیا۔

عوام، کسان اور خصوصاً مسلمان حکومت کشمیر کے خلاف نبرد آزما ہو گئے۔ یہی وہ زمانہ تھا کہ شیخ عبداللہ کشمیری عوام سے لیڈر کی حیثیت سے روشناس ہوئے۔ اُن کی تقریروں نے کشمیری عوام کو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنا کر مہاراجہ کے سامنے لا کھڑا کیا۔ اس تصادم میں حکومت کی طرف سے نہتے مسلمانوں پر گولیاں چلیں اور خونِ بے گناہ سے دریائے جہلم کی بپھری ہوئی موجیں کناروں سے ٹکرانے لگیں۔

ایسے حالات نے پنجاب کے مسلمان کو بھی چونکا دیا اور پریس نے حالات کے بیدار کرنے میں وقت کی خوب معاونت کی۔ انہی دنوں سر فضل حسین نے شملہ میں چند رجعت پسند مسلمانوں کے تعاون سے کشمیر کمیٹی کی بنیاد رکھی جس کے صدر قادیان کے مرزا بشیر الدین محمود، اور سیکرٹری عبدالرحمان درد (مرزائی) کو نامزد کیا۔ میاں صاحب اس کمیٹی کے نگران مقرر ہوئے۔

کشمیر کمیٹی کی تشکیل کے ساتھ ہی مرزائی خلیفہ نے سرکار پرست مسلمان رہنماؤں کو اس کمیٹی کا رکن نامزد کر لیا۔ چنانچہ علامہ سر محمد اقبال کو بھی اس میں شامل کر لیا

گیا۔ احرار رہنماؤں کو جب اس ڈرامے کا علم ہوا تو وہ علامہ اقبالؒ سے ملے۔ انہیں حالات سے آگاہ کیا کہ آپ کی وجہ سے نہ صرف کشمیر کا بتیس لاکھ مسلمان مرزائی ہو جائے گا۔ بلکہ بیرونی ممالک کے مسلمان بھی اس فریب سے متاثر ہوں گے۔ لہٰذا آپ کو کشمیر کمیٹی سے علیحدگی کا اعلان کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ دوسرے ہی روز برکت علی محمڈن ہال میں کشمیر کمیٹی کا اجلاس ہوا اس میں تحریک کشمیر کی ساری ذمہ داری مجلس احرار کے سپرد کر دی گئی۔

مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی نے اپنے لاہور کے اجلاس منعقدہ ۱۸ اگست میں تحریک کشمیر کو باضابطہ چلانے کا فیصلہ کیا۔ انگریز ریاستی حکام اور مرزائی حالات سے ہر گھڑی باخبر رہتے مجلس احرار کے فیصلے کی روشنی میں آنے والے نئے طوفان کا خوف دلا کر انگریز نے اپنے بااعتماد آدمی ہرکشن کول کو کشمیر کا وزیر اعظم بنا دیا۔

وفد کی روانگی

اوائل اکتوبر ۱۹۳۱ء میں چودھری افضل حق، مولانا مظہر علی اظہر اور خواجہ غلام محمد وفد کی صورت میں کشمیری حکام سے بات چیت کے لئے جموں روانہ ہو گئے۔ انگریز اور مرزائی اپنی اپنی اوٹ سے جھانک رہے تھے کہ احرار رہنما سرنگوں پہنچے۔ ڈوگرہ شاہی منتظر تھی کہ وفد کے ارکان کو کسی شیشے میں اتار لیں گے۔ راج محل کا تمام جل جلاؤ اپنی امیدوں میں ناکام رہا۔ احرار رہنماؤں کا ضمیر خریدنے والے شاہی سوداگر گداؤں کی طرح ہر روز ملاقات کو آتے مگر دریا سے ہم کی

موجوں پر تیرنے والا شاہی ہاؤس بوٹ ہر روز دیکھتا کہ شاہی فقیروں سے شکست کھا رہی ہے۔ آخر وفد ناکام لوٹ آیا۔

امیر شریعت کی گرفتاری

وفد کے کشمیر جانے سے پیشتر حضرت امیر شریعت نے پنجاب کو اپنی تقریروں سے گرما کر میدان کارزار کے لیے تیار کر لیا تھا۔ احرار کے سرخ پوش مجاہد کشمیر کی سرحدیں عبور کرنے کے لیے حکم کے منتظر تھے۔ وفد کی ناکام واپسی پر ڈوگرہ شاہی کی سنگینیں اور برطانوی جیل خانے مجاہدین کے انتظار میں تھے۔

مجلس احرار ہنوز سول نافرمانی کے نقشے سوچ ہی رہی تھی کہ ۱۵۔اکتوبر ۱۹۳۱ء کو ۱۴۴ کے تحت حضرت امیر شریعت کو دہلی میں گرفتار کر لیا گیا۔ اس گرفتاری کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے تحریک کشمیر کے ڈکٹیٹر اول مولانا مظہر علی اظہر نے ۱۸۔اکتوبر کو وائسرائے ہند کے نام حسب ذیل مکتوب تحریر کیا :۔

"عام طور پر یہ خیال کیا جا رہا ہے کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری کے خلاف جو دفعہ ۱۴۴ لگائی گئی ہے۔ اس میں مرزا بشیر الدین محمود کا بھی ہاتھ ہے۔ میری اطلاع ہے کہ سید عطا اللہ شاہ بخاری کے خلاف کارروائی کرنے کی منظوری دینے کی ذمہ دار صرف حکومت دہلی ہی نہیں ہے۔"

بہر حال حکومت ہند اور حکومت پنجاب کی پوزیشن خواہ کچھ ہی ہو، عام تاثر یہی ہے کہ حکومت پنجاب نے دوسری پارٹی

(مرزائی) کی حوصلہ افزائی کی خاطر ایک پارٹی کو ہدف بنایا ہے
ہماری جماعت (احرار) کے لوگ کسی سیاسی مقصد کے
حصول کے لئے جیل جانے سے نہیں ڈرتے۔ ایک دوسری
جماعت کی خاطر ہماری جماعت کو تختۂ مشق بنانا کسی طرح کوئی
سازگار فضا پیدا نہیں کر سکتا۔
سرکاری اعلان یا کسی دوسرے ذرائع سے اس امر کی
تردید کافی نہ ہوگی۔ اگر حکومت رائے عامہ کو مطمئن کرنا چاہتی ہے
تو اس کی ایک ہی صورت ہے کہ مقدمہ واپس لے لیا جائے اور اگر
کسی صوبے کی حکومت سید عطا اللہ شاہ کو محبوس زنداں کرنے کی
مشتاق ہے تو وہ اس کے لئے دوسرے مواقع تلاش کر سکتی ہے۔
مولانا مظہر علی کے اس مکتوب کے جواب میں حکومت خاموش رہی اور اس
مقدمہ میں امیر شریعت کو ڈیڑھ سال قید بامشقت کی سزا دے دی گئی۔

بورسٹل جیل

نومبر ۱۹۳۱ء میں مجلس احرار نے کشمیری عوام کی امداد کے لئے ریاست
پر یلغار شروع کی۔ جہلم سے میرپور، راولپنڈی سے کوٹلی، سیالکوٹ سے سچیت گڑھ
کے راستے احرار رضاکار ریاست کی حدود میں داخل ہوتے۔ انہیں یا تو گرفتار کر
لیا جاتا یا وہ ریاستی حکام کے ظلم و جور کا نشانہ بن کر زخمی ہوتے۔ اس طرح تقریباً
تین ماہ کی مسلسل لڑائی کے نتیجے میں چالیس ہزار مسلمان جیلوں میں گئے اور بائیس نوجوان

نے جام شہادت نوش کیا۔ اجنبی حکمران اس دوران تماشائی بنا رہا مگر ڈوگرہ شاہی کا پنجہ ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ لہٰذا اُس نے ایک طرف انگریزی حکومت سے اور دوسری طرف جمعیت علمائے ہند کو درمیان میں لاکر احرار سے صلح کی گفتگو کرنا چاہی۔ اس موقع پر احرار ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو پنجاب کی مختلف جیلوں سے لاہور بورسٹل جیل میں منتقل کیا گیا۔ جس میں حضرت امیر شریعت بھی شامل تھے۔

دہلی سے حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ اور مولانا احمد سعید، ناظم جمعیۃ علمائے ہند حکومتِ کشمیر کے ایما پر احرار رہنماؤں سے صلح کی گفتگو کے لیے لاہور پہنچے۔ دونوں حضرات صبح نو بجے جیل تشریف لاتے اور چار بجے شام واپس چلے جاتے۔ آخر ایک ہفتہ کی ناکام گفتگو کے بعد جمعیۃ علماء کے رہنما واپس چلے گئے۔ حالات نے نئی کروٹ لی۔ مہاراجہ کی درخواست پر انگریزی حکومت نے احرار رضاکاروں کی گرفتاریاں شروع کیں اور ریاست کے قیدی انگریزی جیلوں میں تبدیل کر دیئے گئے۔

حضرت امیر شریعت ان دنوں بورسٹل جیل کی بارڈر لائن میں تھے۔ جیل کا یہ حصّہ دس سال سے کم عمر بچوں کے لئے مخصوص تھا جو معصوم احرار رضاکاروں سے بھرا ہوا تھا۔ امیر شریعت ان بچوں کے درمیان رات دن کھیل کود میں مصروف رہتے تاکہ بچوں کو اپنے گھر اور والدین کی یاد نہ ستائے۔ اس طرح ایشیا کے عظیم خطیب اور ہندوستان کے سیاسی اور مذہبی رہنما نے جن کی ایک للکار ایوانِ برطانیہ میں زلزلہ پیدا کر دیتی تھی، جماعت کے بلند مقاصد اور کشمیری عوام کی غلامی کے خلاف قید خانے کو کارِ طفلاں بنا دیا تھا۔

انگریز اور مہاراجہ کے سمجھوتے نے تحریک احرار کا رخ براہ راست برطانیہ کی طرف موڑ دیا۔ اب ہندوستان میں کانگریس اور احرار کی تحریکیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ انہی دنوں امیر شریعت اور دوسرے احرار رہنماؤں کو نیو سنٹرل جیل ملتان تبدیل کر دیا گیا۔

کانگریس کی جدید سول نافرمانی کے باعث جمعیتہ علماء کے رہنما پہلے سے ملتان جیل میں موجود تھے جن میں مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا محمد داؤد غزنوی، شیخ حسام الدین، مولانا مظہر علی اظہر مولانا نور الدین بہاری، مسٹر آصف علی، مولانا مرتضیٰ احمد میکش، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان مذہبی اور سیاسی بلند مقام شخصیتوں کے باعث جیل کا احاطہ باقاعدہ علمی مجالس میں منتقل رہنے لگا۔ ۱۹۳۱ء سے ۱۹۳۲ء تک یہ رونقیں جاری رہیں۔ جیل کے سپرنٹنڈنٹ میجر فضل الدین جو انگریزی کے علاوہ جرمنی، ترکی اور ایرانی زبان پر قدرت رکھتے تھے۔ ان علمی محفلوں میں برابر شریک رہتے اور مستفید ہوتے تھے۔

ایک ماں کا ایثار

یوں تو ہزاروں ماؤں نے اپنے بچوں کو تحریک کشمیر کے لئے اپنے ہاتھوں کفن بردوش روانہ کیا لیکن بورسٹل جیل لاہور میں ملاقات کے دوران جب ایک ماں اپنے بچے کو تسلی دے کر اس کا حوصلہ بڑھا رہی تھی، امیر شریعت نے بچے کی ماں سے کہا:

"بچے سے پوچھو اُسے کوئی تکلیف تو نہیں؟"

ماں نے مسکراتے ہوئے آبدیدہ نگاہوں سے کہا:

"سیدا! میں تے اپنا گودی دا پتر دی تیرے حوالے کرن آئی آں، شاہ جی!"
(میں تو اپنی گود کا بچہ بھی تمہارے سپرد کرنے آئی ہوں)

جواب میں امیر شریعت نے ماں کے ان جذبات کو اسلام کے لیے زندہ رہنے کی دعا فرمائی۔

جیل سے رہائی اور سکھوں سے ٹکراؤ

(دوسری گول میز کانفرنس کی ناکامی کے بعد گاندھی جی اور دوسرے رجعت پسند ہندو و مسلمان رہنماؤں نے برطانوی وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو اپنا ثالث مقرر کر لیا۔ برطانوی وزیر اعظم نے ۱۶ اگست ۱۹۳۲ء کو اپنا ثالثی فیصلہ سناتے ہوئے تمام ہندوستان میں مخلوط انتخاب رائج کرنے کی تجویز دی۔ اس ثالثی فیصلہ کی تفصیلات میں پورے ملک میں مخلوط انتخاب، سندھ کی علیحدگی، اچھوتوں کے لیے بہ حیثیت ایک قوم جداگانہ انتخاب کا حق اور پنجاب و بنگال میں مسلم اکثریت کو تسلیم کیا گیا۔

اس ثالثی فیصلہ سے سکھ بے حد برہم ہوئے۔ چنانچہ اکتوبر میں ماسٹر تارا سنگھ نے تقریر کرتے ہوئے اعلان کیا کہ "اگر پنجاب میں مسلم راج قائم کرنے کی طرح ڈالی گئی تو ہم خون کی ندیاں بہا دیں گے۔"

سیاسی اور مذہبی جماعتوں کی طرف سے اس ضمن کی ہنگامی محفلیں گرم تھیں کہ

۲۶ راکتوبر ۱۹۳۲ء کو امیر شریعت ملتان نیو سنٹرل جیل سے اپنی معیادِ اسیری گزار کر رہا کر دیئے گئے۔ ان دنوں دیگر احرار رہنما بھی پیشتر ازیں رہا ہو چکے تھے۔ سکھوں کی مسلسل اشتعال انگیزی کے باعث پنجاب کا مسلمان حالات سے مقابلہ کے لیے تیار تھا کہ مجلس احرار نے سکھوں سے نبرد آزما ہونے کا فیصلہ کر لیا جماعت نے حضرت امیر شریعت کو منتخب کیا کہ ایک بہت بڑے اجتماع میں سکھوں کے چیلنج کا جواب دیں۔ چونکہ امرتسر سکھوں کا مرکزی شہر تھا اس لیے قصۂ زمین برسرِ زمین کے مصداق اس شہر کا انتخاب کیا گیا۔ اس اجتماع کی تشہیر ایک ہفتہ پیشتر سے شروع کی گئی۔ پنجاب کے اکثر شہروں سے مسلمان امرتسر پہنچ چکے تھے۔ عیدگاہ (بیرون رام باغ) کے وسیع میدان میں لاکھوں مسلمانوں کا سمندر امڈ آیا کہ عیدگاہ کو اپنی تنگ دامنی کا گلہ کرنا پڑا۔ ہواؤں نے اپنے دامن سنبھال لیے۔ دھوپ نے تمازت کم کر دی۔ آسمانوں کے ستارے سورج کی کرنوں سے جھانکنے لگے۔ رائج الوقت قانون کے محافظ آتشیں اسلحہ سے لیس ہو کر دوسرے حکم کا انتظار کرنے لگے۔

نمازِ عصر کے بعد امیر شریعت اپنے احباب کے جلو میں عیدگاہ پہنچے خطبۂ مسنونہ کے بعد مسلم نوجوان سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"غیرت حیران ہو کر آج نوجوان مسلمان کا منہ تکتی ہے کہ یہی اُس قوم کے بے خبر فرزند ہیں جن کو انگلیوں پر گنے جانے والی قوم خون کی دھمکیاں دے رہی ہے۔ جس قوم نے دجلہ اور فرات کو اپنے پاؤں تلے روندا اور تلواروں کے درمیان کھڑے ہو

کر موت کو زندگی کی دعوت دی۔

بے خبر نوجوان! ہوش سنبھال اور عقل کے ناخن لے۔ سکھوں سے کہہ دو کہ ہمیں اپنی پایاب ندیوں سے نہ ڈرائیں۔ ہم تو خون کے بحر بے کراں میں گھوڑے دوڑانے کے عادی ہیں۔"

آخر میں سکھوں سے خطاب کرتے ہوئے صرف دو فقرے کہے:۔

"سکھ صاحبان کو میرا مشورہ ہے کہ وہ سوچ سمجھ کر بات کریں ایسا نہ ہو کہ ہاتھوں سے دی ہوئی دانتوں سے کھولنی پڑے اور جس قوم کے سہارے وہ مسلمان کو خون کی ندیاں بہا دینے کی دھمکیاں دے رہے ہیں وہ ہندو قوم تو نو سو سال تک ہمارے گھٹنوں تلے رہی ہے۔"

امیر شریعت کی یہی تقریر امرتسر کے بعد سارے پنجاب میں گونجی، جس سے سکھوں کی للکار مدھم پڑ گئی۔ آخر گوردوارہ پربندھک کمیٹی لاہور کے ذمہ دار رکن سردار پرتاپ سنگھ ایڈووکیٹ نے امیر شریعت کی تقریروں کے بعد اپنے پریس بیان میں کہا:۔

"مسلمان دوستوں نے ہماری بات کا غلط مفہوم لیا ہے۔ ہمارا جھگڑا تو صرف حکومت اور کانگریس سے ہے۔ مسلمانوں سے ہماری کوئی لڑائی نہیں۔ سکھ اپنے حقوق کے لیے صرف حکومت برطانیہ سے ٹکرائیں گے۔"

امیرِ شریعت کو زہر دیا گیا

مئی ۱۹۲۳ء میں امیر شریعت کو مدرسہ عربیہ کے سالانہ جلسہ میں شرکت کے لیے شجاع آباد جانا پڑا۔ خان محمد انور خان کی حویلی میں قاضی احسان احمد کی زیرِ صدارت امیر شریعت نماز ظہر کے بعد تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو قاضی صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا

"پان نہیں کھلاؤ گے ؟"

قاضی صاحب نے حاجی نور محمد کو پان لانے کے لیے کہا۔ حاجی صاحب تعمیلِ ارشاد کے لیے چلے ہی تھے کہ برابر کھڑے ایک آدمی نے کہا :

"میں شاہ جی کے لئے پان لایا ہوں۔"

یہ کہہ کر پان حاجی نور محمد کے ہاتھ میں دے دیا اور انھوں نے قاضی صاحب کو دیا۔ امیر شریعت نے تقریر کے دوران جب یہ پان منہ میں رکھا تو ایک منٹ کے بعد کہا :

"قاضی جی زہر دے دیا۔"

یہ کہتے ہوئے پان تھوک دیا اور قاضی جی نے اُسے اپنے ہاتھ پر لے لیا۔ آنًا فانًا امیر شریعت کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ گیا اور قاضی صاحب کا ہاتھ بھی پھول کر ڈبل روٹی کی طرح ابھر آیا۔ تقریر سمیٹ لی اور جلسہ ختم کر دیا گیا۔ اس واقعہ نے شہر کے عوام کو پریشان کر دیا اور قاضی جی کا تمام گھر پاگل ہو گیا۔[1] اکثر

---

[1] رسالہ تجدید؟ احرار کبروڑ پکا ضلع ملتان

چمن داس ریٹائرڈ سول سرجن نے امیر شریعت کو دیکھ کر تشخیص کی کہ انہیں زہر دے دیا گیا ہے۔

اسی وقت پیاز کا پانی بڑی مقدار میں تیار کرایا گیا۔ ڈاکٹر نے اس پانی سے دوا دینا شروع کی تو جسم سے زہر کا رنگ پیشاب اور پاخانے کے راستے خارج ہونا شروع ہوا۔ پیاز کے مسلسل استعمال سے رات تین بجے تک جسم کا تمام زہر خارج ہو گیا۔ اس دوران ڈاکٹر چمن داس امیر شریعت کے سرہانے بیٹھے رہے۔ آخر ساڑھے تین بجے رات ڈاکٹر نے قاضی صاحب کو مبارک باد دی کہ اب شاہ جی خطرے سے باہر ہیں۔

زہر دینے والے کو پولیس صبح ہونے تک گرفتار کر چکی تھی۔ اس کا نام سید عنایت اللہ شاہ یا ولایت شاہ تھا۔ بہرحال جب اُسے امیر شریعت کے سامنے لایا گیا تو امیر شریعت نے اپنے زہر دینے والے سے مخاطب ہو کر صرف اتنا کہا:

"بھائی! میں نے آپ کا کیا نقصان کیا تھا؟"

پھر پولیس افسر سے کہا:

"میں اس سے کوئی انتقام لینا نہیں چاہتا۔ خدا بھی اسے معاف فرمائے آپ بھی معاف کر دیں!"

اگر ملزم پر قانون گرفت کرتا تو ممکن ہے ارتکاب جرم کا انکشاف ہوتا مگر امیر شریعت کی بلند حوصلگی نے یہ راز نہ کھلنے دیا کہ زہر کیوں دیا گیا تھا اور اصل مجرم کون تھا۔

آگرہ اور میرٹھ کے بعد امیر شریعت پر قتل کا یہ تیسرا حملہ تھا۔ گو حملوں کی

نوعیتیں مختلف رہیں مگر مقصود میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ قاتل اور مقتول بھی ایک دوسرے سے اوجھل نہیں ہوئے۔ چونکہ موت و حیات کے مابین انسانی ارادت کو کوئی دخل نہیں اس لیے موت کا ہر اوچھا وار زندگی کی راہ میں مرگ ناگہاں ثابت نہ ہو سکا اور نہ ہی امیر شریعت کے مقاصد میں کوئی دیوار حائل ہو سکی۔

پنڈت کرپا رام برہمچاری

ان ہی دنوں میر پور (کشمیر) کی انجمن اصلاح المسلمین کے سالانہ اجلاس میں امیر شریعت کو شمولیت کی دعوت ملی جسے انہوں نے منظور کر لیا لیکن ریاستی حکام اور برطانوی سامراج کسی طرح بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ امیر شریعت کشمیر کے کسی حصے میں داخل ہوں۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۳ء کے دوسرے ہفتے کی صبح کوچہ رنگریزاں امرتسر مسلح پولیس کے محاصرہ میں تھا۔ پولیس افسران امیر شریعت سے ایک نوٹس کی تعمیل کرانا چاہتے تھے جس کا مقصد یہ تھا کہ امیر شریعت کشمیر کی حدود میں داخل نہیں ہو سکتے۔ پولیس اپنے ارادے میں مایوس ہوئی کیونکہ امیر شریعت گھر نہیں تھے۔ اس ناکامی کے بعد پنجاب بھر کے تمام پولیس اسٹیشنوں کو مطلع کر دیا گیا کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو کسی صورت اور کسی راستے سے بھی کشمیر کی حدود میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ نیز تمام ریلوے اسٹیشنوں، لاریوں کے اڈوں اور دوسرے پیدل پہاڑی راستوں پر خفیہ پولیس تعینات کر دی گئی اور اس طرح امیر شریعت کی کھوج میں پوری مشینری حرکت میں آ گئی۔ امیر شریعت کو حکومت کے اس ارادے کی اطلاع ضلع جالندھر کے ایک گاؤں میں دی گئی۔

انسان اگر اپنے عزم میں مخلص ہو تو آسمانوں کی بلندیاں اُس کے قدم لیتی ہیں۔ ستارے فرشِ راہ ہوتے ہیں۔ سُورج کی کرنیں اُسے چاند کے ہالے تک لے جاتی ہیں لیکن حوصلے کی پستی نحوست کی معراج تک پہنچ کر بھی انسان کو اُس کی شکست سے نہیں بچا سکتی۔ تمام آئینی پابندیوں کے باوجود امیر شریعت نے اپنے وعدے پر میرپور پہنچنے کا فیصلہ کر لیا۔ پولیس اس یقین پر کہ امیر شریعت اب گھر نہیں آئیں گے اس مورچہ سے غافل ہو گئی۔ اسی رات بارہ بجے امیر شریعت گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ میرپور سے کوئی صاحب آپ کو لینے آئے ہوئے ہیں اور اس وقت وہ محلہ کی مسجد میں سو رہے ہیں۔ امیر شریعت نے انہیں بیدار کیا اور صبح چھ بجے کی گاڑی روانگی کا فیصلہ کر کے وہیں سو گئے۔ رات چار بجے اسٹیشن کے ایک ویران کونے میں جا پہنچے۔ نیز ساتھی سے کہہ دیا کہ تم گاڑی میں میرے ساتھ نہ بیٹھنا۔ اگر مجھے آواز دینے کی ضرورت ہو تو شاہ جی کی بجائے "پنڈت کرپا رام برہمچاری" کہہ کر آواز دینا۔ ہندی میں پنڈت کے معنی اُونچی ذات کے ہیں اور مسلمانوں کے ہاں سید سردار کے معنی میں مستعمل ہے۔ کرپا ہندی میں عطا کرنے کو کہتے ہیں اور رام اللہ کے ہم معنی استعمال ہوتا ہے۔ ہندی میں برہمچاری مجرد کو کہتے ہیں۔ امیر شریعت نے بخاری کا وزن برابر رکھنے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا۔ اس طرح پنڈت کرپا رام برہمچاری سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ہم معنی بن گیا۔ اس طرح امیر شریعت نے اپنے بلند مقاصد کی ادائیگی اور پولیس کی گرفت سے محفوظ رہنے کے لئے اپنے نام کا ہندی ترجمہ کر لیا تاکہ پولیس یا کوئی دوسرا سرکاری آدمی چوکس نہ ہو۔

نیلے رنگ کا تہ بند، نیم آستین کی واسکٹ، سر پر موٹے کھدر کی سفید پگڑی

اور ہاتھوں سے خالی ۔۔۔ لیکن پنجاب پولیس امیرِ شریعت کو مندرجہ ذیل لباس میں دیکھنے کی عادی تھی ۔۔۔ سر پر کپڑے کی گول ٹوپی، نیم آستین کا لمبا کرتہ، گھٹنوں سے اونچا پاجامہ اور ہاتھ میں ایک موٹا ڈنڈا۔

اجنبی لباس میں ملبوس امیرِ شریعت نہ تو پولیس سے پہچانے گئے اور نہ سفر میں کسی دوسرے مسافر سے۔ جہلم کے اسٹیشن پر اترتے وقت ضرورت پڑی تو ہمراہی نے امیرِ شریعت کو تلاش کے لیئے پنڈت کرپا رام کہہ کر مسلسل پکارا۔ مگر امیرِ شریعت اُسے ریلوے سٹیشن سے دُور جا کر ملے ۔

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ‌ ‌ ‌ اِک مگر مرگِ ناگہانی اور ہے

میر پور، جہلم شہر سے نو میل دُور دریائے جہلم کے اُس پار آبادی کا نام ہے۔ یہ کشمیر کے ان باشندوں پر مشتمل ہے جن کے اکثر افراد پہلی جنگ عظیم میں بھرتی ہو کر استعماری فوج کے دوش بدوش لڑ چکے تھے۔ تحریکِ کشمیر کے دنوں میں بھی اس بستی کے عوام نے اپنی آزادی کے لیئے مجلس احرار کے تحت بڑی قربانی کی تھی۔ پولیس کے انتظامات امرتسر سے جہلم تک مکمل ہو چکے تھے لیکن مجرم محافظوں کی آنکھوں میں دھول جھونک کر اپنی منزل کے سامنے کھڑا تھا۔

میر پور کے سامنے سے گزرتے ہوئے دریائے جہلم کی چیخ و پکار سے پتھروں کے دل دھڑک رہے تھے۔ ناخدا کشتیوں کے پتوار پھیلائے موجوں سے برسرِ پیکار تھے کہ امیرِ شریعت نے پتن پر قدم رکھا۔ پولیس ہر مسافر کی دیکھ بھال کر رہی تھی۔ حالات کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے امیرِ شریعت نے پتن پر سے دریا کو عبور کرنا مناسب نہ سمجھ کر دو میل اُوپر جا کر دریائے جہلم

کو پار کیا اور پھر کئی میل پیدل سفر کے بعد میر پور میں داخل ہوئے۔ ہمراہی کو متنبہ کیا کہ تم جاؤ لیکن میری آمد کی اطلاع نہ کرنا۔ میں آپ سے آپ جلسہ میں پہنچ جاؤں گا۔

انجمن کے سالانہ اجلاس کا آخری دن تھا۔ ریاستی حکام مطمئن تھے پنجاب کی پولیس اپنے کارنامے پر خوش تھی کہ عطاء اللہ شاہ بخاری ریاست میں داخل نہیں ہو سکا۔ منتظمین جلسہ نے اس خوف سے کہ انجمن کی بدنامی نہ ہو اور رات کے اجلاس میں لوگوں کی حاضری کم نہ ہو شہر میں منادی کرا دی کہ رات آخری اجلاس میں امیر شریعت عوام سے خطاب کریں گے۔ اجلاس شروع ہوا تو صدر جلسہ نے عوام سے معذرت کی:

"ہمیں افسوس ہے کہ امیر شریعت ریاستی اور برطانوی قانون کی پابندیوں کے باعث تشریف نہ لا ــــــ!"

ابھی یہ فقرہ ادھورا تھا کہ امیر شریعت نے جلسے کے ایک کونے سے آواز دی ــــ "آپ غلط کہتے ہیں" ــــ یہ فقرہ کہتے ہوئے اور مجمع کو چیرتے ہوئے اسٹیج کی جانب بڑھنے گئے۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کون دیہاتی ہے کہ صدر استقبالیہ کی بات کاٹ رہا ہے۔ اب امیر شریعت اسٹیج پر تھے اور بھاری بھرکم کھدر کی پگڑی اتار کر عوام کے سامنے کھڑے تھے۔ اس وقت مجمع کا حال دیکھنے والا تھا۔ آخر امیر شریعت نے صبح چار بجے تک تقریر کی۔

امیر شریعت کے میر پور پہنچنے کے نتیجے میں پنجاب پولیس اور ریاستی حکام کے کئی آفیسر معطل ہوئے اور انہی دنوں میر پور کے اکثر دیہاتوں میں بغاوت

پھیل گئی۔ سرکاری عمارات کو نذرِ آتش کیا گیا۔

قادیان کانفرنس

ضلع گورداسپور کا قصبہ قادیان مرزا غلام احمد کی نبوت کا مرکزی مقام تھا اور مرزائی اُمت بہت بڑی اکثریت میں یہاں آباد تھی۔ مرزائیوں کی جماعت احمدیہ نے حکومتی طرز پر اپنا نظام قائم کر رکھا تھا، جس کے تحت مختلف شعبے اور دفاتر قائم تھے۔ عملاً اس قصبہ میں جماعت احمدیہ اور اس کے خلیفہ مرزا بشیر الدین محمود کی حکومت تھی۔

غیر مرزائی عوام مسلمان، ہندو اور سکھ اپنی مذہبی اور معاشی زندگی میں آزاد نہ تھے یہاں تک کہ خلیفہ قادیان کی جانب سے ہر غیر مرزائی دکاندار کو یہ حکم تھا کہ اپنی دکانوں پر درج ذیل عبارت نمایاں طور پر آویزاں رکھیں:

"میں آئندہ سے مرزا غلام احمد کو حضرت مرزا غلام احمد صاحب کہوں گا۔
میں اپنے کسی مذہبی اجتماع میں شامل نہیں ہوں گا اور نہ ہی قادیان میں اپنے کسی عقیدے کے بزرگ کو آنے کی دعوت دوں گا۔
میں کسی ایسے دکاندار سے لین دین نہیں کروں گا جس کے پاس یہ اقرار نامہ نہیں ہوگا۔"

۱۹۲۸ء میں مولانا عبدالکریم[1] اور اُن کے خاندان نے مرزائیت سے

---

[1] اس وقت کے مرزائی مبلغ

تائب ہونے کا اعلان کیا جس کے نتیجے میں اُنہیں سخت اذیتیں دی گئیں اور اُن کی غیر منقولہ جائیداد کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ یہ خاندان ترکِ مرزائیت کے بعد قادیان سے بٹالہ منتقل ہو گیا۔

احرار رہنماؤں کی نظر میں مرزائی دینِ اسلام کے باغی اور برطانوی سامراج کے کھلے ایجنٹ تھے۔ مرزائیوں کے مظالم انتہا کو پہنچ رہے تھے اور کوئی بات پُرس نہ ہو رہی تھی۔ تو اُنہوں نے ریاست کشمیر کی طرح قادیان کے عوام مسلمان، ہندو اور سکھوں کی خدمت کرنا بھی دینی اور سیاسی ثواب سمجھا۔

مجلس احرار نے ۱۹۳۳ء میں قادیان میں اپنا دفتر قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور درپردہ دفتر کے لیے مکان کی تلاش شروع کر دی۔

قادیان کے مظلوم اور بےکس عوام کی زبردست خواہش تھی کہ کوئی اُن کے زخموں کی مرہم بن کر یہاں آئے مگر اُن کے دل خلیفہ قادیان کی قوت کے خوف سے دہشت زدہ تھے۔ وہ ہر اجنبی کو قادیانیوں کا جاسوس سمجھ کر نگاہیں ملانے سے کتراتے تھے۔ آخر مولانا عبدالکریم کے نیم سوختہ مکان میں دفتر مجلس احرار کی بنیاد رکھی گئی۔ علاؤالدین اور حبیب شاہ نامی دو رضاکاروں کو یہاں متعین کیا گیا۔ مرزائیوں کو جب اس کا علم ہوا تو اُنہوں نے دونوں رضاکاروں کی خوب پٹائی کی اور مولانا عبدالکریم کے مکانوں کو بھی مزید جلا کر خاک کر دیا۔

ان واقعات کی روشنی میں مجلس احرار نے اپنی تمام توجہ قادیان کی طرف مبذول کرنے کا فیصلہ کیا۔

۱۹۳۳ء مخصوص سیاسی حالات اور فرقہ وارانہ فضا کی بدولت ایک ہمہ گیر

سال تھا اور کسی دوسری تحریک کو ہوا دینا غیر ملکی حکمرانوں کی عمر بڑھانے کے مترادف تھا لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد انگریزی سامراج نے جن تحریکات کو از خود جنم دے کر پروان چڑھایا تھا مرزائیت اسی پودے کا ایک اہم بیج تھا۔ احرار رہنماؤں کے تدبر نے اس سے چشم پوشی کو ہندوستان سے غداری اور اسلام کے بنیادی عقیدہ ختم نبوت سے انحراف سمجھ کر قادیان کے نظامِ حکومت میں دراڑ ڈالنا ضروری خیال کیا۔ چنانچہ ۲۱، ۲۲، ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو قادیان میں امیر شریعت کی صدارت میں تبلیغی کانفرنس کرنے کا اعلان کیا۔ اس فیصلے سے مرزائی اور حکومت اپنی اپنی جگہ سوچ میں پڑ گئے۔ پنجاب میں خصوصاً احرار رضا کاروں نے کانفرنس میں شمولیت کی تیاریاں شروع کر دیں۔

برطانوی سامراج ذہنی طور پر اس تحریک سے مقابلے کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ کانگریس اور دوسرے مسلمان رہنما حقوقِ قومیت اور سوراج کی سرد جنگ میں مصروف تھے۔ دوسری جانب انگریز حکمران بین الاقوامی سیاست میں جرمن اور روس کے اتحاد میں اُلجھا ہوا تھا۔ بایں ہمہ احرار کشمیر کی لڑائی میں جس قوت کا مظاہرہ کر چکے تھے، حکومت اس سے بھی غافل نہیں تھی۔ تاہم احرار سے اُلجھاؤ نامناسب سمجھ کر کانفرنس کی تیاریوں میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ ڈالی گئی۔ حکومت کی اس سرد مہری کو دیکھتے ہوئے مرزائیوں نے واویلا کیا تو حکومت نے قادیان کی میونسپل حدود میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی۔ حکومت کے اس رویہ نے احرار کو ایک نیا ولولہ دیا لیکن وہ لڑائی کے موڈ میں نہیں تھے۔ لہٰذا قادیان کی میونسپل حدود سے باہر غیر مسلموں سے کانفرنس کے لیے جگہ حاصل کر لی گئی۔ ہندو سبھا ہائی اسکول کی عمارت مہمانوں کے لیے اور

سردار الیشر سنگھ کی زمین کانفرنس کے پنڈال کے لیئے لی گئی۔

پنجاب کے مختلف شہروں سے احرار رضا کاروں کے قادیان پہنچنے کے لیئے ریلوے حکام نے سپیشل گاڑیاں چلانے کا انتظام کیا۔ دہلی تک کے رضا کار جالندھر ریلوے اسٹیشن پر اور پشاور تک کے رضا کار لاہور ریلوے اسٹیشن پر جمع ہو گئے۔ دونوں سپیشل گاڑیاں جب مقررہ اوقات پر قادیان کو روانہ ہوئیں تو یہ نظارہ بھی دیدنی تھا۔ گاڑی کے انجن اور ہر ڈبے پر مختلف مقام کے رضا کاروں کے سُرخ جھنڈے اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ جب دونوں سپیشل گاڑیاں امرتسر پہنچیں تو امیر شریعت ان کے استقبال کے لیئے پہلے سے وہاں موجود تھے۔ دونوں کے درمیان امیر شریعت کے لیئے ایک تیسری گاڑی کا امرتسر سے علیحدہ انتظام تھا جس نے بٹالہ اور دوسرے اضلاع کے رضا کاروں کو بھی سوار کرانا تھا۔ احرار کا یہ سُرخ اژدہا امیر شریعت کی معیت میں جب قادیان پہنچا تو اس سرزمین نے ایک نئی کروٹ لی۔ کفر پر اسلام کی یلغار اس عہد کا عظیم واقعہ تھا۔

امیر شریعت قادیان ریلوے اسٹیشن سے ہزاروں رضا کاروں کے جلو میں پیدل پنڈال تک پہنچے جہاں ایک نیا شہر آباد تھا۔ ہر طرف چھولداریاں اور خیمے نصب تھے۔ ان پر لہراتے ہوتے سُرخ پرچم ہواؤں سے کھیل رہے تھے سُرخ وردیوں میں احرار رضا کار اس طرح لگتے جیسے بیر بہوٹیاں پہاڑوں کی شاہراہوں پر بکھری پڑی ہوں۔

احرار رہنماؤں کے علاوہ ہر مکتبہ فکر کے علماء نے اس اجتماع میں شرکت کی۔ ۲۱ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو لاکھوں انسانوں کی موجودگی میں نمازِ عشاء کے بعد احرار

قابلِ دید

تبلیغ کانفرنس کا پہلا اجلاس حضرت امیر شریعت کی صدارت میں شروع ہوا۔ امیر شریعت حسب عادت رات دس بجے صداقتی تقریر کے لئے کھڑے ہوئے۔ آسمانوں نے ستاروں کو رات بھر جاگنے کی تاکید کر دی۔ ہواؤں نے مہمانوں پہ اپنے سائے پھیلا دیئے۔ چاند نے رات کے اندھیرے پر اپنی سفید چادر ڈال کر کفر کا مکروہ چہرہ ڈھانپ دیا۔ امیر شریعت گویا ہوئے تو کفر گوش بر آواز تھا تمام رات دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے اور سنتے رہے۔ صبح کی اذان کے ساتھ امیر شریعت نے اپنی تقریر ختم کی۔ کانفرنس کی باقی کارروائی تین دن میں مکمل ہوئی۔

گرفتاری

سانحہ شجاع آباد نے حرم امیر شریعت کو ایسا غم دیا کہ وہ دائم المریض ہو کر رہ گئیں۔ زہر ملنے کی اطلاع جیسے ہی امرتسر پہنچی۔ گھر میں اہلیہ محترمہ کو خون کی قے آئی۔ بعد میں ڈاکٹروں کی تحقیق نے ٹی بی کی نشان دہی کر دی۔ امیر شریعت کی تہی دامنی اس شاہی مرض کے علاج کی متحمل نہیں تھی۔ وہ خاصے پریشان رہنے لگے سیاسی اور مذہبی سرگرمیوں میں تعطل آگیا۔ مسکراتا چہرہ گھریلو پریشانیوں کی نظر ہو گیا۔ مخالف موسم مرض کا ہمنوا ہوا۔ ڈاکٹروں نے رائے دی کہ مریضہ کو کسی پہاڑی مقام پر رکھا جائے لیکن گرہ میں اس قدر حوصلہ کہاں تھا کہ پہاڑوں کا بوجھ سہہ سکے۔ تاہم بادل نخواستہ دوستوں اور حکما کی رائے پر سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ بیوی بچوں کو مسوری لے گئے۔ وہاں علاج شروع کر دیا گیا۔

ایک دلچسپ واقعہ

اگر گھریلو معاملات میں اطمینان نہ ہو تو قلب ونظر کا سکون بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ امیر شریعت دیکھنے کو مسوری ایسی خوشنما اور دلفریب فضا میں رہ رہے تھے مگر رفیقہ حیات کی بیماری نے یہ جنت بھی جہنم بنادی تھی۔ اسی عالم میں ایک دن امیر شریعت کی چھ سات سالہ بچی گھر سے کھیلنے بازار اتری کر غائب ہو گئی۔ بچی کی گمشدگی نے سارے گھر کے ساتھ حلقہ احباب کو بھی پریشان کر دیا۔ مسوری کے نشیب وفراز کھنگال ڈالے گئے مگر بچی کا کوئی پتہ نہ چلا۔ بستر پر مریضہ کی حرارت بڑھ گئی۔ برطانیہ جیسی سلطنت کو للکارنے والے پیشانی سے پسینہ پونچھنے لگے۔ دوستوں کے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ اسی طرح دن گزر گیا اور شام کے چراغوں نے مسوری کو جگمگا دیا۔ اتنے میں ایک انگریز خاتون بچی کو لے کر گھر پہنچی۔ دیکھتے ہی امیر شریعت نے بچی کو سینے سے لگا لیا اور انگریز عورت سے تلخی اور غصے میں کہا:

"تم نے یہ کیا کیا؟ تم کون ہو؟ میرے گھر کا نظام تو نے درہم برہم کر دیا۔"

انگریز خاتون امیر شریعت کی یہ گفتگو نہ سمجھ سکی مگر اس نے انگریزی میں کہا:

"عرصہ ہوا میری بچی جو شکل وصورت میں بالکل ایسی ہی تھی فوت ہو چکی ہے۔ مجھے یہ بچی بہت بھلی معلوم ہوئی۔ میں آپ کی اطلاع کے بغیر اسے لے گئی۔ مجھے معاف کر دیں —— لیکن آئندہ ہر صبح میں اسے یہاں سے لے جایا کروں گی اور شام کو چھوڑ جایا کروں گی۔"

اس پر امیر شریعت نے کہا:

"تو ماں ہے۔ اگر ماں کے دکھی دل کو میرے دل کے ٹکڑے سے کوئی سکون مل سکتا ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن یہ دیکھنا کہ اس کی مریض والدہ بھی اسی کے سہارے زندہ ہے۔"

چنانچہ اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا۔ کئی دنوں کے بعد انگریز خاتون اپنے خاوند کے ساتھ مسوری سے جانے لگی تو اس نے بلیوں کا نہایت خوبصورت جوڑا بچی کے کھیلنے کے لیے دے دیا۔ بلیاں اچھی نسل کی تھیں۔ گھر کے ہر فرد سے مانوس ہو گئیں۔ بچی کو کھیلنے کے لیے جیتے جاگتے کھلونے مل گئے۔

قادیان تبلیغ کانفرنس نے مرزائی خلافت اور ایوانِ برطانیہ میں ارتعاش پیدا کر دیا تھا۔ مرزائیت کی اڑتی ہوئی خاک میں خلیفہ قادیان کو موت کے نقشے ابھرتے دکھائی دینے لگے۔ باطل دعووں کی ایک ایک لکیر مٹنے لگی۔ آخر خود کاشتہ پودے کی حفاظت کے لئے امیر شریعت کو قادیان کانفرنس کی تقریر کی بنا پر دفعہ ۱۵۳ ف کے تحت مسوری سے گرفتار کر لیا گیا۔[1] لیکن دوسرے ہی دن ڈیڑھ دن میں انہیں ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ یہ ضمانت ڈاکٹر محمد امیر صاحب نے دی جو ان دنوں ڈیرہ دون ڈسٹرکٹ ہسپتال کے انچارج تھے۔

امیر شریعت کو جس دن مسوری سے گرفتار کیا گیا اس دن اور رات کو اس گرفتاری سے اہل خانہ تو بہر حال پریشان تھے لیکن بلیوں کے جوڑے میں سے نر نے تمام دن اور رات بغیر کچھ کھائے مکان کی چھت پر کھلی فضا میں وقت گزارا

---

[1] دسمبر ۱۹۳۴ء

حالانکہ گھر کے سب لوگ اُسے دُودھ پینے کے لیے پچکارتے رہے مگر وہ نیچے نہ اترا۔ جیسے ہی امیر شریعت ضمانت پر رہا ہو کر مسوری پہنچے اور گھر والوں نے اُن سے اس واقعہ کا ذکر کیا تو اُنھوں نے فوراً آواز دی۔ بلاّ جلدی سے نیچے اتر کر امیر شریعت کے پاؤں چاٹنے لگا اور دُودھ بھی پی لیا۔

بعد میں یہ مقدمہ ضلع گورداسپور کے مجسٹریٹ مسٹر دیوان سُکھا نند کی عدالت میں تقریباً دو ماہ زیر سماعت رہا۔

مجذُوبؒ کی دُعا

مقدمہ گورداسپور کی مصروفیت کے باوجود امیر شریعت اپنے مشن کے لیے رواں دواں رہے۔ ۱۹۳۴ء کا سال آخری دموں پر تھا کہ معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موقع پر امیر شریعت کو ملتان جانا پڑا۔ جلسے کی حاضری تاحدِ نظر تھی اور اس پر خاموشی کا یہ عالم جیسے انسانی سروں پہ پرندے بیٹھے رہے ہوں رات کے اس سکوت کو صرف امیر شریعت کی آواز توڑ رہی تھی۔ واقعہ معراج النبی کا ذکر کرتے ہوئے اُسے تمثیلی انداز میں پیش کیا۔ اور حاضرین کی محویت کا یہ عالم تھا کہ وہ محسوس کرنے لگے جیسے کہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری اُن کے سامنے سے گزر رہی ہے۔ عین ایسے وقت میں مجمع سے ایک مجذوب اٹھا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھا کر اُس نے ملتانی زبان میں کہا:

"سیّدا! اِنشاءاللہ اِتھائیں دفن تھیویں!" (اے سیّد! خدا کرے آپ یہیں (ملتان میں) دفن ہوں)

شاید یہ قبولیت کا وقت تھا کہ دل سے نکلی ہوئی بات حقیقت بن کر رہی ــــ:

مقدمہ کی روئیداد

بظاہر ۱۵۳ الف کا مقدمہ اپنے اندر کوئی ایسی جاذبیت نہیں رکھتا کہ قانون اور ملزم کے درمیان انصاف کرنے والی عدالت کو الجھاؤ محسوس ہو لیکن امیر شریعت کے اس مقدمہ نے صرف عدالت کو بلکہ حکومت کی پوری مشینری کو اپنی جانب متوجہ کر لیا۔ مقدمہ کے دوران ہر پیشی کے دن ہزاروں انسانوں کا احاطہ کچہری میں ہجوم، عدالت پر بارگراں ثابت ہوتا۔ اس روز دیگر عدالتوں کا کام بھی معطل ہو جاتا۔ امرتسر سے گورداسپور کے درمیان ریل گاڑیوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ ملتی۔

جمعۃ الوداع

(انہی دنوں مجلس احرار نے اعلان کیا کہ رمضان المبارک کا آخری جمعہ گورداسپور میں امیر شریعت پڑھائیں گے۔ اس اعلان کے ہوتے ہی پنجاب بھر کے مسلمان گورداسپور پہنچنے کے لیے پر تولنے لگے۔ حکومت پنجاب نے بھی جو شروع سے مسلمانوں اور قادیانیوں کے درمیان تماشائی تھی، جمعہ کے اجتماع میں مداخلت مناسب نہ سمجھی۔

شہر سے باہر کھلے میدان میں نماز جمعہ کا انتظام کیا گیا۔ گورداسپور کی

سرزمین امن یوں اپنے مہمانوں کو سنبھالنے سے قاصر تھی۔ شہر کا دامن اپنی ساری وسعتوں کے ساتھ تنگیِ دامنی کا شکوہ کر رہا تھا۔

امیر شریعت سر پر عربی طرز کا رومال باندھے، ہاتھ میں کلہاڑی سنبھالے جب جمعہ کے خطبہ پر کھڑے ہوتے تو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی عربی شہسوار ہے جو ابھی گھوڑے سے اُتر کر فوج سے میدان جنگ میں خطاب کر رہا ہے۔ زبان کی شیرینی اللہ کے کلام کی صورت میں بانٹی جا رہی تھی۔ جس سے لاکھوں انسانوں کے دلوں کی جھولیاں بھر رہی تھیں۔ نظریں تھیں کہ امیر شریعت کو چاٹ رہی تھیں۔ دل تھے کہ بلیوں اچھل رہے تھے۔ اور امیر شریعت تھے کہ لاکھوں انسانوں کے جذبات سے کھیل رہے تھے۔

نماز سے فارغ ہو کر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے امیر شریعت کے ہاتھ پر بیعت کی تجویز پیش کر دی جسے امیر شریعت نے قبول کر لیا۔ ایک ایک آدمی اگر بیعت کے لئے آتا تو ہفتوں لگ جاتے مگر امیر شریعت نے حکم دیا کہ میرے رُومال کے ساتھ ایک پگڑی کو گرہ دے لو اور پھر اس سے تولئے، رُومال، چادریں اور پگڑیاں باندھتے جاؤ جس کا ہاتھ ان کپڑوں سے لگ جائے گا وہ میری بیعت میں اپنے کو داخل سمجھیں۔ بس پھر کیا تھا۔ لاکھوں انسانوں کے سروں پر پگڑیوں، چادروں، تولیوں اور رُومالوں کا ایک جال بن دیا گیا۔ یہ سلسلہ ختم ہوا تو امیر شریعت نے بیعت ہونے والوں کو شرعی احکام سمجھائے۔ نیز فرمایا کہ کل ہر شخص اپنے اپنے گھر پہنچ کر ایک پوسٹ کارڈ پر اپنا نام اور پتہ درج کر کے مجھے بھیج دے۔

۲۳ مارچ ۱۹۲۵ء کو جب خلیفہ قادیان مرزا بشیر الدین محمود امیر شریعت کے مقدمہ میں بطور گواہ صفائی اپنی شہادت دینے آئے تو خطوط سے بھری ہوئی سات بوریاں امیر شریعت نے عدالت کے سامنے پیش کیں جو بیعت کرنے والوں نے اطلاعاً لکھے تھے۔ تاکہ حکومت اور خلیفہ قادیان کو معلوم ہو سکے کہ میرے روحانی مریدوں کی تعداد بھی کئی لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔

خلیفہ قادیان کی شہادت چار دن تک جاری رہی اور اس دوران اُن کی نگاہیں بار بار خطوط سے بھری ہوئی بوریوں سے ٹکراتی رہیں۔

فردِ جرم

عدالت نے امیر شریعت پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے لکھا:۔

"ملزم نے اپنی تقریر کے دوران ملک معظم کی رعایا کے دو طبقات احمدیوں اور غیر احمدیوں کے درمیان دشمنی یا حقارت پیدا کرنے کی کوشش کی۔

لفظ "طبقات" مذہبی فرقوں پر اطلاق پاتا ہے"

امیر شریعت نے فردِ جرم کے جواب میں کہا:۔

"میری تقریر کے جن حصوں کے متعلق شکایت کی گئی ہے وہ مسخ شدہ عبارتیں ہیں جس سے میری اصل تقریر کے معنی ہی بدل دیئے گئے ہیں۔ میں اقبال کرتا ہوں کہ میں نے اپنی تقریر میں یہ لفظ کہے تھے کہ نبی کبھی دھوکے باز نہیں ہوتا

تبلیغ کانفرنس میں جہاں میں نے تبلیغ اسلام کی اشاعت کے لیے خطبۂ صدارت پڑھا تھا مرزا بشیرالدین اور مسلمانوں میں حقارت پیدا کرنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا۔ مرزائی چالیس کروڑ مسلمانوں کو، مرزا غلام احمد کو نبی نہ ماننے کی وجہ سے کافر سمجھتے ہیں اور چونکہ یہ مذہبی اختلافات ہیں۔ اس وجہ سے احمدیوں اور غیر احمدیوں میں شادی بیاہ کے اور دوسرے تعلقات ممکن ہی نہیں۔ مرزائی مسلمانوں کے بچوں کا جنازہ بھی نہیں پڑھتے اور وہ مسلمانوں کے متعلق خنزیر کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ان کی عورتوں کو گالیاں دیتے ہیں اور کتیا سے بھی برے لفظ استعمال کرتے ہیں۔"

اگر ضرورت ہوئی تو میں ایک تحریری بیان شامل کر دوں گا۔

تحریری بیان

دیوان سکھانند ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گورداسپور نے امیر شریعت کے تحریری بیان کے حسب ذیل اقتباسات اپنے فیصلے میں نقل کیے ہیں۔

"شعبہ تبلیغ مجلس احرار کا فرض تھا کہ اسلامی دنیا کو متنبہ کر دے کہ وہ اپنے تئیں جماعت قادیانی کے جھوٹوں، دھوکوں، غلط الزامات اور عیاریوں سے بچائیں۔

"ضمیمہ انجام آتھم" اور "نزول المسیح" جو مرزا غلام احمد قادیانی بانیٔ

جماعت کی لکھی ہوئی کتابیں ہیں جو پیر مہر علی شاہ گولڑوی اور دیگر مقتدر ہستیوں کے خلاف سخت الفاظ اور گالیوں پر مشتمل ہیں۔"

"خداوند یسوع المسیح کو بھی اس مسیح موعود نے نہیں چھوڑا۔"

"تریاق القلوب" و "نور الحق" اور بہت سی کتابیں مرزا غلام احمد کی لکھی ہوئی اور انگریزوں کے ساتھ اس کی وفاداری اور چاپلوسی اور برٹش گورنمنٹ کی بے نظیر خدمات کا ثبوت ہیں۔

"نور الحق" میں مرزا غلام احمد نے لکھا ہے کہ گورنمنٹ (برطانیہ) سے غداری خدا اور رسول سے غداری کے برابر ہے اور اگر اس بارے میں مرزائی بھی غدار ہو جائیں تو ان سے بڑا غدار کوئی نہ ہوگا۔"

"میں نے کہا تھا کہ او بہرشیا[1]! تو نبی بنا تھا تو تجھے وہی وقار قائم رکھنا چاہیے تھا۔ جب نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو تمہیں انگریزوں کے کتے نہ بننا چاہیے تھا۔ تم انگریزوں کے بغیر دم کے کتے ہو۔"

۱۰۔ "موجودہ خلیفہ کے وقت میں قادیان کے لوگوں پر ہر قسم کا دباؤ ڈالا جاتا ہے اور تشدد کا استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ اس دور کے بارے کوئی عینی شاہد واقع شدہ مظالم کی گواہی دینے کو بھی تیار نہیں ہوتا محمد امین کو دن دہاڑے مار ڈالا گیا۔ مباہلہ بلڈنگ گرا کر جلا دی گئی۔ لیکن حکومت مجرموں کو پکڑ نہ سکی اور نہ ان کا چالان کیا گیا اور نہ کوئی اور کاروائی ان کے خلاف کی گئی۔ یہ موجودہ خلیفہ کی حکومت کا نتیجہ ہے۔ اس کا اثر مظلوموں

---

[1] پنجابی لفظ ہے۔

اور اُن کے ہم خیالوں کے دلوں پر ظاہر ہے۔ ان لوگوں کو یقین ہو گیا تھا کہ سوائے خلیفہ کے انگریزوں کی کوئی حکومت قادیان میں نہیں اور خلیفہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ محمد امین کے قتل سے اُن مسلمانوں میں تبلیغ کرنے کا راستہ کھل گیا جن کے دل پہلے ہی ڈر سے زخمی ہو گئے تھے۔"

"ملزم نے اُس شخص کو چیلنج کیا جسے اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا اور جس سے تمام ڈرتے تھے۔ مرزائیوں اور اُن کی نبوت اور خلافت کے متعلق ملزم نے کہا کہ اب یہ نہیں رہے گا۔"

"ملزم نے بیان کے آخری حصے میں بطور صفائی کے کہا کہ جماعت احمدیہ نے اپنے کاموں سے اپنے خلاف دنیا میں اتنی نفرت پیدا کر لی ہے کہ میرے لئے اُن کے خلاف نفرت پیدا کرنا بے فائدہ تھا۔ بالخصوص اس حالت میں میرا مقصد یہ نہ تھا کہ میں نے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دینے کے الفاظ استعمال نہیں کیے۔"

(امیر شریعت کی تقریر جسے عدالت نے اپنے فیصلے میں نقل کیا)

"اب ہم ملزم کی تقریر کی طرف آتے ہیں۔ سامعین جو کہ اکثر گنوار تھے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ملزم نے دوران تقریر کہا۔ اس علاقہ میں جہاں بُت خدائی کا دعوے کرتے ہیں ہم غریبوں کا اکٹھا ہونا جن میں سے اکثر کا کوئی گھر بھی نہیں، کوئی معمولی بات نہیں۔ پھر ملزم نے کہا، فرعون کا تخت الٹا جا رہا ہے اور خدا نے چاہا تو یہ نہیں رہے گا۔ پھر قادیان کے متعلق ملزم نے کہا۔ اس علاقہ میں حکومت کے اندر ایک اور حکومت پیدا ہو

گئی ہے۔ جہاں ظلم، ناانصافی، تکبر اور غرور اتنا بڑھ گیا ہے کہ جب بخاری
مسوری سے امرتسر کو آیا تو پولیس سائے کی طرح اس کے ساتھ لگی رہی
اور امرتسر پہنچنے پر اسے دفعہ ۱۴۴ کے تحت دو سب انسپکٹروں نے
نوٹس دیا۔ اس موقع پر ملزم نے پولیس کو جنوں کی فوج قرار دیا۔ پھر تقریر
کرتے ہوئے کہا، اللہ اللہ! قادیاں میں غریب شاہ پٹ جاتا ہے۔ ظالم
سمجھتا ہے کہ وہ مر گیا اور حکومت کہتی ہے کہ گواہ نہیں ملتا۔ یہ چشم پوشی
ہے اور ہم اتنے ذلیل ہیں۔ اس لہجہ میں ملزم نے قادیان کی طرف اشارہ
کرتے ہوئے کہا کہ یہاں احمدیوں نے ریاست بہاولپور، پٹیالہ اور کشمیر
جیسے اختیارات حکومت سے حاصل کر لیے ہیں اور ہمیں استنجا تک کرنے کی
اجازت نہیں۔

پھر اس موقعے پر قیام امن کے لیے پولیس متعین کیے جانے کی
طرف اشارہ کر کے اور احمدیوں کی اس کانفرنس کے ناکام کرنے کی کوشش
کی طرف اشارہ کر کے ملزم نے کہا اگر یہ احرار کی تبلیغی کانفرنس نہ ہوتی
تو نہیں معلوم کیا ہو جاتا۔ آج پیروان حسین ہتھکڑیاں پہنے ہوتے۔
ملزم نے لوگوں کو تلقین کی کہ دلیری سے تکلیفیں برداشت کریں
اور اپنے رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے قدموں کی پیروی کریں۔ ملزم
نے خلیفہ قادیاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ وہ ایک نبی کا بیٹا
ہے۔ میں نبی کا نواسہ ہوں۔ وہ آئے تم خاموش بیٹھے رہو۔ وہ میرے ساتھ
اردو، پنجابی، عربی اور فارسی میں تمام مسائل پر بحث کرے تو اس جھگڑے

کا آج ہی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ وہ پردے سے نکلے، لنگوٹ اٹھائے اور حکومت کو ہمارے اختلاف کے بارے میں درمیان میں نہ لائے۔ وہ کشتی کرے اور مولا علی رضی اللہ عنہ کے جوہر دیکھے اور جس شان سے چاہے آئے۔ وہ موٹر میں آئے، میں پیدل آؤں۔ وہ حریر پہن کر آئے، میں کھدر کا کرتا پہن کر آؤں۔ وہ اپنے ابا کی سنت کے مطابق عنبر بھنا ہوا گوشت، یاقوتیاں اور پلومر کی ٹانک وائن پی کر آئے اور میں اپنے نانا کی سنت کے مطابق جو کی روٹی کھا کر آؤں۔ اُسے حکومت سے مدد نہیں مانگنی چاہیے۔ اکیلا آئے اور بخاری کے جوہر دیکھے۔

اگر ہم یہاں دو چار سال رہے تو خدا کے فضل سے یہ بالکل تباہ ہو جائیں گے۔ اخبار "زمیندار" اور اس کے ایڈیٹر مولانا ظفر علی خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور اپنے اس کانفرنس کے صدر ہونے کی طرف اشارہ کرکے ملزم نے یہ بھی کہا کہ ہندوستان کے کسی مولوی میں اس طرح قادیان میں آنے کی طاقت نہیں۔ یہ کسی اکیلے آدمی کا کام نہیں۔ یہ ایک جماعت کی طاقت ہے۔ جماعت کے سر پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے۔ حکومت آج آزما کر دیکھے کہ باوجود پابندیوں کے جو حکومت نے لگا دی ہیں اور باوجود جماعت احمدیہ کی مخالفت کے غلامانِ محمد صلے اللہ علیہ وسلم اتنی تعداد میں نظر آتے ہیں۔

پھر قادیان اور خلیفہ کا ذکر کرکے ملزم نے کہا ہم سب کو ایک عزم یہاں لایا ہے اور وہ یہ ہے کہ اس ناپاک زمین کو پاک کیا جائے۔ خدا اس زمین کو پاک کرے۔ کیونکہ یہاں خاتم النبیین کی توہین ہوتی ہے۔ اس جگہ

پیارے مدنی ؐ کی رسول موجود نہیں ہیں۔ یہاں شرک ہے اور یہاں چالیس کروڑ مسلمانوں کے تیرہ سو سالہ قبلہ کے احترام کی ہتک کی جاتی ہے۔ میں ایک بات جانتا ہوں کہ خواہ کوئی شخص مکہ میں پیدا ہوا اور مکہ ہی میں مرے لیکن اگر اس نے رسول ؐ سے محبت نہ رکھی تو اس کی نجات نہیں ہو سکتی۔ میں غریب ہوں اور اپنے دلی خیال کا اظہار کرتا ہوں۔ حکومت کو یاد رکھنا چاہیئے کہ جو شخص نبوت کی قمیض تک نہیں چھوڑتا ہم اس کے لئے طاعون اور ہیضے کی طرح ہیں۔ اگر حکومت کوئی اور ہاتھ دیکھنا چاہتی ہے تو اس کی مرضی"

تم نے ہمیں سینکڑوں بار آزمایا ہے۔ قبل ازیں خلافت اور مقامات مقدسہ کے احترام کا سوال اٹھا۔ رسول اکرم ؐ کی عزت پر حملہ کیا گیا تو یہ احمدی خوشی کے مارے اچھل پڑے۔ جب ملک کا سوال اٹھا" انہوں نے کہا کہ یہ (مرزائی) ہندوستان کے ساتھ تعلق نہیں رکھتے اور صرف خدا کے رسول سے تعلق رکھتے ہیں۔ حکومت نے ہماری طاقت کو نہیں آزمایا۔ اب گیارہ بجے ہیں۔ سورج نکلنے میں ابھی سات گھنٹے باقی ہیں اور یہاں ہزاروں لوگ جمع ہیں۔ حکومت کو اپنی طاقت ہٹا لینی چاہیئے۔

میں گورنمنٹ کے سامنے مسلمانوں کے مطالبات پیش کرنا چاہتا ہوں لیکن اس شخص کا کیا حشر ہو گا جو حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبی ہونے کا دعوےٰ کرتا ہے۔

یہ ہمارے ساتھ کیا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ یہ انگلستان والوں کے دُم کٹے سکتے ہیں اور انگریزوں کی چاپلوسی بھی کرتے ہیں اور ان کی جوتیوں کے

تبلیغ صاف کرتے ہیں۔ میں فخر نہیں کرتا اور خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں اگر مجھے اکیلا چھوڑ دیا جاتے تو تم میرے اور بشیر کے معرکے دیکھو۔

میں کیا کہوں لفظ تبلیغ نے مجھے مشکل میں ڈال رکھا ہے۔ یہ پولیٹیکل کانفرنس نہیں ہے۔ اگر باہیں ڈھیلی چھوڑ دی جائیں تو مرزائیو! میں تمہیں کہتا ہوں کہ تم پیشاب کی جھاگ کی طرح بیٹھ جاؤ۔ ہم نے کبھی حکومت سے امداد حاصل نہیں کی۔ ان کی نبوت اور خلافت حکومت کے سہارے کھڑی ہے۔ تمہیں کیا پتہ یا پانچ سال کے عرصہ کے اندر اندر یہ پولیس ہمارے قبضہ میں ہوگی۔

پھر علماء سے جو اسٹیج پر بیٹھے تھے ملزم نے مخاطب ہو کر پوچھا کہ آیا جو شخص پانچویں جماعت میں فیل ہو جائے وہ نبی بن سکتا ہے؟ ہندوستان میں تو اس کی ایک مثال موجود ہے کہ ایک شخص نے فیل ہو کر نبی کا دعویٰ کیا۔ پھر ملزم نے کہا کہ حدیث اور تفسیر سے ثابت ہے کہ مرزا غلام احمد نبی نہیں تھا اور کہ نبی دھوکے باز نہیں ہوتا۔ پھر اب دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی گئی ہے۔ حریف شاہ کو مارا گیا۔ محمد امین کو قتل کیا گیا۔

او مسیح کی بھیڑو! تم سے نپٹنے کے لئے کوئی نہیں آیا۔ ہاں اب تمہارا مجلس احرار سے مقابلہ ہے۔ اس نے تمہیں ٹکڑے ٹکڑے کرنا ہے۔ یہ مرزائی ہر جگہ ایک ہی ہیں۔ انگریز اگر مکہ پر بھی قبضہ کر لے تو یہ وہاں بھی ان کی امداد کریں گے۔ او مرزائیو! یہ تمہاری نبوت کی تصویر ہے اور یہ حکومت سے مخفی نہیں ہے۔ تم اس کی دیر تک خدمت کرتے رہے ہو اور تم اس کے ناصح اور خیر خواہ ہو۔

یہ ہندوستانی نبی ڈپٹی کمشنر کے پاس جا جا کر کہتا ہے کہ میں نے اور میرے باپ نے حکومت کی بڑی خدمتیں کی ہیں۔ او خبیث! اگر تم نبی ہو گئے تھے تو تمہیں اپنا وقار قائم رکھنا چاہیئے تھا۔

ملزم نے ایک جھوٹے مدعی کی مثال بیان کی جس نے شہنشاہ عالمگیر کو گمراہ کیا تھا اور کہا اگر نبوت ہی کا دعویٰ تھا تو پھر تمہیں انگریزوں کا کتا نہیں بننا چاہیئے تھا۔ تُف ہے اور لاکھ لعنت ہے اس نبوت پر۔۔۔!

کتاب "آئینہ کمالات" کا ذکر کر کے ملزم نے کہا مرزا غلام احمد نے لکھا ہے کہ وہ جو مجھے نہیں مانتا حرامی ہے۔

میں حکومت سے دریافت کرنا چاہتا ہوں اور حکومت کو جواب دینا ہوگا۔ اگر ایسا ہی کوئی لفظ "زمیندار، احسان، سیاست، احرار" میں چھپ جائے تو یہ تمام اخبارات ضبط ہو جائیں گے لیکن یہ مرزائی حرامی کا لفظ استعمال کریں تو کوئی ایکشن نہیں لیا جاتا۔ "انوار اسلام" بھی جو مرزا غلام احمد کی لکھی ہوئی کتاب ہے کہتا ہے کہ مرزا غلام احمد کے مخالفین جو اس پر ایمان نہیں رکھتے سور (خنزیر) ہیں اور ان کی بیویاں کتیاں ہیں۔

تقریر ختم کرنے سے پہلے ملزم نے حکام کو مخاطب کر کے کہا کہ کانفرنس کے انعقاد سے ہماری غرض لڑائی نہیں بلکہ اس علاقے کے مظلوم مسلمانوں کا بچاؤ ہے۔ پھر سامعین کو یاد دلایا کہ مرزائی دفعہ ۱۴۴ تعزیرات ہند کے نافذ کرا لینے پر بھی شرمندہ نہیں ہیں۔

فیصلہ

میں ملزم کو زیر دفعہ ۱۵۳ الف تعزیرات ہند حضور ملک معظم کی رعیت کے دو فرقوں میں یعنی احمدیوں اور دوسرے مسلمانوں کے درمیان نفرت ڈالنے کے الزام میں مجرم قرار دیتا ہوں۔ فیصلہ کے متعلق اس بات کا پورا احساس رکھتے ہوئے کہ یہ تقریر ایک تبلیغی کانفرنس میں ہوئی تھی میں سمجھتا ہوں کہ چھ ماہ قید بامشقت اس کے لیے کافی ہوگی۔ پس میں ملزم کو چھ ماہ قید بامشقت کی سزا دیتا ہوں۔ اس کے ساتھ بی کلاس کے قیدیوں کا سا برتاؤ کیا جائے۔ دستخط کھانند

مجسٹریٹ درجہ اوّل گورداسپور مورخہ ۲۰/۴/۱۹۳۵

سیشن کورٹ میں اپیل

(ماتحت عدالت کے فیصلہ کے خلاف سیشن کورٹ میں اپیل دائر کی گئی۔

ابتدائی سماعت میں امیر شریعت ضمانت پر رہا کر دیئے گئے۔)

مقدمہ کی پیروی کے لیے بخاری ڈیفینس کونسل قائم ہوئی جو چار وکلاء پر مشتمل تھی:

۱۔ مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ ۲۔ شیخ شریف حسین پلیڈر

۳۔ شیخ چراغ الدین (جو بعد میں پنجاب ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے)

۴۔ لالہ پشاوری مل ایڈووکیٹ

مرزائیوں کی جانب سے چوہدری سر ظفراللہ خاں اور اُن کے بھائی
چوہدری اسداللہ خاں پیروکار تھے۔

اپیل کا فیصلہ

مسٹر جی ڈی کھوسلہ سیشن جج گورداسپور نے فریقین کے وکلا کی بحث
کے بعد حسب ذیل فیصلہ دیا۔

اپیلانٹ سید عطا اللہ بخاری کو تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ الف
کے ماتحت مجرم قرار دیتے ہوئے ۶ ماہ قید بامشقت کی
سزا اس تقریر کی بنا پر دی گئی ہے جو اُس نے احرار تبلیغ کانفرنس
کے موقع پر ۲۱ ر اکتوبر ۱۹۳۴ء کو کی تھی۔

اپیلانٹ کے خلاف فرد جرم پر نظر ڈالنے سے پہلے چند واقعات کا
بیان کرنا ضروری ہے۔ جو معاملہ زیر بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ تقریباً پچاس
برس کا عرصہ ہوا قادیان کے ایک شخص مسمی غلام احمد نے دنیا کو اعلان کیا کہ وہ
مسیح موعود ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی اُس نے اسلام کے اعلیٰ پادری
کی حیثیت اختیار کر لی جس کے ارکان اگرچہ مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں،
لیکن ان کے بعض عقائد اور اصول اسلام کے عام مسلمہ اصولوں سے بالکل
متضاد تھے۔ اس فرقے کا جو قادیانی یا مرزائی یا احمدی کہلاتا ہے امتیازی
نشان یہ ہے کہ اُس کے ارکان اس فرقے کے بانی کی رجس سے مرزا کہا جاتا
ہے ا نبوت پر کامل اعتقاد رکھتے ہیں جو تحریک اس طرح شروع کی گئی اُس

نے جلدی ہی شکل پکڑ لی اور آہستہ آہستہ لیکن غیر مشتبہ طور پر بڑھنا شروع کیا ابتدائی سکے پیرو چند ہزار کی تعداد میں ہو گئے۔ قدرتاً کچھ مخالفت ہوئی اور مسلمانوں کی اکثریت بانیٔ فرقہ کی مذہبی فوقیت کے گھمنڈ سے سخت ناراض ہوئی۔ مذہب کے مخالفوں نے "کافر" کے الزام کا جو مرزا نے ان پر لگایا شدت سے جواب دیا۔ مگر قادیانیوں نے اس بیرونی تنقید کا بالکل خیال نہ کیا اور اپنے وطن قادیان میں مقامی طور پر محفوظ ہوتے ہوئے جہاں تک ہو سکا حالات کے مطابق خوش حال رہے۔

مقابلتاً محفوظ ہونے کی اس حالت نے غرور پیدا کر دیا جس نے قادیانیوں میں تقریباً تمرّد کی شکل اختیار کر لی۔ اپنے دلائل کو منوانے اور فرقے کو ترقی دینے کے لیے انہوں نے ان ہتھیاروں کا استعمال شروع کیا جن کو عام طور پر نہایت ناپسندیدہ کہا جائے گا۔ انہوں نے ان اشخاص کے دلوں میں جنہوں نے ان کی جماعت میں شامل ہونے سے انکار کیا، نہ صرف بائیکاٹ، اخراج اور بعض اوقات اس سے بھی بدتر مصائب کی دھمکیوں سے دہشت انگیزی پیدا کی، بلکہ اکثر انہوں نے ان دھمکیوں کو عملی جامہ پہنا کر اپنے تبلیغی سلسلے کو مضبوط کیا۔ قادیان میں ایک والنیٹر کور مقرر کی گئی۔ جس کا منشا غالباً اپنے احکام کو منوانے کے لئے قوت پیدا کرتا تھا۔ انہوں نے عدالتی اختیارات کا استعمال بھی اپنے ذمے لے لیا۔ دیوانی مقدمات میں ڈگریاں صادر کی گئیں اور اجرا بھی کرایا گیا۔ فوجداری مقدمات میں سزا کے حکم سنائے گئے اور سزائیں بھی دی گئیں۔ لوگوں کو فی الحقیقت

قادیان سے نکال دیا گیا۔ قصہ یہیں ختم نہیں ہوتا۔ قادیانیوں پر صریح الزام لگایا گیا کہ انہوں نے مکانوں کو تباہ کیا، جلایا اور قتل بھی کیے گئے۔

اس خیال سے کہ کہیں یہ نہ سمجھا جائے کہ مذکورہ بالا واقعات محض احرار کے تخیل کی ایجاد ہیں یہ لازمی ہے کہ میں چند واقعی مثالیں بیان کر دوں جو اس مقدمے کی مسل پر لائی گئیں۔

کم از کم دو اشخاص کو اپنے وطن قادیان سے باہر نکالا گیا کیونکہ ان کے خیالات مرزا کے خیالات سے متفق نہ تھے۔ وہ اشخاص حبیب الرحمٰن نمبر ۲۸ اور اسمٰعیل ہیں۔ مسل پر ایک چھٹی ڈی زیڈ نمبر ۲۳ موجود ہے جس کا کاتب خود موجودہ مرزا ہے اور جس میں حکم دیا گیا کہ حبیب الرحمٰن گواہ صفائی نمبر ۲۸ کو قادیان میں آنے کی اجازت نہیں۔ اس چھٹی کو مرزا بشیر الدین محمود احمد گواہ صفائی نمبر ۲۷ نے تسلیم کیا ہے۔ گواہ صفائی نمبر ۲۰ (خانصاحب فرزند علی) نے تسلیم کیا ہے کہ اسمٰعیل کو جماعت سے خارج کیا گیا اور قادیان میں داخل نہ ہونے کا حکم دیا گیا۔ بہت سے دیگر گواہوں نے تشدد اور ظلم کی داستانیں بیان کی ہیں۔ بھگت سنگھ گواہ نمبر ۴۹ بیان کرتا ہے کہ مرزائیوں نے اس پر حملہ کیا۔ ایک شخص غریب شاہ کو قادیانیوں نے مارا اور جب اس نے دعوے کرنا چاہا تو کوئی شخص اس کی شہادت دینے کے لیے آگے نہ آیا۔ قادیانی ججوں کے فیصلہ شدہ مقدمات کی مسلیں پیش کی گئیں جو مسل میں موجود ہیں۔ مرزا نے تسلیم کیا ہے کہ عدالتی اختیارات قادیان میں استعمال کئے جاتے ہیں اور ان معاملات وہ خود آخری عدالت اپیل ہے۔ عدالت

کی ڈگریوں کا اجرا کیا جاتا ہے اور ایک مثال بھی موجود ہے جہاں ڈگری کے اجراء میں ایک مکان کو نیلام کیا گیا۔ قادیان میں ایک والنٹیر کور کی موجودگی کی شہادت گواہ صفائی نمبر ۴ (مرزا شریف احمد) نے دی ہے۔

علاوہ ازیں سب سے سنگین معاملہ عبدالکریم کا ہے جس کی داستان حقیقتاً ایک داستانِ درد ہے۔ اس شخص نے مرزائی مذہب قبول کیا اور قادیان چلا گیا۔ مگر وہاں اس کے دل میں مذہبی شکوک و شبہات پیدا ہوئے اور اُس نے مرزائیت سے توبہ کر لی۔ تب اس پر ستم آرائی کی ابتدا ہوئی۔ اُس نے ایک اخبار "مباہلہ" نامی جاری کیا جس کا مقصد مرزائی جماعت کے اعتقادات پر تنقید کرنا تھا۔ مرزا نے ایک تقریر میں جو دستاویز ڈی زیڈ نمبر ۳۹ (الفضل مورخہ ۱۹۳۰ء) میں شائع ہوئی ہے اس تقریر میں ان لوگوں کی طرف اشارہ بھی کیا جو اپنے مذہب کی خاطر قتل کرنے کو بھی تیار ہوتے ہیں۔ اس تقریر کے فوراً بعد عبدالکریم پر قاتلانہ حملہ ہوا لیکن وہ بچ گیا۔ ایک شخص محمد حسین عبدالکریم کی امداد کرتا تھا اور ایک فوجداری مقدمہ میں جو عبدالکریم کے خلاف چل رہا تھا اس کا ضامن تھا۔ اس پر فی الحقیقت حملہ ہوا اور اُسے قتل کر دیا گیا۔ قاتل پر مقدمہ چلا اور پھانسی کی سزا ہوئی۔

لہ مرزا کو جو عرضیاں دی جاتی ہیں ان پر قادیانی ساخت کا اسٹامپ اور کورٹ فیس تیار کر کے فروخت اور استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہ سب پوشیدہ طور پر کیا جاتا ہے۔

پھانسی کے حکم کی تعمیل ہوئی اور پھانسی کے بعد لاش قادیان لائی گئی اور اس کو دھوم دھام سے اُسے اس جگہ دفن کیا گیا جس کا نام بہشتی مقبرہ ہے۔ الفضل اخبار میں جو مرزائی جماعت کا اخبار ہے قتل کی تعریف اور قاتل کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ لکھا گیا کہ قاتل مجرم نہیں تھا اور امر واقع سے قبل ہی جان دے کر پھانسی کی بدنام کنندہ سزا سے بچ گیا۔ خدا نے اپنے عدل و انصاف میں یہ مناسب سمجھا کہ پھانسی کی ذلت سے پہلے ہی اس کی روح قبض کر لے۔

جب عدالت میں مرزا کا ایک معاملے کے متعلق بیان لیا گیا تو اُس نے بالکل مختلف کہانی بیان کی اور کہا کہ محمد حسین کے قاتل کو باعزت طریق پر اس لیے دفن کیا گیا تھا کہ اس نے اپنے جرم پر اظہار ندامت کیا تھا اور اس طرح گناہ سے بری ہو گیا تھا لیکن دستاویز ڈی زیڈ نمبر ۴ اس کی تردید کرتی ہے اور مرزا کی نیت اور اس کی دلی کیفیت کا پتہ اس اظہار خیال سے بالکل عیاں ہے۔ (ڈی زیڈ نمبر ۴)

میں یہاں یہ بھی کہہ دوں کہ اس دستاویز کا مضمون لاہور ہائی کورٹ کی توہین بھی ہے۔

ایک اور واقعہ بھی ہے جو محمد امین کے قتل سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ محمد امین بھی مرزائی تھا اور یہ امر واقعہ ہے کہ وہ اس فرقے کا ایک مبلغ تھا اس کو بخارا بھیجا گیا تھا لیکن کسی وجہ سے اس کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا۔ اس کی موت کلہاڑی کی ایک ضرب سے ہوئی جو چوہدری فتح محمد گواہ

صفائی نمبر ۲۱ نے لگائی۔ عدالت ماتحت نے اس معاملے کو سرسری نظر سے دیکھا ہے لیکن اس پر نظر غائر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ محمد امین اگرچہ مرزائی تھا لیکن وہ مرزا کا مورد عتاب ہو چکا تھا۔ اس لئے ہستی بزرگ نہیں رہا تھا۔ اس کی موت کے واقعات کچھ ہی ہوں یہ امر ناقابل انکار ہے کہ محمد امین تشدد کی موت مرا۔ پولیس کو واقعے کی اطلاع دی گئی لیکن بالکل کارروائی نہ کی گئی۔ یہ بحث کرنا فضول ہے کہ قاتل حفاظت خود اختیاری کر رہا تھا کیونکہ یہ فیصلہ تو اس عدالت کا کام ہے جو مقدمے کی سماعت کرے۔ یہ امر کافی تعجب انگیز ہے کہ چوہدری فتح محمد نے باقرار صالح بیان دیا ہے کہ اُس نے محمد امین کو قتل کیا تھا مگر پولیس کچھ نہ کر سکی اور اس کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ مرزائی طاقت اتنی بڑھ گئی تھی کہ کوئی گواہ سامنے آ کر سچ بولنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ہمارے سامنے عبدالکریم کے مکان کا معاملہ بھی ہے۔ عبدالکریم کو قادیان سے نکالنے کے بعد اس کا مکان جلا دیا گیا۔ اُسے قادیان کی ٹاؤن کمیٹی سے حکم حاصل کر کے نیم قانونی طریقے سے گرانے کی کوشش بھی کی گئی۔

یہ افسوسناک واقعات ظاہر کرتے ہیں کہ قادیان میں طوائف الملوکی تھی جس میں آتش زنی اور قتل بھی ہوتے تھے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حکام ایک غیر معمولی درجے کے فالج کا شکار ہو چکے ہیں۔ اور دنیوی اور دینی معاملات میں مرزا کے حکم کے خلاف کبھی آواز نہ اٹھائی گئی۔ مقامی افسروں کے پاس کئی مرتبہ شکایات کی گئیں لیکن انسداد

نہ ہوا۔ مسل پر ایک دو ایسی شکایات ہیں لیکن ان کا حوالہ دینا غیر ضروری ہے اور اس مقدمے کے اغراض کے لیے، یہ بیان کر دینا کافی ہے کہ قادیان میں ظلم و جور جاری ہونے کے متعلق غیر مشتبہ الزامات عائد کیے گئے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طرف مطلق توجہ نہ کی گئی۔

ان کارروائیوں کے سدباب کے لیے اور مسلمانوں کے اندر منتقدانہ رُوح حیات پیدا کرنے کے لئے احرار تبلیغ کانفرنس بلائی گئی۔ قادیانیوں نے قدرتاً اس اقدام کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور انہوں نے کانفرنس کے انعقاد کو کلیتہً روکنے کے لیے دلیرانہ کوشش کی۔ احرار کانفرنس کے انعقاد کے لئے ایک شخص ایشر سنگھ کی زمین حاصل کی گئی تھی۔ قادیانیوں نے اس زمین پر قبضہ کر لیا اور اس پر دیوار کھینچ دی۔ اس طرح اس ایک ہی قطعہ زمین سے بھی محروم کر دیئے گئے جو ان کو قادیان میں حاصل ہو سکتا تھا اور اس لئے مجبور کر دیئے گئے کہ قادیان سے ایک میل کے فاصلے پر ایک جگہ اپنا اجلاس کریں۔ دیوار کا بنایا جانا ظاہر کرتا ہے کہ اس وقت فریقین میں تعلقات کس قدر کشیدہ تھے۔ اور مرزائیوں کا تمرد کس حد تک پہنچ گیا تھا کہ وہ اپنی دست درازی کے قانونی انجام سے اپنے آپ کو بالکل محفوظ و مامون سمجھتے تھے۔

لیکن اجلاس ہوا اور یہی اجلاس تھا جس کے لئے اپیلانٹ کو کہا گیا جو بے اندازہ مقناطیسی جذب اور اعلیٰ درجے کی فصیحانہ خطابت کا مالک ہے۔ اس نے اس اجلاس میں وہ تقریر کی جسے ولولہ انگیز خطاب کہا جا سکتا

ہے۔ تقریر کئی گھنٹے جاری رہی اور بیان کیا گیا ہے حاضرین کی یہ کیفیت تھی کہ گویا مسحور ہیں۔ اس تقریر میں اپیلانٹ نے اپنے خیالات کا اظہار کس قدر صاف گوئی سے کیا اور اس نے اس بات کو پوشیدہ نہ رکھا کہ اس کے دل میں مرزا اور اس کے پیروؤں کے خلاف کس قدر ناپسندیدگی بلکہ نفرت ہے۔ تقریر اخبارات میں شائع ہوئی اور اس پر اعتراض کیا گیا معاملہ حکومت پنجاب کے سامنے پیش ہوا جس نے موجودہ مقدمہ کی اجازت دی۔

اپیلانٹ کے خلاف جو فرد جرم ہے اس میں اس کی تقریر کے سات حصے درج ہیں جن کو خاص طور پر قابل اعتراض اور قابل گرفت بنایا گیا ہے۔ وہ حصے یہ ہیں :-

"فرعونی تخت الٹا جا رہا ہے انشاءاللہ یہ تخت نہیں رہے گا"۔
وہ نبی کا بیٹا ہے میں نبی کا نواسا ہوں۔ وہ آئے تم سب چپ چاپ بیٹھ جاؤ۔ وہ مجھ سے اردو، فارسی، پنجابی میں ہر معاملے پر بحث کر لے۔ یہ جھگڑا آج ہی ختم ہو جائے گا وہ پردے سے باہر آئے۔ نقاب اٹھائے۔ کشتی لڑے مولا علیؓ کے جوہر دیکھے۔ وہ ہر رنگ میں آئے۔ وہ موٹر میں بیٹھ کر آئے میں ننگے پاؤں آؤں۔ وہ ریشم پہن کر آئے میں کھدر وہ مزعفر، کباب، یاقوتیاں اور پلومر کی ٹانک وائن اپنے ابا کی سنت کے مطابق کھا کر آئے میں اپنے نانا کی سنت

کے مطابق جج کی روٹی کھا کر آؤں۔

یہ ہمارا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں۔ یہ برطانیہ کے دُم کٹے کتے ہیں۔ وہ خوشامد میں برطانیہ کے بوٹ کی نوک صاف کرتا ہے میں تکبر سے نہیں کہتا ہوں بلکہ خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔ پھر بشیر کے اور میرے ہاتھ دیکھو۔ کیا کر ڈالا لفظ تبلیغ نے ہمیں مشکل میں ڈال دیا ہے۔ یہ سیاسی مجلس نہیں ہے۔ او مرزائیو! اگر باگیں ڈھیلی ہوتیں۔ میں کہتا ہوں کہ اب بھی ہوش میں آؤ۔ تمہاری طاقت اتنی بھی نہیں جتنی پیشاب کی جھاگ ہوتی ہے۔

جب پانچویں جماعت میں فیل ہوتے ہیں نبی بن جاتے ہیں کیونکہ ہندوستان میں ایک مثال موجود ہے جو فیل ہوا وہ نبی بن گیا۔ او مسیح کی بھیڑو! تم سے کسی کا ٹکراؤ نہیں ہوا۔ کس سے اب مقابلہ پڑا ہے یہ مجلس احرار ہے۔ اس نے تم کو ٹکڑے کر دینا ہے۔

او مرزائیو! اپنی نبوت کا نقشہ دیکھو۔ اگر تم نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو نبوت کی شان تو رکھتے۔

اگر تم نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا تو انگریزوں کے کتے نہ بنتے۔"

اپیلانٹ نے عدالت ماتحت میں بیان کیا کہ اُس کی تقریر درست طور پر نہیں لکھی گئی۔ اس نے جملہ نمبر ۵ کے متعلق خاص طور پر کہا کہ وہ اُس کا

کہا ہُوا نہیں ہے اگرچہ اُس نے تسلیم کیا کہ باقی جملوں کا مضمون میرا ہے لیکن اُس نے عبارت کے غلط ہونے کا عذر اٹھایا۔ عدالت ماتحت کے فیصلے پر کہ جملہ نمبر ۵ کی رپورٹ غلط ہے اور اپیلانٹ کو اس کے متعلق جو قرار نہیں دیا جا سکتا اپیلانٹ کی سزایابی باقی چھ فقروں پر مدار رکھتی ہے اپیلانٹ کے وکیل نے بحث کے وقت فوراً تسلیم کیا کہ فقرہ جات نمبر ۱ نمبر ۴ اور نمبر ۵ تا ۷ فی الحقیقت اپیلانٹ نے کہے۔ وہ اس مرحلے پر رپورٹر کی عبارت کی درستگی کو بھی زیر بحث نہیں لانا چاہتا تھا۔ اس لیے میرے واسطے یہی امر قابل فیصلہ ہے کہ آیا یہ چھ جملے زیر دفعہ ۱۵۳ الف قابل گرفت ہیں اور کیا یہ الفاظ کہہ کر مرافعہ گزار نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہے۔

مرافعہ گزار نے عدالت میں بہت سی تحریری شہادتیں پیش کیں اور یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اُس کی تقریر کا مقصد مرزا اور اس کے متبعین کے جبر و تشدد اور ستم رانیوں پر جائز اور معقول تنقید کرنا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ اس کی تقریر کا واحد مقصد ہوتے ہوئے مسلمانوں کو دعوت بیداری دینا اور مرزائیوں کے مذموم افعال کا راز طشت از بام کرنا تھا۔

اُس نے اپنی تقریر میں جا بجا مرزا کے ظلم و تشدد کا ذکر کیا ہے اور مطالبہ کیا ہے کہ ان مسلمانوں کی شکایات کا ازالہ کیا جائے جو صرف مرزا کی نبوت اور اس کے خود ساختہ اقتدار کے منکر ہونے کی وجہ سے ہدفِ جور و ستم بنے ہوئے ہیں۔

میں نے مرافعہ گزار کی تقریر پر اُن حالات کی روشنی میں غور کیا

ہے جو قادیاں میں نشو و نما ہو رہے تھے۔ اوّل یہ کہ وہ مرزا اور اُن کے متبعین کے افعال پر تنقید کرے۔ دوم یہ کہ مسلمانوں کو اس بات کی ترغیب دینا چاہتا تھا کہ وہ مرزائیوں کے مقابلے میں بیدار ہو کر اپنی شکایات کے ازالہ کی کوئی صورت نکالیں۔

مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ تقریر مسلمانوں کی طرف سے صلح کا ایک اعلان تھی۔ لیکن اسے سرسری طور پر پڑھنے سے کوئی معقول آدمی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ اعلان صلح کی بجائے یہ تقریر پیکار آزمائی کی دعوت تھی۔ مرافعہ گزار نے قانون کے اندر رہنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی ہو لیکن اپنی لسانیت اور جوش فصاحت میں وہ قانون کی انتہائی حدود کو پھاند گیا اور اُس نے ایسی باتیں کہہ دیں جو اُس کے سامعین کے دل میں مرزائیوں کے خلاف نفرت پیدا کرنے کے سوا اور کوئی اثر نہیں پیدا کر سکتی تھیں۔ ایک پختہ کار مقرر کی طرح مرافعہ گزار نے روما کے مارک انٹونی کی سنت پر عمل کرتے ہوئے یہ اعلان تو کر دیا کہ وہ احمدیوں سے برسر پیکار نہیں ہونا چاہتا لیکن صلح و آشتی کا یہ اعلان ایسی سخت کلامی سے مملو تھا جس کا مقصد سامعین کے دل میں احمدیوں کے خلاف منافرت و منافرت پیدا کرنے کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مرافعہ گزار کی تنقید میں ایسے حصے بھی ہیں جو مرزا کے افعال کی جائز اور معقول تنقید پر مبنی ہیں۔ تقریر کے دوران غریب شاہ کو زدوکوب کرنے کا واقعہ، محمد حسین اور محمد امین کے واقعات قتل اور

مرزائے قادیاں کے جبر و تشدد کے متعدد ایسے واقعات کا حوالہ دیا گیا ہے جن پر تنقید کرنے کا ہر سچے مسلمان کو حق ہے نیز اس تقریر کے دوران اس توہین کا ذکر بھی کیا گیا جو احمدی پیغمبر (صلے اللہ علیہ وسلم) کی شان میں روا رکھتے ہیں اور جن سے لازمی طور پر مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔

مسلمانوں کے نزدیک محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) خاتم النبیین ہیں لیکن مرزائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے بعد بھی کوئی نبی آ سکتے ہیں اور اُن پر وحی نازل ہو سکتی ہے اور یہ کہ مرزائیہ فرقہ کا بانی نبی اور مسیح موعود تھا۔ اس حد تک مرافعہ گزار کی تقریر قانون کی زد سے باہر ہے لیکن جب وہ سخت کلامی سے کام لیتا ہے اور مرزائیوں کو ایسے ایسے ناموں سے خطاب کرتا ہے جنہیں سُننا کوئی معقول آدمی گوارا نہیں کر سکتا تو وہ جائز اور معقول تقریر کی حدول کو پھاند جاتا ہے اور خواہ اُس نے یہ باتیں دیدہ و دانستہ کہیں یا جذبات کے جوش میں قانون ان سے اغماض نہیں برت سکتا۔

مرافعہ گزار کو معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ اس کے سامعین کی اکثریت ناخواندہ دیہاتیوں پر مشتمل ہے اور یہ کہ اس قسم کی تقریر ان کے دل میں احمدیوں کے خلاف بغض و عناد کے جذبات کی پرورش کرے گی۔ واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ تقریر نے سامعین پر عزم اثر ڈالا اور مقرر کی لسانیت سے مسحور ہو کر لوگوں نے متعدد دفعہ جوش کا مظاہرہ کیا۔ یہاں اس امر پہ بحث کرنے کی ضرورت نہیں کہ سامعین نے اس وقت اپنے مخالفین کے

خلاف متشددانہ اقدام کیوں نہ کیا اس تقریر نے نفرت کو کچھ زیادہ ہی کر دیا ہے۔

فردِ جرم میں جن سات حصوں کو قابلِ گرفت ٹھہرایا گیا میرے نزدیک ان میں سے تیسرا اور ساتواں سب سے زیادہ قابلِ اعتراض حصے ہیں۔ ان فقروں میں مرافعہ گزار نے احمدیوں کو برطانیہ کے "دُم بریدہ کتے" کہا ہے۔ میرے نزدیک دوسرے حصے تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۵۳ کے ماتحت قابلِ گرفت نہیں ہیں۔

پہلا حصہ یعنی فرعونی تخت الٹا جا رہا ہے میرے نزدیک بالکل بے ضرر ہے۔ دوسرا حصہ مرزا کی خوراک کے متعلق ہے۔ یہ امر قابلِ دلچسپی ہے کہ مرزائے اوّل نے اپنے عقیدت مندوں میں سے ایک کے نام خط لکھا تھا جس میں خوراک کی ایسی تمام تفصیلات موجود تھیں۔ یہ خطوط کتابی صورت میں شائع ہو چکے ہیں اور ان کا ایک نسخہ اس مقدمے کے کاغذات میں شامل ہے۔

میری رائے میں تیسرے اور ساتویں حصے کے سوا اور کوئی حصہ قابلِ گرفت نہیں۔ اس کا یہ مقصد نہیں کہ مرافعہ گزار کی تقریر میں صرف دو حصے ہی قابلِ اعتراض ہیں۔ تقریر کے کوائف سے پتہ چلتا ہے کہ مرافعہ گزار کا مقصد جہاں احمدیوں کے افعالِ شنیعہ کا تار و پود بکھیرنا تھا وہاں مسلمانوں کے دل میں ان کے خلاف جذباتِ حقارت پیدا کرنا بھی تھا۔ یہ امر کہ سامعین نے اس کی تقریر سے متاثر ہو کر تشدد اور امن شکنی کا مظاہرہ کیوں نہ کیا اس کے

جرم میں صرف تخفیف کرنے کا موجب ہو سکتا ہے۔

مجھے اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ مرافعہ گزار احمدیوں پر تنقید کرنے میں حق بجانب تھا تاہم میرے خیال میں اس نے قانون کی حدیں توڑ دیں اگرچہ مرافعہ گزار نے اصطلاحی جرم کا ارتکاب کیا ہے تو بھی قانون کی ہمہ گیری کا تحفظ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس مقدمے کے تمام پہلو پر غور کرنے اور سامعین پر اس تقریر کے اثرات کا اندازہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مرافعہ گزار نے تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۵۳ الف کے ماتحت ارتکاب جرم کیا ہے اور اس کے جرم کو قائم رہنا چاہیے۔ سزا کی کمی اور بیشی کا اندازہ کرتے وقت یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان واقعات کو بھی پیش نظر رکھا جائے جو قادیان میں رونما ہو رہے تھے۔ چنانچہ میں اس کی سزا میں تخفیف کرتے ہوئے اسے تا اختتام عدالت قید محض کی سزا دیتا ہوں۔

دستخط

جی ڈی کھوسلہ سیشن جج۔ گورداسپور — ۶ جون ۱۹۳۵ء

تقریر امرتسر

ماتحت عدالت گورداسپور میں مقدمہ ابھی زیر سماعت تھا کہ امیر شریعت نے امرتسر میں ۲۱ اپریل ۱۹۳۵ء کو رات نو بجے مسجد خیر الدین میں مولانا عبد الغفار غزنوی کی زیر صدارت تقریر کرتے ہوئے کہا:

بعض نا عاقبت اندیش لوگ کہتے ہیں کہ مرزائیت کے ساتھ ہمارے شیعہ، سنی اور وہابی کی طرح کے فروعی اختلافات ہیں اور اسی سلسلے میں گورنر بہادر انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں مسلمانوں کو اتحاد اور اتفاق کی تعلیم دے چکے ہیں بات دراصل یہ ہے کہ ان کے لیے اپنے خود کاشتہ پودے کی مخالفت ناقابل برداشت ہے ہم انشاء اللہ اس پودے کو جڑ سے اکھاڑ کر رہیں گے۔

مرزائیت کے وجود میں آنے کی وجہ یہ ہے کہ تیرہ سو سال سے عیسائیت کے جگر میں ایک کانٹا تھا جو کسی طرح نکلنے میں نہیں آتا تھا۔ وہ کانٹا یہ تھا کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وحدت ملی یا مرکزیت عطا ہوئی تھی یہ دنیا کی کسی قوم کو حاصل نہ تھی۔ عیسائیت چاہتی تھی کہ اسلام کی اس وحدت کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جائے۔ چنانچہ اس کی بربادی کے لیے پنجاب میں مرزا غلام احمد قادیانی کو کھڑا کیا گیا۔ اور اس نے ایڑی چوٹی کا زور وحدت ملی کو تباہ کرنے میں لگا دیا۔ یہ اختلافات فروعی ہیں؟ کہ نبیؐ کے مقابلے میں نبی کھڑا کر دیا گیا ہے اور مدینۃ النبیؐ کے مقابلہ میں مدینۃ المسیح اور جنت البقیع کے مقابلہ میں بہشتی دروازہ بنایا گیا ہے۔

اس وقت ضرورت ہے کہ مرکزی شعبہ تبلیغ مجلس احرار کو مضبوط کیا جائے۔ محلہ محلہ شعبہ ہائے تبلیغ قائم کر دیئے جائیں۔ اور قادیان میں زمین اور مکانات خرید لی جائے۔ جس دن ہمارا اپنا

ہائی سکول، اپنا تبلیغی کالج، اپنی مسجد اور مہمان خانہ قادیان میں تیار ہو گیا۔ سمجھیے کہ مرزائیت کا خاتمہ ہو گیا۔

مرزا بشیر الدین محمود نے پیش گوئی کی تھی کہ ۶ ماہ کے بعد احرار کا کام ختم ہو جائے گا۔ اور یہ لوگ ٹھنڈے پڑ جائیں گے مگر میں بتانا چاہتا ہوں کہ ہمارا کام اب شروع ہوا ہے۔

قادیان کانفرنس کے خطبے کی بنا پر جس دفعہ ۱۵۳ کے تحت مجھے گرفتار کیا گیا ہے اس کی سزا زیادہ سے زیادہ صرف دو سال ہے۔ میرا جرم یہ ہے کہ میں حضور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خادم ہوں۔ اس جرم میں یہ سزا بالکل کم ہے میں خاتم الانبیاء کی ناموس پر ایسی ہزاروں جانیں قربان کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے شیروں اور چیتوں سے ٹکڑے ٹکڑے کرا دیا جائے اور پھر کہا جائے کہ تمہیں بجرم عشق محمد تکلیف دی جا رہی ہے۔ تو میں خندہ پیشانی سے اس سزا کو قبول کروں گا۔ میرا آٹھ سالہ بچہ عطاء المنعم اور اس جیسے، خدا کی قسم، ہزار بچے رسول اللہ کی عزت پر سے نچھاور کر دوں۔"

زلزلہ کوئٹہ

۳۰ اور ۳۱ مئی ۱۹۳۵ء کی درمیانی رات جب کہ نظام کائنات محوِ خواب تھا اور صرف آسمان کے ستارے جاگ رہے تھے، کوئٹہ میں

ایسا زلزلہ آیا کہ بندگانِ خدا عذاب الٰہی کے باعث نیند کے راستے موت کی پگڈنڈی پر سفر کرنے لگ پڑے۔ دن بھر کے تھکے ماندے لوگ رات کو صبح اٹھنے کی آس لے کر سوئے تھے کہ زلزلے نے انہیں لاکھوں من ملبے کے ڈھیر تلے دبا دیا۔ اس عظیم حادثہ میں ہزاروں انسان جان و مال سے محروم ہو گئے۔

یوں تو کوئٹہ زلزلے کے حادثات کا عادی تھا لیکن انسانی تباہی کا یہ منظر اپنی نوعیت میں عظیم تر تھا۔ ان دنوں مجلس احرار کا آفتاب نصف النہار پر تھا جس کی روشنی سے غیر ملکی سامراج کی آنکھیں بھی چندھیا رہی تھیں۔ مجلس احرار نے کوئٹہ سے دہلی تک اپنے ریلیف کیمپ کھول دیئے۔ ہزاروں باوردی رضا کار مصیبت زدگان کی امداد کے لیے رات دن مصروف ہو گئے۔

مجلس احرار کی اس بے لوث خدمت سے متاثر ہو کر وائسرائے ہند نے احرار رہنماؤں کو دہلی آنے کی دعوت دی تا کہ انہیں ان خدمات کے صلے میں سرکاری سرٹیفکیٹ دیا جائے۔ وائسرائے کی اس دعوت پر جماعت میں قدرے اختلاف تھا۔ ورکنگ کمیٹی نے اپنے ایک غیر رسمی اجلاس میں اس دعوت پر غور کیا۔ اس اجلاس میں امیر شریعت بھی امرتسر سے پہنچ گئے جب انہیں وائسرائے کی اس دعوت کا علم ہوا تو اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

”ملک ہمارا ہے۔ نقصان ہمارا ہی ہوا ہے۔ بھائی بھی ہمارے

مرے ہیں - اُن کی خدمت کرنا بطور انسان کے ہمارا فرض تھا سو ہم نے جو کچھ کیا اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا - اس میں وائسرائے کون ہے جو ہماری خدمات سے خوش ہو کر ہمیں سرٹیفکیٹ دے - ہم تو اپنے خدا سے انعام چاہتے ہیں انگریز کا سرٹیفکیٹ ہمارے لیے کوئی قیمت نہیں رکھتا - اگر مجلس احرار نے کوئٹہ ریلیف کیمپ وائسرائے کو خوش کرنے کے لیے کھولا تھا تو پھر اُس کی دعوت پر فوراً دہلی جانا چاہیئے اور اگر مصیبت زدگان کی امداد خدا کے لیے کی ہے تو پھر میری رائے میں وہ مخلوق کو اس قسم کے مشورے پر اپنا قیمتی وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے "

امیر شریعت کی اس رائے کو ورکنگ کمیٹی نے پسند کیا اور وائسرائے کو اطلاع کر دی گئی کہ کوئٹہ ریلیف کیمپ کے سلسلے میں آپ کی دعوت کا شکریہ - بعض مصروفیتوں کی بنا پر ہم ملاقات کے لیے نہیں آ سکتے "

مسجد شاہ چراغ

بساطِ سیاست پر بیٹھنے والے کھلاڑی جب حالات و واقعات کی نبض پر انگلیاں رکھتے ہیں تو ان کے فکر کی دماغی نالیاں اُبھر کر حالات کے نقشے کو کچھ اس ترتیب سے لکیرتی ہیں کہ واقعات آپ سے آپ سُلجھتے جاتے ہیں۔ جھوٹ اور فریب کا خوبصورت نام ہے سیاست" اور بیا سیاست میں

اقتدار کے گھوڑے پر سفر کرنے والے لوگ عموماً اسی لباس سے آراستہ رہے ہیں۔

۱۹۳۵ء کے آئین نے ہندوستان کو جو رعایت دی، وقت کے دانشور کرگسوں کا لباس اُتار کر عوام میں شاہین بن کر پرواز کرنے لگے، حالانکہ وہ شاہین کی طرح شکار کرنے کے عادی نہیں تھے۔ لیکن کرگسوں میں پرورش پانے والے جب بال و پر سنوار کر سامنے آ گئے، تو نگاہیں فریب کھا گئیں۔

۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد میاں سر فضل حسین جب وائسرائے کی کونسل سے فارغ ہو کر پنجاب میں آ گئے تو ان دنوں سر سکندر حیات آئندہ انتخاب کے لئے دوسری سیاسی پارٹیوں کے علاوہ مجلس احرار سے بھی رشتہ گانٹھ رہے تھے۔ ان کی رائے میں مجلس احرار ہی اُس وقت ایسی جماعت تھی جو پنجاب کی سیاست پر غالب تھی۔

سر فضل حسین زیرک آدمی تھے اور ہوائی قلعے تعمیر کرنے کے عادی تھے۔ اس گٹھ جوڑ پر اپنے مستقبل کو روشن نہ پا کر حکومت سے سازش کر کے سر سکندر حیات خان کو سٹیٹ بنک آف انڈیا کا ڈپٹی گورنر بنا کر کلکتہ بھجوا دیا۔ راستے کی اب دوسری بڑی دیوار صرف مجلس احرار تھی جس کے رضاکاروں کی سرخ وردیاں گرتے ہوئے فرنگی وقار کے افق پر چھائیاں ڈال رہی تھیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس دیوار کو گرانے کے لیے سیاسی اُستادوں نے مسجد شہید گنج کو گرانے کا منصوبہ تیار کیا۔

سات اور آٹھ جولائی ۱۹۳۵ء کی درمیانی رات کو چند سکھ مزدوروں نے لنڈا بازار کی تاریخی مسجد "مسجد شہید گنج" کو بلا کسی وجہ کے گرانا شروع کر دیا۔ (ان دنوں پنجاب کا گورنر مسٹر ایمرسن تھا، یہی وہ انگریز آفیسر ہے جو ۱۹۲۴ء میں ملتان کا ڈپٹی کمشنر تھا، جس نے تعزیہ داری کے موقعہ پر ہندو مسلم فساد کرایا تھا۔) مسجد گرنے سے لاہور اور باقی پنجاب کی ساری فضا پھر سے مکدر ہو گئی، سیاسی اُستاد گھات میں تھے، اور مسجد کا تمام ملبہ مجلس احرار پر گرا دیا گیا۔ اس سارے کھیل تماشے کے پس منظر میں مولانا ظفر علی خان اور سر فضل حسین کی سیاست کام کر رہی تھی۔

مجلس احرار نے اعلان کیا کہ مسجد گری نہیں گرائی گئی ہے، اور یہ سب الیکشن کی سیاسی تدبیریں ہیں، مگر انگریز، مرزائی اور رجعت پسند مسلمان اس تیز روی سے پنجاب کی سیاسی زندگی کو اپنے قبضے میں کر چکے تھے کہ وقت کی سب سے بڑی فعال جماعت احرار کو سنبھالا لینا دشوار ہو گیا، اس ہنگامہ آرائی میں امیر شریعتؒ نے لاہور شاہی مسجد میں تقریر کے دوران کہا:

"مسجد شہید گنج آج ہی سکھوں کے قبضے میں نہیں آئی، بلکہ سلطنت مغلیہ کے زوال کے ساتھ ہی جن واقعات نے نئی کروٹ لی، اور ۱۷۶۷ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ حکومت کے سنگھاسن پر براجمان ہوئے تو پنجاب کی قسمت نے پلٹا کھایا، ایک ہزار برس تک اٹھارہ لاکھ مربع میل پر حکومت کرنے والی مسلمان قوم بھی ان کی غلامی میں چلی گئی۔"

موجودہ مسجد شہید گنج جو کبھی مسجد عبداللہ خان کے نام سے مشہور تھی، سکھوں کی غلامی میں جا کر اس نے اپنا نام بھی تبدیل کر لیا۔ یہ عبداللہ خان، شہزادہ دارا شکوہ کا خانساماں تھا۔ لیکن یاد رہے کہ خانساماں سے مُراد انگریزی عہد کا کھانا پکانے والا نہیں، بلکہ اُس دَور میں خانساماں کے معنی "خانِ سامان" یا "امیرِ سامان" تھا یعنی سامان کی حفاظت کرنے والا تھا۔

آج الیکشن کی ضرورت نے انگریز پرست لوگوں کو مجبور کیا کہ مسجد گرا کر اور اس کے کھنڈرات کو سیڑھیاں بنا کر پنجاب اسمبلی میں جائیں۔ ان مسجد کے شیدائیوں سے پوچھو کہ کیا لاہور میں کوئی دُوسری مسجد[1] نہیں، جس میں آج کل سرکاری دفاتر قائم ہیں۔ اس کی بازیابی کے لیے تو آواز بلند نہیں ہوتی، مگر ایک ایسی مسجد کو گرا کے کونسل کی سیڑھیاں بنایا جا رہا ہے جس کے گرنے سے پنجاب ہی میں نہیں بلکہ پُورے ہندوستان میں خُون کی ندیاں بہہ جانے کا احتمال ہے۔"

یہ تقریر صرف آدھ گھنٹہ جاری رہی، اور امیرِ شریعتؒ کے اس فقرے نے کہ کیا لاہور میں کوئی اور دوسری مسجد نہیں جس میں آج کل سرکاری دفاتر قائم ہیں، حکومت اور عوام کو گہری فکر میں ڈال دیا۔

مسجد شاہ چراغ کے متعلق رائے بہادر کنہیا لال اپنی کتاب "تاریخ لاہور" میں لکھتے ہیں :

---

[1] امیرِ شریعتؒ کا یہ اشارہ مسجد شاہ چراغ کی طرف تھا جس میں اُن دنوں سرکاری دفتر تھا۔

"محلہ سید چراغ شاہ، محلہ موج دریا بخاری کے مشرقی جانب واقع تھا۔ سادات گیلانی اس میں سکونت رکھتے تھے۔ یہ محلہ شاہ جہانگیر کے عہد میں آباد ہوا، اور مدت تک آباد رہا۔ آخر بلاانتظامی کے باعث سکھ غارتگروں نے اس کو ویران کر دیا۔

سید چراغ شاہ کا مقبرہ و مسجد پختہ اب تک موجود ہے، مسجد تو سرکاری قبضے میں ہے اور اس میں اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر ہے۔"

حکومت پنجاب نے یہ سوچ کر کہ شہید گنج کی مٹی جو سکھ مزدوروں کے ہاتھوں اڑی، اور مجلس احرار کے دامن سے لپٹ گئی، ایسا نہ ہو کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی اس تقریر کے بعد مسجد شاہ چراغ کی اینٹیں حکومت کو بھی زخمی کر دیں، چنانچہ تقریر کے دوسرے ہی دن اخبارات میں یہ خبر جلی عنوان سے شائع ہوئی، کہ "حکومت نے مسجد شاہ چراغ مسلمانوں کو واگزار کر دی ہے، اور اس کا انتظام انجمن اسلامیہ کے سپرد کر دیا ہے۔"

قتل کی سازش

پھول جب اپنی بہار چھوڑ دیتا ہے، تو نسیم سحرگاہی کا ایک ہی جھونکا اسے شاخ سے علیحدہ کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔

جو قومیں حصول زندگی کے سانچے اپنی تن آسانی کے ہاتھوں توڑ دیتی ہیں پھر انہیں اپنے مستقبل کے راستے اندھیرے دکھائی دیتے ہیں۔

ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت انتخاب کی ضرورت نے مسلمان قوم سے دو

شعور چھین لیا، جس سے امتیاز کی دیوار قائم تھی، اور اپنے پرائے کے درمیان نشاندہی کی جا سکتی تھی۔ سیاسی شعبدہ بازوں نے اچھی بھلی قوم کو فکر کی تمام صلاحیتوں سے بیگانہ کر دیا، اور ایسے سبز باغ دکھائے کہ اپنے پرائے میں امتیاز مشکل ہو گیا۔ مسجد شہید گنج کی ہر اینٹ مجلس احرار کے دفتر کی طرف اُٹھنے لگی۔ سیاست کے کھلاڑی مہروں کو اس انداز سے حرکت دینے کہ بساط کی ساری بازی انہی کے حق میں معلوم ہوتی۔ انہی دنوں قادیان کے بتوں نے بھی خدائی کا دعویٰ کیا، وہ بھی اپنے راستے کے پہاڑ سے ٹکرانے کو نکل پڑے۔

امیر شریعتؒ اپنے رفیقوں کی معیّت میں بھیرہ (ضلع سرگودھا) سے اس مشن پہ یو۔پی تک دورہ کرنے کا ارادہ لے کر روانہ ہوئے کہ مسلمانوں کو سمجھائیں کہ مسجد شہید گنج رگری نہیں گرائی گئی ہے۔ اس کے پیچھے کن کن ہاتھوں نے کیا حرکتیں کیں ہیں ــــ چنانچہ مجلس احرار کا یہ وفد امیر شریعت، مولانا حبیب الرحمٰن، شیخ حسام الدین اور راقم الحروف پر مشتمل مسلسل سفر کے بعد پنجاب کی سرحدوں کو عبور کر کے یو۔پی میں داخل ہوا۔ یہاں سے مولانا حبیب الرحمٰن اور شیخ حسام الدین جماعتی ضرورت کے لیے واپس کر دیے گئے۔ اب امیر شریعت اور راقم اس سفر کے لیے ...... باقی رہ گئے۔ یہی وہ تاریخی سفر ہے جس کے دوران لکھنؤ میں امیر شریعت پر انکشاف ہوا، کہ یہاں (لکھنؤ میں) مدح صحابہؓ قانوناً جرم ہے، اور اسی سفر میں امیر شریعت کے دل میں اس قانون کو ختم کرنے کے ارادے نے جنم لیا۔

یہ سفر کانپور تک جاری رہا، جب واپس ہوئے تو امیر شریعتؒ کی صحت تھکن کی وجہ سے بہت کمزور ہو رہی تھی۔ تاہم کچھ دن سستانے کے بعد ارادے، آرزوئیں

اور عزم اُسی طرح جوان تھے۔

لاہور پہنچے کچھ دن گذرے تھے کہ پولیس کا ایک ذمہ دار افسر میرے پاس آیا، اور ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُس نے مجھ سے سوال کیا۔ "آپ راجندر سنگھ آتش کو جانتے ہیں؟"

"جی ہاں!"

میرے جواب پر اُس نے سنبھل کر کہا۔ "کیسے اور کب سے؟"

"۱۹۳۰ء میں راجندر سنگھ آتش میرے ساتھ لاہور بورسٹل جیل میں بطور سیاسی قیدی کے رہا ہے، اس کے بعد میری اُس کی ملاقات نہیں ہوئی۔"

میرے جواب پر پولیس افسر نے کہا "چلئے وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

"کہاں؟" ــــ "تھانے کی حوالات میں" ــــ اب میری پریشانی کچھ بڑھی۔ کیونکہ یہی نوجوان اخبار کی ایک خبر کے مطابق گذشتہ دنوں کلکتہ سے انقلابی پارٹی کے ممبر ہونے کے شبہ میں گرفتار کیا گیا تھا۔ پولیس افسر نے مجھے مجبور کیا، کہ میں راجندر سنگھ آتش سے ملوں۔ اُن کے ساتھ جب میں متعلقہ تھانے پہنچا تو حوالات میں میں نے ایک ایسے نوجوان کو دیکھا جو میرے تصوّر سے بالکل جُدا نکلا ــــ ۱۹۳۰ء میں جس راجندر سنگھ آتش کو میں نے دیکھا تھا، اُس کے سر کے بال اور داڑھی اُس کی عمر سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن پانچ برس گزرنے پر راجندر سنگھ آتش یورپین لباس میں ایک ایسا فیشن ایبل نوجوان تھا، جس کا سر اور مُنہ سکھ مذہب کے اصولوں سے غداری کر چکا تھا۔

"آئیے جانباز صاحب! کہئے مزاج کیسے ہیں؟" "ٹھیک ہیں، لیکن آپ نے

کیا کیا؟"۔ "بس یہی کہانی سنانے کے لیے آپ کو بلایا ہے، یاد ہے گذشتہ
دن سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے ساتھ آپ نے پنجاب اور یوپی کا دورہ کیا تھا"
ہاں"۔ "میں اس پورے دورے میں ساتھ ساتھ تھا۔" اس کے بعد
اجندر سنگھ آتش نے ہمارے سفر کے تمام واقعات من وعن سنائے
س کی تصدیق کرنا پڑی۔

"لیکن آپ نے ہمارے ساتھ یہ دورہ کیوں کیا؟"

میرے اس سوال پر اُس نے پولیس افسر سے کہا کہ ہم کوئی بات
کرنا چاہتے ہیں، آپ ذرا ہٹ جائیں۔ مگر پولیس افسر نے کہا: "میں آپ
دونوں کی گفت گو میں ڈیوٹی پر متعین کیا گیا ہوں۔" اس پر راجندر سنگھ آتش
نے اپنی گفت گو کا لہجہ آہستہ کر دیا۔ راجندر سنگھ نے کہا:

"خلیفہ قادیان بشیر الدین محمود نے مجھے سید عطاء اللہ شاہ
بخاری کے قتل پر مقرر کیا تھا، اور اس کے عوض دس ہزار
روپیہ دینے کا وعدہ کیا جس کی ادائیگی پانچ ہزار روپیہ پیشگی
اور پانچ ہزار واقعہ کے بعد طے پائی تھی، لیکن میں ارادتاً
ایسا نہیں کر سکا۔ حالانکہ مجھے اکثر مواقع میسر آئے۔ میری
ناکامی کی وجہ صرف یہ ہے کہ شاہ جی کو قتل کرنے کو میرا جی
نہیں چاہا۔ ایک آدمی عوام کو اچھی باتیں سناتا ہے خواہ وہ
کسی مذہب سے کیوں نہ ہو، میں اپنی ذاتی غرض کے لیے
اُسے کیوں قتل کر دوں۔

اس کے بعد جب میں واپس قادیان پہنچا تو میری ناکامی پر بشیر الدین محمود نے کہا، تو پھر تم ڈاکٹر گوربخش سنگھ[1] کو قتل کر دو۔ لیکن میں نے اس پر بھی انکار کیا۔ میرے اس انکار پر مرزائیوں نے مجھے ایک سازش کے تحت کلکتہ میں گرفتار کرایا ہے۔ اب میرا ارادہ ہے کہ میں یہ تمام واقعہ عدالت میں کہہ دوں، کیا..... آپ کی جماعت (مجلس احرار) اس مقدمے میں میری امداد کرے گی؟"

یہ سارا کچھ سننے کے بعد میں نے کہا۔ "پارٹی سے مشورے کے بعد ہی کوئی رائے دے سکتا ہوں۔" اس پر راجندر سنگھ سے میری ملاقات دوسرے دن پر ملتوی ہو گئی۔

چودھری افضل حق سے ابھی پہلے دن کی گفت گو کا ذکر چل ہی رہا تھا کہ اخبارات آ گئے، چودھری صاحب نے پہلی سرخی دیکھتے ہی کہا، "لو! اس کو تو پولیس نے رہا کر دیا۔" معلوم ہوا کہ پولیس افسر نے ہم دونوں کی گفت گو اپنے حکام کو پہنچائی، تو پنجاب کی حکومت نے بہتری اسی میں سمجھی کہ راجندر سنگھ کو رہا کر دیا جائے۔

قضا و قدر کی تحریریں نہ مٹائی جا سکتی ہیں، اور نہ ہی ان کا کوئی شوشہ تبدیل ہو سکتا ہے۔ لیکن انسان ہے کہ اپنے قلم کے فیصلے کی طرح ان میں بھی ترمیم چاہتا ہے۔ آگرہ، بمبئی اور شجاع آباد کے بعد امیر شریعتؒ کے قتل کی

---

[1] ڈاکٹر گوربخش سنگھ قادیان میں مرزائیوں کا سخت مخالف تھا۔

یہ چوتھی کوشش تھی جو بہر حال ناکام رہی

قاتل سے ملاقات

حالات کی پیشانی شکن آلود تھی، فضاؤں میں انتقامی ارادوں کے تیور ہنوز سرخ تھے کہ امرتسر میں راجندر سنگھ آتش سے پھر ملاقات ہو گئی۔ اُس نے امیر شریعتؒ سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن مَیں اُسے طرح دے گیا آخر اُس کا اصرار بڑھا تو مَیں اُسے امیر شریعت کے مکان پر لے گیا، قاتل اور مقتول کا آمنا سامنا ہونے سے پیشتر مَیں نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا، اور اپنی تسلی کے لئے راجندر سنگھ کے جسم کو ہاتھ اور نگاہوں سے کھنگال ڈالا، جس پر وہ مسکرایا، اور یہ مسکراہٹ میرے شبہ پر طنز تھی۔

"لباس اور جسم کی تلاش میں اب کیا رکھا ہے جانباز! دل اور آنکھوں میں تلاش کرو، جن میں ندامت کے کس قدر آنسو ہیں، جو شاہ جی کی بھینٹ کرنے آیا ہوں۔ مَیں اپنے پرماتما کی سوگند کھا کر کہہ رہا ہوں کہ میرے پاپ مجھے پچھتاپ کے لیے اُس عظیم انسان کے چرنوں میں سیس جھکا دینے کیلیے مجبور کر رہے ہیں کہ جس کی زبان نے میری چھری کو کُند کر دیا، اور میرے ارادوں کو موت آگئی، ورنہ آج قاتل اور مقتول کا رشتہ ٹوٹ چکا ہوتا!"

یہ کہتے ہوئے راجندر سنگھ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور مَیں نے امیر شریعتؒ کے دروازے پر دستک دی۔

"کون ہے بھائی! اندر آجاؤ۔" یہ امیر شریعتؒ کی آواز تھی، ہم بیٹھک میں

چلے گئے، امیرِ شریعتؒ پان بنانے میں مصروف تھے۔

"یہ آپ کا قاتل ہے شاہ جی!" میں نے عرض کیا۔ امیرِ شریعتؒ نے ایک نظر راجندر سنگھ کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ "ہاں بھائی! ایسے ہی لوگ میرے قاتل ہوتے ہیں"۔ میں نے اپنے فقرے کو دوبارہ ذرا وضاحت سے دہرایا تو سنبھل کر بیٹھ گئے اور متعجب ہو کر سوال کیا۔ "کیا مطلب؟"

"یہ راجندر سنگھ آتش ہے، یہ آپ کے حالیہ طویل سفر میں مرزائیوں کی طرف سے آپ کے قتل پر مامور کیا گیا تھا"

"کیوں بابو! یہ درست ہے؟"۔ "ہاں شاہ صاحب!"۔۔۔ "تو پھر کونسی چیز مانع رہی؟"۔ "یہ میں نہیں جانتا شاہ صاحب! مگر آپ کے طرزِ تکلم نے مجھے اس گناہ سے بچائے رکھا"۔ اس پر امیرِ شریعتؒ نے زور سے قہقہہ لگایا، اور راجندر سنگھ کو مخاطب کر کے کہا:۔

"میرا طرزِ تکلم تجھے کیا بچا سکتا ہے بابو! موت اور زندگی خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ یاد رکھو، جو رات قبر کی ہے وہ باہر نہیں آسکتی، اور جس رات کو باہر آنا ہے، اُسے دُنیا کی کوئی طاقت قبر کے سپرد نہیں کر سکتی۔ البتہ تمہیں میری نصیحت ہے کہ بحیثیت انسان ہمیشہ انسان کی بھلائی کے لیے سوچا کرو۔ دولت ہاتھ کی میل ہے بابو! اس کے لالچ میں اگر تم مجھے قتل بھی کر دیتے، اور میرے قتل کے الزام سے تمہارا دامن محفوظ بھی رہتا، تو کسی دوسرے موقعہ پر

بغیر جُرم کے مار کھا جاتے ـــــ خیر ہا"ـــــ

امیرِ شریعتؒ پھر مُسکرائے اور قرآن کریم کی چند آیات کا ترجمہ سُناتے رہے کہ اتنے میں چائے آگئی۔ راجندر سنگھ امیرِ شریعتؒ کی گفتگو اور قرآن عزیز کے لفظوں میں اپنے ماضی پر غور کرتا ہوا بے اختیار رونے لگ پڑا، اور روتا ہوا امیرِ شریعتؒ کے قدموں پر گر پڑا۔

"اپنے رَبّ کے سامنے گِر جو تمہیں مُعاف کرے میں تو تمہارا چاکر ہوں بابو! لو چائے پیو۔"

امیرِ شریعتؒ اور راجندر سنگھ آتش کے درمیان یہ ملاقات مغرب کی نماز تک رہی۔

تحریک مدحِ صحابہؓ کی ابتدا

پنجاب اور یو۔پی کا دَورہ کرتے ہوئے لکھنؤ (احاطہ شوکت علی) میں تقریر کے دوران کسی نے امیرِ شریعتؒ سے صحابہ کرامؓ کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کہنے پر بلند آواز سے پکارا۔

"شاہ صاحب! یہاں صحابہ کے نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کہنا جرم ہے۔"

یہ فقرہ سُنتے ہی امیرِ شریعتؒ نے مجمع سے دوبارہ تصدیق کی ـــــ اور معاً بعد طبیعت میں یکایک تیزی آگئی، اور صحابہ کرامؓ کا بار بار نام لیا، اور ہر نام کے ساتھ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کہا۔ حالانکہ امیرِ شریعتؒ چار روز لکھنؤ ٹھہرے لیکن

قانون اور حکومت دونوں خاموش رہے۔

امرتسر واپس پہنچ کر جماعت نے صلاح و مشورے کے بعد ۲۷ اگست ۱۹۳۵ء کو دوبارہ لکھنؤ گئے اور چوک فرنگی محل میں حبیب[1] نے یہ تقریر کی:

"مجھے افسوس ہے کہ انگریز نے لکھنؤ میں ایک ایسا قانون جاری کر رکھا ہے جس کی رُو سے منقبتِ صحابہ کرنا اور کرانا جرم ہے۔ حضرت ابوبکر و عمر، عثمان غنی و علی رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تعریف کرنا قابلِ سزا جرم ہے اور یہ سزا دو سال قید تک ہے۔

غضب خدا کا ، اتنی ہزار اہلِ سنت والجماعت کی آبادی اور وہ اس قانون کو حکومت سے نہیں بدلوائی ، چند ماہ ہوئے ہمارے بھائی غازی مٹھے خاں نے یہاں مدح صحابہؓ پڑھی تھی جس کی پاداش میں ان پر مقدمہ چل رہا ہے میں حکومت سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اس قانون کو فوراً منسوخ کر دے۔ یہ مداخلت فی الدین ہے، حالانکہ حکومت نے مذہب کی آزادی کا اعلان کر رکھا ہے۔

گالیاں بکنا تو جرم ہو سکتا ہے، مگر کسی کی تعریف کرنا کیونکر جرم قرار دیا جا سکتا ہے۔ آج حکومت نے قمار بازی، شراب نوشی اور عصمت فروشی پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔

---

[1] لکھنؤ مجلس احرار کے ناظم اعلیٰ تھے۔

لیکن خلفائے راشدینؓ کی تعریف پر پابندی عائد ہے۔ حکومت کو چاہیئے کہ وہ اپنی پوزیشن پر غور کرے۔

میں شیعہ حضرات سے خطاب نہیں کر رہا، بلکہ میرا روئے سخن حکومت کی طرف ہے، شاید کل کو کچھ اور سمجھ لیا جائے۔ اس لئے کان کھول کر سن لو، میں تمام یو،پی کو ایک مرکز پر جمع کروں گا، اور اس قانون کو آئینی جدوجہد سے ختم کرا کے دم لوں گا۔ اور اگر اس طرح بھی اس قانون کو ختم نہ کیا گیا تو پھر میں بے آئینی بھی کر سکتا ہوں۔"

ہندوستان کے موجودہ سیاسی حالات میں حکومت ان دنوں کسی طرح بھی دوسرے رنگ میں سوچنا مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ کیونکہ ۱۹۳۵ء کے آئین کے نتیجہ میں جو واقعات سامنے آنے والے تھے، اُن کے پیش نظر صوبائی جھگڑوں کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ لہٰذا امیر شریعتؒ کی مندرجہ بالا تقریر کو حکومت نے ہوا کے دوش پر لٹکا دیا۔ اس کے بعد مجلس احرار نے اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا، اور یہاں سے تحریک مدح صحابہؓ کی ابتدا ہوئی۔

قادیان میں نماز جمعہ

(احرار ہمیشہ خیالات اور جذبات کے دو مختلف محاذوں پر برسرپیکار رہے ہیں، اوّل ہندوستان میں اسلام کا غلبہ اور دوسرے درجہ پر وطن کی آزادی۔)

ان آمنے سامنے کے دو مختلف مورچوں پر احرار کبھی انگریز سے اور کبھی ہندو سے نبرد آزما رہے۔

۱۹۳۵ء میں انگریز نے جو آئین ہندوستان کو دیا، احرار اپنے دونوں مقاصد کے لیے اس آئین کے تحت الیکشن میں اترنے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ پنجاب میں مسجد شہید گنج اور یو، پی میں مدح صحابہ رضی کے ایسے جال پھیلائے کہ جن کا تعلق احرار کے جذبۂ ایمان سے تھا۔ اسی سن میں امیر شریعتؒ کے مقدمے کا فیصلہ لکھتے وقت گورداسپور کے سیشن مسٹر جی، ڈی کھوسلہ نے مرزائیت کے تابوت میں جو میخ ٹھونکی، اس نے قادیانی مذہب کی بنیادوں میں دراڑ ڈال دی۔ چنانچہ اس خفت کو مٹانے کے لئے خلیفہ قادیان بشیر الدین محمود نے احرار کو مباہلہ کے لئے قادیان آنے کی دعوت دی، جسے احرار نے قبول کر لیا۔ جب وہ تیار ہو کر قادیان جانے لگے، تو قادیانیوں نے اپنی سرکار سے واویلا کرنا شروع کیا، کہ دیکھو احرار پھر قادیان آ رہے ہیں۔ چنانچہ حکومت نے قادیان میں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ کر دیا۔ چونکہ احرار اس سفر کا عزم کر چکے تھے، لہٰذا جماعت نے قادیان میں جمعہ پڑھنے کا اعلان کر دیا، اور امامت کے لئے امیر شریعتؒ کا نام تجویز کیا۔

سال بھر کی دوڑ دھوپ اور مقدمہ سے رہائی کے بعد امیر شریعتؒ کچھ دنوں گھر میں سستانے کا ارادہ رکھتے تھے کہ جماعتی فیصلے کے تحت مولانا مظہر علی اظہر امرتسر پہنچے اور امیر شریعتؒ کو جماعتی فیصلے سے آگاہ کیا۔ امیر شریعتؒ مجلس احرارِ اسلام ہند کے ناظمِ اعلیٰ کا حکم سن کر تھوڑی دیر سوچ

پڑے رہے۔ پھر فوراً ایک سرد آہ بھری، اور کہا ـــــ "بہت اچھا، جو مزاجِ یار میں آئے!"

۱۰ر دسمبر ۱۹۳۵ء کو امیرِ شریعتؒ بذریعہ گاڑی امرتسر سے قادیان روانہ ہوئے۔ اس وقت احرار دوستوں کا جمِ غفیر بھی اُن کی معیّت میں اسی گاڑی پر سوار تھا۔ بٹالہ ریلوے اسٹیشن پر پولیس افسروں نے امیرِ شریعتؒ سے دفعہ ۱۴۴ کے نوٹس پر تعمیل کرانی چاہی، جس کی رُو سے امیرِ شریعتؒ قادیان کی حدُود میں داخل نہیں ہو سکتے تھے، لیکن امیرِ شریعتؒ نے تعمیل نوٹس سے انکار کر دیا، اور اپنا سفر جاری رکھا۔ جینتی پور کے اسٹیشن پر سب انسپکٹر پولیس خان چراغ الدین نے امیرِ شریعتؒ کو دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی میں گرفتار کر لیا، اور اسی وقت سفری مجسٹریٹ مسٹر ڈنی نے آپ کو تین ماہ قید اور ایک سو روپیہ جرمانہ اور عدم ادائیگی جرمانہ کی صورت میں مزید ایک ماہ قید بامشقت کی سزا کا حکم سنا کر گورداسپور ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا، جہاں سے ایک ہفتہ بعد آپ کو لاہور سنٹرل جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ قادیان میں نمازِ جمعہ کی تحریک نے مستقل شکل اختیار کر لی، اور ہر جمعہ کوئی نہ کوئی گرفتاری ہوتی۔ آخر ایک ماہ بعد حکومت نے دفعہ ۱۴۴ واپس لے لی، مگر لیڈروں کو اپنی میعادِ اسیری گزارنے کے بعد رہا کیا گیا۔ چنانچہ امیرِ شریعتؒ ۱۵ر اپریل ۱۹۳۶ء کو لاہور سنٹرل جیل سے رہا کیے گئے۔

سینما کی تعمیر

امیرِ شریعتؒ رہا ہو کر آئے تو ملک کی سیاسی فضا یکسر بدلی ہوئی پائی۔

تمام سیاسی جماعتیں جن میں مجلسِ احرار بھی شامل تھی، اپنے اپنے مینی فسٹو لے کر انتخابی ہنگاموں میں مصروف تھیں۔ امیرِ شریعت رح کا مزاج ان ہنگاموں سے متفق نہ تھا۔ آپ فرمایا کرتے کہ

"برطانیہ نے ہندوستان کو ایسا آئین بنانے کی اجازت کیونکر دے دی، جس کے تحت صوبے خود مختار ہوں گے۔"

اور ساتھ ہی غالب کا یہ شعر پڑھتے ہے

مجھ تک کب اُن کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

لیکن جماعت (مجلسِ احرار) الیکشن لڑنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ لہٰذا امیرِ شریعت نے بادلِ نخواستہ اپنی طبیعت کا رُخ بھی اسی طرف موڑ لیا۔

(مجلسِ احرار کی پوزیشن انہدامِ شہید گنج کے بعد عوام میں مخدوش ہو چکی تھی لیکن اس کے باوجود پنجاب کی سیاسی زندگی احرار سے عبارت تھی اور دوسری کسی جماعت یا افراد کے لیے مشکل تھا کہ وہ اس کے بغیر آگے بڑھ سکے، چنانچہ سر فضل حسین ایک طرف سر سکندر حیات سے تو دوسری طرف قائدِ اعظم محمد علی جناح سے پنجاب کے آئندہ انتخابات کے لیے مصروفِ کار تھے، اسی طرح سر سکندر حیات کے ایما پر نواب مظفر علی جو ان دنوں گورنر کی انتظامیہ کے ممبر تھے، مجلسِ احرار سے ناطہ جوڑ رہے تھے۔

انہیں دنوں صدر گوردوارہ پربندھک کمیٹی راولپنڈی نے جامع مسجد کے عقب میں سینما تعمیر کرنا شروع کر دیا۔ شہر کے مسلمانوں کے احتجاج کے

دیکھو وہ دیکھو سینا مکمل ہو رہا تھا کہ مسلمانان راولپنڈی نے امیر شریعت کو اپنی مشکلات سے آگاہ کیا، اور انہیں راولپنڈی آنے کی دعوت دی۔

انتخابات کا زمانہ اپنے جلو میں جن واقعات کو جنم دیتا ہے، اُن کے شب و روز میں ہزاروں بے بنیاد کہانیاں اپنے نقش و نگار تراشتی ہیں، اور مٹ جاتی ہیں۔ لیکن ان کے معمار اپنے ذہن کی قدر کاوش میں فارغ نہیں بیٹھتے۔ امیر شریعتؒ کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ جماعت کے انتخابی پروگرام کے درمیان کوئی دوسری مصروفیت اختیار کرتے تاہم راولپنڈی کے لیے وقت نکال لیا گیا۔

راولپنڈی میں سکھ مسلمان کشیدگی اس قدر بڑھ چکی تھی کہ دونوں طرف آگ برابر سلگ رہی تھی۔ ہندو اپنی دولت کے سہارے سکھوں کی پشت پناہی کر رہے تھے۔ امیر شریعتؒ نے دو ایک دن میں شہر کے واقعات دیکھے اور سنے۔ آخر معززین شہر کو جن میں سکھ، ہندو اور مقامی حکام بھی شامل تھے، باہم مل بیٹھنے کی دعوت دی۔ یہ اجتماع شہر کی جامع مسجد میں ہوا۔ اس اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے امیر شریعت نے کہا:

سکھ صاحبان اور دوسرے معزز دوستو! میں ایک مسافر ہوں۔ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ آپ کے شہری معاملات میں مداخلت کروں۔ گذشتہ سالوں سے میری زندگی کا ایک مشن رہا ہے کہ میں انسانوں کو لڑتا دیکھنا پسند نہیں کرتا پھر جبکہ ایک تیسری حکومت ہم کو لڑتا دیکھ کر خوش ہوتی ہے ہمارے لیے

آپس کی صُلح اور بھی زیادہ مفید اور کار آمد ہے۔ جنوری سے جو قضیہ آپ کے شہر میں چل رہا ہے، جس نے آپ کی شہری زندگی میں ایسا زہر گھول دیا ہے کہ آپ ایک دُوسرے کی جان کے دُشمن بن گئے ہیں۔

(یہ مسجد ہے، اور ایک مذہبی آدمی ہونے کی حیثیت سے اس کا احترام میرے لیے لازمی ہے۔ اسی قدر آپ کو بھی اس کا احترام کرنا چاہیئے۔ اسی طرح میں گوردوارہ کی بھی عزّت کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ بھی رب کی عبادت گاہ ہے۔ گو میرا آپ کا عقیدہ، عبادت جُدا جُدا ہے)

اگر گوردوارہ کے سامنے یا برابر میں کوئی ہنگامہ ہو، تو آپ برداشت کریں گے؟ یقیناً نہیں۔ اِسی طرح یہ حق مجھے بھی دو، کہ میں بھی مسجد کے احترام میں آپ سے گذارش کروں، کہ آپ یہاں سینما کی تعمیر بند کر دیں۔ یہ میری درخواست ہے۔

میں یہ درخواست آپ سے ایسے وقت کر رہا ہوں، جب کہ سارا ہندوستان انگریز سے آئینی لڑائی میں مصروف ہے، اِس میں آپ کا فائدہ ہے کہ شہر میں امن ہو جائے گا۔ بہو بیٹی کی عزّت محفوظ رہے گی، شہری زندگی کسی دُوسری طرف دھیان کر سکے گی۔

مجھے آپ جانتے ہیں، میں ان دھندوں کا آدمی نہیں ہوں

لیکن آپ کی پریشان زندگی اور اللہ کے گھر کی بے حرمتی نے
مجھے مجبور کیا، کہ میں پارٹی کا کام چھوڑ کر یہاں حاضر ہوا ہوں۔
مجھے اُمید ہے کہ سکھ صاحبان میری گذارش کو قبول کریں گے"

(امیرِ شریعتؒ کی اس تقریر نے اجتماع کو متاثر کیا۔ مقامی حکام کی
موجودگی میں گوردوارہ پربندھک کمیٹی کے عہدیداران نے وعدہ کیا کہ آئندہ سے
مسجد کی تعمیر روک دی جائے گی۔ صبح ہوتے ہی سکھ عوام کو اس فیصلے کی
اطلاع ملی، تو انہوں نے مذہبی ضد کی بنا پر رات کے فیصلے کو کالعدم قرار دیدیا،
اور شہر کے حالات زیادہ خطرناک ہو گئے۔ دوسرے دن امیرِ شریعتؒ نے جامعہ
مسجد میں تقریر کرتے ہوئے سرکاری حکام اور شہر کے حکام کو مخاطب کرتے ہوئے
خطبۂ مسنونہ کے بعد کہا:

"کل رات معزز افسران اور خود ڈپٹی کمشنر کی موجودگی میں
سکھ صاحبان سے جو فیصلہ ہوا تھا۔ مجھے افسوس ہے، کہ
سکھ رہنما اپنی قوم سے وہ فیصلہ منوا نہ سکے۔ اب میں اپنا
فیصلہ اپنی قوم سے منوا کر دکھاؤں گا۔ بشرطیکہ مقامی حکام
درمیان میں حائل نہ ہوں۔ ہاں! اگر وہ انتظامی معاملات میں
کوئی چارہ کریں، تو اس سے میں منع نہیں کروں گا۔

میری اس گفتگو سے یہ مراد نہ لی جائے کہ مسلمان سکھ
بھائیوں سے دست و گریبان ہوں گے، یا کوئی خون خرابہ کریں گے
نہیں۔ بلکہ میں عدمِ تشدد کا حامی ہوں اور اسی پر کاربند رہ کر

اپنی بات اپنی قوم سے منواؤں گا۔ فیصلہ کل رات کو ہوگا۔
۲۴ گھنٹے باقی ہیں، سکھ صاحبان کو اپنے رویے پر غور کرنا چاہیئے"
دوسرے دن شہر میں حالات اور بھی کشیدہ ہوگئے۔ دن بھر سکھ پریشان رہے
نہ جانے شاہ جی رات کو کیا حکم دیں۔ حکومت اپنی جگہ سوچ میں رہی۔ شہر
پولیس اور فوج کی تعداد میں اضافہ کر دیا گیا۔ رات پھر جلسے کا اعلان تھا۔ جامع مسجد
میں انسانوں کا اس قدر ہجوم اس مسجد کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں دیکھا گیا۔ امیر شریعت
اس روز خلاف معمول نماز عشاء کے ساتھ ہی تقریر کے لیے کھڑے ہوگئے۔
آپ نے صرف مسلمان نوجوانوں سے چند منٹ خطاب کیا۔ زندگی میں اتنی مختصر
تقریر امیر شریعتؒ نے کبھی نہیں کی تھی۔

عزیزو! ہماری لڑائی کسی سے نہیں، اگر کوئی قوم اپنی
ضد پر اتر آئے تو ہمیں خوف نہیں کھانا چاہیئے، لہٰذا ایسا کام
کرو کہ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے، میرے ساتھ
وعدہ کرو کہ جو میں کہوں گا وہی کرو گے......

اس موقعہ پر تمام مجمع کے ہاتھ کھڑے ہوگئے، امیر شریعتؒ نے کہا:

دیکھو! جو میں کہوں وہی کرنا ہوگا، اگر کسی دوسری
نازیبا حرکت کی شکایت آئی تو میں ناراض ہوکر چلا جاؤں گا۔"

اس پر مجمع نے پھر وعدہ کیا۔

عزیزانِ من! سنو! یا تو مسجد نہ رہے اور یا سینما نہ بنے
میں نے مقدور بھر کوشش کی شہر کے ذمہ دار حکام گواہ ہیں،

کہ سکھ رہنماؤں نے وعدہ کے باوجود بات نہیں مانی۔ خیر! اب تم اپنا کام کر دیا تو مسجد کے قریب سینما نہ ہو اور یا سینما کے قریب مسجد نہ ہو، بس! لیکن میری یہ درخواست یاد رہے کہ اینٹوں کے سوا انسانوں پر ہاتھ نہ اٹھیں۔"

امیر شریعتؒ کی تقریر سنتے ہی تمام مجمع سینما کی طرف دوڑا، اور صبح اُٹھے تو ایک اینٹ وہاں باقی نہیں تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جنوں کی فوج نے راتوں رات سینما کا تمام ملبہ اُٹھا کر نہ جانے کہاں پھینک دیا کہ اب اس کا نشان تک نہیں ملتا۔

حالانکہ پولیس کا انتظام تھا، سکھ نوجوان بپھرے کھڑے تھے۔ لیکن امیر شریعتؒ نے پہلے روز جو طرزِ عمل اختیار کیا تھا، سرکاری حکام اس سے مطمئن تھے۔ سکھ رہنماؤں نے مسجد میں جو وعدے کیے تھے، وہ ان سے منحرف ہو چکے تھے، لہٰذا مسلمان نوجوانوں کے ہاتھ جب رات کے اندھیرے میں زیرِ تعمیر سینما کی طرف بڑھے، تو پھر قوم کے وقتی جذبات پولیس کی حفاظتی دیوار توڑنے کی جرأت نہ کر سکے۔

راولپنڈی کا یہ تاریخی میدان آج مجاہد پارک کے نام سے مشہور ہے۔

تبلیغِ اسلام

۱۹۳۵ء کے برطانوی آئین نے جہاں اور حالات میں ردّ و بدل کیا، وہاں اچھوتوں کو ہندوستان کی ایک الگ قوم قرار دیتے ہوئے

یہ حق بھی دیا کہ وہ بحیثیت ایک ہندوستانی قوم اپنی قومیت برقرار رکھتے ہوئے نئے انتخابات میں الگ انتخاب لڑ سکتے ہیں، جبکہ اس سے پیشتر کے آئین میں اچھوتوں کا ووٹ ہندو قوم کے ساتھ شامل ہوتا تھا۔

اس اعلان نے ہندوؤں میں ایک خاص قسم کا سیاسی ہیجان پیدا کر دیا، مہاتما گاندھی نے انہی دنوں برطانیہ کے اس قانون کو تبدیل کرانے کے لئے ۲۰ ستمبر ۱۹۳۵ء کو مرن برت رکھنے کا فیصلہ کیا۔ نیز ہندو قوم کو اچھوتوں پر اپنے مندروں کے دروازے کھول دینے کا مشورہ بھی دیا۔

سیاسیات کی دوڑ میں قدم نہیں ناپے جاتے بلکہ ووٹ گنے جاتے ہیں، جو قوم صدیوں سے اچھوتوں کے سائے سے دامن بچاتی رہی، اپنی سیاسی ضرورت کے لیے اس نے نہ صرف اچھوتوں کو انسان تسلیم کیا بلکہ انہیں اپنی برادری کا جزو سمجھنے پر مجبور ہو گئی۔ انہی دنوں ۲۳ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو لاہور میں اچھوت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے امیر شریعتؒ نے مسلمان قوم کو پیغام دیا:

"اس وقت ہمارے سامنے تین مسئلے سب سے زیادہ اہم اور غور طلب ہیں، پہلا مسئلہ انتخاب کا ہے جس کا ظاہر اتنا دلفریب ہے کہ بڑے سے بڑا تارک الدنیا زاہد گوشہ نشین بھی اس کے حسن دلفریب کی تاب نہ لا سکا، اور بے چین ہو کر میدانِ انتخاب میں نکل آیا، نہ کوئی ہندو بچا نہ سکھ اور نہ عیسائی، مسلمان بھی اس سے بے نیاز نہیں

کوئی جماعت بھی ایسی نہیں جو مسئلہ انتخاب میں دلچسپی نہ لیتی ہو۔

دوسرا مسئلہ ختم نبوّت کا ہے چونکہ مسلمان سیاسی الجھنوں میں مصروف ہو گئے ہیں، اس لیے انہوں نے اس طرف توجہ نہیں کی۔ ہندوستان کو ابدی غلامی میں جکڑے رکھنے کے لیے قادیانی نبوّت اپنا جال پھیلا رہی ہے مسلمانوں کو اس دائمی لعنت سے بچنے کیلیے کوئی راہ سوچنی ضروری ہے۔

تیسرا اہم مسئلہ اچھوتوں کا ہے، اس وقت تمام ہندوستان کی توجہ ڈاکٹر امبیدکار[1] کے اعلانات کی طرف ہے، وہ پولیٹیکل اچھوت ہے اور ہندوؤں سے بخوبی واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس وقت ہندوؤں کو دبانے سے کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ اب وہ ٹاٹ پر بیٹھنا نہیں چاہتا لیکن ہندوستان کے آٹھ کروڑ اچھوت جو ہزاروں سال سے جوانوں کی سی زندگی بسر کر رہے ہیں اور کوئی اُن کا پرسانِ حال نہیں ہے، اگر اُن کو مساوات اور انسانیت کا درجہ کسی مذہب میں حاصل ہو سکتا ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اسلام کے سوا دُنیا کا کوئی مذہب اچھوتوں کو لپنے میں

[1] اچھوتوں کا لیڈر

جذب نہیں کر سکتا۔

کائنات میں سب سے بڑا غلام اچھوت ہے
غلام کا جسم اور اس کی کمائی اپنی نہیں ہوتی، بلکہ مالک کی
ہوتی ہے۔ لیکن اسلام نے دُنیا میں غلام کا درجہ بلند
کر دیا ہے، اور اچھوتوں پر سب سے بڑا احسان کرنیوالے
محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ جنہوں نے اپنی پھوپھی زاد ہمشیرہ
زینبؓ سے منسوب کر دی، جو غلام تھا۔ اسلام نے مذہب کے
معاملہ میں جبر و اکراہ سے کام نہیں لیا، بلکہ اپنے عمل سے
اسلام کی تلقین کی، کہ ایسے لوگوں سے کیا سلوک کیا جائے
جو مسلمان نہیں ہے

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزا تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی!

لیکن لیڈر نشے کے گھپ اندھیارے کا کام رکھتا ہے ہمارا فرض ہے
کہ ہم اپنے عمل سے اور اپنے مذہب کی خوبیوں کے ذریعے
اچھوتوں کے ساتھ ایسا سلوک کریں کہ وہ اسلام قبول کرنے
پر مجبور ہو جائیں اور سوائے مذہب اسلام قبول کرنے کے
اُن کے لیے کوئی چارہ نہ رہے۔
اس ضمن میں امیر شریعتؒ نے اپنے چشم دید واقعات
بیان کیے، جن کی رُو سے اچھوت ہمیشہ اپنے کو انسانی

دائرے سے بھی خارج سمجھتے ہیں اور کہا)

"مسلمانو! کروٹ لو اور بکھڑ لو ان گرتے ہوئے اچھوتوں کو

اور اپنے سینے سے لگاؤ۔ ہم روپیہ دے کر کبھی بھی ان کی

اصلاح نہیں کر سکتے۔ نہ ہندو قوم کی طرح ہم انہیں سیاسی

لالچ دے کر ان کے ووٹ حاصل کرنا چاہتے ہیں (اسلام

اسلام ہے) تشنگی بجھانے کے لیے دریا کسی کے گھر نہیں

جاتا، ہمیشہ پیاسے ہی دریاؤں پر جاتے ہیں (کوئی تلوار

کارگر نہیں ہوتی لیکن اخلاق کی تلوار انسان کو ہمیشہ کے لیے

رام کر لیتی ہے۔ اس لیے اچھوتوں کو راہ راست پر لانے اور

دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تم

اُس خلقِ عظیم کو اختیار کرو، جو اسلام نے تم کو بخشا ہے۔"

ڈسکہ میں انتخابی معرکہ

(متحدہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ۱۹۳۶ء کا سال آئینی جدوجہد کا

اہم سال قرار دیا جاسکتا ہے، اس سال کسی بھی سیاسی جماعت نے غیر آئینی

حرکت نہیں کی، بلکہ ہر پارٹی انتخاب کے ذریعہ اقتدار کی کشمکش میں مصروف رہی)

مجلس احرار مسجد شہید گنج کے ملبے کے ڈھیر سے نکل کر منہ اور اپنے

کپڑے جھاڑ رہی تھی کہ انتخاب کا ہنگامہ سر پر آن پہنچا۔ چنانچہ اس کی نگاہِ انتخاب

نے پنجاب میں جن شہروں اور لوگوں کو دیکھا، وطن اور جماعتی ضرورت کیلیے

انتخاب کیا، اُن میں ڈسکہ (ضلع سیالکوٹ) کی سیٹ پر اس کی خاص نظر
(گزشتہ سال ۱۹۳۵ء میں مجلس احرار کا وفد جب دہلی میں وائسرائے
ہند سے ملا کہ وہ چودھری سر ظفر اللہ خاں کو اپنی انتظامیہ میں شامل نہ کریں
وائسرائے نے جواب میں کہا تھا کہ سر ظفر اللہ خاں مسلمانوں کے ووٹوں سے
منتخب ہوتے ہیں۔ مجلس احرار اس وقت تو لاجواب رہی۔ مگر اب
آگیا تھا کہ انگریز وائسرائے کے سوال کا جواب بھی دے دیا جائے)
اگرچہ امیر شریعت انتخابات کے دنوں پنجاب کے علاوہ
صوبہ یوپی میں بھی مصروف تھے، تاہم اُن کی زیادہ تر توجہ کا مرکز ڈسکہ کی
سیٹ تھی۔ چودھری سر ظفر اللہ خان ہمیشہ اسی سیٹ سے مسلمانوں کے
ووٹوں پر کامیاب ہوتے رہے تھے اور آج ان کے بھائی چودھری اسد اللہ
خان ایڈووکیٹ اسی سیٹ پر الیکشن کے میدان میں سامنے آئے
سر ظفر اللہ خان اپنی جاٹ برادری اور ضلع میں مقبولِ عام تھے، سرکاری
اثر و رسوخ بھی انہیں پناہ دیے ہوئے تھا۔ اس تحصیل کے مسلمانوں پر
چودھری ظفر اللہ خان کا اثر ریاستی نواب کی طرح تھا، ایسے حالات میں یہ
ٹکراؤ بڑی جان جوکھوں کا کام تھا، خصوصاً جبکہ الیکشن بھائی چارے اور
برادریوں کے نام پر لڑے جا رہے ہوں۔
بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسی برادری (جاٹ) کے ایک
جاٹ چودھری غلام رسول سنزاہ نے جو اپنے حلقہ میں خاصے رسوخ کے
مالک تھے، مجلس احرار کے ٹکٹ پر انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا۔

چودھری غلام رسول کے پاس روپیہ، برادری کا اثر و رسوخ سب کچھ تھا، لیکن سرکاری دباؤ کا خوف سدِ راہ تھا، دوسری جانب احرار سمجھتے تھے کہ یہی شخصیت سر ظفر اللہ کے کفر کو توڑ سکے گی چنانچہ رات امیر شریعتؒ نے چودھری غلام رسول سے کہا:۔

"دیکھو غلام رسول! اس وقت پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عزت کا سوال ہے، غیر ملکی حکومت کا نمائندہ (وائسرائے) کہتا ہے کہ تم ظفر اللہ کو مسلمان نہیں کہتے، لیکن اس حلقہ کا مسلمان تو اس کو ووٹ دے کر منتخب کرتا ہے۔

چودھری صاحب! اگر آج اس سیٹ سے اس خاندان کا کوئی فرد جو حضور سرورِ کائناتؐ کو آخری نبی نہیں مانتا مسلمانوں کے ووٹ سے اسمبلی میں چلا گیا تو قیامت کے دن تم مجرم قرار پاؤ گے، کیونکہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے دنیوی خوبیوں سے نوازا ہے، برادری میں تمہارا اثر اس سے کم نہیں، دولت اور عزت تمہیں بھی خدا نے دی ہے حکومت میں تمہارا بھی وقار ہے۔"

شریعتؒ کی یہ باتیں سن کر چودھری غلام رسول نے کہا:۔

"شاہ جی! میں بہت ہی سیاہ کار ہوں، اس کے باوجود آپ حکم دیتے ہیں، تو حاضر ہوں لیکن میرے پاس

برادری کی وہ قوت نہیں جو چودھری سر ظفر اللہ کے پاس ہے۔
روپیہ تو میں خرچ کر سکتا ہوں، لیکن حلقہ اور برادری کے
ذمہ دار لوگ شاید میرا ساتھ نہ دیں"

امیر شریعتؒ نے چودھری غلام رسول کا حوصلہ بڑھاتے ہوئے کہا:

"تم اللہ کے رسول ﷺ کی عزت رکھو، اللہ تمہاری
عزت کا وارث ہو گا۔ مجلس احرار کی سرخ فوج آج سے
تمہارے حلقہ میں متعین کر دی گئی ہے، بے فکر رہو"

پولنگ شروع ہونے میں قریباً ایک ماہ باقی تھا کہ ڈسکہ سیٹ کی مہم شروع کی گئی۔ امیر شریعتؒ ساتھ ساتھ دوسرے حلقوں میں بھی جاتے لیکن اس حلقہ میں زیادہ وقت اور توجہ صرف کرتے۔ مرکزی حکومت کے اشارے پر حکومت پنجاب نے بھی اس سیٹ پر خاص توجہ دی۔ امیر شریعتؒ نے گاؤں گاؤں پھر کر جاٹ برادری کو خصوصیت کے ساتھ حضور خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ناموس پر اپیل کی، کہ وہ اپنا ووٹ برادری کے نام پر نہیں بلکہ حضورؐ کے نام پر دیں تاکہ دشمنانِ دین کے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں۔ اس سلسلے میں امیر شریعتؒ جب گھوئینکے (ضلع سیالکوٹ) پہنچے اور وہاں نماز جمعہ پڑھانے کا پروگرام تھا، تو چودھری عبدالغنی بمع اپنی جاٹ برادری کے بندوقوں، پستولوں اور دوسرے اسلحہ سے مسلح ہو کر آن پہنچے کہ ہم عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کو تقریر نہیں کرنے دیں گے (یہ لوگ چودھری اسد اللہ کے حامی تھے) لیکن امیر شریعتؒ نے کہا۔ اگر

آپ اجازت دیں، تو میں صرف جمعہ کی نماز پڑھ لوں - اُنہوں نے کہا "ہاں"۔
نماز سے پہلے امیرِ شریعتؒ نے قرآنِ کریم کا ایک رکوع پڑھا، اور مخالفین
سے پوچھا۔ اگر آپ حکم دیں تو اس آیت کی تشریح کر دوں - اس پر مخالفین
کے دو حصے ہو گئے، ایک حصہ تشریح کے حق میں تھا، اور دوسرا مخالف -
شاہ جی نے قرآنِ کریم کی تفسیر شروع کی - بس پھر کیا تھا کہ جمعہ کی نماز بھی
مقررہ وقت سے ایک گھنٹہ بعد پڑھی گئی، آخر میں مخالفین امیرِ شریعتؒ کے
ہمنوا ہو گئے اور چودھری عبدالغنی گھمن کو اپنے ارادے میں بڑی طرح
شکست ہو گئی -

کیونکہ امیرِ شریعتؒ جاٹ برادری کے دل اپنے قبضے میں کر چکے تھے
ہزار جدوجہد کے باوجود سرکاری اثر و رسوخ بھی کوئی کام نہ دے سکا - یہ
لڑائی مسلمان اور مرزائی کے عنوان پر لڑی گئی - امیرِ شریعتؒ کی مسلسل اور پیہم
تقریروں سے ڈسکہ تحصیل کا مسلمان، مرزائی اور مسلمان کے درمیان حدِ فاصل
سمجھ گیا، اور جب اس الیکشن کا نتیجہ سامنے آیا تو چودھری غلام رسول ستراہ
نے چودھری اسداللہ خان ایڈووکیٹ کو ہزاروں ووٹوں سے شکست دی -
اس کا نتیجہ یہ ہُوا، کہ سیاسی طور پر اس گھرانے کا وقار ڈسکہ تحصیل سے
ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا، اور تحریکِ مرزائیت کو خاصہ نقصان پہنچا -

حضرت مدنی سے اختلاف

انتخابی موسم بھی عجیب موسم ہوتا ہے، ہر پارٹی سیاسی اکھاڑوں میں

ایسے ایسے داؤ پیچ کھیلتی ہے کہ آدمی منہ دیکھتا رہ جاتا ہے۔

(۱۹۳۶ء میں متحدہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں نے ایکٹ ۱۹۳۵ء کے تحت انتخابات میں جو طریقے استعمال کیے، ان میں ایک یہ بھی کہ مسلم لیگ کے رہنماؤں نے جمعیۃ علمائے ہند سے بعض ایسے وعدے کیے کہ مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی ایسے مذہبی اور سیاسی سوجھ بوجھ کے لوگ اس بساط پر مات کھا گئے، جمعیۃ علمائے ہند اور مسلم لیگ نے باہمی اشتراک سے یو پی کے تمام اضلاع میں الیکشن لڑا۔ انہی دنوں ۲۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو امیر شریعتؒ، حافظ محمد ابراہیم کی حمایت میں ضلع بجنور کا دورہ کر رہے تھے کہ بجنور میں مولانا حسرت موہانی سے مڈبھیڑ ہو گئی امیر شریعتؒ ایک جلسہ میں تقریر کر رہے تھے، کہ مولانا حسرت موہانی مخالف سمت سے خاصی جماعت کے ساتھ امیر شریعتؒ کی مخالفت کے لیے جلسہ گاہ میں آن پہنچے۔ عوام نے جو امیر شریعتؒ کی تقریر سے متاثر ہو چکے تھے مولانا حسرت موہانی کی اس حرکت کو ناپسند کیا، اور قریب تھا کہ مجمع مولانا حسرت موہانی پر ٹوٹ پڑتا، امیر شریعتؒ نے مداخلت کر کے مولانا حسرت کو با احترام اسٹیج پر بٹھا لیا، تقریر جاری رہی، آخر جو لوگ مولانا حسرت کے ساتھ امیر شریعتؒ کی مخالفت کرنے آئے تھے، اس قدر نادم ہوئے کہ اُن کے لیے یہاں سے واپسی مشکل ہو گئی۔)

بجنور سے الہ آباد جاتے ہوئے اسٹیشن پر حضرت شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی سے امیر شریعتؒ کی ملاقات ہوئی، عقیدت، محبت اور احترام

سے ملے جلے جذبات سے امیرِ شریعتؒ نے آگے بڑھ کر حضرت سے مصافحہ اور معانقہ کرنا چاہا، لیکن حضرت مدنی نے جو اُن دنوں مسلم لیگ کی حمایت کر رہے تھے، امیرِ شریعتؒ سے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا، اور کہا :-

"چونکہ آپ کا مسلک غلط ہے لہٰذا میرا آپ سے کوئی تعلق نہیں۔"

اس پر امیرِ شریعتؒ کو قلبی رنج پہنچا، اور حضرت مدنی سے عرض کیا :-

"حضرت! اگر آپ حکم کریں تو میں اپنا دورہ ملتوی کر کے پنجاب چلا جاؤں۔ چونکہ آپ مسلم لیگ سے اشتراک کیے ہوئے ہیں، اور اپنے خادموں سے ناراض ہیں، لیکن کل آپ اپنے اس فیصلے پر خود نادم ہوں گے مسلم لیگ سے آپ کا یہ اشتراکِ عمل مجھ میں نہیں آیا، جبکہ کل تک آپ خود ہمیں درس دیتے رہے ہیں کہ مسلم لیگ سرکار پرستوں کی ٹولی ہے خیر!..... آپ ناراض ہوں تب بھی میں نیاز مند ہوں۔"

اس گفت گو کے بعد امیرِ شریعتؒ اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔

انتخاب ختم ہونے پر مارچ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کا جو پہلا اجلاس ہوا، اُس میں تمام رجعت پسند ممبران شامل ہوئے، اس پر جمعیتہ علمائے ہند نے اعتراض کیا کہ جمعیتہ علماء اور مسلم لیگ کا سمجھوتہ اس بنیاد پر ہوا تھا، کہ مسلم لیگ سے تمام رجعت پسند عناصر نکال دیا جائے گا، تو آج انتخاب کی کامیابی کے بعد ایسے عناصر کو پارلیمانی پارٹی کے اجلاس میں شامل کرنا اپنے وعدوں سے انحراف کرنا ہے۔

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کا دن ایکٹ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کا دن تھا، کانگریس اور جمعیتہ علماء کے درمیان اس ایکٹ کے خلاف ہڑتال کرنے کا فیصلہ تھا، لیکن قائدِ اعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کی تمام شاخوں کو حکم دیا کہ وہ اس ہڑتال میں حصّہ نہ لیں، اس پر جمعیتہ علماء نے قائدِ اعظم سے دریافت کیا کہ جب تمام سیاسی جماعتوں نے اس ایکٹ کی مخالفت کا فیصلہ کیا ہے تو آپ نے اس سے علیحدگی کا کیوں اعلان کیا ہے؟ اس پر صدر مسلم لیگ نے اپنے ایک پریس بیان میں کہا کہ جمعیتہ علماء الیکشن میں مسلم لیگ سے اشتراک کر چکی ہے تو انہیں کوئی حق نہیں پہنچا کہ وہ پارلیمانی پارٹی کے فیصلوں پر اعتراض کرے۔

اس بیان کا شائع ہونا تھا کہ جمعیتہ علماء نے مسلم لیگ کی عہد شکنی کی بنا پر اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان پڑھ کر امیرِ شریعتؒ نے حضرت مدنی کو امرتسر سے مبارک باد کا برقی پیغام بھیجا۔

امیرِ شریعتؒ ہمیشہ حضرت مدنی کا احترام کرتے رہے۔ حضرت مدنی کے دل میں بھی امیرِ شریعتؒ کی عزّت رہی، لیکن مسلم لیگ سے اتحاد کے بعد جو خفت جمعیتہ علمائے ہند کو اٹھانا پڑی، جمعیتہ کے رہنما امیرِ شریعتؒ کے سامنے اپنے اس طرزِ عمل کی بنا پر ہمیشہ شرمندہ رہے۔

تحریک مدحِ صحابہؓ کا دورِ ثانی

۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء کا غروبِ آفتاب اپنی کرنوں کے ساتھ

وہ تمام الاؤ سمیٹ کر لے گیا، جن کی چنگاریوں نے ہندوستان کے ہر گھر میں آگ لگا رکھی تھی۔ بھائی سے بھائی، باپ سے بیٹا اور ماں سے بیٹی اپنی رائے کی بنا پر دشمنی کرنے لگی تھی۔ انتخابات ختم ہوئے تو ہاتھا پائی کا دامن سمٹ کر اُن لوگوں کے آنگن میں لہرانے لگا، جنہوں نے مستقبل میں صُوبوں کے راج سنگھاسن سنبھالنے تھے۔

یکم اپریل ۱۹۳۷ء کا سُورج اپنے جلو میں ایک ایسا قانون لے کر طلوع ہُوا، جس سے فرنگی سامراج کی جگہ اپنے دیس کے لوگوں نے صُوبہ خُود مختاری کے تحت حکومتیں سنبھالیں۔ عوام کے نئے منتخب نمائندوں نے آگے بڑھ کر غیر مُلکی آئین کو اپنی راستے کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا، تو متحدہ ہندوستان کے بعض صُوبوں میں انگریزی راج کی پیدا کردہ مشکلات نے انہیں آن گھیرا، یعنی ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ کے شیعہ، سنی اور ہندو مل کر تعزیے کا جلوس نکالتے تھے، اور یہ جلوس تال کٹورا کی کربلا میں ختم ہوتا تھا۔ ۱۹۰۵ء میں شیعہ حضرات نے اس ماتمی جلوس میں شامل ہونے والوں پر یہ قدغن لگادی کہ تعزیہ کے جلوس میں سر برہنہ اور پا برہنہ شامل ہوں۔ یہ شرط سنی عقیدہ کے مسلمانوں کے لیے تھی۔ کیونکہ شیعہ تو پہلے ہی ننگے سر اور ننگے پاؤں شامل ہوتے تھے۔ اس سے پیشتر سنی عقیدہ کے مسلمان سر پہ ٹوپی اور پاؤں میں جوتا پہنے جلوس کے ہمراہ چلتے تھے۔ نئے اختلافات پر سنی مسلمانوں نے اعتراض کیا، تو حکومت نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ اپنی علیحدہ کربلا بنالیں۔ چنانچہ شہر سے آدھ میل دور پھول کٹورا کے نام سے نئی کربلا تعمیر کی گئی۔

۱۹۰۶ء کا محرم سُنّیوں نے اسی کربلا میں منایا۔ یہ بنیاد تھی لکھنؤ میں شیعہ سنّی کے مابین جھگڑے کی۔

۱۹۰۷ء میں رام پور کے شیعہ مولوی مقبول احمد، جو دہلوی کہلاتا تھا، نے اعلان کیا :-

"چونکہ حکومت کا اعلان ہے کہ وہ کسی کے مذہب میں مداخلت نہیں کرے گی، لہٰذا تبرّہ کہنا ہمارا مذہبی حق ہے، اور ہم تبرّہ کہیں گے۔ اس پر ہمیں کوئی نہیں روک سکتا"

اس اعلان سے سنّی عقیدہ کے مسلمان برہم ہوئے، اور اس سال لکھنؤ میں شیعہ سنّی فساد ہوا، اس فساد کی بنا پر ۱۹۰۹ء میں حکومت یو، پی نے ایک کمیشن مقرر کیا، جس نے اپنی رپورٹ کے آخر میں حکومت کو مشورہ دیا کہ

"عشرہ محرم کے دن چہلم کے موقعہ پر اور ۲۱ رمضان کے دن مدح صحابہؓ کی بندش کی جائے"

کمیشن کے اس مشورے پر حکومت نے اعلان کیا :-

"کوئی شخص ایسے اشعار یا نظمیں یا دوسرے الفاظ جن میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور عثمانؓ کی تعریف کی گئی ہو، یا اُن کی مدح میں ہوں تعزیوں میں یا کسی دوسرے اسلامی جلوس کے راستے پر نہ پڑھے، اور نہ ایسے مقام پر پڑھے، جہاں سے جلوس تک آواز پہنچ سکے، اور نہ کسی مجمع اور نہ کسی پبلک مقام پر ایسے

مدحیہ اشعار اور نظمیں پڑھے۔

اگر کوئی شخص احکام مذکورہ کی خلاف ورزی کرے گا
تو وہ فوراً گرفتار کر لیا جائے گا، اور اس پر دفعہ ۲۹۸ یا
کسی مناسب دفعہ تعزیرات ہند کے تحت مقدمہ چلایا جائیگا"

اِس قسم کے ہنگامی اور مذہبی واقعات سے نئی حکومتوں کے راستہ میں کانٹے بکھیرے اور مشکلات پیدا کیں۔

جون ۱۹۳۷ء میں یو۔پی میں نواب چھتاری نے بحیثیت مسلم لیگ کے جب اپنی عارضی گورنمنٹ ترتیب دی تو راجہ صاحب سلیم پور کو جو عقیدتاً شیعہ تھے، اپنی وزارت میں شامل کر لیا۔ ان کے عہدِ وزارت میں مدح صحابہؓ کا قضیہ جب اُن کے سامنے لایا گیا، تو مصلحتاً انہوں نے یہ کاغذات آنے والی وزارت کے سپرد کرنا ہی بہتر سمجھا۔

(یو۔پی) میں باوجودیکہ کانگریس اکثریت سے کامیاب ہوئی تھی، لیکن ہنوز اُن کے درمیان وزارتیں قبول کرنے میں اختلاف تھا۔ آخر چار ماہ کی مسلسل بحث کے بعد جب کانگریس نے بہت قبول کرنے کا فیصلہ کیا تو نواب چھتاری کی وزارت مستعفی ہو گئی۔ مدح صحابہؓ کی تحریک نے انہیں ایسا پریشان کیا کہ کانگریس گورنمنٹ اس عقدہ کے حل کرنے میں ایسی اُلجھی کہ سُلجھاؤ کا کوئی راستہ دکھائی نہ دیا۔ اس دوران شیعہ سنّی اختلافات بڑھتے گئے۔

اس سال ۹ محرم کو امیر شریعت لکھنؤ گئے تو انہوں نے شیخ شوکت علی وکیل کے احاطہ میں تقریر کے دوران سنّی مسلمانوں سے صرف

ایک سُوال کیا :-

"اِس صُوبہ میں آپ کا کوئی وارث ہے یا نہیں ؟"

اِس سُوال کو ہی امیرِ شریعت نے اپنی تقریر کا عنوان بنا کر تین گھنٹے سنّی مُسلمانوں سے خطاب کیا۔

اِس تقریر کے بعد مجلس احرار کے دُوسرے رہنما چودھری افضل حق، مولانا حبیب الرحمٰن اکثر بار لکھنؤ گئے۔ مولانا حسین احمد مدنی کی وساطت سے یُو، پی کانگرس حکومت سے رابطہ قائم کیا گیا لیکن حکومت خواہ کسی کی ہو، اس کا آستانہ اس قدر بلند ہوتا ہے کہ اس پر بغیر زینہ کے چڑھنا دشوار ہے، اور یہ زینہ انسانی لاشوں سے تیار ہوتا ہے۔

شیخ الہند مولانا حسین احمد مدنی اور دُوسرے رہنماؤں نے کانگرسی حکومت کے وزیرِ اعلیٰ پنڈت گووند ولبھ پنت اور گورنر سر ہیری ہیگ سے متعدد بار گذارش کی کہ

"لکھنؤ میں سنّی مُسلمانوں کا حق ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کی تعریف کریں، جبکہ یہاں اُن کی تعداد اٹھاسی (۸۸) ہزار کے قریب ہے اور شیعہ حضرات صرف بارہ ہزار۔"

مگر حکومت، حکومت تھی کہ کسی کی نہ مانی۔ آخر ۳۰ / جولائی ۱۹۳۷ء بروز جمعہ مجلس احرار نے کانگرس حکومت کے خلاف سول نافرمانی کا اعلان کر دیا۔ اس تحریک میں قریباً پچیس (۲۵) ہزار مسلمان گرفتار ہوئے۔

آخر ۴ / نومبر کو گورنر کے اعلان پر تمام قیدی رہا کر دیے گئے، اور ۲۶ / مارچ ۱۹۳۸ء کو سنّی مسلمانوں کا یہ حق تسلیم کرتے ہوئے حکومت نے واضح

طور پر اعلان کیا۔

"سنیوں کا یہ حق ہرگز مابہ النزاع نہیں کہ آیا انہیں جلسۂ عام یا خاص مجلسوں میں خلفائے ثلاثہ کی مدح مثنار کرنے کا حق ہے یا نہیں۔ بلاشبہ اُن کو یہ حق حاصل ہے۔ جھگڑا صرف اِس بات کا ہے کہ کس طریقے اور کن حالات میں لکھنؤ میں مدح صحابہؓ پڑھنی چاہیئے۔

جب مختلف اقوام کے عقائد اور نقطۂ نظر میں فرق ہو تو گورنمنٹ کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ امن عامہ کو قائم رکھنے کیلیے داخلت کرے اور عام لوگوں کی سہولت کا خیال کرے۔"

اس طرح یو، پی حکومت نے سنی عقائد کے مسلمانوں کا مدح صحابہؓ کا حق تسلیم کرتے ہوئے ۱۹۰۹ء کے انگریزی اعلان کو ختم کر دیا۔

قتل کی سازش کا الزام

۱۹۳۸ء میں گو ہندوستان کے سیاسی حالات پُرسکون نہیں تھے تاہم قانون شکنی کا دور ختم ہو چکا تھا۔ ہر سیاسی تنظیم اپنے حامیوں کی تعداد میں اضافے کے لیئے کوشاں تھی۔

مسلم لیگ اور کانگریس کے اختلافات جوان ہو کر دلوں کی جذباتی بھٹیاں روشن کر رہے تھے۔ اگرچہ یہ لڑائی مذہب سے لاتعلق تھی، تاہم سیاسی ضرورت کے تحت اس عمارت کی بنیاد مذہب پر اٹھائی گئی تھی۔ اس وقت

ہندوستان کی سیاست دو دھڑوں میں منقسم ہو چکی تھی مسلم لیگ میں کافی تعداد مسلمانوں کی شامل تھی، اور کانگریس سے ہندو اکثریت وابستہ تھی۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ دہلی کے اخبار ہفت روزہ "الامان" کے مدیر اعلیٰ مولانا مظہرالدین نے اپنے اخبار میں لکھا کہ

"رات میں نے ایک خواب دیکھا ہے، ایک ہندو دیوی جو کھدر کے لباس میں ہے، اس نے مولوی حسین احمد کی پیشانی پر کشکہ لگایا ہے اور مولوی عطاء اللہ شاہ کے گلے میں جینئو پہنایا ہے۔"

اس خواب کو مولانا مظہرالدین نے کارٹون کی شکل میں اپنے اخبار (الامان) میں شائع کیا۔ دن بھر یہ کارٹون اپنوں اور غیروں کے درمیان بحث کا مرکز بنا رہا، اور کچھ دنوں بعد ۲۴ مارچ ۱۹۳۹ء کو ان کے دفتر میں انہیں قتل کر دیا گیا۔ اس قتل کے الزام میں دو نوجوان محمد شفیق اور محمد احمد کو گرفتار کیا گیا۔

اس قتل کا پس منظر کیا تھا؟ لیکن پیش منظر میں یہ مقدمہ سیاسی نوعیت اختیار کر گیا۔ چنانچہ دہلی کی مرکزی حکومت اور لکھنؤ فرنگی محل کے مولانا قطب الدین اس قتل کی سازش میں ملزمان سے یہ اقرار کرانے پر مصر ہے کہ اس قتل پر نوجوانوں کو آمادہ کرنے والے سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی تھے، مگر ملزمان نے پیہم اصرار کے باوجود اس اقرار پر انکار کر دیا، البتہ ملزمان نے اپنی صفائی کے گواہان میں امیر شریعت اور

مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کا نام دیا۔ جب یہ دونوں حضرات عدالت میں تشریف لائے، تو ملزمان نے عدالت سے کہا:

"ہم ان بزرگوں کی صرف زیارت کرنا چاہتے تھے گواہی کی ضرورت نہیں۔"

آخر اس مقدمے کے فیصلے میں ایک نوجوان کو سزائے موت اور دوسرے کو عبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔

ضلع میانوالی کا دورہ

۱۹۳۹ء کا سال ۱۹۱۴ء کی طرح یورپین قوموں کے مقدر کے عروج و زوال کا سال تھا۔ یورپ کے اُفق پر دوسری جنگ عظیم کے بادل منڈلاتے نظر آ رہے تھے۔ اس جنگ کے نتائج خواہ کچھ ہوتے، لیکن چوگان سیاست میں کھیلنے والے جانتے تھے کہ اگر اب برطانیہ جنگ میں اُلجھا تو وہ سورج جو اُس کی سلطنت میں غروب نہیں ہوتا، وہ اس کو لے ڈوبے گا اور یہ وقت تھا کہ برطانیہ پر ضرب کاری لگائی جائے۔ پنجاب کے ایسے علاقوں میں جا کر لوگوں کو انگریزی فوج میں بھرتی ہونے سے منع کیا جائے، جو خالص فوجی علاقے کہلاتے ہیں۔ چنانچہ اگست ۱۹۳۹ء کے دوسرے ہفتے امیر شریعت اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ضلع میانوالی کے دورہ پر روانہ ہو گئے۔

یہ زمانہ پنجاب میں سرسکندر حیات کی وزارت کا تھا۔ اس کی یونینسٹ پارٹی "ٹوڈیوں اور رائے بہادروں" پر مشتمل تھی۔ انگریز کی کوکھ سے جنم لینے والے

یہ لوگ انگریزی ساٹے کو رحمت خداوندی سے تعبیر کرتے تھے (انہیں جب پتہ چلا کہ امیر شریعتؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی ضلع میانوالی کا دورہ کر رہے ہیں، تو حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آ گئی)

موت سے کھیلنے والے لوگوں کی سرزمین گو ریت کے پہاڑوں سے آباد ہے، مگر پتھر دل کے دل رکھنے والے جوانوں کی آبادی میں امیر شریعتؒ نے جب توحید باری تعالیٰ اور برطانوی سامراج کے خلاف بغاوت کے پھولوں کا نشہ بکھیرے تو ریتلی زمین کا دامن بھی تر آلودہ ہوا، اور خشک پہاڑوں سے امید بہار کی لو آنے لگی۔ رات جس گاؤں میں امیر شریعت تقریر کرتے، گرد و نواح کی فضا کو رائفلوں کی آواز سے دہشت زدہ کر دیا جاتا۔ دن کو جن راستوں پر سفر کرتے انہیں ڈاکوؤں کی آماجگاہ بنا دیا جاتا۔ امیر شریعتؒ کے ہمراہیوں کو ضلع کی پولیس نے اکثر پریشان کیا، مگر پُرخطر ماحول میں پرورش پانے والے انسان ہر خطرے کو خود دعوت دے کر اپنے گرد جمع کر لیتے ہیں، اور یہی وہ زندگی ہے جو انہیں آخر کو منزل سے ہمکنار کرتی ہے۔

گرفتاری

اس سنگلاخ وادی میں پندرہ دن گذار کر جب امیر شریعتؒ واپس آئے، تو دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ ہٹلر کی فوجیں پولینڈ، ناروے اور ڈنمارک سے گزر کر فرانس کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ پنجاب میں

یونینسٹ حکومت کو یہ بات پسند نہ آئی، کہ خالص عسکری علاقوں میں انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کو پھیلنے دیا جائے، جبکہ انگریز براہ راست جنگ میں شریک ہو چکا ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کی برستی ہوئی گھٹاؤں نے یورپ کی دلدل میں ایشیا کو بھی اپنے ساتھ گھسیٹنا چاہا۔ چنانچہ ہندوستان میں انگریزی پرچم کی آزاد اڑانوں کی نگاہیں ایسے لوگوں کی جستجو میں مصروف نظر آنے لگیں، جن کے ارادے اس جنگ کے منتظر تھے اور وہ انگریزی اقتدار سے نجات کے راستے تلاش کر رہے تھے۔ آخر ڈیفنس آف انڈیا رولز کی نگاہِ اوّل نے امیر شریعتؒ کو تاک کر سب سے پہلا وار کیا، اور انہیں ۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ضلع مظفرگڑھ سے گرفتار کر لیا گیا ~~دفعہ ۱۲۱، ۱۲۳، ۱۲۴ الف اور ۱۵۳ کے تحت سیشن جج راولپنڈی کے حکم سے گرفتار کر لیا گیا~~

مجلسِ احرار کی قرارداد

امیر شریعتؒ کی گرفتاری کے ساتھ سارے ہندوستان میں سیاسی کارکنوں کی عام گرفتاریاں شروع ہو گئیں، کانگرس اور مجلس احرار ایسی سیاسی جماعتیں تھیں، جنہوں نے ماضیٔ قریب میں ہندوستان بھر میں اپنی سیاسی تاریخ کو اس نہج پر ترتیب دیا تھا کہ انگریزی راج ان سے متزلزل تھا، دوسری جنگِ عظیم سے متعلق بھی فیصلہ کرنے کا انہی جماعتوں کو اختیار تھا، چنانچہ ۱۰ ستمبر ۱۹۳۹ء کو احرار کی مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) نے امرتسر میں فیصلہ کیا،

("مسلمانانِ ہند اُس وقت تک اِس جنگ میں حکومتِ برطانیہ کے ساتھ تعاون نہیں کریں گے جب تک کہ برطانیہ اسلامی ممالک سے اپنی فوجیں واپس نہ بُلا لے نیز ہندوستان کو مکمل طور پر آزاد نہ کردے)

مجلس عاملہ کی رائے میں پھر یہ سوچنا باقی ہے کہ آیا ہمارے برطانوی فوج میں جانے سے انسانیت کو تو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔"

(مجلس احرار کی اس قرارداد سے ایک طرف انگریزی سامراج برہم ہوا تو دوسری طرف کانگرس کے حواس بھی درست نہ رہے۔ کیونکہ کانگرس ذہنی طور پر یہ سمجھتی تھی کہ اس کے بغیر اس جنگ کے متعلق کوئی دوسری پارٹی رائے دینے کی مجاز نہیں۔)

(مندرجہ بالا قرارداد نے امیرِ شریعتؒ کے مقدمات پر بھی اثر ڈالا، اور عدالت نے اُنہیں ضمانت پر رہا کرنے سے انکار کردیا۔ چوبیس ۲۴ روز کی مسلسل کارروائی کے بعد ۱۴ / اکتوبر (۱۹۳۹ء) کو یہ مقدمات سیشن جج راولپنڈی کے سپرد کردیے گئے، لیکن قانون امیرِ شریعتؒ پر عائد کردہ تمام دفعات کی سچائی میں ناکام رہا، اور اس گرتی ہوئی دیوار کو سہارا دینے کے لیے ۲۰/دسمبر ۱۹۳۹ء کو لالہ موسیٰ ضلع گجرات میں ایک دوسرا مقدمہ ۱۱۷ اور ۲۰۳ کے تحت تیار کرلیا گیا۔ سرکاری استغاثہ نے امیرِ شریعتؒ پر الزام لگایا کہ اُنہوں نے ۲۸ / جون ۱۹۳۹ء کو لالہ موسیٰ میں تقریر کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"اب اسلام کی حکومت کہیں نہیں رہی اور مسلمانوں
کو از سر نو حکومت سنبھالنی چاہیئے، موجودہ حکومت میں مسلمان
عورتوں کے نکاح کے فیصلے شیطان فرنگی کرتا ہے، اور
اسلامی قانون کو پیش نظر نہیں رکھا جاتا، اور غیر دیانت دار
یورپین مؤرخوں نے حکومت کے زیر اثر تاریخی واقعات کو
غلط پیرائے میں بیان کیا ہے۔ مثلاً یہ کہ عالمگیر اورنگ زیب پر
الزام ہے کہ وہ ہر روز صبح ہندوؤں کے بارہ من جینیو
اتارنے کا واقعہ بیان کیا گیا ہے؛ اور حاضرین کی حوصلہ افزائی پر
شاہ صاحب نے کہا کہ میں انگریزی حکومت کا تختہ الٹ دوں گا
اور ان کو اتنے زور سے سمندر میں دھکیل دوں گا کہ وہ پھر
واپس نہ آسکیں گے، سمندر کے پانی کو انگریزوں کے خون
سے سرخ کردوں گا، اور زمین کو بھی انگریزوں کے خون سے
اس طرح سرخ کردوں گا، جس طرح یزید نے امام حسینؓ کی
فوجوں کو قتل کردیا تھا۔

مرزا غلام احمد کافر ہے، اس نے برٹش گورنمنٹ کی
پانچ سو گھوڑوں سے امداد کی تھی۔"

گجرات ڈسٹرکٹ جیل میں اس مقدمے کی سماعت لالہ لکھمی داس
مجسٹریٹ نے کی، دیوان چمن لال امیر شریعتؒ کی طرف سے سینئر وکیل تھے،
ان کے علاوہ دوسرے قانون دانوں نے بھی امیر شریعتؒ کی حمایت میں

اپنی کتب کے اوراق کھنگال ڈالے۔

۱۱ر جنوری ۱۹۴۷ء کو امیر شریعتؒ مقدمے کی پیشی کے لیے عدالت کے کمرہ میں داخل ہونے لگے، تو کسی نے اشارے سے کہا "شاہ جی، یہ ہے لالہ لدھارام پولیس رپورٹر، جس نے آپ کی تقریر کی ڈائری لکھی تھی، اور آج آپ کے خلاف عدالت میں پیش ہوگا" اس پر امیر شریعتؒ نے نظر اٹھا کر لدھارام کی طرف دیکھا، نیز اس سے مخاطب ہو کر کہا:

"بابو لدھارام اس عدالت کے سوا ایک دوسری عدالت بھی ہے، جہاں تم نے پیش ہونا ہے، شہادت دیتے وقت اس عدالت کا خیال بھی رکھنا"

یہ فقرے کہہ کر امیر شریعتؒ عدالت میں داخل ہو گئے۔

ڈاکٹر سعید القادر (گجرات) کا بیان ہے جو اس مقدمہ میں امیر شریعتؒ کے معاون تھے، کہ سرکاری گواہ امیر شریعتؒ کے مندرجہ بالا فقروں پر آبدیدہ ہو گیا، اور دیر تک تنہائی میں خاموش کھڑا رہا۔

باب چہارم ——— ۱۹۴۰ء تا ۱۹۵۰ء

ابتدائی کاروائی

اِنسانی ضمیر کے بیدار ہونے میں گاہ عُمر گذر جاتی ہے اور گاہ آنسوؤں کی نمی اُسے بیدار کر دیتی ہے۔ جب احساس جاگ اُٹھتا ہے تو کھوئی ہوئی اِنسانیت تلاش کرنے میں انسان کو دِقّت نہیں ہوتی۔

امیر شریعتؒ کے الفاظ سرکاری گواہ لدھا رام کی کایا کلپ کر گئے، انگریزی سلطنت کا ہیڈ کانسٹیبل دو دیش کے ایک فقرے پر زندگی کی ساری آسائشیں برباد کر بیٹھا۔

استغاثہ کی ابتدائی شہادت ہیڈ کانسٹیبل لدھا رام کی تھی، جس نے ۲۸ جون ۱۹۳۹ء کو لالہ موسیٰ میں امیر شریعتؒ کی تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے تھے۔ جب وہ بطور چیف رپورٹر ۱۱ جنوری (۱۹۴۰ء) کو ڈسٹرکٹ جیل گجرات میں لکھمی داس ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا، تو امیر شریعتؒ کی طرف سے دیوان چمن لال ایڈووکیٹ (ایم ایل اے) میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ (ایم ایل اے) اور مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ

بطور وکیل پیش ہوئے۔ لدھا رام نے حسب ذیل ابتدائی بیان دیا :-

"میں نے ۲۸ جون ۱۹۳۹ء کو اُس جلسہ میں شرکت کی تھی، جو گرانڈ ٹرنک روڈ کے قریب لالہ موسیٰ میں ہوا تھا۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے اس جلسہ میں تقریر کی تھی لیکن مجھے یہ بات یاد نہیں کہ شاہ صاحب کے علاوہ کسی اور شخص نے بھی تقریر کی تھی یا نہیں۔ میں نے شاہ صاحب کی تقریر کا خلاصہ لکھا تھا۔ جس کتاب پر حروف "پی، ڈی" تحریر ہیں اس میں تقریر کا اردو خلاصہ درج ہے، اور میرے ہی ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، لیکن یہ خلاصہ دراصل اُس تقریر کا نہیں ہے جو شاہ صاحب نے کی تھی، بلکہ یہ تقریر کا مسخ شدہ خلاصہ ہے، جو میں نے تقریر کے وقت نہیں، بلکہ تقریر کے بعد کیا تھا، اصل تقریر کا خلاصہ جلا دیا گیا تھا۔

تقریر پیش نظر کا خلاصہ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کی ہدایت پر میں نے گجرات میں اُن کے مکان پر مرتب کیا تھا اور دوسرے روز میں نے اُسے مفصل عبارت میں منتقل کیا۔"

اس مرحلے پر استغاثہ نے عدالت سے درخواست کی کہ اُسے قانون شہادت کی دفعہ ۱۵۴ کے تحت گواہ پر جرح کرنے کی اجازت دی جائے، مختصر بحث کے بعد عدالت نے یہ درخواست قبول کر لی۔ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کی جرح کے جواب میں گواہ نے کہا :-

"میں نے یہ خلاصہ تقریر کے تین روز بعد مرتب کیا تھا مجھے وزیر اعظم پنجاب (سر سکندر حیات) کا ایک خط دکھایا گیا تھا، جس میں مجھے پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر حاضر ہونے کی ہدایت کی گئی تھی، میں نے اس کی تعمیل کی۔ اس خط میں تحریر تھا کہ جلسہ ختم ہونے کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو تم پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر پہنچو، لیکن اس خط میں وہاں پہنچنے کے لیے تاریخ معین نہیں کی گئی تھی۔ یہ خط ٹائپ کیا ہوا تھا اور مجھے اصل خط دکھلایا گیا تھا۔ میں نے اپنی واقفیت کیلیے اس خط کا ترجمہ کر لیا تھا۔ استغاثہ کے دو گواہ جنہوں نے تقریر کے اس خلاصے پر دستخط کیے تھے میرے ساتھ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر نہیں گئے تھے۔ خط میں یہ بھی لکھا ہوا تھا کہ تقریر کا خلاصہ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مشورے سے مرتب کرنا چاہیئے۔

یہ خط ۲۸ جون ۱۹۳۹ء کا لکھا ہوا تھا۔ اس کا نمبر سی، آر، پی، بی، ۷۸، ایل (CRPB 78 L) تھا۔ یہ خط ۳۰ جون کو ہی گجرات پہنچا تھا۔ خط میں یہ ہدایت بھی درج تھی کہ اس خط کو خفیہ تصور کرنا چاہیئے۔ اس بنا پر میں نے کسی دوسرے پولیس افسر کو اس بات کی اطلاع نہیں دی کہ میں نے تقریر کا خلاصہ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مشورے سے مرتب کیا ہے۔ کیونکہ مجھ سے وعدہ کیا گیا تھا کہ مجھے ترقی

دی جائے گی، اور مجھے کام کی عمدگی کی سالانہ سند دی گئی تھی اس لیے میں نے تقریر کے خلاصہ کو مسخ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں کیا، اس سلسلے میں مجھے نقد انعام بھی دیا گیا تھا لیکن مجھے یہ بات یاد نہیں کہ انعام کی صحیح رقم کیا تھی؟

شہادت کے دوران دیوان چمن لال نے چند کاغذات لدھا رام کو دیے جنہیں گواہ نے عدالت میں پیش کیا۔ ان کاغذات میں گواہ نے اپنے اس نظریہ کی وضاحت کی تھی، جس کی بنا پر اب وہ پولیس کی ملازمت سے مستعفی ہو چکا تھا، اس استعفے کو عدالت نے پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے کہنے پر ایگزبٹ بی، ڈبلیو ۴ کر لیا، جو حسب ذیل ہے:

جناب عالی!

میں اڑھائی سال سے محکمہ پولیس میں کام کر رہا ہوں میری ڈیوٹی پولیس رپورٹر کی ہے میں کئی دفعہ اپنے ضمیر کے خلاف کام کرتا رہا ہوں، وہ محض اس لیے کہ افسران بالا کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اُن کو خوش رکھوں۔ مگر آخرکار مجھے اپنے ضمیر نے بیدار کیا اور میں اپنے ضمیر کا خون نہ کر سکا، جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں آج عدالت میں بالکل درست و راست، اصل اور قدرتی چیز پیش کر رہا ہوں۔ چنانچہ سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے مقدمے کے اصل حالات حسب ذیل ہیں:

آنریبل سر سکندر حیات وزیر اعظم پنجاب کی طرف سے چند ایک مراسلات ان کے "پی، اے" کی معرفت سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات کو پہنچے جن میں سے بعض حکموں پر میری تعمیل کرائی گئی۔

سب سے پہلی چٹھی مورخہ ۲۹ [illegible] نمبر CRF جس میں سید عطاء اللہ بخاریؒ کی نگرانی کے لیے تحریر تھا، جس میں مسٹر بی، ایس، برا، سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات کو لکھا گیا تھا کہ "سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ سکنہ ناگڑیاں ضلع گجرات جب تمہاری حدود میں پہنچے، تو اس کی تمام حرکات و سکنات کی نگرانی کی جائے اور ایک اچھے ہوشیار رپورٹر کی ڈیوٹی اس کے ساتھ لگا دی جائے، وہ محتاط ہو کر اس کی نگرانی کرے، اور نگرانی کنندہ کا نام وغیرہ اس چٹھی میں درج کیا جائے" اس چٹھی کی تعمیل میں مجھے سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی نگرانی کے لیے مقرر کیا گیا، اور بذریعہ چٹھی نمبر A-106 مورخہ 12/[illegible] سپرنٹنڈنٹ صاحب کی طرف سے مندرجہ ذیل جواب وزیر اعظم کے پی اے کی معرفت بھیجا گیا۔

جناب عالی! تعمیل حکم حضور والا انشائح ہو گئی ہے، اور ایک اچھا ہوشیار رپورٹر ان کی نگرانی کے لیے منتخب کیا گیا ہے جس کا نام لدھا رام ہے [illegible] کانسٹیبل ہے [illegible]

[illegible]

اس کے بعد مندرجہ ذیل چھٹی "پی اے" سرسکندر حیات کی طرف سے ۱۱ جون ۱۹۳۹ء کو سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات کے نام آئی۔ اس چھٹی کا نمبر $\frac{C.R.P}{86376}$ تھا "آپ کو تحریک جاتا ہے کہ ہمیں خفیہ طور پر اطلاع ملی ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری تمہارے ضلع گجرات میں یونینسٹ وزارت کے خلاف پروپیگنڈے کے لئے جا رہا ہے۔ آپ ایک ہوشیار با اختیار رپورٹر کو حکم دیں کہ وہ اس کی تقریروں کے نوٹ لکھ کر آپ کے سامنے پیش کرے، اور ممکن ہو تو بہت کشادہ لفظ لکھے جاویں اس حکم کو نہایت خفیہ حکم تصور کیا جائے، اور بعد کرانے تعمیل رپورٹ ہمارے پاس بھیج دیا جائے۔ ضروری ہے"

اس چھٹی کے جواب میں مورخہ ۴/۹ ۳۹ کو چٹھی 106,B کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ گجرات نے سرسکندر حیات خان کو ان کے پی، اے کی معرفت اس مضمون کی چٹھی لکھی :

"بجواب حکم B.511.L عرض کی گئی ہے کہ لدھا رام رپورٹر کی ڈیوٹی لگائی گئی ہے اور اس کو خاص ہدایت کی گئی ہے کہ وہ عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریروں کے نوٹ لیتے وقت کشادہ طور پر لکھے، اور ہمارے روبرو پیش کرے اور پیر غازی میں ایک جلسہ ہونے والا ہے جس میں کہ اسے خاص ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کھلے طور پر نوٹ کرے جو کہ ڈائری علیحدہ

ارسال ہوگی۔"

اس چھٹی کے بعد موضع پیر غازی وغیرہ میں جلسے ہوئے جس میں شاہ صاحب نے بالکل مذہبی تقریریں کیں۔ میں نے ان کو کشادہ لکھنا موزوں نہ سمجھا، کیونکہ ان میں کمی بیشی کرکے مقدمہ چلانے کی گنجائش نہ تھی۔ اس پر سپرنٹنڈنٹ صاحب نے میری طلبی کی۔ میں نے جواب میں کہا کہ تقریریں بالکل مذہبی تھیں ان کا کشادہ لکھنا بے سود تھا۔

اس کے بعد سر سکندر حیات کے پرسنل اسسٹنٹ نے ۲۸ جون ۱۹۳۹ء کو چھٹی نمبر $\frac{\text{C.R.P}}{\text{B.7806}}$ کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ ضلع گجرات کو لکھا۔

"ڈائری خفیہ از موضع پیر غازی اور مدینہ پہنچ چکی ہے، چونکہ ان میں مذہبی لیکچر تحریر ہے، جس میں اتنی گنجائش معلوم نہیں ہوتی، لہٰذا آئندہ ڈائری کوئی بھی ہو، جس میں پولیٹیکل اظہار ہو اس میں تقریر کو اس طرح پر لیا جائے کہ حکم پروسیکیوٹنگ انسپکٹر بنایا جائے کہ وہ تقریر زیر دفعہ ۱۲۱ تعزیرات ہند یا کسی قتل کی تبلیغ کے جرم میں مثلاً $\frac{۳۰۲}{۱۱۷}$ کا مرتکب ہو سکے، اور یہ بھی خیال رکھا جائے کہ ساتھ $\frac{\text{۱۲۴ الف}}{۱۵۳}$ بھی قائم رہے اور گواہان خاص طور پر معتبر اور اچھے پولیس کے اثر والے ہوں، اس حکم کو نہایت خفیہ تصور کیا جائے۔"

اس حکم کی وصولی کے بعد مورخہ ۲۸ ۴۹ء کو شاہ صاحب نے لالہ موسیٰ ضلع گجرات میں تقریر کرنے کے لیئے آنا تھا۔ چنانچہ حسب سابق مجھے رپورٹ لینے کے لیے متعین کیا گیا۔ شاہ صاحب نے تاریخ مقررہ پر لالہ موسیٰ میں تقریر کی، اور میں نے اس تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے اور ان میں کچھ کشادہ جگہ موجب ہدایت افسران بالا رکھی اور تقریر کے لونگ ہینڈ نوٹ کے بغیر ہی گجرات واپس آیا اور پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کو شارٹ ہینڈ نوٹ دکھائے اور پڑھ کر سنائے۔ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر نے کشادہ جگہ کو ناکافی خیال کیا اور مجھے کہا کہ میں اس تقریر کو لانگ ہینڈ میں لکھ دوں۔ میں نے تعمیل حکم "پی، آئی" صاحب کی۔ "پی، آئی" صاحب نے لانگ ہینڈ کی عبارت میں اپنے حسب منشا تبدیلیاں اور اضافے کیئے، اس کے بعد چونکہ ۲۸ تاریخ والی کاپی کی تحریر تبدیلیوں اور اضافوں کے باعث مشکوک ہو گئی تھی، اور اُسے عدالت میں پیش نہیں کیا جا سکتا تھا، اس لیے پی، آئی صاحب نے حکم دیا کہ نئی کاپی پر تبدیل شدہ عبارت شارٹ ہینڈ اور لانگ ہینڈ میں تحریر کی جائے۔

نئی کاپی مورخہ ۳۰ ۴۹ء کو صاحب سپرنٹنڈنٹ بہادر پولیس کے سٹینو سے حاصل کی گئی، اور اس پر تمام عبارت

شارٹ ہینڈ اور لانگ ہینڈ نوٹ کرنے کے بعد ۲۴ ، ۲۹ والی اصلی کاپی کو بحکم پی ، آئی صاحب نذر آتش کر دیا ، اور اس نئی کاپی کی بنا پر مقدمے کی منظوری حاصل کی گئی ، اور یہ مقدمہ چلایا جا رہا ہے ۔ اصل ڈائری اور موجودہ ڈائری (جعلی) کے چند ایک اختلافات میں یہاں نوٹ کرتا ہوں ، جن سے معلوم ہو سکے گا کہ کس طرح حکام بالا کے احکام کی ناجائز تعمیل کی گئی ہے جو موجودہ ڈائری میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے ۔

(۱) ساڈیاں دھیاں وسے نکاح تے ساڈے نکاح دے فیصلے شیطان فرنگی کردا اے ، تے ساڈی شریعت دا کوئی خیال تے لحاظ نہیں کردا ۔

(۲) یہ ان بے ایمان فرنگیوں اور سکھوں کی متفقہ چال ہے ۔

(۳) میں حیران ہوں کہ یہ فرنگی ، خدا ان کو غارت کرے کیوں نہیں جاتے ؟

(۴) میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ زیادہ نہیں ، صرف جتنے آدمی یہاں موجود ہیں ، میرے ساتھ ہو جائیں میں اس حکومت کا تختہ پلٹ دوں ، ان کے پرخچے اُڑا کر رکھ دوں اور ان دشمنوں کو بحر میں جا کر ایسا دھکا دوں کہ نظر نہ آئیں ، مجھے اس وقت بھی اگر تمہارا حوصلہ ہو اور تیر و کمان و تیغ بکف ہو کر ان فرنگیوں کے خون کی نہریں بہا دوں ، اُن کے خون سے سمندر لال کر دوں ۔

ان کے خون سے زمین سیراب کر دوں، جس طرح یزید نے حسینؓ کی فوج کو تہ تیغ کیا تھا، اسی طرح ان شیطانوں کو کاٹ دو، حملے سے کام لو، اور ان بے ایمان کافروں کو نکال دو۔"

ضبط شدہ ڈائری میں جو کچھ تحریر تھا :

(۱) ساڈے نکاح۔ تے ساڈی بیٹیاں دے نکاح دے فیصلے غیر مسلم کرن، ساڈی شریعت دا کوئی خیال تے لحاظ نہ ہووے۔

(۲) نہیں، بلکہ یہ سکندر اور یونینسٹ پارٹی کی مہربانی اور چال ہے

(۳) میں حیران ہوں کہ باوجود سردار دھنا سنگھ کی مسجد بنوانے پر بھی سکھ صاحبان کے دل سے کدورت اور برا خیال کیوں نہیں جاتا، اور یہ اتفاق کیوں نہیں کرتے۔

(۴) یہ الفاظ صرف پی، آئی صاحب نے بحکم سر سکندر حیات خاں مندرجہ اپنی طرف سے لکھوا لئے، جو بالکل جھوٹ ہیں اور ایک بے گناہ ہستی کو گناہ عظیم کا موجب بناتے ہیں۔ یہ الفاظ قطعاً ملزم نے اپنی تقریر میں استعمال نہیں کیے۔

اس طرح مقدمہ تیار کرنے کے بعد اور $\frac{۳۰۲}{۱۱۷}$ تعزیرات ہند کا مواد مہیا کرتے اور ساتھ ہی $\frac{۱۲۴}{۱۵۳}$ کا خیال رکھنے کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات نے سر سکندر حیات کو ان کے پی، اے کی معرفت اپنی چٹھی نمبر 156.C مورخہ ۹ ستمبر ۴۲ میں اپنی کارکردگی اور

تعمیلِ ارشاد کی حسبِ ذیل اطلاع دی:

"جنابِ عالی!

مورخہ ۲۸ مئی ۴۹ کو عطاء اللہ نے لالہ موسیٰ میں تقریر کی، جس کے متعلق رپورٹر کو خاص طور پر ہدایت کی گئی تھی۔ مطابق ہدایت پی، آئی صاحب کے پاس ڈائری کو بھیجا گیا، اور اس میں گنجائش نہ ہونے کی وجہ سے ڈائری اور مرتب کی گئی۔ جس میں قانونی اغراض کو مدِنظر رکھتے ہوئے کمی بیشی کی گئی، اور ایسے الفاظ ایجاد کیے گئے کہ جن پر فوراً ۳۰۲/۱۱۷ تعزیراتِ ہند عائد ہوتا ہے، اور بعد شہادت استغاثہ ۲۱ الف تعزیرات ہند بھی قائم ہو سکتا ہے۔ ۳۰۲/۱۱۷ تعزیراتِ ہند کے لیے صرف الفاظ تبلیغ قتل اقوام انگریز اور پبلک میں کافی اشتعال لکھا گیا ہے، لہٰذا بموجب حکم تعمیل ہو کر رپورٹ عرض ہے۔"

وزیرِ اعظم سے لے کر نچلے افسروں تک کی تمام کارروائی کا حال مذکورہ بالا خط و کتابت اور جعلی ڈائری نویسی سے ظاہر ہے۔ اس پر مزید کسی تنقید کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی کوئی منصف مزاج انسان اس بارے میں کسی تنقید کا محتاج ہوگا۔

اب میرے سامنے کئی روز سے یہ سوال درپیش ہے کہ آیا میں اس طرزِ عمل کو قبول کرتا جاؤں جبکہ اب تک

جاری ہے اور جس کے ذریعے دُنیاوی طور پر فائدہ اور ترقی کی اُمّید ہے، اور اس جعلی ڈائری کی ترتیب میں جو خدمت مجھ سے لی گئی ہے، اس کے صِلے میں ۸/۹/۳۹ کو پچیس ۲۵ روپے نقد انعام اور ایک عدد سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے بعد مزید ترقی و انعام و اکرام کے لالچ میں جیسا کہ مجھ سے وعدہ کیا گیا ہے۔ مَیں ضمیر فروشی کرتا جاؤں یا دوسروں کے خون سے ہاتھ رنگین کرنے سے باز نہ آؤں خواہ اس میں دُنیاوی زر و مال کی کمی ہی کیوں نہ ہو، میرے دل نے بیحد کشمکش اور شب و روز کے غور و فکر کے بعد یہی فیصلہ کیا ہے کہ مَیں بڑے بڑے افسران کا آلۂ کار بن کر اپنے ضمیر کا خون نہ کروں اور جس محکمہ میں اس قسم کی بے ایمانی اور ضمیر فروشی کے بغیر ترقی کا راستہ نہیں مل سکتا۔ اس کو خیرباد کہتا ہوا اپنے گناہوں سے توبہ کروں اور اپنے آپ کو خُدا کے بھروسے پر چھوڑ دوں۔ اندریں حالات مَیں ملازمت سے مستعفی ہوتا ہوں۔"

لدھارام بقلم خود

مندرجہ بالا بیان کے بعد گواہ پر مفصل جرح کی گئی اور یہ کہ اُس نے نوٹ بک کس طرح حاصل کی تھی۔ اس سلسلے میں لدھارام نے بیان میں کہا: "مَیں نے ۴ نومبر ۱۹۳۹ء کو مقدمہ کی پہلی سماعت کے

مرتبہ پر جب شاہ صاحب کو دیکھا تو میرے دل میں خیال
پیدا ہوا کہ میں ایک بے گناہ شخص کو مصیبت میں پھنسا رہا ہوں
مجھے خدا کے سامنے اس فعل کا جواب دینا ہوگا چنانچہ
میں نے یہ تہیہ کر لیا کہ اگر کسی وجہ سے آج میری شہادت
نہ ہو سکی تو میں اس راز کو جو ابھی تک میرے سینے میں محفوظ
ہے، طشت از بام کر دوں گا، لیکن اگر آج میں شہادت سے
نہ بچ سکا، تو گواہی دینے کے بعد خودکشی کر لوں گا۔ میں
۳ دسمبر ۱۹۳۹ء کو رخصت پر چلا گیا تھا، اور آج اس
مقدمے کی سماعت کے موقعہ پر حاضر ہوں۔ میں آج ہی
لاہور سے کرائے کی ایک موٹر کار میں یہاں پہنچا ہوں۔ میں
تنہا آیا ہوں۔ میں نے دو آنے تین پائی فی میل کے حساب سے
کرایہ ادا کیا ہے۔ میں ڈرائیور کا نام نہیں جانتا، لیکن وہ
جیل کے دروازے کے باہر موجود ہے۔ میں گذشتہ
اڑھائی سال سے محکمہ پولیس میں ملازم ہوں۔

مجھے چند خفیہ خطوط بھی دکھائے گئے تھے، اگر
عدالت مجھے اس بات کا یقین دلائے کہ ان خطوط کے
مضامین کو منظرِ عام پر لانے کی پاداش میں مجھ پر مقدمہ
نہیں چلایا جائے گا، تو میں انہیں منظرِ عام پر لانے کے
لیے تیار ہوں۔"

گواہ نے بیان جاری رکھتے ہوئے کہا:

"میں اس سے پہلے اپنے ضمیر کو ذبح کر تا رہا ہوں لیکن آئندہ اس کے لیے تیار نہیں ہوں"

اس کے بعد گواہ نے اس بات کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا کہ کس طرح اس مقدمہ میں شہادت دینے سے گریز کرتا رہا۔ پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کا منشا بھی یہ تھا کہ میں شہادت نہ دوں۔ کیونکہ انہیں کسی طرح میرے ارادے کا پتہ چل گیا تھا ــــــ گواہ نے کہا:

"میں ۲۸ دسمبر ۱۹۳۹ء کو پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر گیا۔ جہاں مجھ سے کہا گیا کہ تمہیں تار کے ذریعے چھٹی لینی چاہیئے"

شاہ صاحب کے وکیل کی جرح کے جواب میں گواہ نے کہا:

"میں ایک یا ڈیڑھ سال سے پولیس رپورٹر کی حیثیت سے کام کر رہا تھا۔ مختصر نویسی کی کتابیں پولیس کے دفتر میں رہتی ہیں، جب ایک کتاب ختم ہو جاتی ہے تو اسے پولیس کے دفتر بھیج کر دوسری منگوالی جاتی ہے، مجھے حکم دیا گیا تھا کہ شاہ صاحب کی تقریر کے خلاصہ کو پروسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس لے جاؤں۔ مجھے وزیر اعظم کے حکم میں یہ ہدایت کی گئی تھی کہ شاہ صاحب کی تقریر کا خلاصہ لکھتے ہوئے الفاظ کے درمیان خالی جگہ چھوڑتا چلا جاؤں۔ یہ خط جس میں مذکورہ بالا

ہدایت درج تھی۔ وزیر اعظم کے پرسنل اسسٹنٹ کی جانب سے
تھا۔ ایسے تمام خطوط جو پولیس سپرنٹنڈنٹ کے دفتر میں
موصول ہوتے ہیں، ایک رجسٹر میں درج کر لیے جاتے ہیں،
یہ رجسٹر صیغۂ راز میں ہوتا ہے اور کسی ایسے شخص کو جس سے
اس امر کا کوئی تعلق نہ ہو، نہیں دکھایا جاتا۔ میں ان خطوط کا
خلاصہ اس لیے اپنے پاس لکھتا رہا کہ اس میں میرے لیے
ہدایات درج تھیں۔"

اس موقع پر گواہ نے خطوط سے متعلق اپنی یادداشتیں پیش کیں،
اور اپنے بیان کو مزید جاری رکھتے ہوئے کہا:

"وہ نوٹ بک جس میں شاہ صاحب کی تقریر کا صحیح
خلاصہ درج تھا، ۲۸ دسمبر کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے اپنے
مکان پر جلادی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، شاہ صاحب نے
اپنی تقریر میں کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی، جس کی بنا پر
ان کے خلاف ۱۲۳ الف اور ۱۲۱ قانون ضابطۂ فوجداری کے
تحت مقدمہ چلایا جاسکے۔"

بیان کے آخری حصے میں گواہ نے کہا:

"لاہور سے گجرات آتے ہوئے آج راستہ میں مجھے
یہ بات معلوم ہوئی کہ میری گرفتاری کے لیے جہلم یا گجرات
سے وارنٹ جاری ہوئے ہیں۔ جب میں ڈسٹرکٹ جیل کے

احاطہ میں دیوان چمن لال سے ملا، تو ان سے امداد کی درخواست کی، اور عدالت کے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے چند کاغذات اور ایک خط انہیں دے دیا۔

یہ میرا استعفیٰ تھا، جب میں ڈسٹرکٹ جیل کی عدالت کے کمرہ میں داخل ہو رہا تھا، تو دیوان چمن لال نے عدالت کے سامنے استعفیٰ اور دوسرے خطوط مجھے واپس کر دیے۔

میں مجسٹریٹ کے ساتھ ساتھ سب جیل تک آیا ہوں کیونکہ میں حفاظت کا متمنی ہوں۔ عدالت کے کمرہ میں داخل ہونے سے پہلے میں نے دیوان چمن لال صاحب سے کہا تھا کہ وہ عدالت سے درخواست کریں کہ وہ مجھے بطور گواہ پیش ہونے کے لیے اپنی حفاظت میں لے لیں۔

۲۸ دسمبر ۱۹۳۹ء کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے مجھ سے دوسری ڈائری تیار کرنے کے لیے کہا تھا کہ اس مسودہ کے جس پر حروف پی، آئی لکھے ہوئے ہیں، صفحہ ۴۲ پر جن لوگوں کے دستخط موجود ہیں، وہ ان کی موجودگی میں دوبارہ دستخط کرا سکیں۔

۸ رجنوری ۱۹۴۰ء کو اپنی ملازمت پر واپس آرہا تھا کہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر مجھے وزیرآباد ریلوے سٹیشن پر ملے۔ مجھے یاد نہیں کہ اس وقت میرے ساتھ کوئی تھا یا نہیں۔ بندہ اناراتی میرا عزیز ہے اور لاہور کے قیام کے دوران میں اسی کے

پاس ٹھہرا تھا۔"

اس شہادت کے بعد مقدمہ ۲۳ جنوری پر ملتوی ہو گیا۔

شہادت کے بعد جب لدھا رام عدالت سے باہر آیا تو بخشی آنند رام اسسٹنٹ سب انسپکٹر پولیس نے ان سے ایک نوٹس کی تعمیل کرائی، جس میں تحریر تھا کہ چھٹی منسوخ ہو جانے کے بعد کیونکہ تم بروقت اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے حاضر نہیں ہوئے، اس لیے تمہیں معطل کیا جاتا ہے۔

لدھا رام :۔ "میں مستعفی ہو چکا ہوں"

اس طرح مقدمہ کے حالات و واقعات نے ایک نئی شکل اختیار کر لی، دوسری صبح کے اخبارات نے اس مقدمہ کو جلی سرخیوں سے شائع کیا تو لاء اینڈ آرڈر کے تحفظ کے لیے سرکاری قانون اپنی حفاظت میں لیس ہو کر سامنے آ گیا ۱۳ فروری ۱۹۳۰ء کو ایڈووکیٹ جنرل مسٹر سلیم نے ہائیکورٹ میں درخواست دی کہ

"اس مقدمہ کو ہائی کورٹ میں منتقل کر دیا جائے، کیونکہ لدھا رام گواہ استغاثہ نے وزیر اعظم پنجاب کو جو لاء اینڈ آرڈر کے مالک ہیں، اس مقدمہ میں پھنسانے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا کسی ماتحت عدالت پر اس معاملہ کا فیصلہ نہیں چھوڑا جا سکتا"

چنانچہ جسٹس اسکیمپ نے درخواست کی سماعت کے بعد یہ مقدمہ ہائیکورٹ میں منتقل کر دیا۔

ماتحت عدالت سے فارغ ہو کر لدھا رام گواہ کو یقین تھا کہ پولیس انہیں گرفتار کر لے گی، لیکن امیر شریعت کے وکیل دیوان چمن لال ایڈووکیٹ نے

لدھارام کو اپنی تحویل میں لے لیا، اور اس سے گفت گو کرتے ہوئے اپنی کار کے قریب لے آئے کہ اتنے میں ڈی، آئی، جی پولیس نے کہا "میرے پاس لدھارام کے دفعہ ۲۹ کے وارنٹ ہیں اور انہیں گرفتار کرنا چاہتا ہوں"

دیوان چمن لال نے کہا "آپ انہیں گرفتار نہیں کر سکتے، کیونکہ اب وہ ملازمت سے مستعفی ہو چکے ہیں"

پولیس آفیسر کو گمان ہوا کہ ممکن ہے کوئی قانونی شق ایسی ہو کہ میں انہیں گرفتار نہیں کر سکتا، ابھی وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھے کہ دیوان چمن لال جلدی سے لدھارام کو اپنی کار میں بٹھا کر لے اُڑے۔ پولیس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے، لیکن اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔

لدھارام کی تلاش

پنجاب پولیس نے اپنے مجرم کی تلاش میں مجلس احرار کے دفاتر سیاسی کارکنوں کے مکان اور دیگر پولیٹیکل پارٹیوں کے ٹھکانوں پر مسلسل چھاپے مارے، مگر نامرادیوں کے سوا انہیں کچھ ہاتھ نہ آیا۔ آخر لدھارام کہاں غائب ہو گیا؟ اپنے تمام وسائل کے باوجود پنجاب پولیس اس سے بے خبر رہی۔

ہائی کورٹ میں

ان دنوں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر سر ڈگلس ینگ اور پنجاب کے وزیر اعظم سر سکندر حیات خاں کے درمیان تعلقات خوش گوار

نہیں تھے۔ احرار رہنماؤں نے اس سے استفادہ کرنے کے لیے دہلی کے مشہور چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ مسٹر آئر کی معرفت چیف جسٹس سے ملاقات کی راہ نکالی، نیز سر ڈگلس ینگ نے بھی کسی محفل میں اس ارادے کا اظہار کیا کہ

"اگر آپ مجھے مطمئن کر دیں کہ سر سکندر حیات نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے خلاف ذاتی رنجش کی بنا پر در پردہ سازش کر کے مقدمہ چلایا ہے تو میں سید صاحب کے ساتھ پورا پورا انصاف کروں گا۔"

چنانچہ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کی معیت میں صبح پانچ بجے ٹیکسی کار کے ذریعے جسے ایک سکھ ڈرائیو کر رہا تھا، سر ڈگلس ینگ کی کوٹھی کے عقبی دروازے پر پہنچے۔ سر ڈگلس ینگ پہلے سے منتظر تھے۔ وہ مولانا کو اپنے خاص کمرہ میں احترام سے لے گئے۔ ڈاکٹر عبدالقوی لقمان کے توسط سے مولانا اور مسٹر ینگ کے درمیان گفت گو ہوئی۔ مولانا نے سر سکندر حیات کے پرسنل اسسٹنٹ کے خطوط کی تصاویر دکھائیں۔

گو یہ ملاقات بڑی محتاط اور مخفی طریق سے تھی، لیکن سی، آئی، ڈی کو پتہ چل ہی گیا کہ احرار رہنماؤں اور ینگ کے درمیان ملاقات ہوئی ہے۔ آخر ۱۱ر مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈگلس ینگ اور رائے بہادر جسٹس رام لال پر مشتمل ڈویژنل بنچ کے روبرو زیر دفعہ ۱۲۴ الف بغاوت، دفعہ ۱۵۳ ملک معظم کی رعایا کے درمیان منافرت پھیلانے، دفعہ ۳۰۲-۱۱۷ تعزیرات ہند قتل کی انگیخت وغیرہ الزامات کے تحت مقدمہ پیش ہوا۔ اس موقع پر امیر شریعتؒ کو لاہور سنٹرل جیل سے پولیس کی خاصی تعداد کے

حراست میں بغیر ہتھکڑی کے ہائی کورٹ میں پیش کیا گیا۔

اس موقع پر سینکڑوں کی تعداد میں لوگ عدالت کے صحن میں جمع تھے۔

عدالت کے باہر اور ہائی کورٹ کے صحن میں پولیس کا کڑا پہرہ تھا۔

سرکار کی طرف سے مسٹر محمد سلیم ایڈووکیٹ جنرل اور مسٹر منیر احمد سینئر ایڈووکیٹ جنرل عدالت میں موجود تھے جبکہ امیر شریعت کی طرف سے میاں عبدالعزیز، دیوان چمن لال، مسٹر کے، ایل گابا بیرسٹر، مسٹر بدرالاسلام ایڈووکیٹ مولانا مظہر علی اظہر ایڈووکیٹ اور میر عبدالقیوم وکیل لائل پور پیروکار تھے۔

اس مقدمہ میں استغاثہ کی طرف سے ۱۱۔ ۱۲ مارچ کی کارروائی کے دوران چھ سرکاری گواہان نے عدالت میں بیان دیئے۔ آخری اور اہم گواہ لدھا رام تھا، جس کے لیے مقدمہ یکم اپریل پر ملتوی کر دیا گیا۔

لدھا رام

پانچ فٹ چھ انچ قد، سفید رنگ کے ساتھ دوہرا اور گٹھیلا جسم، خوبصورت نقش و نگار، یہ تھا چوبیس سالہ نوجوان مسٹر لدھا رام، والد کا نام امیر چند نارنگ، اور یہ ضلع سرگودھا کے چک ۴۶ میں پیدا ہوئے، اور سناتن دھرم ہائی سکول گجرات سے میٹرک کرنے کے بعد لاہور ڈی اے وی کالج سے ایف اے تک تعلیم حاصل کی، گجرات پولیس میں بطور ہیڈ کانسٹیبل بھرتی ہوئے۔ اوپر کے افسروں میں اس قدر اعتماد حاصل کیا کہ ضلع کی ہر سیاسی ضرورت کے لیے انہیں استعمال کیا جاتا رہا۔

۱۱ر جنوری ۱۹۴۰ء کو جب وہ پہلی بار امیر شریعتؒ کے مقدمہ میں چیف رپورٹر کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئے اور عدالت اُنہیں منحرف گواہ قرار دے دیا، تو دیوان چمن لال اور میاں عبدالعزیز انہیں لاہور لے آئے۔ وہ قریباً ایک ہفتہ مولانا مظہر علی اظہر کے مکان واقع ریلوے روڈ میں رُوپوش رہنے کے بعد کیلاش پور (سہارن پور سے ۹ میل دُور) پھر کیمتقل، ہردوار کے قریب جنگل میں چھپے رہے۔

عدالت میں

ہائیکورٹ میں اٹھارہ دن التوا کے بعد یکم اپریل کو مقدمہ کی کارروائی ازسرِنو شروع ہوئی۔ اس روز لدھا رام کی شہادت تھی۔ عدالت کے وسیع صحن میں ہزاروں انسانوں کا اجتماع تھا۔ عدالت میں داخلے کے لیے پاس جاری کیے گئے تھے۔ مگر ہجوم کی زیادتی کے باعث پاس بند کرنے پڑے۔ کمرۂ عدالت سے باہر اور اندر پولیس کا اہم انتظام تھا۔ ٹھیک نو بج کر پینتالیس منٹ پر امیر شریعتؒ کو پولیس کی معیت میں کار پر عدالت میں لایا گیا تو ہجوم اس قدر بے قابو ہوا کہ پولیس کو اس پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ مقدمہ کی کارروائی ٹھیک دس بجے شروع ہوئی۔

ایڈووکیٹ جنرل مسٹر سلیم نے عدالت سے کہا:

"سابقہ پیشی کے بعد لدھا رام کے نام سمن جاری کیے گئے تھے لیکن سمنوں کی تعمیل نہیں ہو سکی بہتر کوشش کے بعد بھی

پتہ نہیں چل سکا کہ لدھا رام کہاں ہے؟"

اس پر میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ نے عدالت سے کہا:

"میں عدالت سے درخواست کرنا چاہتا ہوں، مجھے معلوم ہُوا ہے کہ لدھا رام لاہور میں ہی ہے۔ اور میرے ایک دوست نے کہا ہے کہ لدھا رام کو احاطۂ عدالت میں دیکھا گیا ہے"

میاں عبدالعزیز کی درخواست پر لدھا رام کی تلاش کے لیے عدالت کی کارروائی نصف گھنٹہ ملتوی کر دی گئی۔

دس بجکر پینتیس[۳۵] منٹ پر بھُورے رنگ کی ایک کار عدالت کے عین سامنے آ کر رُکی، جس پر لدھا رام سوار تھا۔ پولیس کی خواہش تھی کہ لدھا رام کو عدالت میں داخل ہونے سے پیشتر گرفتار کر لیا جائے لیکن احرار رضا کار چاہتے تھے کہ لدھا رام ایک دفعہ عدالت میں چلا جائے۔ اس کشمکش میں کچھ وقت صرف ہوا، اور آخر کامیابی احرار کارکنوں کو ہوئی، اور لدھا رام کمرۂ عدالت میں داخل ہو گیا۔

عدالت کی دوبارہ کارروائی دس بج کر پینتالیس[۴۵] منٹ پر شروع ہوئی اور لدھا رام کا بیان ہوا۔

چیف جسٹس مسٹر ینگ کے سوال و جواب کے بعد ایڈووکیٹ جنرل مسٹر سلیم نے عدالت سے گواہ پر جرح کرنے کی اجازت چاہی، جس کے جواب میں لدھا رام نے حسب ذیل بیان دیا۔

لدھارام کا بیان

دس جون کو ۲۴ مئی کی کاروائی دوبارہ شروع ہوئی۔ سب سے پہلے لدھارام کا بیان ہوا۔ لدھارام قریباً ۲۴ سال کا مضبوط نوجوان ہے جس نے بنفشی رنگ کا کوٹ، چوڑی دار پاجامہ اور گلابی رنگ کی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ پاؤں میں سفید کینوس کے بوٹ تھے اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں رکھی ہوئی تھیں۔ ایک ہاتھ کی کلائی پر گھڑی بندھی ہوئی تھی، جب وہ کمرۂ عدالت میں داخل ہوا، تو بہت سے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ اس لیے جج جسٹس کو کہنا پڑا کہ اگر ذرا بھی شور ہوا، تو کمرۂ عدالت وزیٹروں سے خالی کرا دیا جائے گا۔

لدھارام ولد امیر چند نارنگ نے شہادت دیتے ہوئے کہا کہ میری عمر قریباً چوبیس پچیس سال ہے۔ میں پہلے ملازم تھا اور اب مستعفی ہو چکا ہوں۔ میں انگریزی جانتا ہوں، لیکن بول نہیں سکتا۔

مسٹر سلیم :- جب ۲۸ جون کو سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ نے لالہ موسیٰ میں تقریر کی تھی، کیا آپ وہاں موجود تھے؟

لدھارام : پولیس رپورٹر کی حیثیت سے۔

س : شاہ صاحب نے جو تقریر کی، کیا آپ نے اُس کے نوٹ لیے؟

ج : جی ہاں میں نے نوٹ لیے۔

س : لانگ ہینڈ میں نوٹ لیے یا شارٹ ہینڈ میں؟

ج : ورنیکلر شارٹ ہینڈ میں۔

س : کیا تم نے تمام تقریر کے نوٹ لیے تھے؟

ج : جو کچھ میں لکھ سکتا تھا لکھا۔

س : کیا تم تمام تقریر لکھ سکتے تھے یا اس کا زیادہ حصہ؟

ج : میں اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا میں نے جو کچھ سمجھا وہ لکھا۔

س : جو کچھ آپ نے لکھا کیا یہ وہی تھا جو شاہ صاحب نے کہا تھا؟

ج : (کچھ دیر تک خاموش رہ کر) جب تک آپ اس سوال کو صاف نہ کریں، میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

س : میرا مطلب یہ ہے کہ شاہ صاحب نے جو کچھ کہا کیا وہی آپ نے لکھا تھا؟

ج : جو کچھ میں نے سمجھا کہ شاہ صاحب نے کہا ہے وہی میں نے لکھا۔

س : جب آپ نے یہ نوٹ لکھ لیے، تو کیا آپ نے کسی سے دستخط کرا لیے تھے؟

ج : جی ہاں، میں نے غلام حسین، رولدو سنگھ (تیسرا نام ذرا سوچ کر) مقبول حسین شاہ اور فیروز خاں کانسٹیبل کے دستخط کرا لیے تھے۔

س : کیا اس کے بعد ان شارٹ ہینڈ نوٹوں کے آپ نے اسی وقت لانگ ہینڈ نوٹ بنائے؟

ج : اسی وقت نہیں۔

س : تو کب آپ نے لانگ ہینڈ نوٹ تیار کیے؟

ج : گجرات میں پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے گھر آ کر لانگ ہینڈ نوٹ لکھے،

اور اُسے دے دیئے۔

س : کس تاریخ کو لکھے ؟

ج : جس دن تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے تھے اُس رات اور دن کے بعد مَیں نے ۲۸ جون کو لالہ موسیٰ میں نوٹ لیے تھے، رات بھر وہیں رہا، ۲۹ کو بھی وہیں رہا۔ ۳۰ جون کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پیش کئے۔

س : چیف جسٹس : کس جگہ پیش کئے ؟

ج : پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر تقریباً دوپہر کے بعد۔

س : یہ لانگ ہینڈ نوٹ علیحدہ کسی کاغذ پر لیے یا اسی نوٹ بک میں جس میں شارٹ ہینڈ نوٹ لیے تھے ؟

ج : علیحدہ کاغذ پر لکھ کر اسے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کو دیا۔

س : کیا وہ ترجمہ جو آپ نے شارٹ ہینڈ نوٹ سے لانگ ہینڈ نوٹ میں کیا درست تھا ؟

ج : شارٹ ہینڈ نوٹوں کے مطابق لانگ ہینڈ نوٹ بالکل درست تھے۔

س : جس نوٹ بک میں آپ نے شارٹ ہینڈ نوٹ لیے اس میں کوئی خالی صفحہ بھی رکھا ؟

ج : مَیں دونوں طرف نوٹ لکھتا گیا۔

س : کیا آپ عام طریقے پر اسی طرح شارٹ ہینڈ نوٹ لیتے تھے ؟

ج : عام طور پر دونوں طرف نہیں لکھا جاتا۔ کسی جگہ درمیان میں خالی صفحے چھوڑ دیے جاتے ہیں کسی جگہ نہیں۔

س : آپ کتنے عرصے سے رپورٹنگ کر رہے ہیں؟

مسٹر جسٹس رام لال : آپ یہ سوال کس لیے دریافت کر رہے ہیں؟

مسٹر سلیم : اس لیے کہ اپنے پہلے سوال کا ٹھیک جواب حاصل کروں۔

(یہ کہہ کر آپ نے پھر سوال دُہرایا)

لدھارام : مَیں قریباً ایک سال سے رپورٹنگ کر رہا ہوں۔

مسٹر سلیم : کیا تم نے اس سے پہلے بھی کسی جلسے میں نوٹ لیے؟

ج : جی ہاں مَیں نے کئی جلسوں میں نوٹ لیے۔

س : جب آپ دوسروں کے نوٹ لیتے تھے تو صفحے کے ایک طرف لکھتے تھے یا دونوں طرف؟

ج : اگر اچھا اور ایسا مقرر ہوتا جو عام طور پر مشہور ہوتا اور یہ خیال ہوتا کہ وہ ایسی تقریر کرے گا جو قابلِ اعتراض ہوگی تو جگہ چھوڑ دیتے۔

چیف جسٹس : مسٹر سلیم آپ سادہ اور مختصر سوال کیوں نہیں کرتے؟ جس سے سارا جواب مل جائے۔

مسٹر سلیم : میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ دوسری تقریروں کے معاملے میں کہیں جگہ چھوڑ لیتے تھے تو اس کا خاص سبب ہوتا تھا؟

ج : جی ہاں شارٹ ہینڈ نوٹوں کے ساتھ کئی دفعہ لونگ ہینڈ نوٹوں کے لیے علیحدہ کاغذ چھوڑ دیا جاتا تاکہ جب مقدمہ پیش ہو تو یادداشت ہو سکے

چیف جسٹس : تم جو شارٹ ہینڈ نوٹ ایک صفحے پر لیتے تھے کیا اس کے لونگ ہینڈ نوٹ اس جگہ پر جو خالی چھوڑ دی جاتی تھی آجاتے تھے؟

ج : سارے نہیں آیا تنے تھے، بلکہ ہم ضروری حصے لکھ لیتے تھے تاکہ انہیں یاد رکھ سکیں۔

مسٹر سلیم : آپ نے کہا۔ ہے کہ کئی حالتوں میں آپ خالی صفحے چھوڑ دیتے تھے اس کا کیا سبب تھا؟

ج : جب ہمیں پتہ لگ جاتا تھا کہ گورمنٹ نے مقدمہ چلانے کی اجازت دیدی ہے تب جگہ خالی چھوڑ لیتے تھے۔

مسٹر سلیم : میرا سوال یہ ہے کہ جن تقریروں کے نوٹ لیتے وقت آپ نے خالی صفحہ نہیں چھوڑا، اس کا سبب کیا ہے؟

ج : جن حالتوں میں تقریریں قابلِ اعتراض ہوتی ہیں، اُن میں ہی خالی جگہ چھوڑی جاتی ہے۔

س : جگہ چھوڑنے کا فیصلہ آپ تقریر کے نوٹ لیتے وقت کرتے تھے یا بعد میں؟

ج : تقریر کے دوران میں ہی جب اس نتیجے پر پہنچیں۔

چیف جسٹس : اب سوال یہ ہے کہ جب آپ لالہ موسیٰ میں پہنچے تو کیا آپ کا خیال تھا کہ شاہ صاحب قابلِ اعتراض تقریر کریں گے؟

لدھا رام : نہیں، مجھے کچھ پتہ نہیں تھا کہ شاہ صاحب قابلِ اعتراض تقریر کریں گے یا نہیں۔

مسٹر سلیم : (ایک نوٹ بک جو کمرۂ عدالت میں موجود تھی گواہ کو دکھا کر) اس کتاب کے ۱۶ سے ۳۴ صفحات تک جو شارٹ ہینڈ نوٹ

درج ہیں وہ کیا تمہارے لکھے ہوئے ہیں ؟

لدھارام : یہ بھی میرے لکھے ہوئے ہیں۔

س : جو کچھ آپ نے لانگ ہینڈ میں لکھا کیا وہ اس شارٹ ہینڈ کا ترجمہ ہے ؟

ج : جی ہاں اس کتاب میں جو شارٹ ہینڈ نوٹ ہیں ان کے مطابق لانگ ہینڈ نوٹ درست ہیں۔

س : کیا آپ نے سارے کے سارے شارٹ ہینڈ نوٹوں کا ترجمہ لانگ ہینڈ نوٹوں میں کیا تھا ؟

پریذیڈنٹ جج : یہ سوال پوچھنے کی کیا ضرورت ہے ؟

مسٹر سلیم : یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ ترجمہ صحیح ہے یا غلط۔ (اس مرحلے پر پھر مسٹر سلیم نے یہی سوال دریافت کیا)

لدھارام : جی ہاں جو کچھ میں نے شارٹ ہینڈ میں لکھا ہے اس کا ترجمہ سارے کا سارا لانگ ہینڈ نوٹوں میں کیا۔

مسٹر سلیم : کیا یہ وہی شارٹ ہینڈ نوٹ ہیں، جو آپ نے لالہ موسیٰ میں ۲۸ جون کو ملزم کی تقریر کے لیے تھے ؟

لدھارام : یہ وہ نوٹ ہیں جو میں نے جلسے میں لیے تھے۔

جرح کی اجازت

اس مرحلے پر مسٹر سلیم نے درخواست کی کہ مجھے گواہ پر جرح کرنے کی اجازت دی جائے، کیونکہ گواہ منحرف ہو گیا ہے۔ میاں عبدالعزیز نے اعتراض کیا

کہ اس مرحلے پر کوئی وجہ نہیں کہ گواہ کو منحرف قرار دیا جائے۔ کیونکہ یہ ثابت نہیں ہوا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ سچ بول رہا ہے۔ فاضل جج ان نے فیصلہ کیا کہ ایڈووکیٹ جنرل کو جرح کرنے کا حق ہے۔ میاں عبدالعزیز سے انہوں نے کہا "اگر کسی گواہ کے منحرف ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے ایک سچے گواہ کو بھی منحرف قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کا مطلب تو صرف یہ ہے کہ اس نے استغاثہ کی مرضی کے مطابق بیان نہیں دیا خواہ استغاثہ جھوٹا ہے یا سچا"۔ مسٹر سلیم نے گواہ پر جرح شروع کی۔

س : یہ شارٹ ہینڈ نوٹ آپ نے کہاں لیے؟ جو آپ کہتے ہیں کہ اصلی نوٹ نہیں ہیں؟

ج : میں نے لالہ موسیٰ سے واپسی پر گجرات میں پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر یہ شارٹ ہینڈ نوٹ لکھے جو مجھے دکھائے گئے ہیں، ۳۰ جون کو جب میں نے یہ نوٹ لکھے تو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے مکان پر ایک اور آدمی راجہ نعمان نائب محرر لالہ موسیٰ پولیس اسٹیشن بھی موجود تھا۔

س : آپ نے ان نوٹوں کی کہیں سے نقل کی یا کسی نے لکھوائے تھے؟

ج : پراسیکیوٹنگ انسپکٹر صاحب جو کچھ مجھے لکھاتے رہے ہیں، اسی کو شارٹ ہینڈ میں لکھتا گیا۔ میں پہلے لانگ ہینڈ ترجمہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس پہنچا چکا تھا اسی کو دیکھ کر اس میں تبدیلیاں کر کے وہ سب مجھے لکھاتے رہے۔

س : کیا ان تبدیلیوں کے متعلق پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے اپنے پاس نوٹ

لکھ کر رکھے ہوئے تھے یا وہ زبانی تبدیلیاں کراتے جاتے تھے ؟

ج : اس وقت میرے لانگ ہینڈ نوٹس کے علاوہ اور بھی ایک کاغذ تھا، لیکن مجھے یہ نہیں دکھایا گیا کہ اس کاغذ پر کیا لکھا ہوا تھا لیکن اتنا نظر آرہا تھا کہ اس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ دوسری طرف سے انگریزی کے ٹائپ شدہ حروف نظر آرہے تھے۔ لکھاتے وقت وہ دوسرے کاغذ کی طرف بھی دیکھتے جاتے تھے۔ شارٹ ہینڈ کے بعد پراسیکیوٹنگ انپکٹر کے مکان پر لانگ ہینڈ بُک کا ترجمہ بھی لکھا گیا۔ لانگ ہینڈ ترجمہ علیٰحدہ کاغذ پر بھی لکھا۔ اسی دن پراسیکیوٹنگ انپکٹر کے مکان پر نوٹ بُک پر لانگ ہینڈ لکھنے کے بعد علیٰحدہ کاغذ پر لانگ ہینڈ ترجمہ کی نقل کی دوسری دفعہ جب لانگ ہینڈ کی نقل کی گئی تو کاربن پیپر کے ذریعے دو کاپیاں بنائی گئیں۔ ایک اصل اور دو کاربن والی کاپیاں، دوسری نوٹ بُک پر جو بعد میں تیار کی گئی میرے سامنے گواہوں نے دستخط نہیں کیے۔ اصل نوٹ بُک جس میں جلسے کی تقریر کے نوٹ تھے۔ پراسیکیوٹنگ انپکٹر کے سامنے میز پر رکھی ہوئی تھی وہ شارٹ ہینڈ نوٹ اور لانگ ہینڈ ترجمہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے سامنے چھوڑ گیا تھا۔

نوٹ بُک جلا دی گئی

اصلی شارٹ ہینڈ نوٹ بُک میرے سامنے پراسیکیوٹنگ انپکٹر کے

مکان پہ جلا دی گئی، اور اصلی نوٹوں کے لانگ ہینڈ نوٹوں کے ترجمے کو بھی میرے سامنے جلا دیا گیا، یہ پرابیکیوٹنگ انسپکٹر کا رہائشی مکان تھا میٹنگ سے پہلے ہی مجھے ہدایت دی گئی تھی کہ پیر غازی میں جس تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لینے مقصود ہیں ان نوٹوں کے درمیان وقفے چھوڑ دینا۔ ہدایات کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا کہ پنجاب کے وزیراعظم کی ایک چٹھی سپرنٹنڈنٹ پولیس گجرات کو موصول ہوئی ہے جس میں انہوں نے لکھا ہے کہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری آپ کے علاقے میں آرہا ہے، وہ یونینسٹ پارٹی کے خلاف منافرت پھیلانے آرہا ہے۔ اس کی تقریر اس طریقے پر لی جائے کہ دفعات ۳۰۲-۱۱۷ اور ۱۵۳ کی زد میں آجائے۔ تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لینے پر ایسے شخص کو لگایا جائے جو تعلیم یافتہ ہو، اور گواہ بھی ایسے ہونے چاہئیں جو پولیس کے زیر اثر ہوں۔"

ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ:

ایک چٹھی ایسی تھی جس پہ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے میرے دستخط کرائے، وہ چٹھی ہدایات سے متعلق تھی اور دستخط اس لیے کرائے تھے کہ بعد میں میں یہ نہ کہہ سکوں کہ ہدایات نہیں ملی تھیں، جس خط پر وزیراعظم کی ہدایات تھیں وہ مجھے نہیں دکھایا گیا تھا، پہلی دفعہ مجھے ۲۸ جون سے دو تین ہفتے پہلے ہدایات دی گئی تھیں۔ ۲۸ جون کو جب میں تقریر کی رپورٹ کیلئے لالاموسیٰ روانہ ہونے والا تھا

تو مجھے بُلا کر کہا گیا کہ تقریر کی رپورٹ جلد از جلد لے کر شارٹ ہینڈ نوٹ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس پہنچا دوں۔ جب دو یا تین ہفتے پہلے ہدایات دی گئیں اُس وقت مجھے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے بُلایا تھا پراسیکیوٹنگ انسپکٹر اور سپرنٹنڈنٹ پولیس انگریزی میں بات کرتے تھے تھوڑی بہت انگریزی میری سمجھ میں آتی تھی باقی نہیں آتی تھی۔ پھر پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے ایس۔پی کی موجودگی میں ہدایات دیں کہ پیر غازی (لالہ موسیٰ) میں میٹنگ ہونے والی ہے وہاں سید عطاء اللہ شاہ بخاری تقریر کرنے والے ہیں، اس کی تقریر کے شارٹ ہینڈ نوٹ لیتے وقت خالی جگہیں چھوڑتے جانا۔

س : کیا اس وقت آپ کو بتایا گیا تھا کہ شارٹ ہینڈ نوٹوں میں جگہیں کیوں چھوڑنی ہیں ؟

ج : اس وقت تک مجھے نہیں بتایا گیا تھا کہ یہ جگہیں کیوں چھوڑنی ہیں۔ لیکن یہ بات تو ہر آدمی سمجھ سکتا ہے کہ جب سپرنٹنڈنٹ پولیس سمجھ چکے تھے تو مجھے ہدایات دی گئیں۔ پیر غازی میں جو جلسہ ہونے والا ہے اس کے نوٹوں میں خالی جگہ رکھی جائے۔

ایک سوال پر گواہ نے کہا کہ جگہ شارٹ ہینڈ نوٹوں میں چھوڑنی تھی۔

س : کیا یہ ہدایات دی گئی تھیں کہ جہاں آپ کا خیال ہو جگہ چھوڑ دو یا کوئی خاص جگہ چھوڑنے کے لیے کہا گیا تھا۔

ج : کہیں ایک لائن کہیں دو لائنیں۔

س : میرا سوال یہ ہے کیا یہ قطعی سہولت دی گئی تھی کہ کس طرح جگہ خالی چھوڑی جائے؟

ج : نہیں، خاص طریقے کی ہدایت نہیں دی گئی تھی۔

س : یہ ہدایات کس کی تقریروں کے متعلق تھیں؟

ج : سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر کے متعلق۔

س : تقریر کہاں کرنی تھی؟

ج : پیر غازی میں۔

س : کیا آپ جانتے ہیں کہ آپ کو جگہ چھوڑنے کے متعلق کیوں ہدایت کی گئی تھی؟

ج : مجھے پتہ نہیں۔

س : آپ کو پتہ نہیں تھا اور آپ نے کسی سے خیال بھی ظاہر نہیں کیا؟

ج : نہیں۔

س : آپ قیاس بھی نہیں کر سکتے تھے؟

ج : قیاس تو ہر شخص کر سکتا ہے ایک معمولی سا ملازم بھی۔

عدالت سے تحفّظ کی درخواست

س : کیا پہلا موقع تھا جب آپ نے اس طرح جگہ خالی چھوڑی؟

ج : اگر عدالت مجھے تحفّظ دے تو میں اس سوال کا جواب دے سکتا ہوں۔

چیف جسٹس : آپ کو تحفظ دی جاتی ہے، لیکن اگر ہمیں خیال ہوا کہ آپ کا جواب غلط ہے تو مقدمہ چل سکتا ہے، اگر درست ہُوا تو نہیں۔

لدھارام : میری عرض یہ ہے کہ مَیں جن واقعات کے متعلق جواب دوں گا، اس میں مقدمہ چل کر سزا ہو سکتی ہے۔

مسٹر سلیم : مائی لارڈ میری درخواست ہے کہ یہ کارروائی میں لکھا جائے کہ گواہ کو مجبُور کیا گیا کہ وہ اس سُوال کا جواب دے۔ اِس میں سب کچھ آجاتا ہے۔

میاں عبدالعزیز : لیکن اس صورت میں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گواہ جواب دینے سے اِنکار کر دے۔

چیف جسٹس : محض یہ سُوال دریافت کیا جائے کہ کیا گواہ کو پہلے بھی یہ ہدایت ملی تھی۔

مسٹر سلیم نے یہی سوال کیا جس کے جواب میں گواہ نے کہا کہ مجھے اس سے پہلے بھی اسی طرح ہدایات ملی تھیں۔

مسٹر سلیم : آپ کو ہدایت کب ملی تھی؟

اِس مرحلے پر وکیل صفائی میاں عبدالعزیز نے درخواست کی کہ اس سوال کے جواب میں گواہ کو تحفظ دیا جائے۔

چیف جسٹس : یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ گواہ پہلے کہہ چکا ہے کہ اسے پہلے بھی ہدایات ملتی رہی ہیں۔

میاں عبدالعزیز : لیکن اس معاملہ میں گواہ کو ضرور تحفظ ملنا چاہیئے۔

چیف جسٹس: صرف اس خاص سوال کے جواب میں تحفظ دیا جائے گا۔

مسٹر سلیم: (گواہ سے) سید بخاری کے جلسے کے متعلق آپ کو جو ہدایات دی گئی تھیں، کیا اس وقت بھی کوئی چھٹی آئی تھی؟

ج: چھٹیاں تو کئی آتی رہتی ہیں۔

مسٹر جسٹس رام لال: کیا اس خاص جلسے کے متعلق کوئی چھٹی دکھائی تھی؟

لدھارام: جی ہاں۔

مسٹر سلیم: اصلی چھٹی دکھائی گئی تھی یا اس کی نقل؟

ج: اس کا ترجمہ کیونکہ اس پر لکھا ہوا تھا یہ بہت خفیہ ہے۔

ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا۔ میں نے اصلی خط نہیں پڑھا بلکہ نقل جو سپرنٹنڈنٹ پولیس کا ریڈر اپنے رجسٹر میں درج کرتا ہے وہی پڑھی۔

مسٹر سلیم: رجسٹر میں جو درج تھا اس میں کیا لکھا تھا؟

ج: مجھے یاد نہیں رہا جو کچھ مجھے یاد ہے وہ کہہ چکا ہوں اور وہ یہ کہ جگہ خالی رکھی جائے اور تقریر کے نوٹوں کی ایک کاپی پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کو دی جائے۔

مسٹر جسٹس رام لال: کیا سارا رجسٹر پڑھا تھا یا محض وہ نقل؟

ج: ترجمہ جو کچھ تھا وہ پڑھا، اور اس خط کے نمبر بھی علیحدہ نوٹ کر لیے۔

ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ میں نے جو کچھ لکھا تھا وہ مستقبل میں اپنی رہنمائی کے لیے لکھا تھا۔ ایک اور سوال کے جواب

میں کہا کہ میں نے یہ نقل ریڈر کے ذریعے سپرنٹنڈنٹ پولیس کی اجازت سے لی تھی۔ اور میں اسی طرح اکثر نقل لیا کرتا تھا۔

چیف جسٹس: آپ نے جس تحریر کی نقل لی تھی وہ بہت تھوڑی تھی یا زیادہ؟

گواہ: کچھ خط تھے جن پر تھوڑی تھوڑی عبارت تھی۔

چیف جسٹس: دس دس سطریں یا بیس بیس سطریں تم نے کتنی دیر میں نقل کیں؟

لدھارام: تین چار منٹ میں، میں نے پیر غازی کے جلسے کے متعلق ہدایات نقل کیں۔

چیف جسٹس: کیا سپرنٹنڈنٹ پولیس اس وقت موجود تھے؟

گواہ: وہ دوسرے کمرے میں بیٹھے تھے۔

مسٹر سلیم: مطلب یہ ہوا کہ بعض اوقات نقل کرتے وقت سپرنٹنڈنٹ پولیس موجود ہوتے تھے اور بعض اوقات نہیں۔

گواہ: کئی اوقات ریڈر کو ہدایت کی جاتی تھی کہ دوسرے کمرے میں لے جائے۔

خفیہ رجسٹر

چیف جسٹس: یہ رجسٹر بہت خفیہ ہے؟

گواہ: جی ہاں۔

چیف جسٹس: اس کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو نہیں بتایا جاتا تھا؟

گواہ : جس کے متعلق ہدایت ہوتی تھی اُسے بتا دیا جاتا تھا۔

چیف جسٹس : سوال یہ ہے کہ ایک سترہ روپیہ ماہوار تنخواہ پانے والے کانسٹیبل کو سپرنٹنڈنٹ پولیس وہی خفیہ تحریریں کیونکر دکھا سکتے ہیں ؟

گواہ : مَیں چند اور باتیں بھی اس سلسلے میں بیان کرنا چاہتا ہوں، کیوں کہ وہ کام مَیں نے کرنا تھا۔

مسٹر سلیم : آپ نے کہا تھا کہ آپ نقل کرتے وقت نمبر بھی نقل کر لیتے تھے، یہ کیوں ؟

گواہ : اس کے متعلق نقل کرتے وقت کوئی خیال نہیں ہوتا۔

س : جو نقل آپ کے پاس تھی اس کے متعلق آپ کو ہدایت تھی کہ اسے محفوظ رکھا جائے یا نہیں ؟

ج : اس کے متعلق کچھ نہیں کہا جاتا تھا۔

چیف جسٹس : سوال یہ ہے کہ جب تم نقل کر لیتے تھے تو کیا یہ بتلایا جاتا تھا کہ اسے جس طرح چاہو استعمال کرو یا اپنے پاس رکھو یا نہیں ؟

میاں عبدالعزیز : (اُٹھ کر) اس وقت گواہ ان کے اعتماد میں تھا۔

گواہ : جو کچھ میرے متعلق لکھا ہوتا تھا اس کے متعلق ہدایت ہوتی تھی کہ اپنی یادداشت کے لیے نقل کر لو۔

س : جب آپ کو چٹھی دکھائی جاتی تھی یا ہدایت دی جاتی تھی تو ہمیشہ اُس کی نقل دی جاتی تھی ؟

ج : مَیں ہمیشہ نقل کر لیتا تھا ——— ایک اور سوال پر گواہ نے کہا کہ

مَیں نقل اپنے ساتھ لے جاتا تھا اور محفوظ رکھتا تھا۔

لکڑی کا بکس

مسٹر سلیم: تو ہم فرض کرتے ہیں کہ کئی مقدمات کے متعلق بھی ہدایات کی نقلیں آپ کے پاس ہوں گی؟

ج: جی ہاں میرے پاس پولیس اسٹیشن گجرات میں ہیں جنہیں مَیں اپنے رہائشی کوارٹر میں اپنے ایک صندوق میں چھوڑ آیا ہوں۔

چیف جسٹس: اسے تالا لگایا تھا؟

گواہ: تالا لگایا تھا مگر وہ پہلے سے ہی خراب تھا، قریباً تین چار ماہ پہلے سے۔

چیف جسٹس: کیا ان کاغذات کو خفیہ رکھنے کے لیے بکس ملا تھا؟

گواہ: جی ہاں ـــــ گواہ نے ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ اس صندوق میں لکڑی کا ایک چھوٹا سا بکس تھا جس میں وہ کاغذات رکھے ہوئے تھے، اس میں تالا لگا ہوا تھا۔ اُس کی چابی ابھی تک میرے پاس ہے۔

چیف جسٹس: لاؤ دیکھیں۔

لدھا رام نے اپنی جیبیں ٹٹولنے کے بعد کہا کہ "مَیں نے اپنی تمام چابیاں اپنے ایک دوست خواجہ کو دی ہوئی ہیں، وہ یہیں موجود تھے"ـــ اس کے بعد خواجہ کو (جس کا پہلا نام گواہ نہیں جانتا تھا) بلایا گیا۔

اُس نے چابیاں گواہ کو دیں۔ گواہ نے چابیاں چیف جسٹس کو دے دیں اور اس بکس کی چابی بتائی۔ گواہ نے یہ بھی بتایا کہ خواجہ سے میری گزشتہ پندرہ بیس دن کی واقفیت ہے۔ مزید کہا کہ جلال الدین ہیڈ کانسٹیبل کے پاس بھی اس بکس کی اسی طرح کی چابی ہے۔ اس کے بعد گواہ کو کچھ دستاویزات دکھائی گئیں۔ انہیں دیکھ کر گواہ نے ایک پیرا دیکھ کر کہا کہ یہ پیرا میں نے رجسٹر سے نقل کیا تھا۔

مسٹر سلیم: اس سے پہلے جو سی۔ آر۔ پی لکھا ہے اس سے کیا مراد ہے؟

گواہ: مجھے معلوم نہیں۔

چیف جسٹس: شاید اس کا مطلب کانفیڈینشل رپورٹ آف پولیس ہے۔

خفیہ جھوٹ

مسٹر سلیم: کسی پر سی ایل پی لکھا ہوتا ہے؟

چیف جسٹس: (ازراہِ مذاق) کانفیڈینشل لائز (جھوٹ) ہو سکتا ہے (قہقہہ)

اِس مرحلے پر چیف جسٹس نے میاں عبدالعزیز سے کہا کہ "آپ اپنی جرح میں اس بات کو ضرور صاف کیجئے کہ اس قدر خطرناک اور کانفیڈینشل ہدایات کو ایک سترہ روپے کے کانسٹیبل کو نقل کر کے ساتھ لے جانے کی اجازت کس طرح دی گئی ہمیں اس کا یقین نہیں ہوتا۔" میاں عبدالعزیز نے کہا، "مائی لارڈ! میں اِس بات کا خیال رکھوں گا۔" گواہ نے مسٹر سلیم کی مزید جرح کے جواب میں کہا کہ:

"۲۸ جون کو میں ہدایت حاصل کر کے پیر غازی والی تقریر کے نوٹ لینے گیا تھا۔ ہدایات مجھے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے گجرات میں دی تھیں ایس پی اپنے کمرہ میں ہوگا، لیکن اس وقت ہم دونوں کے سوائے کوئی وہاں موجود نہ تھا، اس وقت مجھے یہی ہدایات دی گئی تھیں کہ تقریر کے نوٹ لیتے ہی پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس واپس آنا اس کے علاوہ اس دن کوئی مزید ہدایات نہیں دی گئی تھیں لیکن مجھے یہ معلوم تھا کہ تقریر Fabricated ہوگی۔ کیونکہ ایسی باتیں تو قیافہ سے ہی معلوم ہوتی ہیں۔ اس سے پہلے مجھے کہا جا چکا تھا کہ جگہ خالی چھوڑوں یا نہ چھوڑوں۔ مجھے محض یہ ہدایت تھی کہ جس وقت نوٹ لے آؤں فوراً پراسیکیوٹنگ افسر کے مکان پر پہنچ جاؤں

مسٹر سلیم: اس کا یہ مطلب ہے کہ آپ کو یہ ہدایت نہیں کی گئی تھی جس سے یہ معلوم ہو کہ اس میں بناوٹ کی جائے گی؟

ج: مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ اس میں بناوٹ کی جائے گی۔

س: کیا آپ کو شبہ تھا یا بتایا گیا تھا؟

ج: ایسی باتیں ہمیشہ ہوتی رہتی ہیں، مجھے بتایا نہیں گیا تھا۔

س: کیا اس تقریر کے متعلق خاص ہدایت کی گئی تھی؟

ج: مجھے فون پر بلا کر ہدایت کی گئی تھی کہ لانگ ہینڈ نوٹ نہ کرنا۔

س: کیا یہ بتایا گیا تھا کہ کوئی خالی جگہ نہ چھوڑنا؟

ج: مجھے نہیں بتایا گیا تھا۔

س : جس نوٹ بک میں آپ نے نوٹ لیے وہ گجرات سے لی تھی؟ — جب آپ لالہ موسیٰ گئے تھے کیا آپ کو خیال تھا کہ نوٹ بک جلائی جائے گی؟

ج : مجھے معلوم نہیں تھا۔

س : کیا آپ کو یہ ہدایات دی گئیں کہ فوراً آجائیں؟

ج : مجھے یہ ہدایت تھی کہ جتنی جلدی فارغ ہو جاؤ واپس آجاؤ۔

س : کب فارغ ہو گئے تھے؟

ج : اور بھی کئی تقریریں تھیں۔ شہزادہ آزاد نے بھی تقریر کی تھی اس لیے دوسرے دن شام کو فارغ ہوا۔

س : ۲۸ جون کی شام کو آپ نے کس وقت تقریر کے نوٹ لیے؟

ج : مجھے یاد نہیں — ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ نوٹ لینے میں غالباً دو اڑھائی گھنٹے لگے تھے۔

س : لالہ موسیٰ سے گجرات آنے تک کتنا وقت لگا؟

ج : غالباً بیس پچیس منٹ — ایک اور سوال پر کہا کہ غالباً دونوں شہروں میں دس گیارہ میل کا فاصلہ ہے۔

س : کیا جس رات نوٹ لیے تھے اس رات سوئے بھی تھے؟

ج : جی ہاں۔ میں تھانہ لالہ موسیٰ میں سویا تھا۔ وہاں اور سپاہی بھی تھے جنہوں نے مجھے کہا تھا کہ شاید کل جلسہ ہو، اس لیے مجھے لالہ موسیٰ ہی میں ٹھہرنا چاہیے۔ (اس مرحلے پر کارروائی لنچ کے لیے ملتوی ہو گئی)

لنچ کے بعد کارروائی شروع ہوئی تو مسٹر سلیم نے جرح جاری رکھتے ہوئے لدھا رام سے پوچھا :

س : "۲۸ر جون کے جلسے میں جس میں عطاء اللہ شاہ بخاری نے تقریر کی، کیا آپ نے کسی دوسری تقریر کے نوٹ لیے ؟

گواہ : جی ہاں میں نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کے علاوہ ایک دو اور اصحاب کی تقریروں کے نوٹ لیے جن کے نام مجھے یاد نہیں ۔

س : جب آپ نے نوٹ لیے اس وقت دن میں کچھ باقی تھا ؟

ج : نہیں، جلسہ نو بجے رات کے بعد شروع ہوا ۔

س : کیا ان تقریروں کے نوٹ اسی نوٹ بک میں لیے تھے ؟

ج : جی ہاں ۔

س : کیا آپ نے دوسرے دن یعنی ۲۹ر جون کو کسی اور تقریر کے نوٹ لیے تھے ؟

ج : نہیں ۔

مسٹر جسٹس رام لال : کیا اس دن لالہ موسیٰ میں کوئی جلسہ تھا ؟

ج : ایک جلسہ ہونا تھا مگر اُسے ملتوی کر دیا گیا تھا ۔

مسٹر سلیم : آپ لالہ موسیٰ سے گجرات کب گئے ؟

ج : ۲۹ر جون کی شام یا ۳۰ر جون کی صبح، لیکن مجھے ٹھیک یاد نہیں ۔ کیونکہ اس واقعے کو آٹھ نو ماہ کا عرصہ ہو چکا ہے ۔

س : آپ نے پہلے کہا تھا کہ آپ کو ہدایت ہوئی تھی کہ تقریریں نوٹ

کرنے کے بعد فوراً پہنچے، تو کیا آپ کو یاد نہیں کہ ۲۹ جون کی شام کو گئے
یا ۳۰ جون کی صبح کو؟
گواہ: مجھے یاد نہیں، لیکن یہ یاد ہے کہ ۳۰ جون کو پراسیکیوٹنگ انسپکٹر
کے پاس گیا۔
مسٹر سلیم: اگر آپ ۲۹ جون رات کو گجرات جاتے تو کہاں رہتے؟
ج: گجرات جاتے تو تھانہ میں رپورٹ دے کر وہیں رہتا۔
س: پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس کس وقت گئے؟
ج: دوپہر کے بارہ بجے کے بعد مجھے ٹھیک یاد نہیں۔ غالباً تین اور
چار بجے کے درمیان گیا ہوں گا۔
س: جب آپ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر سے ملے تو کیا نوٹ بک جس میں آپ نے
ان تقریروں کے نوٹ لیے تھے، وہ اپنے ساتھ لے گئے تھے اور
اسے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے حوالے کر دیا تھا؟
ج: جی ہاں۔
س: جب آپ نے نوٹ بک حوالے کی، تو کیا شارٹ ہینڈ نوٹ پڑھ کر
سنائے تھے یا لانگ ہینڈ میں لکھ کر؟
ج: میں نے لانگ ہینڈ نوٹ بنائے اور اس کے بعد انہیں انسپکٹر کو
پیش کر دیا۔
س: کیا ان کی موجودگی میں لانگ ہینڈ نوٹ تیار کیے؟
ج: جی ہاں، پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کی موجودگی میں تیار کیے۔

س : جب آپ نے لانگ ہینڈ نوٹ بنائے تو کیا آپ کی موجودگی میں انہوں نے پڑھا؟

ج : جی ہاں۔

س : کیا انہوں نے پڑھنے کے بعد کہا کہ تسلی بخش نہیں ہے یا ہے؟

ج : انہوں نے کہا کہ جو کچھ میں بولوں اس کے نئے سرے سے شارٹ ہینڈ نوٹ لکھو۔ ایک اور سوال کے جواب میں گواہ نے کہا کہ پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے میرے لانگ ہینڈ نوٹ دو تین مرتبہ پڑھے اور اس کے بعد لکھانا شروع کیا۔

س : آپ نے جو نوٹ لکھے ان میں کتنا عرصہ لگا؟

ج : تقریباً چھ سات گھنٹے۔ ایک اور سوال کے جواب میں کہا کہ شارٹ ہینڈ نوٹ لکھوانے اور لانگ ہینڈ نوٹ بنوانے کے لیے پہلی شارٹ ہینڈ نوٹ بک جلائی گئی، تو دوسری تقریروں کے متعلق کیا ہوا؟ گواہ نے کہا کہ اگر کورٹ مجھے تحفظ دے تو میں جواب دے سکتا ہوں کیونکہ ان کے سلسلے میں عدالت فیصلہ دے چکی ہے۔

میاں عبدالعزیز: دوسرے مقدمے میں جو شہزادہ آزاد کے خلاف ہوا، گواہ پر جرح ہوئی ہے، اس لیے گواہ کی درخواست ہے کہ اگر وہ اس کے متعلق بیان جو بھی بیان دے گا وہ اس کے خلاف استعمال نہیں کیا جائیگا اس پر گواہ نے کہا کہ جو شہادت میں نے جہلم میں شہزادہ آزاد کیخلاف دی تھی وہ پراسیکیوٹنگ افسر کے کہنے پر دی تھی۔

مسٹر سلیم: سوال یہ نہیں۔ سوال یہ ہے کہ دوسری تقریروں کے نوٹوں کے متعلق کیا کیا گیا؟

گواہ: ان پر دستخط بھی تھے۔

چیف جسٹس: سوال یہ ہے کہ اس نوٹ بک میں دوسری تقریروں کے نوٹ بھی تھے۔ جب اس نوٹ بک کو جلا دیا گیا تو اُن تقریروں کے نوٹوں کا کیا بنا؟

گواہ: انہیں بھی دوبارہ لیا گیا اسی لیے تو سات گھنٹے صرف ہوئے تھے۔

مسٹر سلیم: جب آپ سید صاحب کی تقریر کے نوٹوں کا ذکر کر رہے تھے، تو دوسری تقریروں کا ذکر کیوں نہیں کیا؟

گواہ: اس لیے کہ میں پروٹیکشن لینے کے بعد ہی کروں۔

س: جو جو تقریریں ہوئیں کیا ان سب کو دوبارہ نوٹ میں لیا گیا تھا؟

گواہ: جی ہاں۔

س: جب آپ نے ان تقریروں کو دوبارہ کر لیا تو کیا انہیں اصل کے مطابق لیا یا ان میں بھی تبدیلی کرائی گئی؟

گواہ: اگر مجھے یقین دلایا جائے کہ اس بیان پر میرے خلاف مقدمہ نہیں چلے گا تو میں بتا سکتا ہوں۔

میاں عبدالعزیز: یہ حفاظت تو پہلے دی جا چکی ہے۔

گواہ: کچھ لفظ سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر سے نکال کر شہزادہ آزاد کی تقریر میں ڈال دیے گئے تھے۔

چیف جسٹس : تاکہ شہزادہ آزاد کو سزا ہو جائے ــــــ تو کیوں یہ لفظ اُن کی تقریر میں ڈالے گئے؟

گواہ : اس لیے کہ اگر ساری تقریر کو بنایا جاتا تو یہ خیال ہوتا کہ بناوٹی ہے شہزادہ آزاد کی تقریر میں سے یہ الفاظ کہ "لوٹوں نے ہزاروں روپوں کے گتے خرید سے" نکال کر سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر کے نوٹوں میں ڈال دیے گئے ــــــ ایک اور سوال کے جواب میں کہا، کہ اس ڈائری میں جو جعلی بنائی گئی، اگر سارے قابلِ اعتراض الفاظ ڈالے جاتے تو معلوم ہو جاتا کہ ساری جعلی ہے، اس لیے وزارت کے متعلق بھی کچھ حصہ ملا دیا گیا کیونکہ خط میں لکھا ہوا تھا کہ سید عطاء اللہ شاہ، یونینسٹ پارٹی کے خلاف پروپیگنڈا کر رہا ہے۔

مسٹر سلیم : آپ کا یہ خیال ہے کہ ایک تقریر کے چند حصے دوسری تقریر میں ڈالے گئے تاکہ یہ معلوم نہ ہو کہ ساری تقریر جعلی ہے۔

گواہ : جعلی نظر نہ آئے اور دوسرے یہ کارکردگی دکھانے کے کہ میں یونینسٹ وزارت کا اتنا ہمدرد ہوں۔

چیف جسٹس : وہ الفاظ جو شہزادہ آزاد کی تقریر سے نکال کر سید عطاء اللہ شاہ کی تقریر میں ڈالے گئے وہ قابلِ اعتراض تھے یا نہیں؟

گواہ : ہو سکتا ہے۔

چیف جسٹس : جو الفاظ سید صاحب کی تقریر سے نکال کر آزاد کی تقریر میں ڈالے گئے وہ قابلِ اعتراض تھے یا نہیں؟

گواہ : ہوں گے، مجھے پتہ نہیں۔
چیف جسٹس : کیا آپ کے خیال میں دونوں نے قابلِ اعتراض تقریریں کی تھیں؟
گواہ : نہیں۔
چیف جسٹس : ہوسکتا ہے تمام تقریریں قابلِ اعتراض نہ ہوں، چند الفاظ ہی قابلِ اعتراض ہوں؟
گواہ : جہاں تک میرا خیال ہے نہیں۔
چیف جسٹس : اگر نہیں تو ایک تقریر کے الفاظ دوسرے کی تقریر کے الفاظ میں کیوں ڈالے گئے؟
گواہ : ایک آدھ لفظ ایک تقریر سے لیا جاتا تھا اور کچھ اپنے پاس سے ملا لیا جاتا تھا۔
مسٹر جسٹس رام لال : یعنی پورے سے جملے نہیں، بلکہ چند الفاظ ہی ملائے جاتے تھے؟
گواہ : جی ہاں۔
مسٹر سلیم : آپ نے کہا تھا یہ دستخط جو اس کے نیچے ہیں آپ کی موجودگی میں نہیں کیے گئے تو پھر کس نے کیے تھے؟
گواہ : یہ اُن لوگوں کے دستخط تھے جو میں نے بتائے ہیں۔ یا پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے کہنے پر مقبول حسین شاہ کو بلایا گیا تھا، اُس نے اپنے دستخط کیے اور دوسرے فیروز خاں کے نام پر اس نے خود دستخط کیے۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کون سے دستخط کیے تھے لیکن یہ یاد ہے کہ

دونوں میں سے ایک میں نے رکھے۔

مسٹر سلیم: فیروز خاں کو کیوں نہیں بلایا گیا؟

گواہ: وہ مل نہیں سکا تھا۔

س: مقبول حسین کب آیا؟

ج: جس دن یہ نوٹ تیار کیے گئے اس کے تین چار دن بعد گجرات سے آیا تھا۔

س: اس دوران میں یہ مبیّنہ جعلی ڈائری کس کے پاس رہی؟

ج: پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس۔

مسٹر جسٹس رام لال: آپ کو کب واپس ملی؟

گواہ: دس پندرہ دن کے بعد۔

چیف جسٹس: جب آپ کو پہلی دفعہ جعلی دستاویز بنانے کے لیے کہا گیا تو کیا آپ نے پروٹسٹ کیا؟

گواہ: جی ہاں! میں نے پروٹسٹ کیا تھا، لیکن میرے ساتھ ایک کانسٹیبل تھا جس نے ایک دفعہ غلطی کی تھی تو اُسے معطل کر دیا گیا تھا۔

خودکشی کا ارادہ

چیف جسٹس: کیا تم نے درخواست میں کہا تھا کہ میں جھوٹی شہادت دینا نہیں چاہتا؟

گواہ: اگر میں لکھتا تو نہ معلوم مجھے کیا دھکے کھانے پڑتے، اور نہ معلوم

پولیس مجھ سے کیا سلوک کرتی ـــــــ اس مرحلے پر مسٹر سلیم نے ایک سوال دریافت کرنا چاہا جس پر لدھا رام نے کہا کہ میری ایک اور درخواست بھی ہے، میں تہیہ کیے ہوئے تھا کہ شہادت دینے کے بعد خودکشی کر لوں گا۔ اس کے لیے میں نے سنکھیا خریدا۔ آپ بیشک اس دوکان سے دریافت کر سکتے ہیں۔ میرے والد، میری والدہ اور گھر کے تمام آدمیوں کو اس کا علم ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میرے دل میں کیا تھا۔

مسٹر سلیم: یہ تو معمولی بات تھی کہ جھوٹی شہادت نہ دو اور خودکشی نہ کرو۔

گواہ: جی ہاں معمولی بات تھی لیکن مجھے پتہ تھا اگر وہاں آواز پہنچاتا تو اس عدالت میں بھی جہاں میری آواز پہنچ رہی ہے پہنچ نہ سکتی۔

مسٹر جسٹس رام لال: یہ پولیٹیکل پلیٹ فارم نہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر تمہارا ضمیر بیدار تھا تو تم نے یہ فیصلہ کیوں نہیں کیا کہ سچ بول دوں گا؟

گواہ: اسی لیے تو میں اب سچ بولنے پر مجبور ہوا ہوں۔

میاں عبدالعزیز: پوزیشن یہ ہے کہ اس وقت برداشت نہیں کیا، کیوں کہ بیعت کا فکر تھا۔ ماتحت عدالت میں مشکل تھا، اس لیے اب عدالت بالا میں اسے ہمت ہو گئی ہے کہ سچ بولے۔

مسٹر سلیم نے گواہ سے جرح جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔ اس نوٹ بک میں جو آپ کے پاس تھی ہے کیا اس میں اور تقریروں کے نوٹ بھی لکھے گئے؟

گواہ: جی ہاں۔

مسٹر سلیم: پہلے بھی اس میں نوٹ تھے؟

گواہ: مجھے خیال نہیں۔

س: جب آپ کو یہ نوٹ بک دی گئی تو کیا آپ کو یہ خیال نہیں، ساتھ کچھ صفحے لکھے ہوئے تھے؟

ج: صفحے تھے جو پھاڑ دیے گئے اور یہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

س: مطلب یہ کہ جب آپ کو یہ نوٹ بک دی گئی اُس وقت اس میں شارٹ ہینڈ کے نوٹ تھے؟

ج: جی ہاں کچھ لکھا تھا۔

س: یہ نوٹ آپ نے لکھے تھے یا کسی اور نے؟

ج: میرے ہی تھے۔

س: کب پھاڑے گئے، آپ کی موجودگی میں۔

ج: جی ہاں۔

س: پھاڑنے کے بعد جو صفحے بچے کیا وہ خالی تھے؟

ج: جی ہاں۔

س: جو صفحے خالی بچے انہیں کیوں نہیں پھاڑا گیا؟

ج: ان میں ڈائریکٹری کی ردو بدل تھی، ان کی تاریخیں بہت پہلے کی تھیں، اس کے بعد کی کئی مقررہ روکے نوٹ لیے جا چکے تھے کئی نوٹ بکیں جل چکی تھیں۔

س: آپ نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے نوٹ اسی پر کیوں نہیں لیے

نئی کاپی کیوں لی ؟

ج : نئی کاپی اس لیے لائی گئی تھی کہ جعلی رپورٹ بنائی جاسکے گی۔

س : گویا یہ شبہ آپ کو تھا ؟

ج : میرا بھی خیال تھا اور عام طور پر ایسا ہو ہی جاتا ہے۔

س : گویا شک ہونے پر آپ نے کہا تھا کہ ایسا نہ کرو نئی کتاب لاؤ۔

ج : میں نے نہیں کہا تھا۔

س : گویا یہ خیال آپ نے دل میں رکھا ؟

ج : نہیں۔

س : اس کا مطلب کیا ہوا ؟

ج : خیال تھا کہ اس راز سے کیا ظاہر ہوتا ہے، اس لئے جو بھی کاپی آئے اسے لگا لیا جاسکے۔

س : گویا وہاں بہت سی کاپیاں پڑی ہوئی تھیں ؟

ج : کورٹ انسپکٹر کے پاس نہیں انگلش سٹینوگرافر کے پاس ہوتی ہیں۔

س : مگر آپ کورٹ انسپکٹر کے گھر گئے تھے وہاں کاپیاں پڑی ہوتی تھیں ؟

ج : نہیں، وہاں دیر سنگھ اسٹینوگرافر کو بلایا گیا کہ ایک نوٹ بک لاؤ۔

س : کیا اسے بتایا گیا تھا کہ کیوں نوٹ بک لاؤ

ج : نہیں۔

س : گویا وہ ایک نوٹ بک لے آیا ؟

ج : تین چار نوٹ بکیں لے آیا۔

س : کیا وہ خالی تھیں ؟

ج : کئی خالی تھیں کئی لکھی ہوئی۔

س : کیا کوئی ایسی تھی جو بالکل خالی تھی ، اور جس میں نوٹ لکھے ہو سکتے نہیں تھے ؟

ج : میں نے تین کاپیاں دیکھی تھیں۔ ایک کے متعلق پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے کہا کہ یہ موزوں ہے۔ میں نے دوسری کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔

س : (نوٹ بک دکھا کر) کہاں سے کاغذ پھاڑ لیے گئے تھے ؟

ج : (دیکھ کر) شروع سے پھاڑ لیے گئے تھے۔

س : یہ صفحے کس نے پھاڑے تھے ؟

ج : میں نے خود اس دن پھاڑے تھے۔

س : آپ کہتے ہیں کہ اس کتاب میں اور تقریروں کے نوٹ بھی ہیں وہ جعلی ہیں یا اصلی ؟

ج : ان میں جعل سازی نہیں کی گئی۔

س : آپ نے کہا تھا کہ مبینہ جعلی نوٹ بک جب آپ کے پاس پندرہ سولہ دن کے بعد آئی تو لانگ ہینڈ نوٹ لکھے تھے ؟

ج : جی ہاں۔

س : جو بلا۔۔۔ کاغذ پر لانگ ہینڈ نوٹ لکھے تھے وہ بھی آپ کے حوالے کر دیے گئے ؟

ج : پہلے اسے پولیس اسٹیشن کو بھیجا گیا اور مجھے کہا گیا تھا کہ لالہ موسیٰ تھانہ سے لے آؤ، مجھے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے جانے کا حکم دیا تھا۔

س : آپ کو وہ لانگ ہینڈ نوٹ کب ملے؟

ج : مجھے تاریخ یاد نہیں۔

س : آپ کے پاس کتنے عرصے تک رہے؟

ج : یہی دو تین دن۔

س : اس کے بعد آپ نے کس کو دیئے؟

ج : عبدالحمید سٹینوگرافر تھانہ گجرات کو۔

س : تاریخ یاد ہے؟

ج : نہیں۔

س : کیا اس دن عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی پیشی تھی؟

ج : نہیں۔

س : آپ نے یہ نوٹ عبدالحمید کو دے دیئے تو کیا پھر واپس لے لیے؟

ج : ہاں، میں نے واپس لیے، اور نقل تیار کر کے اسی دن انہیں واپس دے دیا۔

س : تاریخ کیا تھی؟

ج : غالباً ۸ ؍ نومبر۔

س : آپ نے کس کے پاس انہیں دیکھا؟

ج : پراسیکیوٹنگ انسپکٹر کے پاس، انہوں نے مجھے چند حصوں کو خط کشیدہ

کو کہے دیا اور کہا کہ گواہوں کو یاد کراؤ۔

س: کیا وہ حصے تم نے گواہوں کو پڑھ کر سنائے؟

ج: جس گواہ کے متعلق جو جو حصہ مقرر تھا وہ اُس کو لکھ دیا۔

س: کیا اس دن مقدمہ ملتوی ہو گیا تھا؟

ج: جی ہاں۔

س: کیا گواہوں نے کہا ہے کہ ہمیں ۱۱ نومبر کو بیان بتایا گیا تھا اور آپ ۸ ا نومبر کہہ رہے ہیں؟

ج: مجھے پختہ یاد نہیں یہ تاریخ وہ تھی جب سید عطاء اللہ شاہ بخاری جیل میں آچکے تھے۔

س: تاریخ ملتوی ہونے کے بعد لانگ ہینڈ نوٹ کہاں گئے؟

ج: میں نے سٹینو گرافر عبدالحمید کو واپس کر دیئے۔

س: کیا پھر کبھی اس سے واپس لیے؟

ج: نہیں، میں نے دوبارہ واپس نہیں لیے۔

س: کسی سے بھی نہیں؟

ج: نہیں۔

س: گویا اس کے بعد آج تک آپ نے کبھی ان لانگ ہینڈ نوٹوں کو نہیں دیکھا؟

ج: جی ہاں دیکھا ہے۔

س: کب؟

ج : جب پراسیکیوٹنگ انسپکٹر نے کہا انہیں دوبارہ بنانا ہے تاکہ جو جعلی دستخط بنائے ہوئے ہیں انہیں ٹھیک کیا جائے، کیونکہ شاید عطاء اللہ شاہ بخاری جو کانی باثر مولوی ہے، گواہ غلام حسین اور رولدو سنگھ پر دباؤ نہ ڈال سکے، اس لیے ان دونوں کے دستخط کر دیے جائیں۔

س : تاریخ کیا تھی؟

ج : ۲۸ر دسمبر تھی۔

س : کس طرح آپ کہتے ہیں کہ یہ ضرور ۲۸ر دسمبر ہی تھی؟

ج : میرا خیال ہے کہ ۲۸ر دسمبر ہی تھی۔

گرفتاری اور رہائی

کورٹ کا اجلاس ساڑھے تین بجے ختم ہونا تھا، اس وقت تین بجکر ۲۵ منٹ ہو گئے تھے۔ آنریبل چیف جسٹس نے میاں عبدالعزیز وکیل صفائی کو بتایا کہ لدھا رام کی گرفتاری کے دو بلا ضمانت وارنٹ آئے ہیں، اب سوال یہ ہے کہ موجودہ مقدمے میں شہادت کے سلسلے میں ہمیں لدھا رام کی ضرورت ہے استغاثے کو بھی اور آپ کو بھی۔ یہ وارنٹ جن مقدمات کے سلسلے میں جاری کیے گئے ہیں اُن کا اس مقدمہ سے کوئی تعلق نہیں۔

میاں عبدالعزیز : مائی لارڈ میری یہ درخواست ہے کہ جب تک لدھا رام کا بیان ختم نہ ہو جائے اسے پولیس کے حوالے نہ کیا جائے اس دوران میں اُسے ضمانت پر رہا کیا جائے۔

چیف جسٹس : کیا یہ مناسب ہوگا کہ اسے جوڈیشنل حوالات میں بھیج دیا جائے۔

میاں عبدالعزیز : نہیں جناب۔ میری درخواست ہے کہ جب تک اس کی شہادت ختم نہیں ہوتی اسے ضمانت پر رہا کیا جائے۔

چیف جسٹس : یہ مقدمہ نہایت سخت ہے اور اس میں اس کی حاضری کی ضرورت ہے۔

میاں عبدالعزیز : اس کے لیے زیادہ ضمانت لی جاسکتی ہے، اگر اس کا یہاں کوئی ضامن ہوا تو ضمانت دے گا، پانچ دس ہزار جتنی چاہیں آپ مانگ لیں۔

چیف جسٹس : پانچ ہزار کی ضمانت طلب کی جاتی ہے۔

اس حکم پر لدھارام کو ڈاکٹر عبدالقوی لقمان ایم بی بی ایس کی پانچ ہزار کی ضمانت پر رہا کر دیا گیا اور مقدمہ کی کارروائی دوسرے دن پر ملتوی کر دی۔

۳ اپریل کو ہائی کورٹ کے ڈویژن بنچ نے استغاثہ کے چیف گواہ لدھارام کو ناقابل اعتبار گواہ قرار دیتے ہوئے ۵ اپریل (۱۹۴۰ء) کو امیر شریعت کو باعزت بری کر دیا، اور لدھارام کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ گجرات مسٹر سعداللہ خان اور چودھری منشی لال مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت میں سے جاری شدہ وارنٹوں کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔

اس کارروائی کے بعد چیف جسٹس نے امیر شریعتؒ سے براہ راست سوال کیے :

سوال : کیا آپ نے ۲۰ جون کو لاہوسی میں کوئی تقریر کی ؟

امیر شریعت : جی ہاں۔

سوال : کیا اس تقریر میں کہا تھا کہ مسلمانوں کی سلطنت اب نہیں رہی مسلمانوں کو چاہیئے کہ حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لیں ؟

جواب : میں نے کہا تھا کہ ہندوستان کی حکومت مسلمانوں کے ہی ہاتھ سے گئی ہے، لہٰذا اب مسلمانوں کو آزادیٔ وطن میں حصّہ لینا چاہیئے۔

سوال : کیا آپ نے کہا تھا کہ ہماری بیٹیوں کے نکاحوں کے متعلق فیصلے یہ شیطان فرنگی کرتے ہیں اور شریعت کی کوئی پروا نہیں کرتے ؟

جواب : ایسے غیر شریفانہ الفاظ میں نے کبھی اپنی زبان سے استعمال نہیں کیے میں نے کہا تھا کہ وطن آزاد ہو جانے پر ہمارے مذہبی معاملات یعنی نکاح اور طلاق وغیرہ کے فیصلے بھی غیر مسلموں کی بجائے ہمارے مذہبی نقطۂ نگاہ سے شریعت کے مطابق ہوں گے۔

سوال : کیا آپ نے یہ بھی کہا تھا کہ مورخوں نے انگریزوں کی متعصّبانہ چال میں آ کر لکھ دیا ہے کہ اورنگ زیب بادہ من جینؤ روزانہ اُتارتا تھا۔

جواب : چونکہ یہ جلسہ کانگرس کا تھا اور میں کانگرس کے پلیٹ فارم سے بول رہا تھا لہٰذا ہندو مسلم اتحاد کے ضمن میں میں نے یہ کہا تھا کہ بعض متعصّبین نے یہ غلط رنگ میں مشہور کر رکھا ہے کہ اورنگ زیب روزانہ بادہ من جینؤ جلایا کرتا تھا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو دہلی کے قرب و جوار میں ایک بھی ہندو نظر نہ آتا۔ حالانکہ اس وقت بھی وہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی اور اب بھی ہے۔

سوال : کیا آپ نے کہا تھا کہ اگر آپ میرے ساتھ ہو جائیں تو میں حکومت کا تختہ الٹ دوں، اور ان انگریزوں کو ایسا دھکا دوں کہ سمندر سے باہر واپس نہ آسکیں ؟

جواب : میں نے اپنی زندگی میں یہ الفاظ کبھی استعمال نہیں کیے اور نہ کبھی میں نے یہ کہا کہ انگریزوں کو اس طرح قتل کر دو، جس طرح یزید نے حسینؓ کی فوج کو قتل کیا۔ میں پچھلے تیس ۳۰ سال سے عدم تشدد کا پرچار کر رہا ہوں، جنگوسے ڈھاکہ اور شملہ سے بمبئی تک میں نے کروڑوں انسانوں میں عدم تشدد کا پرچار کیا۔ میں عدم تشدد کو اپنا مذہبی فریضہ سمجھتا ہوں۔ اس قسم کے لغو الفاظ میں نے کبھی استعمال نہیں کیے، اور نہ آئندہ زندگی میں کر سکتا ہوں۔ جہاں تک حسینؓ اور یزید کا تعلق ہے، آپ کے سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ میں نے اپنے کو یزید کہا اور انگریزوں کو حسینؓ، ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ کوئی مسلمان اپنے آپ کو یزید نہیں کہہ سکتا۔

اس موقعہ پر چیف جسٹس نے میاں عبدالعزیز ایڈووکیٹ سے امیر شریعت کے مندرجہ بالا آخری فقرے کی وضاحت چاہی۔

میاں عبدالعزیز : شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ میں غیر اسلامی الفاظ کبھی استعمال نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ الفاظ استعمال کر کے میں اپنے کو یزید اور انگریزوں کو حسینؓ کہوں گا، نہ ہی میں برداشت کر سکتا ہوں کہ کوئی مسلمان اپنے کو یزید کہے۔

جسٹس رام لال : (امیر شریعت سے) کیا اس کے سوا کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟

امیر شریعت : مَیں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔

مسٹر سلیم ایڈووکیٹ جنرل نے چیف جسٹس کی اجازت سے امیر شریعت سے مندرجہ ذیل سوالات کیے۔

"کیا آپ نے کہا تھا کہ وہ کون تھا کافر (غلام احمد)؟"

میاں عبدالعزیز : (مسٹر سلیم سے) مگر اس کا اس مقدمہ سے کیا تعلق ؟

جسٹس رام لال : مسٹر عبدالعزیز! آپ جانتے ہیں کہ لدھارام کی شہادت کی کیا وقعت ہے؟ (قہقہہ)

مسٹر سلیم نے اپنا سوال پھر دُہرایا، جس پر چیف جسٹس نے امیر شریعت سے براہِ راست سوال کیا :

"کیا آپ نے کہا تھا کہ وہ کافر ہے، جس نے انگریزوں کو پانچ صد گھوڑسواروں سے مدد دی تھی، وہ کون ہے، غلام احمد؟ سوال یہ ہے کہ یہ کوئی تاریخی واقعہ ہے؟

میاں عبدالعزیز : نہیں مائی لارڈ! یہ کوئی تاریخی واقعہ نہیں۔

امیر شریعت : (چیف جسٹس سے) مَیں نے ہزاروں مرتبہ مرزا غلام احمد کو کافر کہا، کہتا ہوں اور کہتا رہوں گا۔ یہ میرا مذہب ہے باقی مرزا غلام احمد کی اپنی کتابوں میں درج ہے، جس میں انہوں نے گورنمنٹ کو اپنی وفاداری کا یقین ان الفاظ میں دلایا تھا کہ اُن کے دادا نے ۱۸۵۷ء میں پانچسو سواروں سے گورنمنٹ کی مدد کی تھی" اس کے سوا مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

دوسرا مقدمہ

ہائی کورٹ کا فیصلہ سنتے ہی ہجوم نے امیر شریعت زندہ باد، لدھارام زندہ باد کے نعروں سے اس فیصلے کا استقبال کیا۔

لدھارام کو پولیس نے گرفتار کر لیا، اور امیر شریعت کو راولپنڈی میں زیر دفعہ دوسرے مقدمہ ۱۲۴ ا اور ۱۵۳ ا کے لیے روک لیا گیا۔

(۳ جون ۱۹۳۹ء کو امیر شریعت نے نواں محلہ (راولپنڈی) میں ایک تقریر کی، جسے فرنگی قانون نے پسند نہ کیا اور انہیں ۸ ستمبر ۱۹۳۹ء کو ضلع مظفر گڑھ کی ایک گمنام بستی سے (زیر دفعہ ۱۲۱ (ترغیب قتل) ۱۲۴ الف (حکومت خلاف بغاوت) ۱۵۳ (ملک معظم کی حکومت کے دو فرقوں کے درمیان منافرت پھیلانا) گرفتار کر لیا گیا) یہ مقدمات ہنوز زیر سماعت تھے کہ لالہ موسیٰ میں مندرجہ مقدمات کی بنیاد ڈالی گئی، چنانچہ ۵ اپریل ۱۹۴۰ء کو جیسے ہی امیر شریعت ہائیکورٹ سے رہا ہوئے، دوسرے مقدمے کی بنیاد بھی حکومت کی ریتلی دیوار ثابت ہوئی، اور اس قدر جلدی گر گئی کہ قانون اپنی ساری قوت کے باوجود درویش سے مات کھا گیا۔

۴ جون ۱۹۴۰ء کو لاہور سیشن جج کے جواب میں امیر شریعتؒ نے کہا:

"اس مقدمے کی حقیقت بھی وہی ہے جو مقدمہ گجرات کی تھی، جس میں ہائیکورٹ نے مجھے بری کیا۔ یعنی جس طرح ایک جعلی تقریر پیش کر کے گجرات میں مجھ پر مقدمہ بنایا گیا، اسی طرح جو

تقریر مجرم عدالت میں پیش کی گئی ہے، وہ بھی اسی طرح گھٹا اور بڑھا کر میرے بعض جملوں کو خلاف ترتیب سے پیش کیا گیا ہے کہ جس سے میری تقریر کا مقصد اور مفہوم ضائع ہو گیا، جو نیکی برباد گناہ لازم کے مصداق ہے۔

پنجاب میں یونینسٹ پارٹی کے قیام کے بعد یونینسٹوں اور احرار کے تعلقات کشیدہ رہے ہیں۔ ہماری یہ کوشش رہی کہ ہم اپنی حکومت قائم کریں، یہ کشمکش انتخابات کی صورت میں تمام پنجاب میں پھیل گئی، ہم نے یونینسٹ اُمیدواروں کے مقابلے میں اپنے اُمیدوار کھڑے کیے اور انہوں نے ہمارے اُمیدواروں کو شکست دینے کی کوشش کی، اس سلسلے میں مَیں نے اور میرے رفیقوں نے تمام اضلاع کا دورہ کیا۔ یکم، دو، تین جون کو پنڈی گھیپ ضلع کیمبلپور میں کانفرنس ہوئی، جس میں مَیں شریک ہوا، اور میرے رفیقوں میں مولانا مظہر علی اظہر ایم، ایل اے بھی شریک ہوئے، حسن اتفاق پیر لال بادشاہ آف مکھڈ کانفرنس میں شریک ہوئے اور ایک اجلاس کی انہوں نے صدارت بھی فرمائی۔ دوسرے اجلاس میں انہوں نے یونینسٹ وزارت کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک پیش کی جو باتفاق پاس ہو گئی۔

کانفرنس میں تمام علاقے کے بڑے بڑے زمیندار، علماء، صوفیاء اور نوجوان شامل ہوئے۔ ۲ر جون کو اڑھائی بجے کانفرنس ختم ہوئی۔ مولانا مظہر علی اظہر اور مَیں لاہور جاتے ہوئے راولپنڈی پہنچے، چونکہ

شہید گنج ایجی ٹیشن کے بعد میں نے راولپنڈی آنا جانا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تمام پنجاب میں سب سے زیادہ مجلس احرار کی مخالفت اسی شہر میں ہوئی۔ میری رائے تھی کہ راولپنڈی میں کوئی سیاسی تحریک کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اس ماحول میں بھی چند دوست ایسے تھے جو ہماری رائے سے اتفاق کرتے تھے اور اُن کی خواہش تھی کہ میں یہاں (راولپنڈی) تقریر کروں میں نے حتی الامکان کوشش کی کہ تقریر نہ کروں، لیکن جب دوستوں کا اصرار بڑھا تو میں نے گھڑی سامنے رکھ کر ایک گھنٹہ ۴۵ منٹ تقریر کی۔

میری تقریر کا مقصد صرف مجلس احرار پر سے ان الزامات کا ہٹانا تھا، جو مسجدوں اور بازاروں میں عام جلسوں کے اندر مجلس احرار پر لگائے جاتے تھے۔ مثلاً یہ کہ یہ لوگ کانگرس کے زرخرید غلام ہیں اور ہندوؤں سے مل کر ہندوستان میں ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں۔

ہماری جماعت میں علماء بھی ہیں، اور میں خود ۱۹۳۰ء سے لے کر تا آن جمعیتہ علماءِ ہند کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر ہوں۔ جب بازاروں میں علماء کے خلاف نعرے لگائے جاتے تھے اور "مولوی کا غلط مذہب" نامی رسالہ علامہ عنایت اللہ مشرقی کا لکھا ہوا ٹکے میں بکتا تھا۔

میں نے اپنی تقریر میں علماء کی صحیح روش اُن کا
صحیح مذہب اور صحیح پالیسی کا بیان کرنا ضروری سمجھا چنانچہ
اس سلسلہ میں ۱۸۵۷ء سے لے کر اس وقت تک کی
عدم تشدّد اور تشدّد کی تاریخ میں نے بیان کی اور ثابت
کیا کہ صحیح مذہب اور پالیسی وہی ہے جس پر مجلس احرار
اور جمعیتہ علماء کار بند ہیں، چنانچہ ہم پر جو الزام تھا، کہ
ہم نے اپنے ضمیر کو بیچ کر اور کانگرس سے مل کر بجائے
اسلامی حکومت کے ہندو راج قائم کرنا چاہتے ہیں،
میں نے یہ بیان کیا کہ ہمارے بزرگوں کا دماغ اس
خیال سے خالی نہیں کہ ہندوستان میں ایک دفعہ پھر
اسلامی حکومت قائم ہو جائے چنانچہ ۱۸۵۷ء کے
ہنگامے میں علماء شریک ہوئے اور ناکامی کے بعد کچھ
لوگ شہید ہوئے، اور ہزاروں انسانوں نے وطن عزیز
کے بیچے جانیں دیں، مغل شہزادوں کا خون بہایا گیا
ان مصیبتوں کے بعد بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، اور
اسلامی حکومت قائم کرنے کا خیال شکست کھا گیا۔

اس کے بعد ۱۹۱۴ء میں علماء کی ایک جماعت
نے بھی ارادہ کیا کہ مسلم راج قائم کرنے کے لیے تحریک
شروع کی جائے اور اس میں بھی شکست کھائی۔

چنانچہ ۱۹۲۰ء میں شیخ الہند حضرت مولانا محمود الحسنؒ دیوبندی مالٹا سے رہا ہو کر تشریف لائے۔ دہلی میں ملک کے مختلف حصوں سے پانچ سو سے زائد علماء کا اجتماع ہوا اور یہ طے پایا کہ تشدد کا راستہ غلط ہے اور موجودہ دور میں اسلامی حکومت کا قیام تقریباً ناممکن ہے، لہٰذا کانگرس کے ساتھ شامل ہو کر اور تمام قوموں سے مل کر ملک کو آزاد کرائیں، اور جمہوری حکومت قائم کریں، چنانچہ اس وقت سے ہم (احرار) اس عقیدے پر قائم ہیں، اور اسی راستے کو صحیح راستہ سمجھتے ہیں۔

عدالتِ عالیہ! یہ میری تقریر کا مفہوم تھا جو میں نے ۳ جون کو راولپنڈی میں کی تھی۔"

عدالت کے ایک سوال پر امیرِ شریعت نے کہا:

میں نے کہا تھا، خواہ ہمیں قتل ہونا پڑے، تباہ ہونا پڑے یا پھانسی پر چڑھنا پڑے، ہم یہاں بھی اُسی طرح کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں، جس طرح دوسرے صوبوں میں حکومتیں قائم کر کے برطانوی اقتدار کو کم کیا گیا ہے۔

میرا بیس برس سے یہ سیاسی کردار ہے کہ جب بھی مجھ پر حکومت نے مقدمہ بنایا، جو لفظ میں نے کہا اس کا اقرار کیا۔ میں نے ایسی بات کبھی نہیں کی جس پر مجھے بعد میں افسوس ہوا اور اس کے لیے عدالت میں جھوٹ بول کر جان

بچانی پڑے۔ میں جھوٹ بول کر زندہ رہنا نہیں چاہتا۔"

اس مفصل اور تحریری بیان کے بعد سیشن جج لاہور مسٹر ڈی فالشا نے اپنے چار اسیسروں کی رائے کے ساتھ اتفاق کرتے ہوئے امیر شریعتؒ کو ۷ جون ۱۹۴۰ء کو باعزت طور پر بری کر دیا۔ نیز اسی روز شام کو لاہور ریڈیو پر امیر شریعتؒ کی بریت کا بھی اعلان کیا گیا۔ اور دوسرے دن برلن ریڈیو کے اناؤنسر نے کہا کہ

"ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے سب سے بڑے باغی مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو صوبے کی سب سے بڑی عدالت نے بری کر دیا ہے۔"

نیز جرمن شعبہ نشر و اشاعت نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی تصاویر ہوائی جہاز کے ذریعے اپنے ملک میں تقسیم کیں۔

رہائی کے بعد

یورپ میں دوسری بڑی لڑائی کے بادل اس تیزی سے برس رہے تھے کہ توپوں کے دہانوں سے نکلتی ہوئی آگ تہذیب یورپ پر مسکرا رہی تھی۔

۲۴ مارچ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کے بعد ہندو مسلمانوں کے درمیان سلگتی ہوئی آگ شعلے دینے لگی تھی، اور گذشتہ ربع صدی کی فرقہ وارانہ کشمکش فیصلے کے آخری موڑ پر پہنچ گئی تھی۔ انہی دنوں ملک کے دانشور تدبر کے ناخن لیے عقل و خرد کے گوشوں میں بیٹھے تھے کہ امیر شریعتؒ قریباً

نو ماہ جیل خانے میں گزار کر رہا ہوئے۔

غیر ملکی قانون کے محافظ سر سکندر حیات خان کے دامِ تزویر کی تمام کڑیاں از خود ٹوٹ کر قانون کو شرمندہ کرنے لگیں۔ اقتدار نے اپنے منہ پر کئی طمانچے مارے، جس سے اُس کا اپنا چہرہ لہو لہان ہو گیا۔ اور اپنے اس خون کی سرخیوں میں ڈوبتے ہوئے سورج کی طرح وہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غرقاب ہو گیا۔

امیرِ شریعتؒ مقدمات سے بری ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے والدِ محترم سے ملنے ناگڑیاں چلے گئے۔

اِن دنوں امیرِ شریعتؒ انچاس سال کے پیٹے میں تھے مصائب و آلام میں گزرے ہوئے برسوں نے داڑھی اور سر کے بالوں میں سپیدی کو اس قدر تیزی سے جنم دیا کہ وہ قبل از وقت بوڑھے دکھائی دینے لگے۔ دوسرے قوائے جسمانی بھی مشین کے پرزوں کی طرح ڈھیلے ہو چکے تھے۔ اندرونِ جسم ۱۹۳۵ء میں جس بیماری کا آغاز ہوا تھا، اُس کی جڑیں بدستور پھیلتی جا رہی تھیں اس طرح سے گھر کا سکون بھی میسر نہ تھا، اور اکثر جماعتی احباب کے جیلخانوں میں جانے کے باعث جماعتی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی انہیں کے کندھوں پر آن پڑا تھا۔

دل اور دماغ جب باہم متصادم ہوں تو آدمی فکر کے ایسے دوراہے پر کھڑا ہوتا ہے، جہاں سے خرد کے تمام دروازے مسدود ہو جاتے ہیں اور جنون اپنا دامنِ شوق وا کیے ہر موڑ پر آدمی کا استقبال کرتا ہے، ایسے موقعے پر

آوارہ ذہن آدمی کا مقصدِ حیات سے بھٹک جانا بڑی بات نہیں لیکن امیرِ شریعتؒ نے ۱۹۲۱ء میں جس سفر کا قصد کیا تھا اور صعوبتوں کو دعوت دی تھی، ان سے وابستگی کی تمام کڑیوں کو اپنے ہاتھوں سے گرہ دیتے رہے۔

کئی دن والد صاحب کے ہاں ٹھہرے اُن کی دُعائیں لیں اور پھر تازہ دم ہو کر سفر پر چل دیے۔ حالانکہ مُلکی حالات اور اہلیہ کی بیماری راستہ روکتے رہے، لیکن وقت کا مسافر اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔

حضرت رائے پوریؒ سے وابستگی

دُوسری جنگ عظیم کے باعث ہندوستان کے ہنگامی قوانین نے سیاسی کارکنوں کے محاسبے کو اس قدر تنگ کیا ہوا تھا کہ اپنے قدموں کی آواز پر بھی دشمنوں کا گمان ہوتا تھا، اور ہر قدم پھونک پھونک کر رکھنا پڑتا تھا، ایسے حالات میں امیرِ شریعتؒ نے لاہور پہنچ کر جماعتی کاموں کا جائزہ لیا اور ضروری احکامات دے کر اپنے مرشد حضرت مولانا عبدالقادر کی خدمت میں حاضری کے لیے رائے پور (ضلع سہارن پور) چلے گئے۔

(امیرِ شریعتؒ نے ۱۹۳۷ء کے دم توڑتے ہوئے دنوں میں حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری کے ہاتھ پر لاہور میں مولانا عبداللہ فاروقی کے مکان پر بیعت کی تھی، اس سے پیشتر امیرِ شریعتؒ، سید پیر مہر علی شاہ صاحب گولڑویؒ کے دامن سے وابستہ تھے، ان کی وفات کے بعد ایک عرصہ اپنے رُوحانی پیشوا کی تلاش میں رہے اور اس غرض کے لیے میاں شیر محمدؒ کی خدمت میں

شرق پور (شیخوپورہ) بھی گئے) دراُن سے عرض کیا۔

تو کہ کیمیا فروشی نظرے بقلب ماکن

حضرت میاں شیر محمد صاحبؒ نے دو گھنٹہ مراقبہ کے بعد فرمایا :

"شاہ جی! آپ کوئی دُوسرا گھر تلاش کریں، میرے امن میں اتنی وسعت کہاں کہ آپ کو پناہ دے سکے۔"

واپسی پر میاں صاحب امیر شریعتؒ کو اپنے جلو میں گاؤں کی آخری سرحد تک، چھوڑنے آئے۔

حضرت مولانا عبدالقادرؒ موضع ڈھڈی سدہ ضلع سرگودھا کے ایک ممتاز دینی گھرانے میں پیدا ہوئے اور تکمیلِ علم کے بعد برِصغیر کے مشہور رُوحانی پیشوا حضرت شاہ عبدالرحیم (رحمۃ اللہ علیہ) کے آستانے سے وابستہ ہو گئے۔ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ، حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ کے ممتاز خلفاء میں سے تھے، ان کا ظاہری اور باطنی علوم میں بہت بڑا مقام تھا، انہوں نے حضرت مولانا عبدالقادر کی سعید رُوح کا جائزہ لے کر اُن پر ایسی توجہ فرمائی کہ انہیں جذب و سلُوک کی تمام منزلیں طے کرنے میں زیادہ دیر نہ لگی کہ حضرت نے انہیں اپنا خلیفہ منتخب کیا، اور پھر شیخ طریقت شاہ حضرت شاہ عبدالرحیمؒ کے وصال کے بعد حضرت عبدالقادر اُن کے جانشین مقرر ہوئے، پھر ایسے فنافی الشیخ ہوئے کہ اپنا وطن ترک کر کے دم واپسیں سے کچھ دن پیشتر تک رائے پُور میں قیام کیا، آخر ۱۶ر اگست ۱۹۶۲ء کو لاہور میں اللہ کو پیارے ہو گئے، اناللہ وانا الیہ راجعون،
امیر شریعتؒ اور ان کے مُرشد کے درمیان احترام کی ایک اُونچی دیوار

حائل تھی لیکن اس کے باوجود حضرت رائے پوریؒ نے امیرِ شریعتؒ سے محبت کا رشتہ اس قدر مضبوط استوار کر لیا تھا کہ پیرِ طریقت کے دل میں اپنے مُرید کیلئے بے پناہ لگاؤ تھا۔

کسی سیاسی یا مذہبی تحریک میں شامل ہونے یا شروع کرنے سے پیشتر اوّل اپنے ضمیر سے پھر پیرِ طریقت سے مشورہ کرتے۔ جب دونوں راہیں ہم آہنگ ہوتیں تو پھر نتائج سے بے نیاز ہو کر میدانِ میں نکل آتے۔

قانون کی شکست

سیاسیات کی بادِ سموم کے باعث ہندوستان کی فضا نے اس قدر گرمی پیدا کر دی تھی کہ جس دل و دماغ میں احساس کی آگ جل رہی تھی، اُس کے لیے گوشۂ تنہائی میں بیٹھنا دشوار ہو گیا تھا، چنانچہ ان دنوں اتحادی اور محوری فوجیں ایک دوسرے کے مقابل صف آرا تھیں، اقوامِ یورپ کی اس جنگ نے ایشیا کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، ۱۲ر اکتوبر ۱۹۴۰ء کو کانگرس نے اس لڑائی کے خلاف انفرادی ستیہ گرہ شروع کیا، تو ہندوستان میں ڈیفنس رولز آف انڈیا ایسے ہنگامی قوانین کا نفاذ ہو چکا تھا۔ محبِ وطن لوگ جیل خانوں میں مقفل کر دیے گئے۔

امیرِ شریعتؒ نے انہی دنوں انگریز کے خلاف جلتے ہوئے دلوں کی بھٹیوں میں جذبات و نفرت کا ایندھن بھرا، وہ ہندوستان کے ہر کوچہ و بازار میں گئے اور لاکھوں انسانوں کے اجتماع سے خطاب کیا۔

پنجاب میں سرسکندر حیات خان کی فوجی حکومت برطانوی سامراج کے دشمن سے لاہور ہائی کورٹ میں شکست کھا چکی تھی۔ قانون اپنی پوری گرفت کے باوجود امیر شریعتؒ تک نہ پہنچ سکا لیکن امیر شریعتؒ مجلس احرار کی جنگ کے خلاف تحریک کی بڑی بے باکی اور چابکدستی سے سارے ہندوستان میں رہنمائی کرتے رہے۔ حکومت کی پوری مشینری ان کے تعاقب میں رہی، امیر شریعتؒ اپنے رضاکاروں کو فوجی بھرتی کے خلاف سول نافرمانی پر اُکساتے رہے۔ گاؤں، قصبات اور شہروں کے ہزاروں عوام اس تحریک کے تحت جیل خانوں میں گئے ملتان اور مظفر گڑھ کا ضلع خصوصیت کے ساتھ اس تحریک سے براہ راست متاثر ہوا۔

جاپان جنگ میں شریک ہو چکا تھا اور دوسری طرف جرمن فوجیں جنرل رومیل کی کمان میں سکندریہ کے ساحل تک بڑھ آئی تھیں، اتنے میں ۱۹۴۲ء کی عمر کا جام لبریز ہو چکا تھا اور ۱۹۴۳ء کی شعاعوں نے آگے بڑھ کر اپنا اقتدار قائم کر لیا تھا۔

اپنے ماضی کی طرح ہندوستان ان دنوں بھی سیاسی طور پر دو دھڑوں میں منقسم تھا۔ رجعت پسند، انگریزی حکومت کے معاون تھے، اور انتہاپسند گروہ اس موقعہ کو غنیمت جان کر غیر ملکی حکومت کے خلاف بغاوت کو اپنا دین سمجھتا تھا چنانچہ اول الذکر گروہ فوجی بھرتی کے لیے گاؤں گاؤں گھوم پھر کر سادہ لوح عوام کو انگریزی اقتدار کی بقاء کے لیے دوسری جنگِ عظیم کی آگ میں جھونکنے کے لیے خوبصورت وردی، بندوق اور مفت راشن کا لالچ دے کر بھرتی کر رہا تھا۔ والدین کو جب معلوم ہوتا کہ ہمارا لڑکا فوج میں بھرتی ہو گیا ہے تو وہ

پریشان ہو کر امیر شریعتؒ کے پاس آتے، امیر شریعتؒ پہلے تو انہیں سخت سست کہتے، پھر اُن سے مجلس احرار کے لیے پانچ روپے چندہ وصول کرتے اور اُس کی رسید اُس لڑکے کے نام کاٹتے جو فوج میں بھرتی ہو کر ٹریننگ کیلیے جا چکا تھا۔ ساتھ ہی جماعت کے طبع شدہ فارم پر اس لڑکے کے نام حسب ذیل خط لکھتے:

"عزیزم ......!

سلام مسنون۔ تمہارا چندہ برائے مجلس احرار بڑی پابندی سے پہنچ رہا ہے، شکریہ! اپنی جماعتی ذمہ داریوں کو خوب اچھی طرح نبھانا، فوج کے اندر رہ کر جماعت نے جو ڈیوٹی تمہارے سپرد کی ہے اُسے خیال سے انجام دینا۔

فقیر، عطاء اللہ شاہ بخاریؒ"

یہ خط جب فوجی افسروں کے پاس پہنچتا تو وہ متعلقہ لڑکے کو بلا کر دریافت کرتے "تمہارا عطاء اللہ شاہ سے کیا تعلق ہے؟"

سولجر: "میں تو انہیں جانتا بھی نہیں صاحب!"

آفیسر: "تم اُس کی جماعت کو چندہ بھی دیتے ہو؟"

سولجر: "نہیں صاحب!"

آفیسر: "لیکن تمہارے نام اُس کا خط اور چندے کی رسید کیسے آ گئی؟ چلو تمہیں فوج کی ملازمت سے علیحدہ کیا جاتا ہے"۔

گویا خط پہنچنے کے چوتھے روز بعد لڑکا اپنے گھر واپس پہنچ جاتا، اور گھر والے

امیر شریعتؒ کو دُعائیں دیتے۔ انگریز جو اِن دِنوں محاذِ جنگ پر مصروف تھا امیر شریعتؒ کی ان حرکات سے چیں بہ جبیں ہوا، لیکن اندرونِ مُلک وہ حالات سے مجبُور تھا کہ اپنے کسی سیاسی حریف کو قانُونی گرفت میں لیتا۔ اس طرح سے سینکڑوں نوجوانوں کو انگریز کی فوج سے نکالنے کا سہرا امیر شریعتؒ کے سر ہے، اور یہ سلسلہ اختتامِ جنگ تک جاری رہا۔

حکومتِ الٰہیہ

۱۹۴۰ء کی لاہور قرارداد کے بعد اقوامِ ہند کے خیالات نئے زاویوں سے دیکھے جانے لگے۔ ہندو کے جذبۂ نفرت نے مُسلمان کو اس سے متنفّر کر دیا تھا۔ دِلوں کی باتیں زبانوں پر آکر فضاؤں میں پھیل چُکی تھیں، جس کے باعث ہر روز کے حالات نئے واقعات کو جنم دے رہے تھے۔ دُوسری طرف جنگِ عظیم کے متوقع نتائج کے پیشِ نظر غیر مُلکی اِقتدار کا زوال صاف دِکھائی دے رہا تھا۔ ایسے میں احرار راہنماؤں کو یقین تھا کہ مستقبل قریب میں ہندُستان کے نقشے پر کوئی نیا سوُرج طلوُع ہوگا، اور ہو سکتا ہے کہ یہ سوُرج اسلام کا سوُرج ہو۔ جو بُرائی نیکی کی ضامن بن جائے، لہٰذا آنے والے کل کے لیے آج سے راستہ ہموار کرنا چاہیئے۔ چنانچہ مئی ۱۹۴۳ء میں آل انڈیا احرار ورکنگ کمیٹی نے سہارن پوُر میں سول نافرمانی کی قرارداد جو کہ ۱۹۴۲ء میں واپس لے لی گئی تھی، کی جگہ حکومتِ الٰہیہ کی قرارداد منظوُر کی۔ نیز فیصلہ کیا کہ مجلسِ احرار ہندُستان کے موجوُدہ فرقہ وارانہ فیصلوں سے الگ رہے گی اور ہندُستان کے آئین میں اگر

کوئی تبدیلی آئی تو مسلمان اپنے لیے حکومتِ الٰہیہ کا نظام پسند کریں گے، کیونکہ اس سے پیشتر انگریز کا نعرہ تھا ـــــــ

"خلقت خُدا کی، حُکم بادشاہ (ملکِ معظم) کا،"

لیکن سہارن پُور کی قرارداد کے بعد مجلسِ احرار کا نعرہ تھا ـــــــ

"خلقت خُدا کی اور حُکم بھی خُدا کا!"

(اِنِ الحُکمُ اِلاَّ اللّٰہِ)

اِن دونوں نعروں کے درمیان خاصا ٹکراؤ رہا، مگر قانُون شکنی کی نوبت نہ آئی۔

جماعت کی اس نئی قرارداد نے امیرِ شریعتؒ کی ذمہ داریوں میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

مسلم لیگ کا مطالبۂ پاکستان اِن دِنوں زوروں پر تھا، ہندوستان کے مُسلمانوں کی اکثریت اس کے حق میں تھی، لیکن امیرِ شریعتؒ کی رائے مسلم لیگ کے نعرے سے متصادم تھی، وہ تقسیمِ مُلک کے بعد کے نتائج کو اپنی بصیرت کی روشنی میں ناپسند کرتے تھے، چنانچہ اس کے خلاف وہ حکومتِ الٰہیہ کے حق میں عوام سے کہتے:-

"کسی زمین کو حاصل کرنے سے پیشتر اللہ کا نظام اپنے دِلوں پر قائم کریں۔ فرنگی کی ڈیڑھ سو سالہ غُلامی سے جو دِل زنگ آلود ہو چکے ہیں، انہیں اِیمان کی کسوٹی پر پرکھیں گے تاکہ کُفر کے نظامِ حکومت کی جو آلائشیں اس پر جم چُکی ہیں وہ صاف ہو جائیں اس کے عِلاوہ اگر آپ نے کوئی زمین حاصل کر بھی لی، تو جو

نظام آپ قائم کریں گے، وہ انسانوں کا بنا ہُوا ہوگا جس کی
ہر شق کُفر کے آئین سے ماخذ ہو گی"

امیر شریعتؒ نے انہیں خیالات کا اظہار سارے ہندوستان میں
کروڑوں انسانوں کے اجتماعات میں کیا۔

(حکومتِ الٰہیہ کی قرارداد سے ہندو اور انگریز کے بعد مسلم لیگ سے
متعلق مسلمان بھی امیر شریعتؒ سے اختلاف کرنے لگے۔ اگرچہ مجلس احرار کا
عسکری نظام ہندوستان کے اکثر صوبوں میں قائم تھا، تاہم مسلمانوں کی غالب
اکثریت جو مطالبۂ پاکستان کی حامی تھی۔ امیر شریعتؒ کے عوامی جلسوں میں ہر جگہ
اپنی ناراضگی کا اظہار کرتی لیکن یہ مخالفین کی رائے کو خس و خاشاک کی طرح
بہا کر لے جاتے۔

مولانا گُل شیرؒ کی شہادت

فرد ہو یا قوم، غصّے اور انتقام کی آگ میں جلتے ہوئے دونوں انجام
سے بے خبر ہوتے ہیں۔

موضع ملھو والی ضلع کیمبلپور کے مشہور عالم دین مولانا گُل شیر اپنے ضلع کی
حدوں سے نکل کر میانوالی اور جہلم کے دریا کے کنارے تک اپنی منفرد طرزِ خطابت،
خلوص، جرأت اور طبیعت کی سادگی کے باعث مسلمانوں کے دلوں پر راج کرتے
تھے، وہ سیاسیات سے الگ تھلگ فقہِ اسلامی کی وکالت کے لیے شب و
روز غیر اسلامی رسم و رواج سے منع کرتے، غیر مسلموں سے لین دین میں مسلمان

عورتوں کو روکتے، گاؤں گاؤں پھر کر اپنے اس مؤقف کی وضاحت میں قرآن کریم ۲
سناتے۔ آزادیٔ وطن کے ضمن میں کانگرس سے اتحاد پر مجلس احرار ایسی سیاسی جماعتوں ۱۰۱
سے سخت متنفر تھے۔ اگر کہیں احرار رہنماؤں سے ڈبھیڑ ہو جاتی تو مولانا گل شیر
احرار راہنماؤں کو ایسا کوسنے کہ انہیں اپنا پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

۱۹۳۸ء میں مولانا گل شیر حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے۔
واپسی پر اُن کے طریقِ زندگی میں اس قدر انقلاب آیا کہ فوجِ محمدی[1] کی
سٹیج پر مجلسِ احرار اور امیرِ شریعتؒ کی بار بار تعریف ہونے لگی۔ اس تبدیلی سے
عوام کے لیے یہ بات ایک سوال بن گئی کہ ایکا ایکی یہ کیسے ہو گیا؟ مگر مولانا
گل شیر نے یہ راز چھپائے رکھا۔ آخر ۱۹۳۹ء میں جب وہ مجلسِ احرار میں ۱۱
شامل ہوئے تو مجلسِ احرار کے ایک اجلاس میں مولانا نے کہا:

"مَیں ہمیشہ سے امیرِ شریعتؒ مولانا سیّد عطاءاللہ شاہ بخاری اور اُن کی جماعت کو ہندوؤں کی زرخرید سمجھتا تھا۔ اپنے اس عقیدے کے تحت مَیں نے اپنے علاقے میں ان حضرات کی سخت مخالفت کی، جہاں کہیں میرا بس چلا مَیں نے اس جماعت کے پاؤں نہیں جمنے دیے، لیکن گذشتہ سال حج کے موقعہ پر مَیں طوافِ کعبہ سے فارغ ہو کر نماز عصر سے ذرا پہلے نیند میں تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے رویا میں مجھ سے کوئی کہہ رہا ہے: ——

[1] مولانا گل شیر کی اپنی رضا کارانہ غیر سیاسی تنظیم تھی۔

تم مجلس احرار میں شامل ہو جاؤ"۔ تم مجلس احرار میں شامل ہو جاؤ!" "تم مجلس احرار میں شامل ہو جاؤ!"
اس فقرے کے مسلسل تکرار سے میری آنکھ کھل گئی، اور میں نے وہیں فیصلہ کر لیا کہ میں اس حکم پر ضرور عمل کروں گا۔ الحمدللہ کہ اب میں اس مجاہد جماعت کے ایک رضاکار کی حیثیت سے ہمیشہ حق کے لیے کفر سے نبرد آزما رہوں گا۔"

اسی سال مولانا گل شیر، امیر شریعتؒ، مولانا حبیب الرحمٰن، قاضی احسان احمد اور خواجہ عبدالرحیم عاجزؔ کو میانوالی کے ضلع میں اپنے ساتھ لے گئے۔ میانوالی سے واپسی پر امیر شریعتؒ نے مولانا گل شیر کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو کے ایک عظیم اجتماع میں کہا: "اج میں اپنے نال اِک ہور جنا لے کے آیا واں"۔ (لفظ "جنا" میانوالی کے علاقے میں بہادر اور جرأت مند پر بولا جاتا ہے) یعنی آج میں اپنے ہمراہ ایک اور بہادر کو لے کر آیا ہوں۔

ان دنوں ملک میں مجلس احرار فوجی بھرتی کے خلاف تحریک چلا رہی تھی مولانا گل شیر بھی گرفتار ہو کر جیل چلے گئے، رہا ہو کر آئے تو نواب آف کالاباغ کی اپنی رعایا سے ٹکر ہو چکی تھی، مولانا نے وہاں کے غریب عوام کا ساتھ دیا، اور اس تحریک کو سارے پنجاب میں ہوا دی۔

مولانا گل شیر کی مقبولیت اب پنجاب کے قصبات تک پہنچ چکی تھی شہرت کے ساتھ ساتھ ان کے سیاسی جرائم میں بھی اضافہ ہوتا چلا گیا کیمبلپور اور

میانوالی اضلاع کے امراء کو یہ بات کب پسند تھی کہ رسم و رواج پر وعظ کرنے والا مولوی اس حد تک آگے بڑھے کہ اس کے ہاتھ اُن کے گریبانوں تک پہنچ جائیں ان کے نزدیک مولانا گل شیر کے مندرجہ ذیل جرائم ناقابلِ معافی تھے۔

۱: مجلس احرار میں شمولیت

۲: امیر شریعتؒ کا ضلع میانوالی میں ورود ——— (یہ ضلع انگریز کا اہم ترین عسکری مرکز تھا)

۳: نواب کالاباغ کی مخالفت،

۴: خلافِ شرع رسم و رواج کے خلاف جہاد۔

اپنے علاقہ کے اُمراء سے اس کشمکش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۳ اور ۲۴ مئی ۱۹۴۰ء کی درمیانی رات کو جبکہ مولانا گل شیر اپنے مکان کے صحن میں سوئے ہوئے تھے، کسی نامعلوم شخص نے انہیں گولی مار کر شہید کر دیا۔

مولانا کی شہادت سے پنجاب بھر میں کہرام مچ گیا۔ ہر آنکھ آبدیدہ، ہر زبان رائج الوقت قانون سے سوال کرتی تھی۔ ایک پارسا، نیک، تہجد گزار اور حق گو عالمِ دین کو کس نے قتل کیا؟ وہ ہاتھ کس کے اشارے پر اُٹھا جس نے ناکردہ گناہ کی سزا میں ایک نیک انسان کے خون سے اپنے کو مجرم ٹھہرایا؟ قاتل کو وہ بندوق کس نے دی، جس سے نکلی ہوئی گولی سے مولانا گل شیر شہید ہوئے؟

ان سوالات کے جواب اُس وقت کے قانون کے پاس بھی نہیں تھے، اور آج کی انصاف پسند دنیا بھی خاموش ہے۔

قاتل کے نشان پاکن محلات کے سامنے جا کر گم ہو جاتے ہیں؟ قانون

اپنی کھوج میں کیوں ناکام رہا؟ میانوالی کی زمین کے ذرات اس رازہا ئے درونِ پردہ کو کب چاک کریں گے؟ ؎

قریب آلگا ہے یارو روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

اس حادثۂ جانکاہ کے بعد امیر شریعتؒ اپنا مجوزہ پروگرام ملتوی کر کے کیمبل پور اور میانوالی کے سفر پر روانہ ہو گئے، جہاں انہوں نے وہی باتیں کہیں، جو مولانا گل شیر کے قتل کا باعث بنی تھیں۔

تحریکِ پاکستان

(ہٹلر کی فوجیں جیسے جیسے برطانوی سلطنت کا سورج غروب کرتی ہوئی آگے بڑھتی گئیں۔ ایشیا کی سیاست اسی قدر متاثر ہوتی گئی۔ مجلس احرار ان دنوں کانگرس اور مسلم لیگ کے تصادم سے بالاتر رہ کر اپنی پالیسی پر گامزن تھی۔ ہندوستان کے مسلمان دو دھڑوں میں بٹے ہوئے تھے۔ مطالبۂ پاکستان زور پکڑتا جا رہا تھا، سرکاری دفاتروں میں ہندو کی تنگ نظری نے کلرک قسم کے مسلمان کو بھی مسلم لیگ کا ممبر بنا دیا تھا۔ کانگریس پر قابض فرقہ پرست ہندو نے نیشنلسٹ مسلمان کو بھی کانگریس سے علیحدگی پر مجبور کر دیا تھا) دوسری طرف مسلم لیگ میں رجعت پسند اور تن آسان لوگوں کے ہجوم نے "پاکستان" کا نعرہ کچھ اس انداز سے بلند کیا کہ متعینہ راہ پر چلتے ہوئے مسافروں کو بھی راستے کی لکیریں گڈمڈ نظر آنے لگیں۔

(سال ۱۹۴۴ء کے آخری ایام برطانوی سلطنت اور غلام ہندوستان کے مابین کشمکش کے آخری اور انتہائی نازک دن تھے۔ متحدہ ہندوستان نے لیگ اور کانگرس کے ٹکراؤ سے ۹ ستمبر ۱۹۴۴ء کو ایک نئی کروٹ لی، جبکہ بمبئی میں گاندھی جناح ملاقات سے پاکستان کے نعرے میں نئی بہار آئی۔ مسلمان من حیث القوم مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ لیکن امیر شریعت یہ سب کچھ دیکھتے اور سُنتے ہوئے بھی حکومتِ الٰہیہ کی وضاحت میں ایسے مصروف ہوئے کہ انہوں نے مجلس احرار کی سہارن پور والی قرارداد کے دوسرے حصے پر عمل کرتے ہوئے مسلم لیگ اور کانگرس کے جھگڑوں میں اُلجھنا غیر مناسب سمجھا، اور اس طرح یہ سال بھی گذر گیا)

نئے سال کے طلوع ہوتے ہی دوسری جنگِ عظیم کے برستے ہوئے بادلوں کے دامن خشک ہو رہے تھے کہ ۱۵ اگست ۱۹۴۵ء کو امریکہ نے جاپان کے ایک خوبصورت شہر ہیروشیما پر ایٹم بم دے مارا۔ جرمنی اس سے پیشتر اتحادیوں کے سامنے سپر انداز ہو چکا تھا۔ اس طرح جنگ کے خاتمہ پر جہاں اور بہت سی تبدیلیاں آئیں، وہاں لندن کی کنزرویٹو پارٹی نے الیکشن ہار کر حکومت کا چارج لیبر پارٹی کے سپرد کر دیا۔ برطانیہ کی نئی حکمران پارٹی نے چونکہ اپنے ووٹروں سے ہندوستان میں نئی تبدیلیوں کے عنوان پر ووٹ لیے تھے، للٰہذا ہندوستان کو جلد سے جلد آزاد کرنے کے منصوبے بنانے شروع کیے۔

بعد از جنگ کے حالات نے باوجودیکہ اتحادیوں کی فتح ہوئی تھی، برطانیہ کو دُنیا کی تیسرے درجہ کی طاقت بنا دیا تھا۔ ہندوستان کے سیاسی حالات بھی

برطانیہ کے حق میں نہیں تھے۔ ان واقعات کو دیکھتے ہوئے مصلحت کا تقاضہ تھا کہ برطانیہ ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ ہندوستانیوں کی رائے پر چھوڑ دے۔ چنانچہ ان دنوں برطانوی دانش وروں کے اکثر وفود ہندوستان آئے، جن میں "کرپس مشن" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس نے مسلم لیگ اور کانگرسی راہنماؤں سے گفت گو کی۔

قائد اعظمؒ سے ملاقات کی خواہش

(عالمی سیاسیات میں برطانیہ کی پوزیشن ڈوبتے سورج کی طرح سہارے تلاش کر رہی تھی۔ بدیں حالات یقین ہو چکا تھا کہ اب انگریز ہندوستان کو تقسیم کئے بغیر دم نہیں لے گا۔ چنانچہ امیر شریعتؒ نے دہلی میں تقریر کرتے ہوئے مسٹر محمد علی جناح (قائد اعظم) سے مخاطب ہو کر کہا:

"پاکستان کی تھیوری میرے بار بار سوچنے پر بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں جس قدر اِس پر سوچتا ہوں اُسی قدر خود ہی کھو جاتا ہوں لیکن اگر آپ کہتے ہیں کہ مسلمان قوم اور خود ہندوستان کی نجات بھی اسی میں ہے، تو اس سلسلے میں میرے چند خدشات ہیں۔ اگر آپ مجھے ملاقات کا موقع دیں، اور میرے خدشات دُور کر دیں، تو پھر آپ آرام سے بمبئی بیٹھ جائیں میں آپ کے ایک ادنیٰ سپاہی کی حیثیت سے حصولِ پاکستان کے لیے ہندو اور انگریز دونوں سے نپٹ لوں گا۔

دیکھئے مسٹر جناح! یہ دس کروڑ مسلمان قوم کے مذہب
اور اُن کے مستقبل کی زندگی کا سوال ہے۔ یہ دس کروڑ عرب سے
نہیں آئے، بلکہ اسی کفرگڑھ سے خواجہ معین الدین چشتیؒ ٢١
(اجمیری) حضرت خواجہ مجدد الف ثانی سرہندیؒ، حضرت علی ہجویریؒ
(داتا گنج بخش) حضرت نظام الدین اولیاءؒ (دہلی) حضرت پیرانِ کلیرؒ
جیسے ولی، قطب، ابدال اور شب زندہ دار لوگوں نے اپنی
ریاضت و عبادت سے راجپوتانہ ایسے کفرگڑھ میں بیٹھ کر
انہیں مسلمان کیا تھا۔ اگر ہندو اور انگریز کی ملی بھگت سے ان
دس کروڑ مسلمانوں کو کسی طرح کا نقصان پہنچا تو اس کی ذمہ داری
آپ پر ہوگی۔"

اسی مجمع میں آپ نے عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"میں نے اپنی عمر کا ایک تہائی حصہ فرنگی سے لڑ کر اُس کے
جیل خانوں میں گذارا ہے۔ مگر جو بات ایک دفعہ سمجھ میں آ گئی ہے
پھر اس سے مُنہ نہیں موڑا، اور انگریز جیسی جابر سلطنت کے
سامنے کھڑے ہو کر وہی کچھ کہا جس سے میرا ضمیر مطمئن تھا۔ میں
مسٹر جناح کا بے حد احترام کرتا ہوں، میری اُن کی سیاسی لڑائی
ہے ذاتی نہیں۔ آج میں آپ لوگوں کو گواہ کر کے یہ بات کہتا
ہوں کہ اپنی بات سمجھنے کے لیے اگر مجھے مسٹر جناح کے قدموں پہ
اپنی یہ سفید داڑھی بھی رکھنی پڑی، تو خدا کی قسم میں اس سے گریز

نہیں کروں گا۔ لیکن بات سمجھے بغیر اُن کی ہاں میں ہاں ملانے پر تیار نہیں ہو سکتا۔ چاہے میری قوم میرے خلاف ہو جائے"

(اس سے ملتے جلتے خیالات کا اظہار امیر شریعتؒ نے قریباً سارے ہندوستان میں کیا۔ مگر قائداعظم کی طرف سے کوئی جواب وصول نہ ہوا، تا آنکہ ملک میں ۱۹۴۶ء کے نئے انتخابات کا ہنگامہ شروع ہو گیا۔ یہ ۱۹۴۵ء کے وسط کا واقعہ ہے۔ دسمبر ۱۹۴۵ء کے آخر تک انتخابات کے نتیجے سامنے آئے تو مسلم لیگ ہندوستان میں اسّی فی صد کامیاب رہی لیکن امیر شریعتؒ کے خدشات بدستور ذہن میں رہے، جن کا اظہار وہ کبھی کبھار نجی محفلوں میں بھی کرتے، لیکن اس آس پر کہ شاید الیکشن سے فارغ ہو کر قائداعظم انہیں بلائیں گے۔ بالآخر امیر شریعتؒ کی اس خواہش کو ٹھکرا دیا گیا۔)

دوسری

قرارداد مجلسِ احرار

(ہندوستان کے سیاسی حالات و واقعات دیکھتے ہوئے برطانیہ کی نئی حکومت نے جس کے سربراہ مسٹر ایٹلی تھے۔ ۱۹ فروری ۱۹۴۶ء کو برطانوی پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ کابینہ کے تین وزراء کا ایک وفد ہندوستان جا کر وہاں کی مختلف سیاسی پارٹیوں سے گفت گو کرے گا۔ اس اعلان کے پیشِ نظر ۲۴ مارچ (۱۹۴۶ء) کو برطانوی وفد ہندوستان پہنچ گیا، جس کی قیادت وزیرِ ہند مسٹر لارڈ پیتھک لارنس کر رہے تھے۔ امیر شریعتؒ نے جب یہ خبر اخبارات میں پڑھی، تو ۲۵ مارچ کو لاہور پہنچ کر صدر مجلسِ احرار شیخ حسام الدین کے

مشورے سے ۷، ۲۷ مارچ کو لاہور مجلس احرار کی ورکنگ کمیٹی کا ہنگامی اجلاس طلب کر لیا۔ ممبرانِ احرار ورکنگ کمیٹی سے پاکستان سے متعلق اپنے خدشات کا اظہار کرنے کے بعد امیرِ شریعتؒ نے حسبِ ذیل قرارداد پیش کی :

(الف) آل انڈیا مجلسِ احرار اسلام کی ورکنگ کمیٹی کا یہ اجلاس موجودہ اہم سیاسی مسائل کے متعلق ایک بار پھر اپنی پوزیشن واضح اور غیر مبہم طور پر ظاہر کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

(ب) جہاں تک مسلم لیگ کے نظریۂ پاکستان کا تعلق ہے مجلسِ عاملہ کسی صورت میں بھی اس سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ ہم تقسیمِ ہند کے نظریہ کا تجزیہ محض اقتصادی اور معاشرتی اصولوں پر نہیں کرتے، پاکستان کے قبول کرنے کا مطلب ملتِ اسلامیہ ہندیہ کو تین مختلف حصوں میں منتشر کرنا ہو گا۔ پنجاب (کا نامکمل صوبہ) سرحد، سندھ اور بلوچستان ہندوستان کے ایک سرے پر اور بالکل دوسرے سرے پر مشرقی بنگال اور آسام کے کچھ اضلاع کو پاکستان بنایا جا رہا ہے۔

ملتِ اسلامیہ ان دو حصوں میں بٹ کر نہیں رہے گی، بلکہ اس سے ایک قابلِ قدر حصے پر ہندوستان میں دوامی غلامی مسلط رہے گی، ان دو پاکستانی ریاستوں میں مؤثر غیر مسلم اقلیت موجود رہے گی۔ شبیہِ پاکستان کی یہ دونوں ریاستیں جغرافیائی اعتبار سے ایک دوسرے کی کسی بیرونی حملے کے وقت امداد نہیں کر

سکیں گی، اور ان دو ریاستوں کے درمیان ہندوؤں کو دُنیا کی
سب سے بڑی سلطنت سونپ دی جائے گی جس میں مسلم اقلیت
کی پوزیشن حد درجہ غیر مؤثر رہے گی۔

مزید براں اب مسٹر جناح نے نواب زادہ لیاقت علی خاں
کے نظریہ کو اپنا لیا ہے اور سکھوں کی علیحدہ سلطنت بنانے کا
حق تسلیم کر کے پنجاب میں جمنا سے لے کر راوی بلکہ چناب تک کا
علاقہ مغربی پاکستان سے علیحدہ ہونا درست قرار دے دیا ہے۔
اس روش کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بنگال اور آسام کے صوبوں کی
بھی اسی طرح قطع و برید ہو گی جس سے مغربی پاکستان کی طرح
مشرقی پاکستان بھی پہلے سے زیادہ بے وقعت اور اقتصادی لحاظ
سے بے حال ہو جائے گا۔

ان مخصوص حقیقتوں کے بعد کوئی ذی شعور جماعت جو
مسلمانوں کے تحفظِ حقوق کا دعویٰ کرتی ہے اس مہلک نظریہ
سے متفق نہیں ہو سکتی۔

مجلس عاملہ اس حقیقت کا اعلان کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ
یہ تمام خلافِ آئین و اخلاق سرگرمیاں اور محدود حق رائے دہندگی
مسلم لیگ کی وقتی کامیابی کی ضامن ہوں۔ مسلم لیگ کی قیادت
مسلمانوں کو ایک غیر منظم قوم اور بے ہنگام گروہ کی حیثیت دینا
چاہتی ہے۔ لہٰذا یہ اجلاس ایک بار پھر اعلان کرتا ہے، کہ

مسلم لیگ کی قیادت قطعی غیر اسلامی ہے۔ اِس کا عمل آج تک
ملّتِ اسلامیہ کے مفاد کے منافی رہا ہے۔ مرکزی اسمبلی اور
صوبائی اسمبلیوں میں اِسلامی قوانین کی مخالفت اس کا مستقل
شعار ہے۔ اس لئے مسلمان سیاسی، مذہبی، تمدنی راہنمائی کی
توقع مسلم لیگ کی غیر اسلامی قیادت سے نہیں کر سکتے، اور
مسلم لیگ کے کسی فیصلے کو اسلامی ہند کا فیصلہ نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اپنی اس قرارداد کی تائید میں تقریر کرتے ہوئے امیرِ شریعتؒ نے کہا:

رفقائے محترم! گذشتہ سال کے وسط میں مَیں نے دہلی
میں پاکستان سے متعلق اپنے خدشات اور دلی اطمینان کے لیے
جناح صاحب سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھے پاکستان کی
تصویری سمجھائیں۔ اگر اُن کا نظریہ درست نکلا اور مجھے ذہنی اطمینان
ہُوا تو مَیں انشاءاللہ حصولِ پاکستان کے لیے انگریز اور ہندو
دونوں سے ٹکرا جاؤں گا۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ جناح صاحب نے
میری حقیر گذارش کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ آج مَیں نے ورکنگ کمیٹی
کے سامنے اپنے خدشات کا اظہار کر دیا ہے۔

مَیں صرف آئینی سمجھوتے میں ہندوستان کی نجات نہیں
سمجھتا، اور نہ ہی میرے نزدیک الیکشن کی ہار جیت مُلک یا قوم
کے لیے نفع بخش ہو سکتی ہے۔ مَیں تو بس ہندوستان میں انگریز سے
ایک ایسی لڑائی دیکھنے اور لڑنے کا متمنی ہوں کہ جس میں گھر بار تباہ

برباد کر کے پھانسیاں لگنے کا پروگرام ہو، بس یہی پروگرام آزادیٔ
ہند کے مسئلے کو حل کر سکتا ہے۔ جماعت کو الیکشن نہیں لڑنا
چاہیئے تھا بلکہ کوئی اور ٹھوس پروگرام سامنے رکھ کر کام کرنا چاہیئے۔
پاکستان کے بارے میں گزشتہ سال سے میں نے
جس جگہ بھی تقریر کی، پاکستان کو مسلمانانِ ہندوستان کے لیے
مہلک بلکہ ہلاکت آفرین اور ہلاکت خیز بنایا ہے اور دلائل سے
یہ باتیں ثابت کی ہیں۔ میری سمجھ میں پاکستان کے حق میں کوئی دلیل
بھی تو نہیں آئی۔ اس وقت قوم کی زندگی اور موت کا سوال ہے
میں نہیں کہتا کہ میری رائے مان لی جائے، سب کو ہی اس پر
ٹھنڈے دل سے غور سے کرنا چاہیئے۔ اگر کسی کے پاس میرے
دلائل کے خلاف کوئی واضح اور ٹھوس دلائل ہوں تو مجھے اپنی
تجویز پر اب بھی ضد نہیں ہے۔"

(امیر شریعتؒ کی اس تقریر کے بعد ورکنگ کمیٹی نے جمعیت العلماء ہند کی
حسب ذیل سہارنپور والی قرارداد کو تھوڑی سی ترمیم کے ساتھ منظور کر لیا۔

("جمعیت العلماء ہند کے نزدیک تمام ہندوستان کے لیے
عموماً اور مسلمانوں کے لیے خصوصاً یہ صورت مفید ہے کہ وہ
حسب ذیل نکات پر اتفاق کر لیں اور اس بنیاد پر حکومت
برطانیہ کے سامنے متفقہ مطالبہ پیش کریں:

(الف) ہمارا نصب العین آزادیٔ کامل ہے۔

(ب) وطن کی آزادی میں مسلمان آزاد ہوں گے، ان کا مذہب آزاد ہوگا۔ مسلم کلچر، تہذیب و ثقافت آزاد ہوگی۔ وہ کسی ایسے آئین کو قبول نہ کریں گے، جس کی بنیاد ایسی آزادی پر نہ رکھی گئی ہو۔

(ج) ہم ہندوستان میں کامل آزادی اور خود مختاری کے حامی ہیں، غیر محدود داخلی اختیارات صوبوں کے ہاتھ میں ہوں گے، اور مرکز کو صرف وہی اختیارات ملیں گے جو تمام صوبے متفقہ طور پر مرکز کے حوالے کریں، اور ان کا تعلق تمام صوبوں سے یکساں ہو۔

(د) ہمارے نزدیک ہندوستان کے آزاد صوبوں کا وفاق ضروری اور مفید ہے، مگر ایسا وفاق اور ایسی مرکزیت جس میں اپنی مخصوص تہذیب و ثقافت کی مالک، نو کروڑ نفوس پر مشتمل مسلمان قوم کسی غالب اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو، ایک لمحہ کے لیے بھی گوارا نہ ہوگی یعنی مرکز کی تشکیل ایسے اصولوں پر ہونی ضروری ہے کہ مسلمان اپنی مذہبی، سیاسی و تہذیبی آزادی کی طرف سے مطمئن ہوں۔

۱: مرکزی ممبروں کی تعداد کا یہ تناسب ہو، ہندو ۴۵، مسلمان ۴۵، اور دیگر اقلیتیں ۱۰۔

۲: مرکزی حکومت میں اگر کسی بل یا تجویز کو مسلم ارکان کی

۱ ¾ اکثریت اپنے مذہب یا اپنی سیاسی آزادی یا اپنی تہذیب و ثقافت پر مخلصانہ اثرانداز قرار دے تو وہ بل یا تجویز ایوان میں پیش ہو تو پاس نہ ہو سکے گی۔

سطر ۳: ایک ایسا سپریم کورٹ قائم کیا جائے جس میں

ا مسلم و غیر مسلم ججوں کی تعداد مساوی ہو، اور جس کے ججوں کا تقرر مسلم و غیر مسلم صوبوں کی ساوی تعداد کے ارکان کی کمیٹی کرے۔

یہ سپریم کورٹ مرکز اور صوبوں کے درمیان تنازعات

ا یا صوبوں کے باہمی تنازعات یا ملک کی قوموں کے اختلافات کا آخری فیصلہ کرے گا۔ نیز تجویز نمبر ۲ کے تحت اگر کسی بل کے

ا مسلمانوں کے خلاف ہونے، نہ ہونے میں مرکزی اکثریت مسلم ارکان کی ¾ اکثریت کے فیصلے سے اختلاف کرے تو اس کا فیصلہ سپریم کورٹ سے کرایا جائے گا۔

۹ سطر ۴: محکمہ قضا کا قیام

سطر ۵: ہندوستانی فوج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی مساوی

ا نمائندگی ہوگی تاکہ کسی قوم کی زیادہ نیابت دوسری قوم کیلیے خوف و ہراس کا باعث نہ رہے۔

ا سطر ۶: مرکز کی طرف سے پسماندہ صوبوں میں تعلیم و صنعت کے مستقل عطیہ جات۔

۷: اقلیتوں کے لیے صوبوں میں ویٹیج کا طریقہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔

۸: ہندوستان میں مختلف ملتوں کے کلچرل، زبان، مذہبی تعلیم، مذہبی تبلیغ، مذہبی عقائد، مذہبی اعمال، عبادت گاہیں، اوقاف آزاد ہوں گے۔ حکومت ان میں مداخلت نہ کرے گی۔

۹: دستورِ اساسی میں اسلامی پرسنل لاء کی حفاظت کے لیے خاص دفعہ رکھی جائے گی جس میں تشریح ہو گی، کہ مجالسِ قانون ساز اور حکومت کی جانب سے ان میں مداخلت نہ کی جائے گی اور پرسنل لاء کی چیزیں مثلاً احکامِ نکاح، طلاق، رجعت، عدت، خیار، بلوغ، تفریقِ زوجین، خلع عنین و مفقود، نفقۂ زوجیت، حضانت، ولایت، نکاح و مالِ وصیت، وقف وراثت، تکفین و تدفین و قربانی وغیرہ،

۱۰: مسلمانوں کے ایسے مقدمات کرنے کے لیے جن میں مسلمان حاکم کا فیصلہ ضروری ہے، مسلم قاضیوں کا تقرر کیا جائیگا۔ اور ان کو اختیارات تفویض کیے جائیں گے۔"

(مجلس احرار کی یہ تاریخی قرارداد دور رس نتائج کی حامل تھی۔ وقتی اور فوری اثرات سے بے نیاز ہو کر احرار رہنماؤں نے اپنی دانست میں مسلمانانِ ہندوستان کے مستقبل کو ایسی قرارداد کے ذریعے محفوظ سمجھا۔)

دہلی کا آخری اجلاس

ورکنگ کمیٹی کے اجلاس سے فارغ ہو کر حضرت امیر شریعتؒ اپنے رفقاء مولانا حبیب الرحمٰن، شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری کی معیت میں ۲۷ر مارچ (۱۹۴۶ء) کو دہلی روانہ ہو گئے، جہاں انہوں نے مختلف الخیال رہنماؤں سے بات چیت کی۔

ان دنوں دہلی میں برطانوی مشن مسلم لیگ اور کانگرسی راہنماؤں سے سیاسی مذاکرات میں مصروف تھا۔ ۳۰ر مارچ کو جمعیت العلمائے ہند کے راہنماؤں سے ان کی دعوت پر امیر شریعتؒ کی گفت گو ہوئی، جس میں مجلس احرار کی قرارداد کا بھی ذکر آیا۔ اور آخر میں جمعیت کے ناظم اعلیٰ مولانا حفظ الرحمٰن سہاروی نے مجلس احرار کی قرارداد کو مسلمانانِ ہند کے لیے پسندیدہ قرار دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے بھی انہی دنوں ملاقات ہوئی۔

۲۶ر اپریل (۱۹۴۶ء) کو رات گیارہ بجے اردو پارک (دہلی) میں امیرِ شریعتؒ نے ایک کثیر اجتماع سے خطاب کیا۔ یہ آخری اجتماع ہے، اس کے بعد امیر شریعتؒ پھر کبھی دہلی نہیں جا سکے۔ اس اجتماع میں قریباً پانچ لاکھ انسانوں نے شرکت کی۔ چشمِ دہلی نے پیشتر ازیں اتنا بڑا اجتماع کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس اجلاس کی صدارت مولانا حسین احمد مدنی نے کی، اور اسٹیج سیکرٹری کے فرائض شیخ حسام الدین نے انجام دیے، جب کہ عوام کے سنبھالنے کا انتظام احرار رضاکاروں کے ذمے تھا، اجتماع کے چاروں طرف احرار رضاکاروں کے

رہتے تھے۔ اجتماع کے چاروں طرف احرار پرچم لالہ و گل کی سی بہاریں دکھا رہے
تھے۔ اسٹیج پر مولانا حبیب الرحمٰن، ماسٹر تاج الدین انصاری اور جمعیت العلمائے ہند
کے راہنما موجود تھے۔

اچانک انسانی سمندر میں ایک لہر اُٹھی، ایک ارتعاش پیدا ہُوا۔
دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ شوقِ دید تجسّس کے لیے سرگرداں ہوا کہ امیر شریعتؒ
زندہ باد کے نعروں نے جلسے کے امن و سکون کی ساری طنابیں توڑ دیں —
عوام اپنے محبوب راہنما کی زیارت کے لیے سراپا نیاز اُٹھ کھڑے ہوئے،
شاہجہان کی مسجد کے مینار اور لال قلعہ کی دیواریں محو دید تھیں۔ آسمان ستاروں کی
روشنی میں دُنیا کی اندھیر گردی میں روشن چراغوں کو آخری بار ٹمٹماتے دیکھ کر
مُسکرا رہا تھا۔

امیر شریعت اسٹیج پر تشریف لائے کہ ایک دُوسرا قافلہ آن پہنچا۔ اس میں
برطانوی مشن کے سربراہ وزیرِ ہند لارڈ پیتھک لارنس مولانا آزاد اور پنڈت
جواہر لال نہرو نمایاں تھے۔ اسٹیج اس وقت بین الاقوامی شخصیتوں سے بارونق تھا
ٹھیک بارہ بجے حضرت امیر شریعتؒ نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کی،
الفاظ جیسے جیسے آگے بڑھتے جاتے تھے۔ قرآن حکیم اپنے مُعانی و مطالب
آپ سے آپ واضح کرتا جاتا حضرت امیر شریعتؒ کے گلے کی حلاوت اور
طرزِ بیان سے ایسا محسُوس ہوتا جیسے آیاتِ خُداوندی کا نزول ہو رہا ہو—
لاکھوں انسانوں کے اجتماع میں ہُو کا عالم اس خاموشی کو کبھی کبھار آسمان پر
ستاروں کی انگڑائیاں توڑ رہی تھی۔

"مَیں تو صرف بخاری صاحب کا قرآن سُننے
کے لیے حاضر ہوا تھا، اب مَیں اجازت چاہتا
ہوں۔ برطانوی مشن کی آمد کے باعث میں زیادہ
مصرُوف ہوں۔"

یہ تھے پنڈت جواہر لال نہرو کے الفاظ جو اُنہوں نے امیرِ شریعتؒ کے اختتامِ قرآن پر مجمع سے خطاب کرتے ہوئے کہے اور واپس چلے گئے۔

امیرِ شریعتؒ نے انسانی سمندر کے بحرِ بیکراں پر ایک نظر ڈالی، اور خلافِ معمول خطبۂ مسنونہ سے پہلے فرمایا:

"آپ حضرات درُود شریف پڑھیں۔"

پھر فرمایا "درُود شریف پڑھیں"۔ تیسری بار بھی عوام سے یہی مطالبہ کیا۔ لوگ حیران تھے کہ اس سے پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا، آج یہ نئی رسم کیوں ؟!

اس سوال کے جواب میں خود ہی امیرِ شریعتؒ نے فرمایا:

"مَیں نے یہ حرکت اس لیے کی ہے کہ اتنے بڑے عظیم اجتماع کی موجُودگی کے باوجُود صبح یار لوگ اخباروں میں کہیں گے کہ رات مجمع تو چار پانچ لاکھ کا تھا، مگر اس میں مُسلمان کوئی نہیں تھا اس لیے مَیں نے درُود شریف پڑھوایا ہے تاکہ دوستوں کو اندازہ ہو جائے کہ اس مجمع میں مسلمان ہیں یا یہ مجمع مُسلمانوں کا ہے۔"

اس پر تمام مجمع کشتِ زعفران بن گیا

خطبۂ مسنونہ کے بعد تقریر کرتے ہوئے حضرت امیر شریعتؒ نے کہا :-

"حضرات ! مجھے آج کوئی تقریر نہیں کرنی ، بلکہ چند حقائق ہیں ، جنہیں بلا تمہید عرض کروں گا ، اس وقت آئینی اور غیر آئینی دنیا میں خواہ اس کا تعلق ایشیا سے ہو یا یورپ سے ، جو بحث چل رہی ہے وہ یہ ہے کہ آیا ہندو اکثریت کو مسلم اقلیت سے جُدا کر کے برصغیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے ، قطع نظر اس بحث کے مجھے پاکستان بن جانے کا اسی قدر یقین ہے جتنا کہ اس بات پر کہ صبح سورج مشرق سے طلوع ہونے والا ہے ، لیکن یہ پاکستان وہ پاکستان نہیں ہوگا ، جو اس وقت کے دس کروڑ مسلمانانِ ہند کے ذہنوں میں موجود ہے ، اور جس کے لیے آپ بڑے خلوص سے کوشاں ہیں ، ان مخلص نوجوانوں کو کیا معلوم کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

بات جھگڑے کی نہیں ، سمجھنے اور سمجھانے کی ہے ، تحریک پاکستان کی قیادت کرنے والوں کے قول و فعل میں بنیادی تضاد ہے ! اگر آج مجھے کوئی اس بات کا یقین دلا دے کہ کل کو ہندوستان کے کسی قصبے کی کسی گلی میں شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ ہونے والا ہے ، تو میں آج ہی اپنا سب کچھ چھوڑ کر آپ کے ساتھ رہنے کے لیے تیار ہوں لیکن یہ بات میری سمجھ سے بالاتر ہے کہ جو لوگ اپنی اڑھائی من کی لاش اور چھ فٹ قد پر اسلامی قوانین نافذ نہیں کر سکتے ، جن کا اٹھنا

بیٹھنا، جن کا سونا، جاگنا، جن کی وضع قطع، رہن سہن، بول چال، ز
لباس، غرض کوئی چیز اسلام کے مطابق نہ ہو، وہ ایک قطعۂ زمین
اسلامی قوانین کس طرح نافذ کریں گے ؟"

کلہاڑی کو دونوں ہاتھوں پر اُٹھا کر امیر شریعتؒ نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے نقشے سمجھاتے ہوئے کہا:

"ادھر مغربی پاکستان ہو گا، اُدھر مشرقی پاکستان، درمیان چالیس کروڑ ہندو کی حکومت ہو گی۔ لالوں کی حکومت، لالے دولت والے، لالے ہاتھیوں والے، ہندو اپنی عیاری اور مکاری سے پاکستان کو ہمیشہ تنگ کرے گا۔ اسے کمزور بنانے کی ہر کوشش ہو گی۔ آپ کے دریاؤں کے پانی روک دیے جائیں گے، آپ کی معیشت تباہ کرنے کی کوشش کی جائے گی، اور آپ کی حالت یہ ہو گی کہ بوقتِ ضرورت مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان کی اور مغربی پاکستان، مشرقی پاکستان کی مدد کرنے سے قاصر ہوں گے۔ پاکستان پر چند خاندانوں کی حکومت ہو گی اور یہ خاندان زمینداروں، صنعت کاروں کے خاندان ہوں گے، جو اپنی من مانی کارروائیوں سے عوام الناس کو پریشان کر کے رکھ دیں گے۔ غریب کی زندگی اجیرن ہو جائے گی، امیر دن بدن امیر تر ہو جائیں گے اور غریب، غریب تر ــــ"

رات کافی بھیگ چکی تھی، حضرت امیر شریعتؒ اپنی سیاسی بصیرت اور سوجھ بوجھ کے موتی بکھیر رہے تھے۔ مستقبل سے ناآشنا مسلمان منہ کھولے انجانے دا...

ت سے سن رہا تھا۔ ہندو سے خطاب کرتے ہوئے امیرِ شریعتؒ نے کہا۔

"پاکستان کی بنیاد ہندو کی مسلمان دشمنی پر استوار ہوئی ہے

دولت سے پیار کرنے والے ہندو نے، گائے کی پوجا کی،

پیپل مہاراج پر پھول چڑھائے چیونٹیوں کے بلوں پر چاول

ڈالے، سانپ کو اپنا دیوتا مانا ـــــ لیکن مسلمان سے ہمیشہ

نفرت کی ـــــ اس کے سائے تک سے اپنا دامن بچائے رکھا،

پھر ایک ایسا وقت بھی آیا کہ بڑے سے بڑے ہندو نے اچھوتوں

پر اپنے مندروں کے دروازے کھول دیئے ـــــ لیکن مسلمان

سے اس قدر نفرت کی کہ اس کے لیے دل کے دروازے

کبھی وا نہ کیے ـــــ آج اسی نفرت کا نتیجہ ہے کہ مسلمان اپنا

الگ وطن مانگنے پر مجبور ہوا ہے ـــــ کانگرس یہ سب کچھ دیکھ کر

بھی مصلحتاً خاموش رہی، اگر کانگرسی راہنما، ہندو مہاسبھا۔ آریہ دل

اور اسی قسم کی فرقہ وارانہ تحریکوں کو اپنے اثر سے ختم کر دیتے تو مسلم لیگ

کے پنپنے کی یہاں کوئی گنجائش نہ ہوتی، مگر میں کیا کروں، یہ

کوڑھ کانگرس کے اندر سے پھوٹا ہے۔ جو بیماری جسم کے اندر

سے پیدا ہو، اس کا علاج باہر کے اثرات کیسے کر سکتے ہیں۔

کانگرس نے ہمارے ساتھ بھی نباہ نہ کیا۔ اگر مسلم لیگ سے

بگاڑی تھی، تو نیشنلسٹ مسلمان کی بات ہی مان لی ہوتی۔ لیکن

آج اس قدر قربانیوں کے باوجود فرنگی کو اپنا ثالث مان رہے ہو۔

اے کاش! ہم سے نہیں تو مسلم لیگ ہی سے بنائی ہوتی، تاکہ آپس میں بیٹھ کر کوئی معاملہ طے کر لیا جاتا۔"

آخر میں امیر شریعتؒ نے زوردار آواز میں کہا:

"مسلم لیگ اور کانگرس دونوں میری بات سنو! ؎

احباب جمع ہیں میر دردِ دل کہہ لے
پھر التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

یاد رکھو! اگر تم باہم مل بیٹھ کر کوئی معاملہ طے کر لیتے تو الگ الگ رہ کر بھی شیر و شکر رہتے، مگر تم نے فرنگی سے اپنا انصاف مانگا ہے وہ تم دونوں کے درمیان کوئی نہ کوئی ایسا فساد ضرور پیدا کر جائے گا کہ تم دونوں قیامت تک چین سے نہیں بیٹھ سکتے! آج تلواروں اور لاٹھیوں سے لڑتے ہو، تو آنے والے کل کو توپ اور بندوق سے لڑو گے۔ تمہاری اس نادانی سے انسانیت کو جو نقصان ہو گا، عورت کی جو توہین ہو گی اور شرافت جس بری طرح برصغیر میں زخمی ہو گی، اس کے لیے تم دونوں مجرم ہوں گے۔ و آخر دعوانا الحمد للہ رب العالمین، ؎

اب تو جاتے ہیں میکدے سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا!"

امیر شریعتؒ کی یہ تقریر قریباً ساڑھے پانچ گھنٹے جاری رہی، تاآنکہ شاہی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی اور صبح کی نماز اسی پنڈال میں ادا کی گئی۔

امیرِ شریعتؒ کشمیر میں!

امیرِ شریعتؒ ہندوستان کے تمام سیاسی راہنماؤں سے برصغیر کے حالات پر گفتگو میں مئی کے آخر تک مصروف رہے۔ حالات ان دنوں عاجلانہ طور پر آگے بڑھ رہے تھے۔ ہر صبح کا سورج نئے واقعات ڈھال رہا تھا۔ مجلس احرار کے رہنماؤں کی نگاہیں کانگرس، مسلم لیگ اور برطانوی مشن کی ایک ایک حرکت کو احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ آخر یہی بہتر سمجھا کہ مسلم حقوق کے معاملات میں کانگرس کے مقابل مسلم لیگ کو ذمہ داری سونپ دی جائے۔ اس فیصلہ کے بعد احرار رہنما وقتی طور پر گوشۂ تنہائی میں خاموش جا بیٹھے۔

انہی دنوں امیرِ شریعتؒ اپنے حرم محترم سمیت کشمیر چلے گئے اور سری نگر سے پندرہ میل دور سوپور نامی گاؤں میں خواجہ غلام محمد بٹ کے ذاتی مہمان ہوئے امیرِ شریعتؒ کی قیام گاہ لبِ سڑک ایک اوسط درجے کے دو منزلہ مکان پر تھی۔

ہندوستان کے ساتھ ساتھ کشمیر کے حالات بھی انقلاب کی ہنگامہ آرائیوں سے نبرد آزما تھے۔ سری نگر کے درمیان بہتا ہوا دریائے جہلم کا پانی کشمیری حریت پسندوں کے خون سے نہ جانے کتنی بار اپنی رنگت تبدیل کر چکا تھا۔ ڈوگرہ شاہی سے نجات کے لیے کشمیری غلام اپنی آخری پونجی داؤ پر لگا چکا تھا۔ مسلم لیگ اور کانگرس کی سیاسی ضرورتیں یہاں بھی اپنا جادو چلا رہی تھیں لیکن امیرِ شریعتؒ سوپور میں رہ کر بھی واقعات و حالات سے اس قدر انجان رہے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ امیرِ شریعتؒ کشمیر میں ہیں۔ اس گمنامی کے باعث صبح سے شام اور

رات سے سویرا ہونے تک ذکرِ الٰہی میں مصروف رہتے، البتہ دن کے کسی حصے میں میزبان کی دوکان پر آبیٹھتے اور اخبارات پر ایک نظر ڈالتے، حالات سُنتے اور پھر رہائش گاہ پر چلے جاتے۔ ان دنوں مولانا ابوالکلام آزادؒ بھی گلمرگ (کشمیر) میں قیام پذیر تھے۔ انہیں جب پتہ چلا کہ حضرت امیرِ شریعتؒ سری نگر میں موجود ہیں تو اس تمنا کے ساتھ راقم کے توسط سے ملاقات کی خواہش کی:

"شاہ جی سے کہنا، زندگی اور موت کے مابین اب کوئی فاصلہ نہیں رہا حالات نے دونوں کو جس ڈگر پہ ڈال دیا ہے، جانے اس سفر میں کس کی جیت ہو؟ اس لیے بہتر ہے کہ وقت نکال کر مل جائیں۔"

گلمرگ سے واپسی پر راقم نے امیرِ شریعتؒ کو جب یہ پیغام دیا، تو بے اختیار رونے لگ پڑے اور اس قدر روئے کہ داڑھی آنسوؤں سے بھیگ گئی۔

خیالات کی ہم آہنگی بھی کیا چیز ہے؟ برسوں کی رفاقت کے بعد ایک منزل کے دو راہی وقت کے عاجلانہ فیصلے کے ہاتھوں جب بے بس ہوئے، اور اپنے ارادوں میں شکست نظر آنے لگی تو اپنی تمناؤں کی ساری عمارت اپنے آنسوؤں کی نذر کردی۔

عبوری حکومت میں احرار کو شمولیت کی دعوت

(ہندوستان کے سیاسی حالات بڑی تیزی کے ساتھ تبدیل ہو رہے تھے برطانوی حکومت فیصلہ کر چکی تھی کہ ہندوستانیوں کو اُن کے حقوق جلد سے جلد منتقل

کر دیے جائیں۔

کانگرس اور مسلم لیگ کے مابین عبوری حکومت میں مساوی نمائندگی کی بحث چل رہی تھی، کانگرس اپنے نمائندوں میں ایک مسلمان کو شامل کرنا چاہتی تھی لیکن مسلم لیگ غیر مسلم لیگی مسلمان کو نمائندہ ماننے پر آمادہ نہیں تھی۔ اس بحث نے جب طول کھینچا تو بالآخر وائسرائے ہند لارڈ ویول نے ۱۶ جون ۱۹۴۶ء کو بہرحال عبوری حکومت بنانے کا اعلان کر دیا۔

فریقین میں بحث جاری تھی کہ اسی دوران کانگرس نے مجلس احرار کو بھی دعوت دی کہ وہ عبوری حکومت میں شامل ہو جائے۔

غالباً کانگرس کا منشا تھا کہ اگر مسلم لیگ کسی طرح بھی عبوری حکومت میں شامل ہونے کے لیے راضی نہ ہو تو مجلس احرار کو شامل کر لیا جائے۔ احرار راہنماؤں نے امیر شریعتؒ کے مشورے سے جو ان دنوں کشمیر میں تھے کانگرس کی اس پیش کش کا جواب حسب ذیل دیا:

۱: ملک کی موجودہ حالت کے پیش نظر مجلس احرار یہ ضروری سمجھتی ہے کہ کانگرس مسلم لیگ سے باوجود وسیع اختلافات کے کوئی ایسا عارضی سمجھوتہ کر لے جس پر مسلم لیگ کے نمائندے عارضی حکومت میں شامل ہو کر کام کر سکیں تاکہ متحدہ ہندوستان کی جدوجہد آزادی کسی نہ کسی مرحلہ پر کامیاب ہو جائے۔

۲: اگر مسلم لیگ عارضی حکومت میں شامل ہونے کے لیے کسی طرح بھی رضامند نہ ہو تو مجلس احرار اس شرط پر عارضی

حکومت میں اپنا نمائندہ وزیر بھیجنے کو تیار ہے کہ مجلسِ احرار کا
نمائندہ مجلسِ احرار کی ہدایت کے مطابق کام کرے گا۔

۳: مجلسِ احرار کا نمائندہ اس کا پابند ہوگا کہ وہ سیاسی
سمجھوتے یا عدم سمجھوتے کی بنا پر صرف کانگرس ہی کا ساتھ دے۔"

مولانا ابوالکلام آزاد نے مجلس احرار کی اس شرط کو جو کانگرس ہائی کمانڈ کی دعوت کے جواب میں تھی، کانگرس ورکنگ کمیٹی میں پیش کیا۔ سردار پٹیل نے اس مشروط پیش کش کی سخت مخالفت کی، بنا بریں مجلس احرار نے بلا شرط عارضی حکومت میں شامل ہونے سے انکار کر دیا۔

مسلم لیگی حلقوں میں اور خاص کر نوابزادہ لیاقت علی خان تک جب یہ بات پہنچی تو انہوں نے احمد شاہ بخاری کے ذریعے شیخ حسام الدین کو جو اُن دنوں مجلسِ احرار کے صدر تھے، مبارکباد کا تار بھیجا کہ "مجلس احرار نے ملک کے سیاسی سمجھوتے کے بارے میں ایک صحیح قدم اُٹھایا ہے۔"

کشمیر سے واپسی

(قریباً تین ماہ کے بعد جب امیرِ شریعتؒ کشمیر سے واپس آئے تو برطانوی وفد حالات سے مات کھا کر واپس جا چکا تھا لیکن ملک کے سیاستدان اپنی اپنی بساط پر نئے مہرے چن رہے تھے یعنی کانگرس اور مسلم لیگ اقتدار کی کشمکش میں مصروف تھیں۔)

غیر ملکی حکومت کا بجھتا ہوا چراغ دودِ محفل بنا ہوا تھا، ۲ نومبر ۱۹۴۶ء کو

میرٹھ میں کانگرس کے سالانہ اجلاس کے موقعہ پر سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اپنی تقریر کے دوران کہا:

"آج ۱۹۴۲ء کے حالات نہیں ہیں، کانگرس پہلے سے بہت زیادہ مضبوط ہے، وہ زیادہ توانائی اور آسانی سے اپنے دشمنوں کا مقابلہ کر سکتی ہے۔ موجودہ فرقہ وارانہ لڑائی اگر ختم نہ ہوئی، تو اُن لوگوں کو جن پر حملے کا خدشہ ہے میں کہوں گا کہ وہ تلوار سے اپنی حفاظت کریں۔ ہندوستانیوں کو چاہیئے کہ وہ غنڈوں سے اپنی حفاظت کے لیے اپنے کو منظم کریں۔ پولیس اور فوج پر انحصار نہیں کیا جا سکتا۔ تلوار کا جواب تلوار ہے میں لوگوں پر زور دیتا ہوں کہ وہ حفاظتِ خود اختیاری کے لیے طاقت کا استعمال کریں۔

میں عوام کو یہ مشورہ اس لیے دے رہا ہوں کہ مرکز میں اس وقت کوئی گورنمنٹ نہیں، انتقالِ اختیارات کے اس مرحلے میں حکومت مفلوج ہو چکی ہے۔"

سردار پٹیل کی یہ تقریر کانگرس کی آئندہ پالیسی کی آئینہ دار تھی اخبارات کے ذریعے جب یہ تقریر امیرِ شریعتؒ تک پہنچی تو اُن کے ذہن میں ہندو ارادوں کا سارا نقشہ کھنچ گیا، وہ پارٹی سے مشورہ کے بعد متحدہ پنجاب کے اضلاع میں دورے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

پنجاب میں اِن دِنوں ہندوؤں میں جن سنگھ اور اکالی پارٹی ایک ساتھ

سامانِ حرب کے طریقۂ استعمال کی مشق کر رہی تھی۔ ہندو سکھ ڈنڈ پیلتے اور اکھاڑوں میں ورزش کرتے۔ ہندو محلوں کے سامنے آہنی دروازے لگا دیے گئے۔ اس طرح اندرونِ خانہ مسلمانوں سے مقابلے کی پوری تیاری ہو رہی تھی۔ ریوالوروں اور دستی بموں سے قریباً تمام ہندو محلوں کو مسلح کر دیا گیا تھا لیکن جذباتی مسلمان جسے مسلم لیگ نے صرف نعروں سے لیس کیا تھا، آنے والے خطرناک ہندو منصوبوں سے ناآشنا تھا۔ مسلمان نے ہمیشہ جذبات کی رَو میں سانس لی اور محض تدبیر کے سہارے تقدیر بنانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ قوموں کی تقدیر تدبیر سے نہیں شمشیر سے بنتی ہے۔ امیرِ شریعتؒ نے اس پُرآشوب دَور کو اپنی بالغ نظری سے بھانپ کر انبالہ سے راولپنڈی تک کے مسلمان نوجوانوں سے کہا:

"عزیزمن! وقت آگیا ہے کہ اپنے تمام مذہبی اور سیاسی اختلاف کو بھلا کر صرف اپنی آبرو بچانے کی تدبیریں سوچیں، ہمسایہ قومیں تمہارے مٹانے کی فکر کر رہی ہیں۔ سکھوں کے گوردوارے ہندوؤں کے مندر جنگی قلعے بن گئے ہیں، سامانِ حرب سے لیس ہمسایہ قومیں تمہارے خون کی پیاسی ہیں۔

میں نے گذشتہ تیس سال سے تمہیں ایک طرف انگریز کے خلاف اکسایا، تو دوسری طرف اپنے بازو پر بھروسہ کرنے کا سبق بھی دیا۔ عزیزمن! تمہیں یاد ہوگا کہ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ اپنے اندر زندہ رہنے کی صلاحیتیں پیدا کرو! قومیں جب قصاص لینے پر آتی ہیں تو لحاظ نہیں کرتیں، مگر تم نے میری

ایک نہیں سُنی۔ آخر وہی ہُوا جس کا خطرہ تھا ؎

سبُو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا
کئے جاؤ مے خوارو کام اپنا اپنا

یاد رکھنا اگر اب بھی تم نے فیصلہ کرنے میں ڈھیل کی تو دریائے بیاس اور ستلج پانی کی بجائے تمہارے خُون سے بہیں گے۔ جو کچھ میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں، دُشمن جو منصُوبے باندھ چکا ہے خُدا نہ کرے، اگر ایسا ہُوا تو پھر مسلمانو! تمہاری عزّت و آبرُو کا خُدا حافظ۔ وقت تمہیں مُہلت نہیں دے گا۔ اُٹھو! حالات سے مقابلے کے لیے کفن بردوش ہو جاؤ۔ اپنے گھروں میں جس قدر سامانِ حرب جیسا کیسا ہو جمع کرو، اور اپنی حفاظت کے لیے کمربستہ ہو جاؤ۔ یہ میری آخری گذارش ہے، پھر خدا جانے مَیں زندہ رہوں یا تم میں سے کوئی حالات کی نذر ہو جائے۔ یہ وقت زیادہ لمبی چوڑی تقریروں کا نہیں کہ مَیں تمہیں صُبح تک بٹھائے رکھوں، جاؤ اپنے اپنے گھروں میں جو کچھ مَیں نے کہا ہے، اس کے لیے تیاری کرو۔"

(اس قسم کی تقریریں امیرِ شریعتؒ نے پنجابی اور اُردو زبان میں پنجاب کے شہروں، قصبوں اور دیہاتی آبادیوں کے عام اجتماعوں میں کیں۔ اس کے ساتھ وہ محلّوں میں خفیہ اجلاس بُلا کر مسلمان نوجوانوں کو حالات و واقعات سے آگاہ کرتے نیز مخیّر حضرات کو اُکساتے کہ وہ صُوبہ سرحد سے اسلحہ منگوا کر نوجوانوں میں

تقسیم کریں اور استعمال کی تربیت بھی سیکھیں، فوجی پنشنروں کی خدمات حاصل کریں، تاکہ اسلحہ کے استعمال کی تربیت دے سکیں۔ جالندھر اور امرتسر جیسے مرکزی شہروں میں اسلحہ کی درآمد دسمبر ۱۹۴۶ء کے آخر تک جاری رہی۔ مجلس احرار کے ذمہ دار کارکن اور با اعتبار مسلم لیگی اس اہم کام میں امیر شریعتؒ کے معاون تھے۔

۱۹۴۷ء

۱۷۶۷ء میں سلطان حیدر علی والیٔ میسور نے آزادیٔ وطن کیلیے غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف جو جہاد شروع کیا تھا، ۱۹۴۷ء کا سال اس مہم کا آخری سال تھا۔ ایک سو اسی ۱۸۰ برس کی طویل جد و جہد کے دوران محبانِ وطن کو غیر ملکی سامراج سے نبرد آزما ہونے میں جن سنگلاخ وادیوں سے گذرنا پڑا، تاریخ کا ایک ایک ورق اس خونچکاں داستان کو مستقبل کی امانت سمجھ کر سمیٹ چکا ہے۔ برطانوی کیبنٹ کمیشن آج جن حیلے بہانوں سے پاک و ہند کے راہنماؤں کو اپنی بساط پر لیے بیٹھا ہے، یہ اس بجھتے ہوئے چراغ کی آخری لَو ہے جس نے ۱۸۰ سال برصغیر پاک و ہند میں روشن رہ کر دلوں میں ایسی اندھیر گردی مچادی کہ نہ اس ملک کا تمدن ہی اپنا رہا اور نہ اخلاق!

پاک و ہند کی از سرِ نو دیوار میں تعمیر ہونے کا یقین پختہ ہو چکا تھا۔ ہندوستان کی تمام قومیں اپنے حقوق کی نگہداشت میں چوکس نظر آرہی تھیں۔ سکھوں کے لیڈر گیانی کرتار سنگھ نے اس افراتفری میں ۱۳ جنوری ۱۹۴۷ء کو ایک پریس بیان میں اعلان کیا۔——

"وزارتی مشن کی سکیم کے مطابق جلد ۳ گروپ اسمبلیاں
قائم ہو رہی ہیں۔ ان اسمبلیوں میں مسلم لیگ کی اکثریت ہو گی۔ اور
حقیقت یہ ہے کہ ایسے گروپ بنا کر پاکستان کا اصول تسلیم کر لیا
گیا ہے، ان حالات میں ہندو اور سکھوں کا مفاد اسی بات میں
ہے کہ وہ اپنے لیے ایک الگ صوبے کا مطالبہ کریں۔"

پاک و ہند کے دوسرے سیاسی حلقوں کے علاوہ احرار حلقوں میں یہ بیان بڑی معنی خیز نظروں سے پڑھا گیا۔ سکھوں کے اس بیان سے تقسیم در تقسیم کا شبہ ہونے لگا۔ چنانچہ احرار نے ورکنگ کمیٹی کا فوری اجلاس طلب کیا۔ جس میں ۲۴ مارچ ۱۹۴۷ء کو لاہور میں جنرل کونسل کا اجلاس منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا ـــــ ہندوستان کے حالات روز و شب بد سے بدتر ہو رہے تھے۔ ملک میں فرقہ دارانہ فساد کی خبریں دلوں میں دبی ہوئی آگ کو ہوا دے رہی تھیں۔ یہ خبریں لندن پہنچیں تو ایوانِ برطانیہ سے ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو ایک اعلان شائع ہوا۔

"عبوری کابینہ میں کوئی سا فرقہ ہے اور کوئی سا نہ رہے
اس سے متعلق ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم خود (برطانیہ) جون ۴۸ء
تک یعنی زیادہ سے زیادہ اٹھارہ ماہ کے اندر ہندوستان سے
اپنا ہاتھ کھینچ لیں گے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں سے رخصت
ہوتے وقت حکومت کسی ایسے ادارے کے سپرد کر سکیں، جو
کابینہ مشن پلان کے مطابق باہمی سمجھوتے سے قائم ہو۔"

برطانیہ کے اس اعلان نے حالات کو مزید پریشان کرنے میں کافی مدد دی۔

ان دنوں ہندوستان بے یار و مددگار تھا، نہ اس کا کوئی وارث اور نہ ہی اس پر کسی کا راج تھا۔ ۲ مارچ کو پنجاب کے وزیر اعلیٰ سر خضر حیات ٹوانہ نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔ ۴ مارچ کو ماسٹر تارا سنگھ نے پنجاب اسمبلی ہال سے باہر کرپان کو بے نیام فضا میں لہراتے ہوئے اعلان کیا۔

"جو مانگے گا پاکستان! اس کو دے دیں گے قبرستان!"

تارا سنگھ کے ان الفاظ کی تائید ہندو راہنماؤں نے کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسی شام امرتسر میں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان خونریز فساد کی ابتدا ہوئی۔ حضرت امیر شریعتؒ اس وقت امرتسر میں موجود تھے۔ حالات کا رخ دیکھ کر محلے کے تمام نوجوانوں کو اپنے گھر میں جمع کیا اور انہیں اپنے گھروں کی حفاظت کے لیے تیار رہنے کی تلقین کی اور خود ان کے ساتھ تمام رات تلوار سے مسلح پہرہ دیتے رہے۔ دوسرے دن بھی ایسا ہی ہوا اور رات بھر محلے والوں کی معیت میں گلوالی گیٹ سے باہر، جس کے قریب ہی سکھوں کا مرکز تھا، پہرہ دار رہے، آخر ۸ مارچ کو امرتسر میں کرفیو لگا دیا گیا۔

تقسیم پنجاب کی مخالفت

سکھوں کے ۱۳ جنوری والے اعلان کے بعد مجلس احرار اپنے اجلاس میں تقسیم پنجاب کی شدت سے مخالفت کر چکی تھی کہ ۹ مارچ کو لاہور بریڈلے ہال میں پنجاب سوشلسٹ پارٹی اور مجلس احرار کا مشترک اجلاس ہوا، جس میں حضرت امیر شریعتؒ نے تقسیم پنجاب کی مخالفت میں دو گھنٹے تک اپنے دلائل دیے اور اپنے

خدشات کا از سرِ نو اظہار کیا، اور مسلم لیگ پر زور دیا کہ وہ پنجاب کی تقسیم کو کسی صورت میں بھی منظور نہ کرے، ورنہ مشرقی پنجاب کا مسلمان تباہ ہو جائے گا۔ آخر وہی ہُوا، جس کا خدشہ تھا۔ پنجاب کے فسادات کی آڑ لے کر کانگرس نے اعلان کیا۔

"پنجاب اور بنگال کی تقسیم ناگزیر ہے۔"

ہندو مہا سبھا اس کے لیے پہلے سے تیار تھی، گو گاندھی جی نے اس اعلان کی مخالفت کی، لیکن واقعات اس قدر تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے کہ نہ حکومت رہی تھی اور نہ لیڈر، دونوں بیکار ہو چکے تھے، ایسی افراتفری کے دور میں ۲۴ مارچ (۱۹۴۷ء) کو لاہور میں مجلس احرار کی جنرل کونسل نے ایک ہزار سے زائد نمائندوں کی موجودگی میں سہ روزہ بحث کے بعد حسب ذیل تاریخی قرار داد منظور کی:۔ ——————

"پنجاب کے حالیہ فسادات میں وحشت و بربریت لوٹ مار، آتش زدگی، قتل و خونریزی وغیرہ جرائم کا سیلاب سا لیے بناہ تیزی کے ساتھ برپا ہونے کا جو آیا اور جس باقاعدگی سے اس خانہ جنگی کو ہوا دینے کے لیے صوبہ کے مقتدر اور ذمہ دار غیر مسلم افراد اور جماعتوں نے اس میں حصہ لیا۔ اس کی روشنی میں مجلس احرار اسلام ہند کی یہ پختہ رائے ہے، کہ یہ انسانیت سوز تصادم برطانوی استعمار کے حالیہ اعلان کا نتیجہ ہے۔ جس میں قطعی طور پر ہندوستان کی زمام اقتدار کو منتقل کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے اور جس کے باعث صوبے کی

غیر مسلم اقلیتوں نے انتقالِ اختیارات سے پیشتر ہی جبر و تزویر سے ایسی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی جس سے سہم کر صوبے کی اکثریت اپنے جائز اور آئینی حق کے استعمال سے قاصر اور مجبور ہو کر رہ جائے، اور صوبے کا اقتدار آسانی کے ساتھ غیر مسلم فسطائی قوتوں کے قبضہ و تصرف میں منتقل ہو سکے، چنانچہ خضر وزارت کے مستعفی ہونے کے فوراً بعد ڈاکٹر گوپی چند بھارگو سردار پرتاپ سنگھ کیروں ممبر کانگریس ورکنگ کمیٹی، چودھری کرشن گوپال دت، چودھری لہری سنگھ، سیٹھ سدرشن اور مسٹر یشپال خازن پنجاب کانگریس کمیٹی جیسے کانگرسی رہنماؤں نے قومیتِ متحدہ کے بلند بانگ دعویٰ کو پسِ پشت ڈال کر ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ جیسے اکالی رہنماؤں سے گٹھ جوڑ کیا، اور لنگر لنگوٹ کس کر یہ اعلان کرتے ہوئے نہ شرمائے، کہ ہم ہر قیمت پر صوبہ میں مسلم اکثریت کو اُس کے جائز حق سے محروم رکھیں گے، خواہ اس سے صوبے کے امن اور انسانی جانوں کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ پہنچے۔

واضح رہے کہ یہ صورتحال اضطراری نہیں بلکہ پہلے سے طے شدہ سکیموں اور سازشوں کا بدیہی ردِ عمل ہے جس کا علم ملک کو پہلے پہل اُس وقت ہوا تھا، جب ماسٹر تارا سنگھ نے گورنمنٹ ہند اور برطانوی حکومت کو تسلّی دینے کے لیے ونڈ نامہ

اجیت" کے "کانتی دھر نمبر" میں مورخہ ۱۰ جنوری ۱۹۴۵ء کو ایک توضیحی مضمون اپنے نام سے چھپوایا تھا، اس سے ایک طرف تو ماسٹر صاحب کا مقصد یہ تھا کہ اُن کی پارٹی کے متعلق انگریز دشمنی کے الزامات کی تردید ہو جائے، اور ساتھ ہی ہندو فسطائیت کو یہ یقین دلایا جائے کہ اکالی سُورماؤں نے مہاراجہ پٹیالہ کی امداد سے سکھوں کو بندوقوں وغیرہ سے مسلح کر لیا ہے، تاکہ انگریز کے مُلک چھوڑنے پر پنجاب سے مسلمانوں کو بھی زبردستی بے دخل کر دیا جائے۔ دُوسری طرف ہندو فسطائیت کے عزائم کا ذمہ دارانہ اعلان اُس وقت ہوا جب میرٹھ کانگرس کے مشترک پلیٹ فارم سے بہار، گڑھ مکتیشر، کلکتہ اور نواکھلی کے انسانیت سوز فسادات کے سلسلے میں ایک طرف تو راشٹریہ سیوک سنگھ کی بہیمانہ کارروائیوں پر پردہ ڈالنے کے لیے صدر کانگرس نے عائد کردہ الزامات کو مذاق میں اُڑا دیا اور دوسری طرف کانگرس کے نفس ناطقہ سردار پٹیل نے فسطائی گرجے میں اعلان کیا کہ مخالفین کو تلوار کا جواب تلوار سے دیا جائے گا، جس کے بعد مُلک کے ایک سرے سے لے کر دُوسرے سرے تک اکالی سیناؤں اور راشٹریہ سیوادل کی تنظیم کا کام باقاعدگی کے ساتھ شروع کر دیا گیا۔

(مجلس عاملہ کی رائے میں پنجاب کے حالیہ فسادات بھی

اسی غیر مسلم فسطائی سازش کا قدرتی نتیجہ ہیں، جس کا مقصد محض غیر مسلم اقتدار کو بہر حال ملک پر مسلط و قابض کرنا ہے، خواہ اس کے حصول کے لیے جنگ کے ہولناک سیلاب ہی سے گزرنا پڑے۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال کو کوئی بھی ذمہ دار جماعت جسے ملک میں آبرومندانہ اور منصفانہ زندگی بسر کرنی ہو کبھی برداشت نہیں کر سکتی۔

مجلس احرار اسلام ہمیشہ سے ملت کی سربلندی اور آزادئ وطن کی حامی رہی ہے، اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی قربانی اور آبرومندانہ اشتراک و تعاون کی داعی چلی آئی ہے۔ اب جبکہ حکومت کے انتقالِ اقتدار کے اعلان سے غیر مسلم فسطائی قوتیں کانگرس کی مشترک وطنی روایات و پالیسی کو نظرانداز کرتے ہوئے اس کے اندر اور باہر حصولِ اقتدار کے لیے عریاں طریقے پر برسرِکار نظر آتی ہیں۔ مجلس عاملہ تمام مسلم جماعتوں کو توجہ دلاتی ہے کہ وہ اس نہایت نازک مرحلے پر سیاسی اختلافات کو نظرانداز کرتے ہوئے مشترک دشمن کی جارحانہ سرگرمیوں کے مقابلے کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک دوسرے کے قریب ہوں تاکہ ملتِ مسلمہ کے ننگ و ناموس اور مستقبل کی حفاظت کی جا سکے۔

مجلسِ عاملہ کو اگرچہ پنجاب کے حالیہ فسادات میں انسانی مال و جان کے اتلاف کا دلی رنج ہے جس کی تلافی عرصہ تک نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی مجلس عاملہ اُن مسلم و غیر مسلم افراد کا شکریہ ادا کرنا اپنا

فرض سمجھتی ہے جنہوں نے سفاکی اور بربریت کے اس دور میں جب انسان، انسانیت کے دائرے کو تار تار کر چکا تھا، حق ہمسائگی اور انسانی اخلاق کو سربلند رکھا اور عورتوں، بچوں اور اُن کے متعلقین کو پناہیں دیں۔

(مجلسِ احرار اسلام کی مجلس عاملہ جملہ رضاکاران احرار اور کارکنان و ہمدردانِ احرار کو بھی مُبارکباد دیتی ہے کہ انہوں نے ہر جگہ امن کی بحالی اور مظلومین کی خدمت کے فرائض تا بحدِ امکان ہر قسم کے خطرات اور حوصلہ شکن واقعات کے باوجود جوانمردی کے ساتھ ادا کیا، اور مجلس توقع رکھتی ہے کہ اس نیک کام کو زیادہ سے زیادہ تیزی کے ساتھ جاری رکھیں گے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں یہ بھی واضح کر دینا چاہتی ہے کہ ملّتِ اسلامیہ ابھی تک خطرے سے محفوظ نہیں ہوئی۔ اس لیے جہاں تک ممکن ہو جیوشِ احرار کی تنظیم میں بیش از بیش سرگرمی کا اظہار کیا جائے، اور اپنی اپنی جگہ دیگر اسلامی جماعتوں سے اشتراک و تعاون سے اس نیک مقصد کے حصول کے لیے کوششیں جاری رکھیں۔ واضح رہے کہ ابتلاؤ آزمائش کے اس نازک ترین دور میں ملّتِ اسلامیہ کی حفاظت ہمارا اوّلین فرض ہے جس کی بجا آوری کے لیے سیاسی اختلافات بہر نوع سدِّ راہ نہیں بننے چاہئیں۔")

عطاء اللہ شاہ شہید کر دیے گئے

ایک طرف برطانیہ ہندوستان کو آئینی کے ذریعے اس کے حقوق منتقل کر رہا تھا، تو دوسری طرف غیر آئینی سرگرمیاں اس قدر تیز ہو چکی تھیں کہ انسان انسانیت سے ماوراء ہو کر ایسی حرکتوں پر اُتر آیا تھا کہ خون انسانی کی ارزانی سے انسانیت کا دامن ہمیشہ کے لیے داغدار ہو کر رہ گیا۔ اس ہنگامی دور میں وائسرائے لارڈ ویول کی ناکامی کے بعد ۲۲ مارچ ۱۹۴۷ء کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے بطور وائسرائے اپنے عہدے کا چارج لیا، اور ساتھ ہی واقعات تیزی کے ساتھ آگے بڑھنے لگے۔

امیر شریعتؒ ان دنوں اپنے بال بچوں سمیت لاہور میں قیام پذیر تھے۔ مشرقی پنجاب سے اُجڑ کر آنے والے لوگوں کی خون آشام داستانیں سن کر اس قدر رنجیدہ دل ہو گئے تھے کہ تمام دن دفتر میں خاموش بیٹھے رہتے، نہ کسی سے بات کرتے، کوئی مشورہ دیتے۔

جو آدمی اپنے وجود میں خود ایک انجمن تھا، جس کی مسکراہٹوں سے بہار کا جوبن بکھرتا رہا، جس کے ایک بول پر سینکڑوں خاموشیاں رقص کناں تھیں انسان کے بگڑے ہوئے چلن نے آج اُسے پتھر کی تصویر بنا دیا تھا۔

اپریل اور مئی کے مہینے اسی پُر آشوب طریق سے گذرے کہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو متحدہ ہندوستان میں برطانیہ کے آخری نمائندے لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے لیگی اور کانگرسی رہنماؤں کے مشورے پر حکومت برطانیہ کا وہ تاریخی اعلان کیا

جس کی رُو سے برصغیر کو دو حصّوں میں تقسیم کر دیا گیا، اور ساتھ ہی پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر بھی اپنی مہر ثبت کر دی، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں اور ہندوؤں نے وہاں کی اقلیتی آبادی کا قتلِ عام شروع کر دیا۔ انہی دنوں ۱۴ اگست کو امرتسر کے اہلِ حدیث رہنما مولوی ثناء اللہ کے لڑکے مولوی عطاء اللہ کو ہندوؤں نے اپنے محلّہ میں گولی مار کر شہید کر دیا لیکن اخبارات میں یہ خبر چھپی، کہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کو امرتسر میں شہید کر دیا گیا۔ اس خبر نے پنجاب اور سارے متحدہ ہندوستان کو پریشان کر دیا۔ چنانچہ چنیوٹ کے ملک اللہ دِتہ بلوچ نے اس خبر کی تصدیق کے لیے اپنے ایک عزیز کو لاہور بھیجا۔ جیسے ہی اُس نے شاہ جی کو دفتر میں سلامت پایا، وہ باغ باغ ہو گیا، اور اُس نے دوستوں کی تسلّی کے لیے امیرِ شریعتؒ کے ہاتھ کی تحریر چاہی۔ آخر امیرِ شریعت نے بڑے اصرار کے بعد ۲۰ اگست کو ملک اللہ دِتہ کے نام حسبِ ذیل خط تحریر کیا:

لاہور۔ ۲۰ اگست ۱۹۴۷ء

عزیزانِ من نذر محمد و ملک اللہ دِتہ!

السلام علیکم۔ مَیں اپنے اہل و عیال اور دوستوں سمیت خیریت سے ہوں، مارچ کے مہینے سے لاہور میں ہوں۔ اب خان گڑھ ضلع مظفر گڑھ میں نواب نصر اللہ خان کے یہاں چلا جاؤں گا۔ ارادہ کر لیا ہے۔

امرتسر بالکل تباہ ہو چکا ہے، اور آئندہ مسلمانوں کے وہاں آباد ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس وقت ایک

لاکھ کے قریب مسلمان لاہور پہنچ چکا ہے، اور اب فیروز پور، ہشیار پور وغیرہ کی آمد شروع ہو گئی ہے۔ مشرقی پنجاب کا مسلمان اس وقت تباہ ہو چکا ہے، باقی ہو رہا ہے۔

سکھ قوم کی خباثت کو انگریز کی اور ہندو کی تائید حاصل ہے، اور وہ تباہی مچا رہی ہے۔ اور نہ جانے کب تک یہ سلسلہ باقی رہے۔

میرا ایک مکان خاک میں مل چکا ہے، دوسرا جس میں میں رہتا تھا، ابھی تک تو موجود ہے۔ میری زندگی کی ساری کمائی یعنی میری کتابیں اور سامانِ زندگی وہیں ہے، اللہ کے حوالے ہے ابھی تک کوئی صورت سامان برآمد کرنے کی نظر نہیں آتی۔ پہلے بھی فقیر ہی تھا، لیکن اب سر چھپانے کی جگہ بھی نہیں ہے، دعائے خیر سے یاد کریں۔ ملکی حالات اتنے خراب اور اتنے خطرناک اور ہیبت ناک ہیں کہ ان سطروں میں بیان نہیں ہو سکتے۔ میں انشاء اللہ تعالیٰ کل کراچی میل سے ملتان کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔

زندگی رہی تو آئندہ ملاقات پر باتیں ہوں گی۔ والسلام

دوستوں اور عزیزوں کو سلام و دعا۔

سید عطاء اللہ شاہ

مندرجہ بالا خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ امیر شریعتؒ تقسیمِ ملک کے بعد رونما ہونے والے واقعات سے کس قدر متاثر تھے۔ حالات نے انہیں اس حد تک

رقیق القلب کردیا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر آنسوؤں کی جھڑی باندھ دیتے۔ اپنے علمی اثاثے کے ضائع ہونے کا تو انہیں زندگی بھر احساس رہا۔ جب کبھی علمی مسائل پر بحث چھڑتی تو فوراً اُن کا ذہن اپنی امرتسر ضائع ہو جانے والی لائبریری پر جاتا اور ساتھ ہی سرد آہ بھر کر خاموش ہو جاتے۔

اچھی کتاب اور بہترین رفیق دورِ رواں میں کہاں ملتے ہیں۔ زندگی میں ان کا بچھڑ جانا موت سے زیادہ وزنی ہوتا ہے۔ بشرطیکہ پہلو میں حساس دل ہو۔

۱۹۴۷ء کے انسانیت سوز واقعات نے زندگی کی تمام عبادت کو اس بُری طرح پریشان کیا کہ امیرِ شریعتؒ جیسے خوددار انسان بھی دل و نظر پر قابو نہ رکھ سکے۔

عورت کی عظمت بھی مذہب کے تقدس سے وابستہ ہے جب انسان نے مذہب کی دیواروں پر کھڑے ہو کر عورت کا نیلام شروع کر دیا، تو مذہب کی پاکیزگی کیوں کر محفوظ رہ سکتی ہے۔ سال ۱۹۴۷ء میں انسان نے اپنی ضرورت کے لیے جن نقشوں کو آدمی کے لہو سے خوبصورت بنانا چاہا۔ انہیں نقشوں کی لکیروں پر سے انسان کے اپنے پھسلنے کا احتمال بھی تھا، ایسی ناپائیدار عمارت کی خوبصورتی نگاہوں کو سکون تو دے سکتی ہے مگر دِلوں کی تسلی نہیں کر سکتی۔

امیرِ شریعتؒ جس نے زندگی بھر عظمتِ آدم کا احترام کیا تھا، جب وقت کے اس موڑ پر پہنچے، تو آپے سے باہر ہو کر کہہ اُٹھے سہ

تُو نے یہ کیا غضب کیا، مجھ کو بھی رُسوا کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

خان گڑھ میں قیام

مارچ سے جولائی ۱۹۴۷ء تک امیر شریعتؒ لاہور میں رہے اور اگست کے آخری ہفتے بچوں سمیت ضلع مظفر گڑھ کے ایک گاؤں خان گڑھ چلے گئے۔ اس علاقے کے رئیس نواب زادہ نصر اللہ خان ان دنوں آل انڈیا مجلسِ احرار کے ناظم اعلیٰ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت کچھ دے رکھا ہے۔ امیر شریعتؒ کے میزبان تھے۔ آموں کے باغات جو اس ضلع کی خصوصیت ہیں۔ امیر شریعتؒ کے لیے اپنی تمام بہاریں لے کر حاضر تھے۔ گھر کا سا ماحول، شب و روز خدام کی حاضری نے گو امیر شریعتؒ سے اجنبیت چھین لی تھی، لیکن دل کا سکون یہاں بھی بیگانہ رہا۔ یہیں سے ۲۴ دسمبر ۴۷ء کو صدر مجلسِ احرار کے نام امیر شریعتؒ نے حسب ذیل تاریخی خط لکھا جس کی بنا پر مجلسِ احرار کی آئندہ پالیسی وضع کی گئی: ——

خان گڑھ - ۲۴ دسمبر ۴۷ء ۱۹

برادر محترم ماسٹر جیؒ! السلام علیکم

ملتان کی میٹنگ میں حالات کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا۔ اس کے بعد بیماری آہستہ آہستہ بڑھتی گئی، اور آخر غالب آ گئی۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس وقت نشست و برخاست بھی آسانی سے نہیں کر سکتا۔ تفصیل کیا لکھوں کیا گزری؟ پہلے محسنؒ اور بہن سلمہم بیمار ہو گئے اور ایک وقت ایسا بھی آ گیا کہ ہم محسن سے تھوڑی دیر کے لیے

ہاتھ دھو بیٹھے، خیر اللہ تعالیٰ نے کرم کیا، اب اس کی حالت اچھی ہے، لیکن ہمیں بہت کمزور ہے اور بخار میں مبتلا ہے۔ رات ننھی سا لگ سخت بخار میں تھی۔

یہ ہے میرا مختصر سا حال، اس وقت میں اپنے بچوں کی خدمت کے قابل بھی نہیں اور گھر میں کوئی دوسرا شخص بھی نہیں جو پرسش احوال کر سکے۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی سہارا نہیں۔ حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

ملتان میں آپ کے اجلاس کو کامیاب دیکھنا چاہتا ہوں چند باتیں لکھ دیتا ہوں، اگر احباب کو پسند ہوں تو بہتر ہے۔

ا: لیگ سے ہماری سیاسی کشمکش ختم ہو چکی اور الیکشن کے ساتھ ہی ختم ہو چکی تھی۔ اس وقت لیگ قوت حاکمہ ہے مسلمانوں نے اسے بنایا اور قبول کر لیا ہے۔ پاکستان نہ صرف مسلم لیگ کا بلکہ کانگرس کا تقسیم پنجاب کے اضافے کے ساتھ تسلیم کردہ معاملہ ہے جس پر "حضور برطانیہ" کی مہر ثبت ہے۔ اس میں صرف مسلم لیگ کو ہدف ملامت بنانا آئین شرافت سے بعید ہے۔ اگر اچھا کیا تو کانگرس اور لیگ دونوں نے، اگر برا کیا تو دونوں نے اب پاکستان بن چکا اور تقسیم پنجاب کو کانگرس نے پیش کر کے مسلمانوں سے پاکستان کی بہت بڑی قیمت ادا کرائی، اور کرا رہی ہے۔ ابھی نہ جانے کب تک مسلمانوں کو سود در سود ادا کرنا

پڑھے گا۔

میری آخری رائے اب یہی ہے کہ ہر مسلمان کو پاکستان کی فلاح و بہبود کی راہیں سوچنی چاہییں، اور اس کے لئے عملی قدم اٹھانا چاہیئے مجلس احرار کو ہر نیک کام میں حکومت پاکستان کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے، اور خلاف شرع کام سے اجتناب، اصلاح احوال کے لیے ایک دوسرے سے مل کر "الدین نصیحۃ"

پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ یہ ارشاد ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا۔

۲۔ مجلس کا قیام و بقا بہر حال ایک شرعی امر ہے۔ تبلیغ اعتقاد صحیحہ اور تنقید رسومات قبیحہ، اعلائے کلمۃ الحق، اعلان و بیان ختم نبوت و اظہار فضائل صحابہ و اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین مجلس کے فرائض میں سے ہیں خصوصاً اس دور لادینی میں جنس انسانی کی تمام مشکلات کے لئے شریعت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ہی بطور حل پیش کرنا ہمارا وہ فریضہ ہے کہ اگر ہمیں دار و رسن تک بھی رسائی ہو جائے تو الحمد للہ —

اس لئے مجلس کے قیام بقا کی بہر حال کوشش رہنی چاہیئے۔

اگر دوستوں کو یہ باتیں معقول و مدلل نظر آئیں، تو ان بنیادوں پر آئندہ زندگی کی عمارت استوار کریں، ورنہ جیسے اُن کی

---

[1] ماسٹر تاج الدین انصاری جو اُن دنوں مجلس مرکزیہ کے صدر تھے۔ [2] امیر شریعت کے بڑے سے چھوٹے صاحبزادے۔ [3] سب سے چھوٹے صاحبزادے۔ [4] سب سے چھوٹی صاحبزادی۔

مرضی، میں کسی کی راہ میں حائل نہیں، اب میں تھک گیا ہوں
ورنہ مفصل بھی لکھ سکتا تھا۔ غریب الدیار

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

بچّی کی وفات

انسان اور مصائب کے رشتے پر سے صدیاں گذر چکی ہیں، کبھی انسان غالب آجاتا ہے، کبھی مصائب انسان کو زیر کر لیتے ہیں، لیکن دونوں کے تعلقات میں بال برابر خلیج حائل نہیں ہوتی۔

امیر شریعتؒ عوام کی کہانیاں سُنتے سُنتے خود مصائب کا پہاڑ بن کر رہ گئے، اُجڑے ہوئے دلوں پر غموں کا رین بسیرا، مسکراتی ہوئی آنکھوں میں آنسو، سُرخ و سپید چہرے پر موت کے دھبے۔ امیر شریعتؒ کا ان دنوں ایسا ہی حال تھا کہ ۷ر فروری ۱۹۴۸ء کو عزیزی سالمہ کا انتقال ہو گیا۔ معصوم بچّی جو غم کی اندھیری رات میں گھر کا چراغ اور سوگوار دلوں کا کھلونا تھی، اس کی موت نے سارے گاؤں میں صفِ ماتم بچھا دی۔

ننھی سالمہ اس اعتبار سے خوش نصیب رہی کہ باپ اس کے جنازے میں شریک تھا، ورنہ اس سے قبل امیر شریعتؒ کی دو بچیاں فوت ہوئیں تو وہ جیلخانوں میں تھے۔

پاکستان ۱۹۴۸ء

برصغیر کی غلامی کا آخری سورج جب اپنی پہنائیوں میں غروب ہوا

تو ہندوستان تقسیم ہوچکا تھا، ایک ہی دھرتی کی کوکھ سے جنم لینے والے لاڈلے بیٹوں نے اپنی آشناؤں کے لئے ماں کو دو حصوں میں بانٹ لیا —— آہ! انسان کتنا خود غرض ہے۔

آسمان نے یہ سارا تماشہ دیکھا، زمین کے ذرات انسانی گناہوں سے لرزہ براندام ہوگئے، لیکن خلافتِ ارضی کا وارث تختِ شاہی کی طلب میں ایسا کھویا کہ دامنِ یزداں کی بجائے اشارۂ ابلیس پر رقص کرنے لگا، اور اسی طرح ۱۹۴۸ء اپنے جلو میں گذشتہ سال کی خوں آشام تاریخ لے کر نمودار ہوا، تو شفق اپنے دامن سے خون نچوڑ رہا تھا، انسانوں کی بے گور و کفن لاشوں نے درندوں کو بھوک سے بے نیاز کر دیا۔ انسانیت حیران تھی کہ شاید انسان سے انسان کے انتقام کا یہ آخری سال ہو، مگر نہیں ؎

یہ کہہ رہی ہے پلٹ کر نگاہِ یار ابھی!
زمانہ اور بھی بدلے گا ایک بار ابھی!

امیرِ شریعتؒ ۱۹۲۱ء میں برطانوی سامراج سے اپنے وطن کو آزاد کرانے کے لیے جذبات کا ایک الاؤ سینے میں لے کر نکلے تھے، ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب یہ مُراد بر آئی تو جوانی کے ساتھ ساتھ جذبات کی آگ بھی دھواں دے رہی تھی، وہ جس پودے کو خون کی آبیاری سے ثمر آور دیکھنا چاہتے تھے، جب اس پر بہار آئی تو اُسے کانٹوں نے گھیر ا ہوا تھا۔ بادِ نسیم مُنہ تکتی رہ گئی، مگر بادِ سموم کے تیز جھونکوں نے گل بوٹوں کی تمام پتیاں خزاں کے حوالے کر دیں۔

اس سال امیرِ شریعتؒ اپنی عمر کے ستاونؔ برس گزار رہے تھے، ہمت

جواب دے چکی تھی، دانت ساتھ چھوڑ گئے تھے، چہرے پر عمر رفتہ کی پگڈنڈیاں گذرے ہوئے وقتوں کو پکار رہی تھیں۔ جن آنکھوں میں بلا کی شوخی تھی وہ خشک ندی نالوں کی طرح اُداس دکھائی دیتی تھیں۔ ہاتھوں میں تلوار اور کلہاڑی کی جگہ معمولی چھڑی نے لے لی تھی، آنکھوں پر عینک، خمیدہ کمر کے ساتھ چھڑی کے سہارے امیر شریعتؒ جب بازار سے گذرتے تو یوں لگتا جیسے دیمک کھائی ہوئی گذشتہ ربع صدیؒ کی تاریخ گذر رہی ہے۔

جس کی آواز سے ایوانِ افرنگ میں زلزلہ آجاتا تھا، ۱۹۴۷ء کے حالات نے اُسے اس قدر مضمحل کر دیا کہ وہ پنجاب کے دُور افتادہ گاؤں (خان گڑھ) میں بیٹھا اپنی آواز کو ترس رہا تھا۔

دردِ گُردہ کی تکلیف کا آغاز بھی انہیں دنوں ہوا۔

قریباً ایک سال خان گڑھ میں خاموش رہنے کے بعد اپریل ۱۹۴۸ء کو امیر شریعتؒ رضاکاروں کے اصرار پر ملتان آئے اور جلسۂ عام میں خطاب کرتے ہوئے کہا:

> "میرے بزرگو اور عزیزو! ..... ایک سال کا عرصہ ہو گیا کہ میں نے کسی اجتماع میں تقریر نہیں کی۔ اب بھی خدا شاہد ہے کہ میں بادلِ نخواستہ اُٹھ کر آیا ہوں، اِس ڈر سے کہ رضاکار ناراض نہ ہو جائیں۔ ورنہ قریباً تیس سال سے جو کچھ میں نے آپ سے کہا اگر اسی کو آپ سمجھ لیتے تو کافی تھا۔ لیکن میری تو کوئی سُنتا ہی نہیں۔ میرا تو شکاری کُتّے کا سا حال ہے جو شکار کو دیکھ کر بھونکتا ہے، کیونکہ

وہ جو کچھ اپنی آنکھ سے دیکھتا ہے، اُسی کی آواز لگاتا ہے وہ دندناتا ہے کودتا ہے، بھڑکتا ہے، پھڑکتا ہے کہ شکاری سے لپٹ جاؤں، اور بھونکتا ہے کہ اپنے مالک سے اس کی خبر کردوں۔ اسی طرح میں دیکھ رہا تھا شکار کو، اور تمہارے دروازے پر بھونکا، بس دروازے پر گیا اُسی نے لاٹھی رسید کی، "بے ایمان سونے نہیں دیتا" حالانکہ جو کچھ میں دیکھتا تھا، اُسی کی صدا لگاتا تھا۔

عزیزو! میری صحت خراب ہوگئی ہے، کیونکہ میں نے حسین وجمیل دنیا اُجڑتی دیکھی ہے۔ دلکش و دلفریب دُنیا، اچھی دُنیا بُری دُنیا، معزز بزرگ، معزز بیبیاں عصمت مآب بیٹیاں، سب اُجڑے اور ہم سب کے ساتھ اُجڑے، وہ اُجڑے تو میں بھی اُجڑا، اور سب ایک ساتھ اُجڑے۔ عزیزو! کیا حال بتاؤں! کیسے بتاؤں؟ اگر کسی کا حال مجھ سے بہتر ہو تو بتاؤ؟ اللہ جانے کس پر کیا گزری؟

اس وقت یہاں بہ سزا کے طور پر کھڑا ہوں، رضاکاروں نے مجھے سزا دی ہے، اور میں نے اس سزا کو قبول کرلیا ہے، تقریر کا ارادہ نہ تھا اور نہ ہے۔ بس یونہی دو ایک باتیں کرنے آیا ہوں، صحت تباہ ہوگئی ہے، دراصل ساری بات محسوس کرنے پر ہوتی ہے۔ میں جتنے کو بوڑھا ہوں آپ کے درمیان، مگر فکر کیلئے ویسا ہی توانا، کفر کے لیئے مجھ سا توانا ماں نے آج تک نہیں جنا۔

یہ ضد بھی یہ بیری، اُدھر تم زور آور، اور جب آپ پانا پکڑ کر میدان
میں چھوڑ دیا۔ تم دُعا دو تب بھی خوش، بد دُعا دو تب بھی خوش، پیار کر دو تب بھی خوش۔ ہم تو اُسی میں خوش ہیں جس میں آپ کی خوشی ہے۔ ہماری اپنی تو خوشی رہی ہی نہیں۔ اب تو اپنا یہ کہنا ہے کہ اللہ کو خوش کروں یا نہ کروں، مگر تم کو ناراض نہ کروں۔ تمہارے لیے ہیں اگر جہنم میں چلا گیا تو کیا ہوا، یہ میرے جانے سے تم تو خوش رہنے ہو نا۔ بھئی! یہ سیدھی سی بات ہے کہ اگر ایک شخص کے جہنم جانے سے قوم یا ملت بچ جائے تو ایسا کام سبحان اللہ! ہم یہ سمجھیں گے کہ یہ بھی تیر سے سیلے کر دیا۔
بیماری کی وجہ سے اور کچھ ایسی یاد کی وجہ سے وہی لتنے، وہی گلیاں، وہی زمانہ، وہی کوچے، وہی باغ و بہار، سب یاد آتے ہیں تو دل بیٹھنے لگتا ہے۔
تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ رضاکاروں کا ڈر تھا جو حاضر ہو گیا ہوں۔ ان کی منتیں کیں کہ بھائی مجھے چھوڑ دو، میں اب نہیں بول سکتا، ممکن ہے کوئی وقت ایسا آجائے کہ میں خود بول اٹھوں مگر انہیں سمجھائے کون؟ جی کی بات ہے، اب وہ بولنے نہیں دیتا۔ تیس ۳۰ سال بولتا رہا ہوں، اب خدا سے دُعا ہے جس نے تیس ۳۰ سال بولنے کی توفیق عطا کی کہ اب نہ بلوائے۔
ابھی جو مولانا غلام غوث اور ماسٹر تاج الدین آپ کے

سامنے کہہ گئے ہیں، مجھے بے چین کرنے کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔
تم (آہ سرد بھر کر) کہہ کر بھی بھول جاتے ہو اور اپنا یہ حال ہے کہ نہ کہا بھولتا ہے اور نہ کسی کا سنا بھولتا ہے۔ اب اس کا کیا جواب؟
کنگھی تو میری جیب میں بھی ہے، جب جی چاہتا ہے، سر میں کر لیتا ہوں۔ گو تم نے سر میں بال نہیں چھوڑے۔ بہت کم رہ گئے ہیں۔
اگر دو چار دن زندہ رہا، اور یہی بدعادت باقی رہی تو انشاءاللہ ایک بال بھی باقی نہیں رہے گا۔ ہاں! (سرد آہ بھر کر) تم جیتے رہو۔ ہمارا کیا پوچھنا میاں، فقیرانہ آئے صدا کر چلے، اور اس کا فیصلہ تو وہاں ہوگا میدانِ قیامت میں، جہاں سیاہ اور سفید چہرے الگ الگ کر دیے جائیں گے۔

بہر حال اب بھی یہ کہوں کہ قرآن کے چار جملے ہیں، مجھے بھی آتا ہے اور وہ تمہیں پسند نہیں۔ جو تم چاہتے ہو وہ میرے پاس نہیں۔ کوئی نئی بات نہیں، وہی ایک بات اسی کتاب کی۔
جسے آجکل کی زبان میں فرسودہ نظام کہا جاتا ہے۔ جسے تم کہتے ہو یہ ہمیں فٹ نہیں آتا، تو یہ نکاح، یہ طلاق، یہ شادی، یہ قربانیاں، یہ مسجد، یہ نماز یہ کیسے فٹ آئیں۔ پھر تو سرے سے چلو کہ یہ بیت اللہ ہی سرے سے فٹ نہیں۔ نہ وجودِ باری تعالیٰ ہے نہ کوئی نبی ہے، نہ وحی ہے، نہ نزولِ وحی ہے۔ آنا ہے تو یوں سیدھے آؤ، یہ منافقت نہ کرو۔"

درمیان میں کسی نے امیر شریعت کا نعرہ لگایا۔

"دیکھئے بھائی! میری تقریر میں اس قسم کے نعرے نہ لگایئے
میں دونوں سے بے نیاز ہو چکا ہوں۔ مردہ باد کے قابل ہوں
نہ زندہ باد کے لائق۔ مجھے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ قبرستان میں
اذانیں دے رہا ہوں۔ میں اضطراری طور پر چپ نہیں ہوں
سوچ سمجھ کر چپ تھا۔ تیس سال چیختا رہا ہوں۔ اب آرزو ہے کہ
نہ بولوں۔ جس پر خدا نے اپنا انتخاب کیا ہے جی چاہتا ہے
چپ رہوں۔

میں تو صرف نوجوانوں کی دلداری کے لیے آیا ہوں ___
نہ ورکنگ کمیٹی کے دباؤ سے نہ ماسٹر صاحب کے کہنے پر، بلکہ
اُن رضا کاروں کے دباؤ سے جنہیں مجھ سے محبت ہے۔"

حضرت امیر شریعتؒ کی یہ تقریر رات ڈیڑھ بجے تک جاری رہی۔ عوام اور خواص زار و قطار
رو رہے تھے۔

نفاذ شریعت کانفرنس

پاکستان کی بنیاد کے ساتھ ہی علماء نے دین پسند طبقہ کو مجتمع کرنے کے لیے
پشاور میں ۳، ۴ ستمبر ۱۹۴۸ء کو نفاذ شریعت منعقد کرنے کا فیصلہ کیا۔

گھریلو پریشانیوں اور اپنی مسلسل بیماری کے باوجود امیر شریعت سرحدی علماء
کے فیصلے پر پھول چڑھا کر سفر کی تیاریاں شروع کیں۔ اسی سلسلے میں سرحد کے متعدد رہنما

پیر مانکی شریف، قائد اعظم کے پاس کراچی پہنچے، اور ان سے تحریری وعدہ لیا کہ پاکستان کا آئندہ نظام حکومت اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ہوگا۔ ان دنوں سرحد میں عبدالقیوم خان کی حکومت تھی۔ کانفرنس کی تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں کہ حکومت نے دفعہ ۱۴۴ کے ذریعے کانفرنس کو خلافِ قانون قرار دیدیا۔ اس کے نتیجہ میں دین پسند لوگوں کو بہر حال تعجب ہوا۔ مگر اس کے نتیجہ میں پیر مانکی شریف مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر عوامی لیگ میں شامل ہو گئے۔

ملتان میں قیام

ملک کے سیاسی حالات ہنوز ابتر تھے، عوام اقتصادی لحاظ سے کمزور سے کمزور تر ہوتے جا رہے تھے۔ ہر آدمی خانگی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ نوزائیدہ مملکت کی سرحدیں غیر محفوظ تھیں۔ اُس زمانے میں عوام سے نہ تو کوئی بات کہی جا سکتی تھی، اور نہ ہی عوام اس کے لیے تیار تھے۔ ملک کی سیاسی جماعتیں وقتی طور پر اپنا وجود ختم کر چکی تھیں۔ پھر وہ لوگ، جن کی زندگی خزاں کے خشک پتے کی طرح آوارہ ہو رہی تھی اُس بازار میں کیونکر آتے، جہاں ہر دوکان پر جنسِ انسانی کوڑیوں کے مول تُل رہی ہو۔

امیر شریعت بھی زندگی کی سنگلاخ وادیوں سے گزر کر آئے تھے، اُن کے آگے بڑھا جن راہوں کو اپنے خون سے سیراب کر چکے تھے وہ راہیں ہنوز تشنہ تھیں لیکن سانپ زمانہ ابن انقلابی راہوں میں لگنے آلاپ رہا تھا، سالار کارواں کے پاس اتنی مہلت کہاں تھی کہ جرس کارواں کو چھوڑ کر غبار کارواں پر توجہ دیتا۔

۱۹۴۸ء کے آخر میں خان گڑھ چھوڑ کر امیر شریعت ملتان کے ایک گمنام محلہ (ڈپٹی شیر خان) میں تیس ۳۰ روپے ماہوار کرایہ کے مکان میں آ بیٹھے اور گوشہ نشینی کا فیصلہ کر لیا، لیکن جماعت کے مستقبل کی پوزیشن ہنوز واضح نہیں تھی، اور وقت کا تقاضہ بھی تھا کہ بہار آنے پر گل و گلچیں سے کیونکر برتاؤ کیا جاتے؟ صبا سے ہمارے راہ و رسم کن طور و اطوار سے ہوں؟ نسیم صبحگاہی سے اٹھکیلیاں ہوں تو کس طرح؟ اور اگر کبھی کبھار بادِ سموم چمن اُجاڑنے لگے تو آشیانوں کا دفاع کس دامن کی اوٹ میں بیٹھ کر ہو؟ ——

۱۹۴۹ء

خزاں پر سے کتنے موسم گزرتے ہیں کہ بہار آتی ہے؛ رات بھر نہ جانے کتنے ستاروں کا خون ہوتا ہے کہ صبح نمودار ہوتی ہے۔ جماعتوں کی تشکیل کا بھی یہی قانون ہے، ارادے باندھ کر کئی بار توڑنے پڑتے ہیں، دل و دماغ کو ہم آہنگ کرنے میں آنکھوں کو ساون بھادوں کی طرح کئی بار برسنا پڑتا ہے، پھر کہیں جاکر یہ کھیتی سیراب ہوتی ہے ؎

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مجلس احرار کا آخری سیاسی اجلاس

مجلس احرار نے ۱۹۲۹ء میں جنم لیا تو یہ غیر ملکی سامراج کے خلاف ایک

نیا محاذ تھا۔ اور ۱۹۴۹ء کے آفتاب نے احرار کی سیاسی زندگی پر جب اپنے سائے ڈالے تو وقت مقتضی تھا کہ سامراج کا سورج غروب ہو چکا ہے، غلامی کی کڑیاں ٹوٹ کر گر چکی ہیں، فرنگی اپنی بساط لپیٹ کر سمندر پار جا چکا ہے۔ نیز وہ بادل چھٹ چکے، جن کے دامن میں بجلیاں پرورش پا رہی تھیں۔

احرار رہنماؤں نے امیر شریعتؒ کو مجبور کیا کہ وہ نئی مملکت میں نئے زاویوں سے چلنے کی راہ سجھائیں، حالانکہ وہ ۲۴ ستمبر ۱۹۴۷ء کے اپنے خطبہ میں فیصلہ دے چکے تھے تاہم پارٹی نے انہیں مجبور کیا کہ وہ عوام میں آکر اعلان کریں۔ چنانچہ ۱۲-۱۳-۱۴ جنوری ۱۹۴۹ء کو لاہور دہلی دروازہ کے میدان میں دفاع احرار کانفرنس کے عنوان پر احرار کا آخری اور تاریخی اجلاس ہوا۔ جس میں قریباً پچاس ہزار احرار کارکن اور براہ راست رضاکاروں نے شمولیت کی۔ تقسیم ملک کے بعد احرار کا یہ پہلا اجتماع تھا۔ اس کانفرنس کے آخری اجلاس میں حسب ذیل قرارداد شیخ حسام الدین نے پیش کی:-

"اس حیثیت کے پیش نظر کہ تقسیم ہند کے نتیجے کے طور پر ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود اور مستقبل کی ترقی اور فارغ البالی پاکستان کی قوت اور استحکام ہی میں مضمر ہے۔ نیز بین الاقوامی تسلط حاصل کرنے کے لیے امریکہ اور برطانیہ ایک طرف اور روس دوسری طرف دنیا کے گوشے گوشے میں کمزور اور پسماندہ اقوام کو اپنے اپنے دھڑے میں شامل کرنے کے لیے ہر قسم کی حیلہ جوئی، لالچ اور دباؤ سے انسانیت کو پھر ایک دفعہ ناقابل تصور تباہی اور

ہلاکت کا شکار بنا رہے ہیں۔ بالخصوص جمعیتِ اقوام کے بہشتے میں یہودی وطن کی تخلیق، مشرقِ وسطیٰ اور مشرقِ بعید میں اقتصادی تحفظات کے نام پر ترکی، ایران، عراق، شرقِ اردن، سعودی عرب، فلسطین، یمن، شام، مصر، سوڈان اور انڈونیشیا وغیرہ اسلامی ممالک کی آزادی، امن اور ترقی کو برابر قربان کیا جا رہا ہے۔

سفید فام اقوام نسلی برتری اور سیاسی اجارہ داری کے تحفظ اور بقا کے لیے جس منظم طریق سے انگریزی زبان بولنے والی قوموں اور مغربی یورپی اقوام وغیرہ کے نعروں کے فریب سے اپنے انسانیت سوز عزائم کو پورا کرتے نظر آرہے ہیں۔ یقیناً ملّت اسلامیہ کی سلامتی اور عالمگیری امن کی خواہش رکھنے والے افراد اور گروہ اس صورتِ حال کو خاموشی سے نظر انداز نہیں کر سکتے۔

بنابریں وفاقِ پاکستان احرار کانفرنس کا یہ تاریخی اجلاس اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ ایسے نازک ترین وقت میں اسلامیانِ پاکستان بہت حد تک اس زہر کا تریاق پیدا کر سکتے ہیں، بشرطیکہ ملت کی رہنمائی اور ترقی کے لیے ان کی داخلی سیاست کو ہر قسم کی سیاسی گروہ بندیوں سے آزاد کر کے ایک ہی مشترک پلیٹ فارم کو مضبوط سے مضبوط تر کیا جائے۔ اس سے ایک طرف ملّتِ اسلامیہ کے اندرونی اور بیرونی دشمنوں کی سازشوں کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے وہاں پاکستانیوں میں صحیح اور سنجیدہ غور پیدا کرنے کی راہیں بھی کھُل

جائیں گی، اور کم سے کم مدّت میں قوم میں ضبط و نظم اور خود اعتمادی کی خصوصیات پیدا ہو سکیں گی۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا، کہ مجلس احرار کے مقاصد میں مذہبی سربلندی کے ساتھ ساتھ وطن کی آزادی از بس شامل تھی، جو پاکستان کے قیام کے بعد سیاسی طور پر اب پوری ہو چکی ہے۔ لہٰذا وفاق پاکستان احرار کانفرنس کا یہ اجلاس غیر مبہم الفاظ میں یہ اعلان کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ آئندہ سے مجلس احرار اپنی سعی و عمل کو مسلمانوں کے دینی عقائد و رسوم کو درست رکھنے اور خصوصاً مسئلہ ختم نبوّت کی مرکزی اہمیت کو برقرار رکھنے کے لیے تبلیغی سرگرمیوں تک محدود رکھے گی جو اراکین و ہمدردان احرار زمانۂ حال کے موافق سیاسی خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں وہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنے روائتی اخلاص اور عملی انہماک سے ملک و ملّت کی خدمت میں حصّہ دار بن سکتے ہیں"

اس قرارداد کی تائید کرنے سے پیشتر حضرت امیر شریعت نے جیوش مجلس احرار کے عہدے داروں کو انعام میں تلواریں اور تمغے دیے۔ ان اہم ذمّہ داریوں سے فارغ ہو کر امیر شریعت نے اپنی تقریر کا آغاز ایک فارسی کے شعر سے کیا، اور پھر ایک واقعہ دہرایا کہ دہلی میں ایک مجذوب چتلی قبر کے آس پاس اکثر یہ مصرعہ دہرایا کرتا تھا۔ ؎

اس لیے مجھ کو تڑپنے کی تمنّا کم ہے

نتیجے اس کے پیچھے شور مچاتے "کس لیے" مگر وہ دوسرا مصرعہ زبان پر نہ لاتا۔ لوگ اُسے تنگ کرتے، چھیڑتے، مگر وہ صرف یہی کہتا "اس لیے مجھ کو تڑپنے کی تمنا کم ہے"۔ ایک روز کچھ نوجوانوں نے اُسے گھیر لیا اور مجبور کر دیا کہ وہ دوسرا مصرعہ بھی سنائے۔ عاجز آ کر اُس فقیر نے کہا، ؎

وسعتِ دل ہے بہت وسعتِ صحرا کم ہے
اس لیے مجھ کو تڑپنے کی تمنا کم ہے

یہ کہا اور وہ ایک آہ کے ساتھ سرد ہو کر رہ گیا۔

امیرِ شریعتؒ نے فرمایا "مجھ سے دل کی بات نہ پوچھو۔ میں اپنے دل کی کہنے نہیں آیا، تمہارے دلوں کی کہنے آیا ہوں۔

بزرگانِ ملت! برادرانِ عزیز! کافی عرصہ کے بعد آپ حضرات کی خدمت میں مجھے کچھ گزارشات پیش کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ میں ناتوان ہوں، وہ نہیں جو آج سے دو یا چار برس پہلے تھا، اس لیے میری گزارش ہے کہ آپ حضرات اپنی خاموشی سے میری مدد کریں۔ میں زیادہ دیر تک آپ حضرات کا وقت نہیں لوں گا۔ میں آپ سے چند ضروری باتیں کہنا چاہتا ہوں۔ اس وقت گردوپیش میں جو تاریک بادل چھائے ہوئے ہیں، نہ آپ اُن سے بے خبر ہیں اور نہ میں۔ انہیں حالات نے مجبور کیا ہے کہ میں آپ کے سامنے آؤں ـــ جو میں کہنا چاہتا ہوں وہ کوئی نئی بات نہیں، بلکہ آج سے کافی عرصہ پہلے یعنی ۲۴ دسمبر ۱۹۴۷ء کو مجمل طور پر ایک تحریر نے

ذریعے میں نے جماعت کو اپنا پیغام بھیج دیا تھا جو طبع شدہ ہے۔

دسمبر کے آخر میں جب طوفانی حوادث ختم ہو چکا تو لاہور میں ہماری جماعت کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں اُس وقت بستر مرگ پر تھا، مسلسل تین ماہ سے بیمار تھا، اور میرے بچنے کی بہت کم اُمید تھی، تو اُس وقت میں نے اپنے دو عزیزوں نوابزادہ نصراللہ خان اور سردار محمد شفیع کی معرفت ماسٹر تاج الدین انصاری کی خدمت میں یہ خط بھیجا تھا۔

مسلم لیگ سے ہمارا اختلاف صرف یہ تھا کہ ملک کا نقشہ کس طرح بنے۔ یہ نہیں کہ ملک نہ بنے بلکہ یہ کہ اس کا نقشہ کیونکر ہو یہ کوئی بنیادی اختلاف نہیں تھا، نہ حلال و حرام کا، نہ گناہ و ثواب کا، اور نہ مذہب کا۔ وہ تو ایک نظریے کا اختلاف تھا، ہم چاہتے تھے کہ پورے چھ صوبے ملیں اور مسلم لیگ بھی چاہتی تھی، ہمارا اختلاف صرف مرکز کی علیحدگی پر تھا۔

مسلم لیگ بھی فرقہ وارانہ جماعت تھی اور مجلس احرار بھی، مسلم لیگ میں بھی کوئی غیر مسلم شامل نہیں ہو سکتا تھا، اور نہ ہو سکتا ہے۔ بس اختلاف تھا تو اتنا کہ ہم کہتے تھے کہ آزادی مل جائے، ذرا سنبھل لیں اور اس کے دس سال بعد مرکز سے بھی علیحدہ ہو جائیں گے، مگر لیگ کہتی تھی کہ نہیں مرکز کے ساتھ ہمارا کوئی الحاق نہیں رہ سکتا۔ وگرنہ تقسیم ملک کے ہم بھی

قائل ہے کہ یہی فساد مولا اب بھی موجود ہے، اس میں تقسیم ملک ہی کا قضیہ درج ہے، ہم پورے چھ صوبوں پر مصر تھے، لیکن کانگرس نے تقسیم در تقسیم کو قبول کیا، اور گاؤں کا فیصلہ کر کے اس کو فتنے بنا دیئے۔

پس، اب ہمارا مسلم لیگ سے کوئی اختلاف نہیں، نہ پہلے ہمارے اور اُن کے درمیان مذہبی اختلاف تھا نہ خدا کا نہ رسُول کا، نہ ہم ولی ہیں نہ لیگ والے قطب، اگر لیگ والے گنہگار ہیں تو ہم کون سے ولی اللہ ہیں۔ ہمارا اور ان کا اختلاف صرف مرکز سے علیحدگی پر تھا اور داغ کے الفاظ میں یوں کہنا چاہیئے۔ ؎

مدتوں سے میری اُن کی قیامت کی ہے تکرار
بات اتنی ہے وہ کل کہتے ہیں میں آج

ہمارا اور لیگ کا اختلاف کوئی کفر اور ایمان کا اختلاف نہ تھا یہ تو بالکل سطحی اختلاف تھا۔

بھائی حسام الدین نے آپ کے سامنے جو قرارداد پیش کی ہے، وہ مجلس احرار کی آئندہ پالیسی کی آئینہ دار ہے، ہم نے اپنی تیس سال کی کمائی حکومت اور مسلم لیگ کے حوالے کر دی ہے۔

ع سپردم بتو مایۂ خویش را

کانگرس کے سب سے بڑے لیڈر گاندھی جی نے کہا تھا کہ ہندوستان کی

تقسیم گائے کے دو ٹکڑوں کے برابر ہے اور میں اسے کبھی قبول نہیں کروں گا، یہ خبر اخبارات میں آئی تو لیگ نے کہا "نہیں، دو ٹکڑے نہیں ہوں گے" اب ہم لیگ کا نام ہی کیوں لیں، یہ مطالبہ اسی، پچاسی فی صد مسلمانوں نے کیا۔

چنانچہ گاندھی جی کی زندگی میں ماونٹ بیٹن کے سامنے پنڈت نہرو اور قائدِ اعظم نے ہندوستان کی تقسیم کو قبول کیا، یعنی کانگرس نے گائے کے دو ٹکڑے کر دیئے، بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کانگرس نے کیا ــــ کون کانگرس؟ نیشنلزم کی مدعی کانگرس، ایک وطن، ایک تہذیب اور ایک ملک کا نعرہ لگانے والی کانگرس، اس کانگرس نے ضلعوں کو بٹوایا۔ گئو ماتا کے دو ٹکڑے ہی نہیں کروائے بلکہ گائے کا قیمہ قیمہ کر کے اس کے کوفتے بنا دیئے۔

(اس موقعہ پر بے انتہا قہقہے بلند ہوئے، تو آپ نے فرمایا)

یہ وقت مذاق کا نہیں نوجوانو! سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرو، زندہ رہنے کے عزائم سوچو اسپاہی رہو۔"

اس موقعہ پر چودھری غلام عباس جنہیں مجلسِ احرار نے اپنے اجلاس میں شامل ہونے کی دعوت دے رکھی تھی، پنڈال میں داخل ہوئے، جوشِ احرار نے اپنے روایتی انداز میں اُن کا استقبال کیا۔ اس دوران "کشمیر ہمارا ہے" کے نعرے بھی بلند ہوتے رہے۔ اس موقعے پر امیر شریعتؒ نے چودھری غلام عباس اور دوسرے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"چوہدری صاحب کی آمد سے بات دوسری طرف چلی گئی،
عزیزو! خدا جانے اب آپ کس کشمیر کو لینے کے ارادے کر رہے
ہیں، یا کس کشمیر کے متعلق سوچتے ہیں؟ ورنہ وہ کشمیر جو ذہنوں میں
جنت کا نشان ہے، جس کے متعلق میری رائے ہے کہ پروردگار عالم
نے آسمانوں پر اپنی موجودگی میں تیار کروا کے اُسے زمین پر اُتار دیا
وہ جنت کا ایک ٹکڑا ہے، جس پر اب نہیں بلکہ ۱۹۳۱ء سے
مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہے، اُس زمانے میں ہم نے اسی کشمیر کے
متعلق مسلمانوں سے بات کہی تھی، لیکن اُس وقت کے رئیس مسلمانوں
نے جن کا دخل فرنگی ایوانوں میں تھا، ہماری بات نہ سُنی، اگر اُس
زمانے میں جب ہم نے چالیس ہزار کے قریب مسلمانوں کو جیل
بھجوایا اور بائیس نوجوانوں نے کشمیر کی آزادی کیلئے جام شہادت
نوش فرمایا تھا، ہماری بات مان لی ہوتی تو آج کشمیر کا نقشہ یہ نہ ہوتا۔
خیر ــــ بہرحال ..... اب آپ بھی سُن لیں اور چوہدری صاحب بھی!
کشمیر تو آپ اپنے ہاتھ سے دے چکے۔ اگر فائر بندی کی بات
نہ ہوتی تو ممکن ہے کوئی بات بن جاتی، مگر اب تو میری بات
لکھ کر جیب میں ڈال لو، فرنگی اور ہندو، اب آپ کو کشمیر نہیں
دینگے۔ ہاں البتہ اگر کبھی فرنگی کو ضرورت ہو کہ وہ اس مستقل فساد کو
ختم کرنا چاہے تو ممکن ہے اس کا کچھ حصہ آپ کے پاس
آجائے۔"

آخر میں آپ نے فرمایا :

"مجلس احرار اب مذہبی اور اصلاحی کاموں میں سرگرم عمل رہے گی مسئلہ ختم نبوت اس کا بنیادی مسئلہ ہے۔ سیاسیات اب ہماری منزل نہیں، وہ جانے اور مسلم لیگ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلم لیگ کے پاس قوت ہے اور ہم اس قوت سے ڈر گئے ہیں، نہیں نہیں! بلکہ ملک کی ضرورت اور حالات کا تقاضہ ہمیں مجبور کرتے ہیں کہ ہم متحد ہو کر بغیر کسی امر ذی خلفشار کے پاکستان کی کوتاہ بنیادوں کی نگہداشت کریں۔ ان الفاظ سے میں اُس قرارداد کی تائید کرتا ہوں"

امیر شریعتؒ کی یہ تقریر رات دو بجے کے قریب ختم ہوئی۔

سیاسیات سے علیحدگی

میدان جنگ کے بعد سیاسی لڑائیاں ہمیشہ فکر و نظر کے تحت لڑی گئیں، کبھی شطرنج پر مُہروں کی اُٹھا پٹک سے اور کبھی افراد کی ذہنی کاوش سے لیکن میدان میں مات کھانے والے لوگ نہ بزدل ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں بزدل کہا جاتا ہے۔

امیر شریعتؒ اور اُن کے رفقا نے زندگی کی بساط پر جو بازی لگائی، وہ اسلحہ کی لڑائی نہیں تھی بلکہ ایک نظریے کی جنگ تھی۔ ایک طرف اقتدار، وہ بھی غیر ملکی، سمندروں کے پانی اور پہاڑوں کی بلندیاں جن کے پاؤں چھوتی تھیں۔ سورج جن کے جلو میں طلوع ہو کر جب شام کو شفق کی پنہائیوں میں غروب ہوتا تو یہاں بھی

برطانوی پرچم کی اُڑا ملیں ہی اُسے پناہ دیتیں اور دوسری طرف یہ درویش منش لوگ، جن سے اپنے بھی ناخوش، جو اپنی تقدیر کے آپ خالق تھے، لیکن ان کی تدبیروں سے شہنشاہوں کے مقدر بنتے اور بگڑتے رہے وہ آواز دیتے تو اقتدار کی زبانیں گنگ ہو جاتیں۔ ان کی رفتار سے کردار کو کئی راہیں ملیں، انہیں غیرملکی راج کے داتوں نے لوہے کی زنجیروں میں جکڑا، پسِ دیوارِ زنداں اُن کے حوصلے توڑنے کی کوششیں کیں، پھانسی کے تختے اُن کے راستے میں بچھائے لیکن مردانِ حُر اپنی منزل سے دُور نہ رہے اور آخر وقت آیا کہ برطانوی سامراج کا سانس اُکھڑ گیا، اور وہ موت کی ایسی گہری غار میں دفن ہوا کہ نشان تک باقی نہ رہا۔

یہ فکر و نظر کی لڑائی کا نتیجہ تھا کہ ان لوگوں کی جیت ہوئی جو ایمان کی قوت سے مسلح تھے، جن کے عزم و ارادوں نے وقت کی سب سے جابر سلطنت سے ٹکرا کر بھی فتح پائی۔

پاکستان دو نظریوں میں اختلاف کی جنگ تھی، نہ کہ مقصد کی جس پر لفظ فتح اور شکست کا اطلاق کیا جائے۔ امیر شریعتؒ اپنے مقصد میں کامیاب نکلے کہ برطانوی پرچم سرنگوں ہو گیا۔ بلاشبہ وقتی طور پر وہ اپنی اسٹیج کی بازی ہار گئے جس کا انہوں نے ۲۴ دسمبر ۱۹۴۶ء کے خطبہ میں اعتراف کیا، لیکن یہ فیصلہ مستقبل کے ہاتھ میں ہے، کہ امیر شریعت کی رائے درست تھی یا ۱۹۴۷ء کا برطانوی آئین۔

۱۴ جنوری کی قرارداد کے بعد امیر شریعتؒ سیاسیات سے کنارہ کش ہو کر ملتان میں گوشہ نشین ہو گئے۔ البتہ کبھی کبھار دیہات کے مذہبی اجتماعات میں شرکت کرتے، وہ بھی بڑے اصرار پر، ورنہ مکان کی مردانہ بیٹھک میں عبادتِ الٰہی میں

مصروف رہتے، ملنے والے بھی آجاتے تو پھر گھنٹوں ادبی محفلیں جمتیں۔ اسی طرح کی ایک محفل میں لاہور کے ایک ایڈووکیٹ بابو عبدالغفور نے امیر شریعتؒ سے سوال کیا۔ "شاہ جی! آج کل سیاست کیسی ہے؟"

جواب میں فرمایا۔

"ریاست میں سیاست کیسی، بابو! اپنے بال بچوں کا پیٹ پال لو، اگر ہو سکے تو نیکی کرتے رہو اور مر جاؤ فرا"

کسی نے پوچھا "شاہ جی! پہلے آپ مسلم لیگ کی مخالفت کرتے تھے اور اب حمایت؟"

فرمایا: "بھائی ان دنوں میں حضرت حسینؓ کی سنت ادا کرتا تھا، اور اب حضرت حسنؓ کی۔"

انہیں دنوں لاہور کے حاجی دین محمد امیر شریعت کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کرائے کا مکان دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے، اور کہا "شاہ جی! اگر آپ چاہیں تو لاہور شاہ باغ میں زمین خرید کر مکان تعمیر کرا دوں"۔ جواب میں فرمایا:

"حاجی صاحب! میرے پاس اتنی رقم کہاں؟"

حاجی صاحب نے کہا "نہیں تو پھر بیس ہزار روپیہ مجھ سے لے لیں، اور جہاں مناسب سمجھیں مکان بنا لیں۔"

امیر شریعتؒ نے مسکرا کر جواب دیا "نہیں حاجی صاحب! شکریہ!"

اسی سال لائل پور کے، ایم ہوزری کے مالک بھی ملتان آئے کہ شاہ جی کے لیے مکان کا انتظام کیا جائے۔ گوجرانوالہ کے دوستوں نے تو زمین بھی خرید لی، لیکن ان سب کو امیر شریعتؒ نے ایک ہی جواب دیا۔

"میں تمام احباب کا ممنون ہوں جو اپنی اپنی جگہ پر میرے لیے رہائش کا انتظام کر رہے ہیں۔ شاید انہیں معلوم نہیں کہ اسی طرح کی کوشش ایک دفعہ نواب بہاولپور نے بھی کی تھی، لیکن اگر میں نے مکان ہی بنانے ہوتے تو ہر شہر اور ہر بستی میں سونے کے مکان بنا سکتا تھا لیکن جس نے اپنے امرتسر والے مکان کا کلیم داخل نہیں کیا جو میرا حق بنتا ہے وہ کسی دوسرے کا ممنونِ احسان کیونکر ہو سکتا ہے۔

پٹنہ میں میرے ننہال کی خاصی جائیداد تھی وہاں گیا تو دیکھا کہ اس پر ہندوؤں نے مندر تعمیر کرایا ہے۔ اُس جائیداد کو میں نے یہ کہہ کر چھوڑ دیا کہ چلو اللہ کی عبادت ہی کریں گے۔ میرے عقیدے پر نہ سہی اپنے رنگ میں ہی سہی۔

بہرحال میں تمام دوستوں کا ممنون ہوں۔ اللہ تعالیٰ سب کو جزائے خیر دے۔"

مدرسہ قاسم العلوم ملتان کے مفتی محمد شفیع صاحب ایک دن امیر شریعت سے ملنے گھر پہنچے تو دیکھا کہ مرغیوں کو دانہ کھلا رہے ہیں مفتی صاحب نے سوال کیا:

"شاہ جی! یہ کام باقی رہ گیا تھا؟"

جواب میں فرمایا:

"تیس سال تک میں نے آپ لوگوں کو بلایا ہے، مگر آپ مجھ سے دور بھاگے ہیں۔ اب یہ بے زبان ہیں، ذراسی

آواز دیتا ہوں تو فوراً چلے آتے ہیں۔ اِس دَور کے اِنسانوں
سے تو یہ حیوان کہیں بہتر ہیں۔"

غرض اس طرح کی اَدبی اور نیم سیاسی گھریلو محفلوں میں اور کبھی
کبھار شہری آبادی سے دُور دیہاتی عوام میں مذہبی قسم کی وعظ کرتے ہُوئے
امیرِ شریعتؒ نے ۱۹۵۰ء تک کا زمانہ گزُار دیا۔



پانچواں باب : ۱۹۵۰ء ــــ ۱۹۶۱ء

استحکامِ پاکستان

برصغیر پاک و ہند کے آزاد ہوتے ہی برطانوی سامراج کی تمام نو آبادیات اپنی آزادی کے لیے پَر تولنے لگیں۔ اسلامی ملک اور خاص کر عرب ریاستوں کو برطانوی اقتدار نے جن اطوار سے غلام بنا رکھا تھا، وہ آہستہ آہستہ دم توڑ رہے تھے انہیں دنوں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم خان لیاقت علی خاں کو روس نے اپنے ہاں آنے کی دعوت دی۔ اس سے پیشتر امریکہ نے بھی وزیر اعظم پاکستان کو اپنے ہاں دورہ کی دعوت دے رکھی تھی، جسے لیاقت علی خان نے فوراً منظور کر لیا؛ اور وہ روس کی بجائے امریکہ چلے گئے۔ یہ ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے۔

پاکستان کو روس اور امریکہ کی دعوتیں برطانوی منشا کے خلاف تھیں۔ جبکہ مصر اور ایران اپنے اپنے ملک سے برطانوی اقتدار کے خاتمے کی

فکر میں تھے۔ ایک نوزائیدہ اسلامی مُلک کا برطانوی منشا کے خلاف حرکت کرنا تعجب خیز تھا۔

ہنوز پاکستان کی بنیادیں بھی ناپختہ تھیں۔ ایک طرف مُلکی استحکام متزلزل تھا، دُشمن پاکستان کی کوتاہ دیواروں سے جھانک رہا تھا، تو دُوسری طرف اندرونِ مُلک کے حالات بھی موافق نہیں تھے۔ مرزائی جماعت کا الہامی عقیدہ تھا اور ہے کہ ——————

"پاکستان کا وجود عارضی ہے اور کچھ وقت کیلئے دونوں قومیں (ہندو، مسلمان) جُدا جُدا رہیں گی، مگر یہ حالت عارضی ہو گی اور ہمیں کوشش کرنی چاہیئے کہ جلد دُور ہو جائے۔

بہر حال ہم چاہتے ہیں کہ "اکھنڈ" ہندوستان بنے اور ساری قومیں باہم شیر و شکر ہو کر رہیں۔"

(اخبار "الفضل" ۵ اپریل ۱۹۴۷ء)

امیرِ شریعتؒ نے انہی دِنوں ملتان میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"عزیز نوجوانو! مَیں پونے ایک سال سے ارادتاً خاموش ہوں، اور نہ اب تقریر کرنے آیا ہوں، ظاہر ہے کہ مَیں تم سے کہوں تو کیا کہوں؟ جو کہنا چاہتا ہوں وہ تم سُنتے نہیں، اور جو تم سُنتے ہو، وہ میرے بس میں نہیں۔ مَیں گھر کی چار دیواری میں بند ہوں، جس کے اندر سارا کچھ ہی ہے اور باہر کچھ بھی نہیں

وہ ہے اسلام!

میرے پاس اللہ کی ایک کتاب ہے جسے میں معاشرۂ انسانی کے لیے ضابطۂ حیات سمجھتا ہوں، اور اسی کی تبلیغ گزشتہ چالیس سال سے کر رہا ہوں، تم مانتے نہیں ہو اور میں خاموش نہیں رہ سکتا۔

جب بھی خطرے کی کوئی بات دیکھتا ہوں تو مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔ باہر نکل کر چیختا ہوں کہ چور دیواریں توڑ رہے ہیں، مگر تم چور کو تو دیکھتے نہیں اُٹھ بھیجے مارنے دوڑتے ہو کہ کم بخت سونے نہیں دیتا۔ مگر کیا کروں عادت سی بن گئی ہے۔

بیماری نے میرا کچومر نکال دیا ہے، سارا جسم بغاوت پر اُتر آیا ہے، ہوتی بھی تو کم نہیں اس کم بخت کے ساتھ بغاوت نہ کرے تو کیا کرے۔

مرزا بشیر الدین محمود نے ایک الہام شائع کیا ہے جسے آجکل مرزائی تیزی سے ہوا دے رہے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ "میں نے ایک رویا دیکھا ہے جس کے معنی ہیں کہ گاندھی آئے ہیں اور حضور کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر لیٹنا چاہتے ہیں اور ذرا سی دیر میں اُٹھ بیٹھے اور گفتگو شروع کر دی۔"

اس الہام کی تعبیر میں وہ خود ہی (مرزا بشیر الدین محمود) کہتا ہے کہ "پاکستان) اور ہندوستان اکھنڈ ہو جائیں گے۔ (یعنی

ہندوستان اور پاکستان اکٹھے ہو جائیں گے"۔

میں تم سے پوچھتا ہوں مسلمانو! جس ملک کو دس ہزار بیٹیوں کی آبرو دے کر اور چالیس لاکھ مسلمانوں کی بربادی اور تباہی کے بعد حاصل کیا ہے، اُسے پھر ہندوستان کے ساتھ ملانے کے ارادے ہیں؟

مسلمانو! مرزائیت کے یہی ناپاک ارادے مجھے گھر کی چاردیواری سے نکال کر تمہارے سامنے لے آئے ہیں، ورنہ اب میں تھک چکا ہوں، رہی سہی کسر بیماری نے پوری کر دی ہے، میں ایک عظیم خطرے سے پھر تمہیں آگاہ کرنے آیا ہوں۔ مرزائیوں کے ناپاک عزائم خدا جانے کیا رنگ لائیں گے۔ انگریز گورنر اپنی روحانی اولاد کو پنجاب کے اس پار جو قیمتی زمین کوڑیوں کے بھاؤ دے گیا ہے یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ انگریزوں کا یہ خودکاشتہ پودا پاکستان میں بیٹھ کر بھی برطانیہ کی جاسوسی کر رہا ہے۔

میری حکومت نے اگر اس طرف توجہ نہ دی، تو مجھے ڈر ہے کہ اس ملک پر مرزائیوں کا قبضہ ہو جائے گا، میں اپنے پیارے وزیراعظم کی خدمت میں گزارش کروں گا کہ وہ اس سیاسی فتنہ پر خصوصی نظر رکھیں"

امیر شریعت کی اس تقریر کو اُس زمانے کے اخبارات نے کافی دلچسپی سے شائع کیا۔ امریکی دورے سے واپسی پر خان لیاقت علی خان نے امیر شریعت سے

ملنے کی خواہش کی، لیکن انہوں نے یہ کہہ کر وزیر اعظم کو ملنے سے انکار کر دیا کہ:

"یہ کام جماعت کے صدر کا ہے کہ وہ ٹکٹ کے کسی ذمہ دار آنیسر سے یا عہدے دار سے ملیں، میں تو ادنیٰ رضا کار ہوں۔"

ان دنوں مجلس احرار کے صدر ماسٹر تاج الدین تھے، انہوں نے بھی کہا مگر امیر شریعت نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ کام آپ کا ہے۔

مسلم لیگ کی غلطی

اسی سال صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں پنجاب مسلم لیگ نے اپنے امیدواروں میں چھ مرزائیوں کو شامل کر کے انہیں ٹکٹ دیدیے تھے۔ اس سلسلہ میں مجلس احرار نے ایک پریس بیان میں کہا:

"مجلس احرار براہ راست سیاسیات میں دخیل نہیں، اور نہ ہی وہ الیکشن میں حصہ لینا پسند کرتی ہے لیکن مسلم لیگ نے مرزائیوں کو ٹکٹ دیے ہیں، اب مجلس احرار ان کا مقابلہ کرنا اپنا دینی فرض سمجھتی ہے۔"

اس پر مجلس احرار نے پاکستان کے وزیر اعظم خان لیاقت علی خان سے جو مسلم لیگ کے صدر بھی تھے، برقی تار کے ذریعے احتجاج کیا، جس کے جواب میں وزیر اعظم نے احرار رہنماؤں کو اپنے ایک ذمہ دار اور با اعتماد ذرائع سے یقین دلایا کہ وہ ان حلقوں کا دورہ نہیں کریں گے، جہاں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مرزائی الیکشن لڑ رہے ہیں۔

انتخابات کے دنوں حضرت امیر شریعتؒ نے اپنی بیماری اور نقاہت کے باوجود شب و روز ان قصبات کا دورہ کیا، جہاں مرزائی اسلام اور مسلمانوں کا سا لباس پہن کر الیکشن کی تیاریاں کر رہے تھے۔ جب اس الیکشن کا نتیجہ نکلا تو تمام مرزائی شکست کھا چکے تھے جس پر مسلم لیگ کو کافی شرمندگی اٹھانا پڑی۔

والد صاحب کا انتقال

ایران اور مصر کے حالات نے اس تیزی کے ساتھ کروٹ لی کہ برطانوی سامراج کے طوطے اُڑنے لگے۔ ایران کے وزیر اعظم ڈاکٹر محمد مصدق نے اینگلو پرشین آئیل کمپنی کے مابین معاہدوں کو ختم کر کے تمام وسیع کاروبار کو قومی تحویل میں لے لیا۔ اس سے برطانوی مفاد پر خاصی ضرب پڑی۔ دوسری طرف مصر کے وزیر اعظم نحاس پاشا اس معاہدہ کے خلاف ہو رہے تھے جس کی رو سے برطانیہ کو نہر سویز کی حفاظت کے لئے ایک مخصوص علاقے میں اپنی فوج متعین کرنے کی رعایت حاصل تھی۔

ایشیا میں یہی حالات برطانیہ کے خلاف وہاں کے عوام میں بغاوت پھیلا رہے تھے کہ بھارت کی فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر متعین کر دی گئیں جنہیں پاکستان کے لئے فوجی خطرہ محسوس کرتے ہوئے وزیر اعظم لیاقت علی خان نے بھارت کے وزیر اعظم پنڈت نہرو سے احتجاج کیا اور ساتھ ہی ۲۷ جولائی ۱۹۵۱ء کو کراچی کے ایک اجتماع میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"پاکستان جنگ نہیں چاہتا، لیکن حملہ آور
کے لیے پاکستان کا "مُکّہ" تیار ہے"

یہی "مُکّہ" بھارت کے خلاف پاکستان کا قومی نعرہ بن گیا، ان تمام افغانات نے ایران، مصر اور پاکستان کو ایک دوسرے کی دھڑکنیں سُننے پر مجبور کر دیا۔

پاکستان، بھارت کی ان جنگی سرگرمیوں کی وجہ سے میدانِ جنگ بن گیا، اور ہر پاکستانی مُلک کی حفاظت کے لیے کفن بردوش نظر آنے لگا۔ ان دنوں ۱۶ اگست ۱۹۵۱ء کو لاہور موچی دروازہ کے باغ میں پنجاب اسمبلی کے اسپیکر آنریبل خلیفہ شجاع الدین کی زیرِ صدارت امیر شریعتؒ نے کہا:

"حضرات اور صدرِ محترم! بزرگانِ ملت اور برادرانِ عزیز! جنگ کے متعلق کوئی مشورہ یا رائے دینا میرے بس کی بات نہیں، یہ وزارتِ جنگ جانے اور محکمہ جنگ، کہ کہاں لڑنا ہے اور کہاں نہیں، یا کب لڑنا ہے اور کب نہیں۔ یہ کام ہمارا نہیں، لیکن دُعاگو ہوں کہ خُدا تعالیٰ ہمیں کامیابی و کامرانی عطا فرمائے۔

۱۴ اگست کو ہم نے یومِ آزادی منایا اور عوام نے دل کھول کر جوش کا مظاہرہ بھی کیا۔ میں دُعا کرتا ہوں کہ خُداوند تعالیٰ اِس جذبے کو مستقل کر دیں۔

جب کچھ حاصل ہوتا ہے تو خوشی کا اظہار ہوتا ہے، لیکن خوشی میں اصل چیز کو نہیں بھول جایا کرتے۔

پاکستان کسی چاردیواری کا نام نہیں، اگر ہماری زندگی

مقتضیات سے عبارت ہے تو پاکستان بھی آپ سے کچھ تقاضا کرتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جنگ اچھی چیز نہیں۔ لیکن جب گلے پڑ جائے تو پھر اس کا مقابلہ کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اگر ناگہاں کوئی مصیبت آجائے تو اس کا دور کرنا بھی ضروری ہے۔

ہندو مہا سبھا نے اعلان کیا کہ ہم پاکستان کو بزور شمشیر فتح کریں گے۔ تشکیل پاکستان کے وقت "ملاپ" اخبار نے بھی لکھا تھا کہ "فی الحال چلو پھر قوت کے ساتھ واپس آئیں گے۔" اب تو بھارتی فوجیں پاکستان کی سرحدوں پر جمع بھی ہو گئی ہیں۔ لیکن خان لیاقت علی خان کے جواب میں پنڈت نہرو نے کہا۔ "ہم تو جنگ نہیں چاہتے۔ یہ فوجیں ہم نے امن کے لیے جمع کی ہیں۔" خدا جانے پنڈت نہرو نے یونہی بے خبری میں کہہ دیا ہو۔ لیکن خان لیاقت علی خان نے مُکّہ دکھایا ہے ...... تاہم مجھے یقین سا ہے کہ جنگ نہیں ہو گی۔

اگر اعلان جنگ ہوا، تو بوڑھا انصاری بھی میدان جنگ میں کود پڑے گا۔ مجھے افسوس ضرور ہے کہ میں جوان نہیں لیکن دشمن کے مقابلے میں جوان ہوں۔ میری تمنا ہے کہ بستر پر ایڑیاں رگڑ کر مرنے کی بجائے میدان جنگ میں جان دوں۔

جنگ اور کشیدہ حالات کے لیے احکامات مختلف ہوتے ہیں۔ اب یہ ہمارا ملک ہے، ذہنیت کو تبدیل کرنا چاہیئے ہم کسی کے ملازم نہیں ہیں۔ یہ قطعہ زمین ہم نے بے پناہ قربانیوں کے بعد

حاصل کیا ہے۔ اور تیرہ سو سال میں آج تک کسی نے آزادی کے لیے
اتنی قیمت ادا نہیں کی جتنی ہمیں کرنی پڑی ہے۔ اب اس بیش قیمت
خطے کو ہر قیمت پر بچانے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔"

ہوابازوں سے خطاب کرتے ہوئے آپ نے فرمایا:

"ہوائی جہاز بھی قوت ہے۔ ہتھیار سے بندوقیں، ریڈ گنیں، رائفلیں، ٹینک، یہ سب چیزیں قوت ہیں، انہیں اکٹھا کرو، اپنے فرائض کو سمجھو، حکومت کو مشورہ نہ دو۔ وہ اپنی ذمہ داری خود محسوس کرتی ہے، اور خدا کرے زیادہ سے زیادہ محسوس کرے۔

میں مجمع کی زیادتی کو دیکھنا نہیں چاہتا، اور نہ ہی پرجوش جلسہ دیکھنا پسند کرتا ہوں۔ یہاں سے اپنے مقدر کا فیصلہ کر کے اٹھو۔ نوجوانو! یہ میدانِ کارزار کی بات نہیں، اس سے پہلے کی بات ہے۔ لڑائی کے وقت کیا کرنا ہوگا، اس کے لیے اور احکام ہیں۔ ابھی تو صرف آنے والے وقت کے لیے تیاری کرو، وہ ہاک بڑھا دو، قرآن کے ارشاد کے مطابق اللہ کے دشمنوں پر اور اپنے دشمنوں پر قوت سامان پیدا کرو کہ دشمن مرعوب ہو جائے۔ قوت ہی سب کچھ ہے، قوت کے بغیر کچھ بھی نہیں۔"

[illegible] کے موقف کی وضاحت کرتے ہوئے اعلان کیا:

"یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے پاکستان کی مخالفت کی لیکن

جو کچھ کیا اور جو کچھ صحیح سمجھا وہی کچھ کیا۔ ہمارا ضمیر اُس وقت بھی مطمئن تھا اور آج بھی شرمندہ نہیں۔

آج ہم کسی سے ڈر کر کچھ نہیں کہہ رہے بلکہ پوری آزادی سے کہتے ہیں کہ دفاعِ وطن کے لیے تیار ہو جاؤ، اور اگر کوئی غدار ہو تو اُسے کیفرِ کردار تک پہنچاؤ۔ میں آپ سے کچھ نہیں مانگتا۔ میرے پاس نہ دولت ہے نہ ثروت، صرف آپ کی خدمت میں پورے خلوص سے التجا کرتا ہوں۔ آپ کے پاؤں پر سفید داڑھی رکھ کر اپیل کرتا ہوں کہ آپ اِسے منظور کریں! اور وہ یہ کہ ایک جوان بھی ایسا نہ رہے جو نیشنل گارڈ کی وردی نہ پہنے ہوئے ہو۔"

امیرِ شریعتؒ کی اِس تقریر نے سارے لاہور کو میدانِ کارزار کیلئے تیار کر دیا۔ حالات جوشِ جہاد کے جذبات سے آگے بڑھ رہے تھے سارا ملک جنگی تیاریوں میں مصروف تھا۔ امیرِ شریعتؒ کراچی، راولپنڈی، پشاور اور لاہور کے علاوہ دیہات و قصبات میں بھی جہاد کی تقریریں کر رہے تھے کہ ۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی کے ایک عام اجتماع میں خان لیاقت علی خان کو گولی مار کر شہید کر دیا گیا۔

اسی سال ۸ شعبان المعظم اتوار کے روز امیرِ شریعتؒ کے والد محترم حافظ سید ضیاءالدین شاہ صاحب بخاری اٹھاسی سال کی عمر پا کر اپنے گاؤں ناگڑیاں ضلع گجرات میں انتقال کر گئے۔ اس وقت حضرت امیرِ شریعتؒ کی اپنی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی لیکن اس مقام پر بھی حضرت امیرِ شریعتؒ جب کبھی گاؤں جاتے

تو والد صاحب انہیں مولوی عطاء اللہ کہہ کر پکارتے تھے۔ یا بڑے پیار میں ہوں، تو حافظ جی کہہ دیتے۔ مگر بقول امیر شریعتؒ ایسا وقت زندگی میں کم ہی آیا۔ کیوں کہ حافظ سید ضیاءالدین شاہ صاحب بخاری (رحمۃ اللہ علیہ) کی طبیعت میں جلال ہی جلال تھا۔

والد صاحب کی موت نے امیر شریعتؒ کی صحت کو خستہ دیوار کی طرح گرا دیا۔ لیکن پاکستان کے حالات اور مرزائیوں کے ارادوں نے انہیں والد صاحب کے افسوس کا بہت کم وقت دیا۔

ایک اہم انکشاف

پاکستان کے وزیر اعظم کی موت کے باوجود بھارت کے جنگی ارادے بدستور قائم رہے۔ اس کے پیش نظر ملک کے ملی انتظامات ہو رہے تھے کہ ۲۴-۲۵ مارچ ۱۹۵۲ء استحکام پاکستان احرار کانفرنس میں شمولیت کے لیے امیر شریعتؒ سرگودھا پہنچے۔ سارا علاقہ اپنے محبوب رہنما کی زیارت کے لیے سمندر کی طرح امڈ آیا تھا۔ آپ کی قیام گاہ پر ایک شخص نے امیر شریعتؒ سے علیحدگی میں گفتگو کرنے کو کہا، جسے بڑے اصرار کے بعد امیر شریعتؒ نے مان لیا۔ قریباً آدھ گھنٹے کے بعد امیر شریعتؒ واپس دوستوں میں آئے تو ان کے چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔

کمبل اوڑھے، سیاہ عینک لگائے دراز قامت یہ کون شخص تھا؟ کہ جب امیر شریعتؒ اس سے مل کر علیحدہ ہوئے تو تحریک ختم نبوت کا آغاز ہو گیا۔ یہ راز حضرت امیر شریعتؒ کے پاس محفوظ ہے، اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔ البتہ

تحریک ختم نبوت کے بعد ملتان جیل سے رہا ہوئے تو اپنے مکان (ملتان) میں بیٹھے بیٹھے یکایک راقم سے کہنے لگے،

"جانباز! تم اس سال سرگودھا کانفرنس میں موجود تھے جب ایک آدمی مجھے علیحدگی میں بلا رہا تھا؟"

"جی ہاں وہیں تھا"

"بھلا وہ آدمی کون تھا اور اس نے کیا کہا تھا؟"

"حضرت! یہ تو آپ نے بتایا ہی نہیں تھا"

مسکرا کر فرمانے لگے "نام تو اب بھی نہیں بتاؤں گا، لیکن تھا وہ ایک سرکاری آدمی، اور بتایا یہ تھا کہ راجہ غضنفر علی (جو اُن دنوں ایران میں پاکستان کے سفیر تھے) اور سر ظفر اللہ خاں (جو پاکستان کے وزیر خارجہ تھے) کے درمیان حال ہی کی ملاقات میں یہ فیصلہ ہوا ہے کہ اس وقت ہم دونوں اقتدار پر ہیں کیوں نہ حکومتِ پاکستان سے ایسا قانون پاس کرالیں کہ پاکستان میں کوئی فرقہ کسی فرقے کو کافر نہ کہے؛

اس کے لیے کوشش شروع ہو چکی ہے، شاہ صاحب! اگر آپ کچھ کر سکتے ہیں تو کریں۔"

یہ واقعہ سنانے کے بعد امیر شریعتؒ نے کہا:

تمہیں یاد ہے کہ میں نے اُسی رات بغیر جماعت کے مشورے کے سر ظفر اللہ کا شہر میں جنازہ نکلوانے کا اعلان کر دیا تھا۔ اگر اس رات یہ حرکت نہ کرتا، تو ممکن ہے ملک میں کوئی قانون ایسا بن جاتا کہ باطل کو اپنی زندگی کے لیے

قانون کا سہارا میسر آجاتا۔"

سازش محل میں ہو یا جھونپڑی میں، قانون دونوں جگہوں کو مجرم قرار دیتا ہے۔ راجہ غضنفر علی (شیعہ) اور چودھری سر ظفر اللہ خان (مرزائی) اپنی سرکاری ذمہ داریوں کی اوٹ لے کر اگر اپنے ارادوں میں کامیاب ہو جاتے، اگر ان کی باہم سازش پاکستان میں کسی قانون کے بنانے کی مرتکب ہوتی جس کی رُو سے کُفر کو کُفر کہنا جرم قرار دے دیا جاتا، تو پھر استحکامِ پاکستان کے لیے صدیوں کی ضرورت پڑتی۔

امیرِ شریعت کی فراست اور دُور رس نگاہوں نے تھوڑی سی تلخی گوارا کر کے یہ زہر بھی پی لیا کہ وطنِ عزیز کا مستقبل باطل کے ہاتھوں تاریک نہ ہو جائے۔

بیٹی کی شادی

گھریلو رسم و رواج اور برادری کے مروّجہ آئین سے انحراف جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ پھر اُس آدمی کے لیے جس نے عوام کو ہمیشہ مذہب کی راہیں سجھائی ہوں، اس وادی سے گزرنا اور بھی مشکل ہے۔

امیرِ شریعتؒ کے قدم اس راہ میں بھی نہیں ڈگمگائے، حالانکہ اُن کی برادری بھی تھی اور خاندان کی رسمیں بھی، لیکن غیر ملکی سلطنت کے باغی اور اسلام کے داعی نے سماج کے بنائے ہوئے تمام آئین کو ٹھکرا کر اسلام کے ضابطۂ حیات کو اپنی عاقبت کے لیے بہتر سمجھا، اور نہ ہی بیٹی کا "بَر" تلاش کرنے میں عجلت کی، اور نہ ہی خاندانی حصار میں رہے، بلکہ نیک سیرت،

نیک خصلت اور تقویٰ کے پابند نوجوان کی جستجو میں بیٹی کے بالغ ہونے تک اپنی نظروں کو مصروف رکھا۔ آخر اس تجسس میں کامیاب نکلے۔ بحر حوادث کے باوجود ایسا موتی تلاش کیا کہ جس کی تو دامنی پر فرشتے وضو کر سکتے ہیں۔

عبدالحکیم ضلع کے ایک گمنام سید محمد شفیع شاہ صاحب جن کا آبائی وطن پسرور ضلع سیالکوٹ ہے کے لڑکے سید وکیل احمد شاہ سے اپنی لڑکی کی نسبت کر دی۔

وکیل احمد شاہ شادی سے قبل دینی کتب سے فارغ ہو کر بی۔اے کے طالب علم تھے۔ سیرت کے ساتھ مشاطۂ فطرت نے انہیں حسنِ ظاہری سے بھی سنوارا ہے۔ بوٹا سا قد، چشم آہو، کھلی پیشانی، یہ سارا کچھ گندمی رنگ کے چہرے پر اس قدر خوبصورت اور دلآویز ہے کہ صانع فطرت کی بلائیں لینے کو جی چاہتا ہے۔

جہیز

بیٹی کا جہیز زمانے کے رسم و رواج میں والدین کے لیے عذابِ دنیوی سے کم نہیں۔ یہ رسم قرض کی رقم سے پوری کی جائے یا اثاثہ حیات بیچ کر۔ دونوں صورتوں میں لڑکی کے والدین کا مستقبل تاریک ہو جاتا ہے۔ لیکن امیر شریعت نے کفر کی اس عمارت کو استقلال کے جن ارادوں سے چکنا چور کیا، اور عزیزہ بیٹی کو سنتِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی چادر میں لپیٹ کر گھر سے رخصت کیا یہ بھی ایک جہاد تھا، سوسائٹی کے ان مروجہ رواج کے خلاف جس

دورِ رواں میں نجات مشکل ہے۔

انصاف کلاتھ ہاؤس (دالٹن پور) کے مالک شیخ گلزار کا بیان ہے کہ :

"شاہ جی اپنی بیٹی کی شادی کے سلسلے میں کراچی آئے

اور کہا کہ "تمہاری ہمشیرہ کی شادی کے لیے کپڑا خریدنا ہے بازار

چلو"۔ میں ہزار روپیہ جیب میں ڈال کر شاہ جی کے ساتھ ہو لیا

پانچ سو سے کچھ کم کا کپڑا خرید چکے تو کہا "بس بیٹا !"

میں نے عرض کیا : "حضرت یہ تو کچھ بھی نہ ہوا"

جواب میں کہا۔ "بیٹا ! میری گرہ اسی قدر اجازت دیتی ہے"

اس پر میں نے عرض کیا "حضرت ! پیسے بہت ہیں"

کہا "نہیں میرے عزیز ! میں تمہیں اس لیے ساتھ نہیں لایا کہ

تمہارے پاس پیسے بہت ہیں، بلکہ مجھے اس کاروبار کی پہچان

نہیں، اور دوسرا تمہارے ساتھ ہونے سے کچھ رعایت ہو گئی"

"چنانچہ شاہ جی نے تمام رقم اپنی گرہ سے ادا کی"

رسمِ نکاح مخدوم محترم حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری نے ادا فرمائی،

اور اس طرح مارچ کے آخر یا اپریل ۱۹۵۲ء کے شروع میں امیر شریعت نے

اپنے جگر گوشے کو آنسوؤں کے زیورات سے آراستہ کر کے گھر سے رخصت کیا۔

شادی کے بعد سید وکیل احمد شاہ نے عربی کا ایم۔ اے کیا اور اس پر

سر سے پاتک کھدر کے لباس میں ملبوس، شرعی داڑھی، طبیعت میں سادگی

لیے ہوئے یہ نوجوان آج میونسپل کالج اوکاڑہ میں پروفیسر ہے۔

تحریکِ ختمِ نبوت

۱۸۵۷ء کے بعد غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے دائمی استحکام کے لیے ہندوستان کی مختلف اقوام میں منافرت کا جو بیج بویا، اُس کے برگ و بار میں مرزائیت ایک ایسی تحریک ثابت ہوئی کہ نہ صرف اسلام کے بنیادی ستون ہی متزلزل ہوئے بلکہ ہندوستان کی غیر ملکی غلامی کی عمر بھی طویل ہوتی چلی گئی۔ جیسے جیسے اجنبی راج کا اقتدار جڑ پکڑتا گیا، اُسی رفتار سے مرزائیت کو پنپنے کے وسائل میسر آتے رہے۔

اپنی بنیاد کے دو سال بعد مجلسِ احرار نے اس تحریک کے مقابلے کیلئے قادیان میں اپنا دفتر قائم کیا۔ زعمائے احرار کے نزدیک غلامی سے آزادی تک کا راستہ مرزائیت کی موت کے بغیر طے نہیں ہو سکتا تھا۔ جڑ کاٹنے سے پیشتر درخت کے تنے اور شاخیں کاٹنا ضروری ہوتی ہیں۔

۱۹۲۰ء میں امیرِ شریعتؒ نے مرزا بشیر الدین محمود کو للکارا تھا۔ اُس وقت اُن کی یہ للکار انفرادی حیثیت رکھتی تھی، لیکن ۱۹۳۱ء میں مجلسِ احرار نے جب مرزائیت کا محاسبہ کیا تو امیرِ شریعتؒ کے لاکھوں مُرید اور ہزاروں رضاکاروں کی فعال جماعت اُن کی پشت پناہ تھی۔

۱۹۴۷ء میں انگریزی سامراج کے خاتمے نے یہ اُمید دلائی تھی کہ پاکستان اسلامی ریاست ہوتے ہوئے غیر اسلامی مذاہب کو اس قدر اہمیت نہیں دے گا کہ وہ براہِ راست ریاست کے نظم و نسق پر حاوی ہو جائیں۔ ان دنوں مرکزی

اور صوبائی حکومتوں کے درمیان محلاتی سازشوں کا جال اس تیزی سے بچھایا جا رہا تھا کہ اندرون ملک کی سیاسی قلابازیوں سے حکمران طبقہ قطعاً نا آشنا تھا۔

خان لیاقت علی خان کی موت کے بعد خواجہ ناظم الدین وزارت عظمیٰ کی کرسی پر جا بیٹھے، اور اپنی جگہ ملک غلام محمد کو جو وزیر خزانہ تھے، پاکستان کا گورنر جنرل بنا دیا، اور وزیر خزانہ کی کرسی چودھری محمد علی کے حوالے کر دی گئی۔ اس عاجلانہ اکھاڑ پچھاڑ نے پاکستان کی سابقہ خارجہ پالیسی پر بھی اثر کیا۔ شہید وزیر اعظم نے اسلامی ممالک سے جو راہ و رسم بڑھائے تھے۔ خواجہ ناظم الدین نے اپنی حکومت کا رخ ان سے مختلف کر دیا۔ مصر اور ایران کی حمایت کرنے کی بجائے برطانوی سامراج سے قرابت داری کو مقدم سمجھا گیا۔

اس افراتفری میں صوبائی اور مرکزی حکومت کے مابین اختلافات میں کشیدگی شروع ہوئی۔ پنجاب میں میاں ممتاز محمد خان دولتانہ اور سرحد میں خان عبدالقیوم خان نے من مانی کارروائیاں شروع کر دیں۔ اس طرح سندھ کے گورنر شیخ دین محمد نے صوبے کے وزیر اعلیٰ محمد ایوب کھوڑو اور وزیر مال قاضی فضل اللہ کے خلاف پروڈا کے تحت مقدمات دائر کر دیئے۔ مشرقی پاکستان میں اردو کے مقابل بنگالی زبان کو پاکستان کی قومی زبان بنانے پر وہاں کے طلبا نے ایجی ٹیشن شروع کر دی۔ غرض ہر صوبہ کے حاکم اعلیٰ نے اپنی اپنی سیاسی ضرورت کے لیے کبھی الیکشن کا ہنگامہ، کبھی آٹے کی قلت کا سوال اور کہیں بنگالی اور اردو کے تصادم سے عوام کو مرکزی حکومت کے خلاف اکسایا۔

پاکستان کے ایسے حالات کو مرزائیوں نے اپنے لیے مفید پاکر اکھنڈ بھارت کے

الہامی عقیدے کی تبلیغ شروع کردی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے مختلف الخیال رہنماؤں کو مرزائیت کے متعلق سوچنا پڑا۔ امیر شریعتؒ ۱۹۴۹ء میں سیاسیات سے علیحدگی کے بعد قادیانیت کے استیصال کے لیے ہمہ تن مصروف تھے کہ ۹ رمئی ۱۹۵۱ء کو برکت علی ہال لاہور میں ایک کنونشن بلایا گیا، جس میں امیر شریعتؒ بھی شریک ہوئے۔ اس اجلاس کے اختتام پر مرزائیت کے خلاف سامنے سے مغربی پاکستان میں تحریک کا آغاز ہوا لیکن حکومت کے سامنے مطالبات رکھنے کے لیے کنونشن کے مختلف اجلاس لاہور اور کراچی میں ہوئے۔ اس اثنا میں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے مابین حالات نے کئی کروٹیں لیں حکمرانوں کو غافل پاکر مرزائی لیڈر مرزا بشیر الدین محمود نے کہنا شروع کر دیا :

۱: "احمدیت کے مخالف عنقریب مرزا صاحب یا اُن کے کسی جانشین کے سامنے مجرموں کی طرح پیش ہوں گے"۔

(خطبہ جمعہ بشیر الدین محمود - ۳ر جنوری ۱۹۵۲ء)

۲: "احمدیوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ فوجی محکموں کی طرح گورنمنٹ کے دوسرے محکموں میں بھی بھرتی ہونے کی کوشش کریں تاکہ تبلیغی پروگرام کو تقویت پہنچے"۔

(خطبہ جمعہ بشیر الدین محمود۔ "الفضل" ۱۱ر جنوری ۱۹۵۲ء)

نیز مرزائیوں کو ہدایت کی گئی ،

"ایسے حالات پیدا کردو کہ ۱۹۵۲ء گزرنے سے پہلے پہلے دشمن احمدیت کی آغوش میں گرنے پر مجبور ہو جائیں"۔ ("الفضل"، ۱ر جنوری ۱۹۵۲ء)

مرزائیوں کی ان اشتعال انگیز تحریروں نے پاکستانی عوام کو اس قدر مشتعل کیا کہ وہ وطنِ عزیز اور ایمان ایسی گرانبہا دولت کو محفوظ رکھنے کے لیے تدبیریں سوچنے لگے۔

امیرِ شریعتؒ کی صحت اور ...... اُن کا ذاتی معالج (حکیم عطاءاللہ خان) اُنہیں کسی قسم کے سفر کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ لیکن توہینِ خاتم الانبیاء کے باعث امیرِ شریعتؒ اپنی بیماری کو بھول چکے تھے۔ تحریک راجپال کے بعد یہ دوسرا موقعہ تھا کہ امیرِ شریعتؒ مرزائیت کے خلاف اس قدر جذباتی ہو گئے تھے کہ اس سے پیشتر انہیں کبھی اتنا متشدد نہیں دیکھا گیا تھا۔

"لاالٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ" کے آگے "لانبی بعدی" کا جملہ ہر مجمع میں کہتے اور عوام کو تاکید کرتے کہ:

> "مقام نبوت ایسے خطرناک موڑ پر آن پہنچا ہے، اگر آج اس کی حفاظت نہ کی گئی، تو قیامت کے دن ہم سب کی بخششوں کا کوئی امکان نہیں۔"

یہ فقرہ کہتے ہوئے امیرِ شریعتؒ کی حالت غیر ہو جایا کرتی تھی، وہ آپے سے باہر ہو کر غصہ میں کانپنے لگتے۔

مرزائیت کے خلاف تحریک ہنوز تیز نہیں ہوئی تھی حالانکہ امیرِ شریعتؒ نے مغربی پاکستان کو اپنی تقریروں سے اس قدر مشتعل کر دیا تھا کہ تحریک کا سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا تاہم ایسی بات نہیں تھی کہ ...الات کے

بگڑنے کا امکان ہو۔ ۱۷، ۱۸ مئی ۱۹۵۲ء کو جہانگیر پارک کراچی میں چودھری سر ظفر اللہ خان وزیر خارجہ پاکستان نے مرزائیوں کے سالانہ اجتماع میں وزیر اعظم پاکستان کے منع کرنے کے باوجود تقریر کی جس نے حالات کو زیادہ خراب کر دیا۔ لیکن امیر شریعتؒ کی تقریروں نے حالات کو سنبھالا دیتے ہوئے تشدد کی طرف سے رُخ موڑ کر محض احتجاجی کر دیا۔ انہیں دنوں ــــــ

ــــــ ملتان شہر کے ایک تھانہ (کچہری) کے سب انسپکٹر غلام مصطفےٰ نے (جس کے متعلق لوگوں کی رائے تھی کہ یہ مرزائی ہے) ۸ جولائی کو عوام کے ایک جلوس پر لاٹھی چارج کیا تھا، عوام نے تھانہ کے سامنے جمع ہو کر اس کے خلاف احتجاج کیا، تو اس مجمع پر بلا وارننگ گولی چلا دی گئی۔ دس منٹ تک ستر راؤنڈ چلائے گئے جس کے نتیجے میں چھ مسلمان شہید ہوئے اور زخمیوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ اس خونی واردات کے خلاف سارے پاکستان میں یوم احتجاج منایا گیا۔ ۲۵ جولائی ۱۹۵۲ء کو امیر شریعت نے شہدائے ملتان کو حسب ذیل الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا۔ آپ نے قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت فرمائی:

اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ یُّتْرَکُوْا اَنْ یَّقُوْلُوْا اٰمَنَّا وَھُمْ
لَا یُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ
فَلَیَعْلَمَنَّ اللّٰہُ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَلَیَعْلَمَنَّ
الْکَاذِبِیْنَ ۝

ترجمہ: کیا لوگوں نے یہ خیال کر رکھا ہے کہ وہ محض ایمان لانے سے ہی نجات حاصل کر لیں گے اور ان کی کوئی آزمائش نہ ہوگی۔

حالانکہ وہ تمام لوگ آزمائے جا چکے ہیں، جو اُن سے پہلے گذرے ہیں، پس معلوم کر لے گا اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو حق و صداقت پر ہیں اور اُن لوگوں کو جو کاذب و مفتری ہیں"

(آپ نے صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کے زمانۂ خلافت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا)

"جب مسیلمہ کذاب نے نبوّت کا دعویٰ کر کے اِسلام کے بنیادی عقیدہ کو گزند پہنچانے کی ناپاک کوشش کی تو حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کاذب و مفتری سے کسی قسم کا مناظرہ کر کے دعویٰ نبوّت کے جواز میں دلیل طلب نہیں کی۔ اگر کیا تو یہ کہ سات ہزار سے زائد حافظِ قرآن صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین، ناموسِ رسالتؐ اور تاج و تخت ختم نبوّت پر قربان کر دیئے۔ اور اس طرح مسلمانوں کی متاعِ دین و ایمان کو ایک عیار اور مکار کی دست برد سے بچا لیا۔ اور آئندہ کے لیے ملّتِ اسلامیہ کو سبق دیا کہ جو شخص اس قسم کی ناپاک کوشش کرے۔ اس کے لیے اسلام اور ملّتِ اسلامیہ کا فیصلہ کیا ہے؟

ملتان کے غیور اور صاحب ایمان مسلمانوں نے بھی اس دورِ پُر آشوب میں جبکہ کفر و ارتداد کی سیاہ گھٹاؤں نے ایمان و ایقان کو پریشان کر رکھا ہے، اسلام کی لاج رکھ لی، اور اپنے

جگر گوشوں کو شمع رسالت پر پروانہ وار نثار کر کے ثابت کر دیا ہے کہ مسلمان آج بھی فخر دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت و ناموس کی خاطر گولیوں کی بارش میں مسکرا سکتا ہے ؎

رُتبۂ شہید نازِ کا گر جان جائیے
قربان جانے والے کے قربان جائیے

خُدا کی نعمتیں نچھاور ہوں تم پر شہیدانِ ناموسِ رسالتؐ، سلام ہو تم پر اے ختم المرسلینؐ کی عزت و آبرو پر قربان ہونے والو! مُبارک ہیں اُن کے والدین کہ اُن کے نذرانے سرکارِ رسالتمآبؐ میں شرفِ قبولیت حاصل کر گئے۔

یُوں تو اس دُنیا میں ہزاروں بچے جنم لیتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ ہزاروں کلیاں کھلتی ہیں اور بادِ سموم کے تھپیڑوں کی تاب نہ لا کر مُرجھا جاتی ہیں۔ مگر وہ موت جو حق اور راستی کی راہ میں آئے، حیاتِ جاوداں بن کر آتی ہے ؎

جو موت آئے تو زندگی بن کے آئے
قضا کی نرالی ادا چاہتا ہوں

مجلسِ عمل کا قیام

صدرِ مملکت بننے کی خواہش میں ملک غلام محمد گورنر جنرل، خواجہ ناظم الدین کی کیبنٹ پر اپنا اثر بڑھا رہے تھے، اور اس میں وہ خاصے کامیاب ر

کیبنٹ کے پارلیمانی اختیارات آہستہ آہستہ گورنر جنرل کے ہاتھ میں آگئے اور فیصلوں کی تمام تر ذمہ داری گورنر جنرل کے قبضے میں چلی گئی۔ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کی اس باہم کھینچا تانی نے مرزائیت کے خلاف تحریک کو زیادہ ہوا دی۔

پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں ممتاز محمد خاں دولتانہ کی نواب افتخار حسین آف ممدوٹ سے اندرونِ خانہ چل رہی تھی۔ نواب ممدوٹ نے سرحد کے عبدالقیوم خان سے دولتانہ کے خلاف سمجھوتہ کر لیا تھا، دوسری طرف دولتانہ مرکزی حیثیت حاصل کرنے کی غرض سے خواجہ ناظم الدین کے خلاف اُبھرتی ہوئی مرزائی مسلمان ایجی ٹیشن کو ارادتاً نظر انداز کر رہے تھے۔

یہ تھا پس منظر جس نے عوام میں یہ تاثر دیا کہ مرزائیت کے خلاف تحریک دولتانہ کی پیداوار ہے۔ حالانکہ دولتانہ مرکز سے اور نواب ممدوٹ سے اپنا سیاسی انتقام لے رہے تھے۔

ایسے حالات میں مرزائیوں کی بڑھتی ہوئی ریشہ دوانیوں نے عوام کو موقعہ دیا کہ وہ حکومت سے مرزائیوں کو مسلمانوں سے الگ غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کریں۔ جہانگیر پارک میں ظفر اللہ خان کی تقریر کے بعد کراچی میں ۲ جون ۱۹۵۲ء کو آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن طلب کیا گیا۔ جس میں دو دن کی مسلسل بحث کے بعد حسب ذیل قرارداد کی تشکیل کی گئی۔

ا:۔ مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔

۲:۔ چودھری ظفر اللہ وزیر خارجہ کو اس کے عہدے سے الگ کر دیا جائے۔

۳:۔۔۔ مرزائیوں کو تمام کلیدی آسامیوں سے ہٹا دیا جائے۔"

ان مطالبات کی تصدیق کے لئے ۱۳ر جولائی ۱۹۵۲ء کو لاہور برکت علی ہال میں آل مسلم پارٹیز کنونشن کا پھر اجلاس ہوا، جس میں حسب ذیل حضرات کی ایک مجلس عمل مرتب کی گئی۔

۱۔۔۔ مولانا ابوالحسنات محمد احمد قادری صدر جمعیۃ علمائے پاکستان

۲۔۔۔ مولانا امین احسن اصلاحی (جماعت اسلامی)

۳۔۔۔ ماسٹر تاج الدین انصاری (احرار)

۴۔۔۔ شیخ حسام الدین (احرار)

۵۔۔۔ مولانا عبدالحلیم قاسمی (جمعیۃ علمائے اسلام)

۶۔۔۔ مولانا محمد طفیل (جمعیۃ علمائے اسلام)

۷۔۔۔ مولانا محمد بخش مسلم (جمعیۃ علمائے پاکستان)

۸۔۔۔ مولانا غلام محمد ترنم (حزب الاحناف)

۹۔۔۔ مولانا غلام دین (حزب الاحناف)

۱۰۔۔۔ مولانا داؤد غزنوی (جمعیۃ اہلحدیث)

۱۱۔۔۔ مولانا عطاء اللہ حنیف (جمعیۃ اہل حدیث)

۱۲۔۔۔ مولانا نصراللہ خان عزیز (جماعت اسلامی)

۱۳۔۔۔ حافظ کفایت حسین (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ)

۱۴۔۔۔ مظفر علی شمسی (ادارہ تحفظ حقوق شیعہ)

۱۵۔۔۔ مولانا نورالحسن شاہ بخاری (تنظیم اہل سنت والجماعت)

۱۶۔۔۔۔ صاحبزادہ فیض الحسن (انجمن سجادہ نشینان پنجاب)

۱۷۔۔۔۔ مولانا عبدالغفور ہزاروی (انجمن سجادہ نشینان پنجاب)

۱۸۔۔۔۔ علامہ علاؤالدین صدیقی (نامزد)

۱۹۔۔۔۔ مولانا اختر علی خان (نامزد)

۲۰۔۔۔۔ مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش (نامزد)

مجلس عمل نے ۲۱ جنوری ۱۹۵۳ء کو وزیراعظم پاکستان سے مل کر انہیں اپنے مطالبات پیش کئے اور ایک ماہ کا نوٹس دے دیا۔ کہ اگر ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء تک مجلس عمل کے متذکرہ مطالبات منظور نہ کئے گئے تو مجلس اپنے مطالبات منوانے کے لیے راست اقدام کرنے پر مجبور ہو گی۔

اس دوران دوسری جماعتوں کے مقررین کے علاوہ امیر شریعت نے پنجاب، سندھ اور سرحد میں تقریریں کر کے مسئلہ ختم نبوت کو عوام کے سامنے بڑی وضاحت سے بیان کیا۔ اس ضمن میں پشاور کے چوک یادگار کی ایک تقریر کے اقتباس خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مفتی مرحد مولانا عبدالقیوم پوپلزئی کی صدارت میں تقریباً ساٹھ ہزار نفوس کی حاضری میں امیر شریعت نے فرمایا:

"اللہ تبارک و تعالیٰ نے قرآن مجید میں انبیاء علیہم السلام کا جہاں ذکر کیا ہے، وہاں ہر نبی کے بعد آنے والے دوسرے نبی کی پہلے اطلاع دے دی۔ چنانچہ تمام انبیاء کرام علیہم السلام اپنے بعد آنے والے نبی کی بشارت دیتے رہے۔ حتیٰ کہ یہ سلسلۂ نبوت خاتم الانبیاء حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک آن پہنچا۔

آپؐ نے فرمایا کہ مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَا اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ہ

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کے باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور تمام نبیوں کے ختم کرنے والے ہیں۔

اگر حضورؐ کے بعد کسی اور نبی نے آنا ہوتا اور یہ سلسلہ نبوّت جاری رہنا ہوتا تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام یہ اعلان نہ فرماتے کہ انا خاتم النبیین لا نبی بعدی، یعنی میں آخری نبی ہوں میرے بعد کوئی نبی نہیں آنے گا۔

یہ تاجدار مدینہ رحمت دو عالم، خاتم الانبیاءؐ کی شانِ اقدس پر انتہائی کمینہ اور گستاخانہ حملہ ہے کہ ایک انگریز کا پروردہ اُٹھ کر یہ اعلان کرے کہ قرآن پاک کی وحیِ الٰہی میں میرا نام محمد رکھا گیا اور رسول بھی" (ایک غلطی کا ازالہ)

امیر شریعتؒ نے فرمایا:

"اگر میں آج یہ اعلان کردوں کہ میں قائد اعظم ہوں تو کیا تم برداشت کرو گے؟"

سامعین: "ہرگز نہیں!"

امیر شریعتؒ: "اگر تم اپنے ایک دنیوی لیڈر کا مقام کسی دوسرے شخص کو دینے کی اجازت نہیں دیتے تو پھر یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ

برطانیہ کا پٹھو، تاجدارِ مدینہ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کرے کہ میں محمد ہوں۔

اسی اصول اور ضابطے کے مطابق ہم اپنی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ چونکہ مرزائیوں نے حضور پر نور کے بعد مرزا غلام احمد کو اپنا نبی تسلیم کر کے اپنا تعلق سرکارِ مدینہ سے توڑ لیا ہے اسلامی آئین کے مطابق حضورؐ کے بعد کسی دوسرے نبی کو ماننے والا مرتد اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔"

امیر شریعتؒ نے قادیانی الہام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ:

"مرزا البشیر الدین محمود کہتا ہے کہ "موجودہ ملکی تقسیم غلط ہے، یہ تقسیم ختم کرانے اور دونوں ملکوں کا باہمی افتراق دور کرانے کی وہ ہر ممکن کوشش کریں گے۔ اس عارضی تقسیم کو کسی نہ کسی طرح ختم کیا جائے گا، اور ہند و پاکستان کو پھر اکھنڈ ہندوستان بنایا جائے گا۔"

"جو آزادی ایک لاکھ ماؤں، بہنوں کی عزت و آبرو قربان کرکے اور دس لاکھ مسلمانوں کا خون بہا کر اور ایک کروڑ مسلمانوں کی خانہ بربادی کے بعد حاصل کی گئی ہے اس کو عارضی آزادی سمجھنے والا ملک و ملت کا بدترین دشمن نہیں، تو اور کیا ہے؟"

یہ بصیرت افروز تقریر رات ایک بجے تک جاری رہی۔

راست اقدام

۲۳ رجنوری (۱۹۵۳ء) سے ۲۲ رفروری (۱۹۵۳ء) تک واقعات نے کئی کروٹیں لیں۔ صوبائی اور مرکزی حکام نے مجلس عمل کے رہنماؤں کو دھمکایا بھی اکثر کارکنوں پر متشددانہ بھی وارد کیے۔ اخبارات پر قدغن بھی لگائی گئی، لیکن مرزائیت کے خلاف عوام کا غصہ اُبلتے ہوئے لاوے کی طرح تیز تر ہوتا چلا گیا تاآنکہ ۲۲ رفروری کا سورج طلوع ہوگیا۔

خدا اور رسول ؐ کے نام پر حاصل کی ہوئی مملکت کے حاکموں پر مسلمانوں کو یقین تھا کہ کچھ بھی ہو اپاک سرزمین پر تختِ ختمِ نبوّت تک پہنچنے والے پاؤں سلامت نہیں رہ سکتے۔ وہ ہاتھ جو سرتاجِ انبیاءؐ کے گریبان تک پہنچنے کی گستاخی کرے گا شل کردیا جائے گا۔ وہ آنکھ پھوڑ دی جائے گی جس کے ارادوں میں بُرائی جھلک رہی ہوگی۔ مگر اپنی کرسیوں کے لیے لڑنے والے حاکموں نے پیغمبر خدا علیہ السلام کی نبوّت کو لاوارث قرار دے کر اُس سے اس بے اعتنائی برتی کہ ۲۲ رفروری کا دن اُمید و یاس کے درمیان گذر گیا، اس سے پیشتر لاہور سے کراچی روانہ ہوتے ہوئے امیر شریعتؒ نے دہلی دروازہ کے باغ میں اپنی تقریر کے دوران فرمایا کہ:

"عزیزانِ من! مرزائیت جیسے فتنے کی پرورش برطانیہ نے کی ہے، اگر افغانستان ہوتا تو اس فتنے کا کبھی کا فیصلہ ہو گیا ہوتا امیر حبیب اللہ پر خدا کی ہزار ہزار رحمت ہو جس نے افغانستان کی

حدود میں مرزائیت کو داخل نہ ہونے دیا۔

مرزا غلام احمد قادیانی نے امیر حبیب اللہ کو ایک خط لکھا کہ میں نبی بن گیا ہوں، تم مجھ پر ایمان لاؤ۔

امیر حبیب اللہ نے مرزا غلام احمد قادیانی کو جواب دیا "ایں جا بیا"۔ مرزا غلام احمد وہاں کیسے جاتا؟ اور اگر چلا جاتا تو کچھ نہ کچھ ہو جاتا، اور مرزا غلام احمد کا دماغ درست ہو جاتا۔

آج یہ اجتماع تاریخی اجتماع ہے جو مرزائیوں اور سر ظفراللہ کے خلاف مظاہرہ کرنے کے لیے منعقد ہوا ہے۔ یہ اجتماع مجلس عمل کے زیر اہتمام ہو رہا ہے۔

میں خواجہ ناظم الدین صدر مسلم لیگ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ مسلم لیگ کو قوم کی واحد نمائندگی کا دعویٰ ہے۔ آج لاہور کے تمام مسلمان جمع ہیں جو مرزائی وزیر خارجہ کے خلاف عدم اعتماد اور اپنی بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں۔

یہ وہی جلسہ گاہ ہے جہاں کئی سیاسی تحریکات نے جنم لیا، اور پروان چڑھیں۔ نہرو رپورٹ کے سلسلہ میں بھی غالباً اسی باغ میں تاریخی اجتماع ہوا تھا۔ اور آج مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے اور سر ظفراللہ کو اس کی ذمہ داریوں سے علیحدہ کرنے کے لیے بھی اسی باغ میں اجتماع ہو رہا ہے۔

میں کہتا ہوں خواجہ ناظم الدین صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے

اس باغ میں ایک جلسہ منعقد کریں اور اسلامیانِ لاہور کو اس میں شرکت کی دعوت دیں۔ جلسہ کی صدارت خواجہ صاحب خود کریں، اور پھر ظفر اللہ کے متعلق عوام کا ووٹ حاصل کریں، ان باتوں کا فیصلہ آج ہی ہو جائے گا۔ اگر خواجہ صاحب کے فرمان پر کوئی آدمی بھی نہ آیا تب بھی فیصلہ ہو گیا، اور اگر لوگوں نے آکر ظفر اللہ کے خلاف عدم اعتماد اور بیزاری کا اظہار کر دیا تب بھی فیصلہ ہو گیا۔

خواجہ صاحب نے پچھلی دفعہ ایک تقریر میں کہا تھا کہ کسی کے پیچھے ہجوم کا ہو جانا، کسی جلسے میں زیادہ حاضری اور کثیر اجتماع اس امر کی دلیل نہیں کہ اسے عوام کا اعتماد حاصل ہے۔

میں پوچھتا ہوں کہ "خواجہ صاحب ساری زندگی تو اسے دلیل اور مدار قرار دیتے رہے، وہ اب کیوں گریز فرما رہے ہیں؟ اور اگر اجتماع دلیل نہیں اور کسی کے ساتھ اکثریت کا ہو جانا مدار نہیں تو پھر مسلم لیگ کو واحد نمائندگی کا حق کیسے حاصل ہے؟ اور پھر آپ کس واحد نمائندہ جماعت کے صدرِ اعظم ہیں؟"

امیرِ شریعتؒ نے آئی۔جی پولیس میاں انور علی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"کیا میاں صاحب نے "الفضل" میں شائع شدہ مرزا محمود کا خطبہ یا بیان پڑھا ہے؟ اگر نہیں پڑھا تو اب پڑھیں، اور اس کے ساتھ ساتھ ان پرچوں کو بھی پڑھیں جن میں "الفضل" نے "خونی مُلّا کے آخری دن" لکھ کر علمائے کرام کو قتل کی دھمکی دی تھی۔"

"الفضل" کی عبارت

"ہاں آخری وقت آن پہنچا ہے، اُن علمائے حق کے خون کا بدلہ لینے کا جن کو یہ علماء قتل کراتے آئے ہیں۔ اب اُن کے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔

(۱)۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے، (۲) ملا بدایونی سے، (۳) ملا احتشام الحق سے، (۴) ملا محمد شفیع سے (۵) ملا مودودی پانچویں سوار سے۔"

(الفضل" ۱۵ جنوری ۱۹۵۲ء)

آپ یہ اقتباس پڑھ کر سنا رہے تھے کہ مجمع سے ایک آواز آئی" حکومت اس وقت کہاں سو رہی تھی؟"

"حکومت تو وہیں سو رہی تھی جہاں اب ہے، لیکن تم کہاں سو رہے ہو؟ تم اس مشین کے پرزے ہو۔ میں نے پنجاب کے وزیر اعلیٰ میاں دولتانہ سے ملاقات کی اور "ڈائریکٹر تعلقات عامہ کی وساطت سے اخبار "الفضل" کا یہ اقتباس پڑھ کر سنایا تو میاں صاحب نے ایکشن لینے کا وعدہ کیا۔"

آخر میں امیر شریعتؒ نے فرمایا:

"مجلس عمل کا جو وفد خواجہ ناظم الدین سے ملا تھا، اس وفد کے سامنے خواجہ صاحب مرزائی وکیل کی حیثیت سے پیش آئے اور ظلی بروزی کا جھگڑا لے بیٹھے۔

میں پوچھتا ہوں، خواجہ صاحب ایک وزیر ہیں، انہیں

شیخ الاسلام کس نے بنایا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے علامہ شبیر احمد عثمانی کی وفات کے بعد خواجہ صاحب خود بخود شیخ الاسلام کے فرائض بھی انجام دینے لگ گئے ہیں۔"

عوام سے خطاب کرتے ہوئے امیر شریعت نے کہا :

"تم ناموسِ مصطفٰے کا تحفظ کرو، میں تمہارے کتے پالنے کو تیار ہوں، میں تمہارے سؤر چراؤں گا۔ میں کہتا ہوں مسلم لیگ نے پاکستان بنایا، ملک تقسیم کرایا ہے، یہ انجمن احمدیہ نے نہیں بنایا۔ مرزا محمود اور ظفر اللہ کا پاکستان سے کیا تعلق؟ یہ تو ہم پروردہ سگان برطانیہ آج پاکستان میں دندنا رہے ہیں۔ ہم ان کی یہ غدارانہ سرگرمیاں ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔"

گرفتاری

۲۲ فروری کے بعد مجلسِ عمل نے راست اقدام کے طریق کار پر غور کرنے کے لیے ۲۶ فروری ۱۹۵۳ء کو کراچی میں اپنا ایک اجلاس منعقد کیا جس کی صدارت مولانا ابوالحسنات نے کی اور حسبِ ذیل قرارداد منظور کی :

"۱۸ جنوری کے کنونشن میں مرکزی حکومت کو جو نوٹس دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا، وہ چونکہ مجلس عمل کے ایک وفد نے اس حکومت کے حوالے کر دیا تھا اور ۲۲ فروری کو اس نوٹس کی میعاد ختم ہو گئی ہے، بلکہ مزید چار دن بھی گذر چکے ہیں، اس لیے اب

پرامن راست اقدام کی تشکیل کا فیصلہ کیا جانا ضروری ہے۔
راست اقدام کی تشکیل کے متعلق یہ فیصلہ کیا گیا کہ پانچ رضاکار ایسے جھنڈے اٹھائے ہوئے ہوں گے جن پر یہ ایات ثبت ہوں گے۔
شاہراہِ عام پر سے نہیں بلکہ چھوٹی سڑکوں پر سے بچتے ہوئے وزیر اعظم کی کوٹھی پر جائیں گے۔ اگر وہاں سنتری ان رضاکاروں کو روکے گا تو وہ اس سے کہیں گے کہ وہ وزیر اعظم کی خدمت میں مطالبات پیش کرنے اور ان کو تسلیم کرنے کی درخواست کرنے آئے ہیں، اور وہ اسی صورت میں واپس جائیں گے کہ وزیر اعظم ان مطالبات کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیں۔
اگر یہ رضاکار گرفتار کر لیے جائیں گے تو مجلس عمل پانچ رضاکاروں کا ایک اور دستہ بھیج دے گی اور یہ سلسلہ پرامن طریقے پر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک مطالبات تسلیم نہ کیے جائیں گے۔
گورنر جنرل کی کوٹھی پر بھی اسی قسم کا پہرہ لگایا جائے گا تاکہ یہ نہ سمجھا جائے کہ اس تحریک کا رُخ محض خواجہ ناظم الدین کی طرف ہے کہ وہ بنگالی ہیں۔
مولانا ابو الحسنات محمد احمد اس متحرک تحریک کے پہلے ڈکٹیٹر مقرر کیے گئے اور انہیں گرفتاری کی صورت میں اپنے

جانشین کی نامزدگی کا اختیار دے دیا گیا۔ یہ بھی قرار دیا گیا کہ
اسی دن شام کو آرام باغ میں جو جلسہ عام ہو رہا ہے اس میں عوام
کو مشورہ دیا جائے کہ وہ حسب معمول اپنے کاروبار میں مصروف
رہیں اور رضاکاروں کے ساتھ نہ جائیں۔“

۲۶ر فروری کو آرام باغ میں مجلس عمل کا عظیم اجتماع ہوا جس میں راست اقدام
کمیٹی کے منتخب ارکان کے علاوہ حضرت امیر شریعتؒ نے حسب ذیل تقریر کی ——
خطبۂ مسنونہ کے بعد آپ نے فرمایا:

”مرزائی افسروں نے اپنے عہدوں سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے
اسلامیانِ پاکستان کو کافر اور مرتد بنانے کی ایک ہمہ گیر تحریک کے
ساتھ ساتھ اپنے الہامی عقیدے کی بنا پر پاکستان کو ہندوستان
سے ملانے کی ناپاک تحریک بھی شروع کر رکھی ہے۔ بھولے اور
سادہ لوح مسلمان اقتصادی بدحالی اور معاشی اُلجھنوں سے تنگ
آکر ان کے دامِ تزویر کا شکار ہو رہے ہیں، اور اس طرح
مرزائی اُن کے ایمان پر ڈاکہ ڈالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

۱۶ر اگست ۱۹۵۲ء کو پاکستان کے وزیر اعظم نے اپنے ایک
آرڈی ننس کے ذریعے سرکاری ملازمین پر پابندی عائد کی تھی کہ وہ
کسی مخصوص فرقہ کے عقائد کی تبلیغ نہیں کر سکتے۔

مرزائی افسران نے اس آرڈی ننس کا جو مذاق اُڑایا وہ
حکومت اور عوام دونوں کے سامنے ہے۔

سب سے پہلے مرزائی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ نے اس قانون کی مخالفت کرتے ہوئے بیان دیا کہ ہم اپنے مذہبی عقائد اور ضمیر کی تبلیغ سے باز نہیں رہ سکتے، اس کے بعد میاں نصیر احمد فاروقی چیف سیکرٹری حکومت سندھ، خان بہادر ڈاکٹر سید احمد سپرنٹنڈنٹ ڈاجر سینی ٹوریم، کرنل سید شبیر حسین شاہ انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات اور ان کے علاوہ دوسرے مرزائی افسران نے کئی بار کھلے جلسوں کی صدارتیں کر کے کفر و ارتداد کی تبلیغ کی، اور سرکاری احکام کا کھلم کھلا منہ چڑایا، لیکن ان کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لیا گیا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ در اصل حکومت خود مرزائیت کی تبلیغ کروا رہی ہے۔

ان کے مقابل اگر مسلمان اپنے دینی عقائد اور اسلامی روایات کی تبلیغ کریں تو اسے سرکاری اثر ڈال کر بند کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

تاریخ شاہد ہے کہ دنیا کی قومیں ارباب اقتدار سے اپنے مطالبات کرتی ہیں۔ اور حکومتیں انہیں تسلیم بھی کرتی ہیں مگر ہمارے ارباب اقتدار عجیب ہیں، پوری قوم متفقہ طور پر ان سے مطالبہ کر رہی ہے لیکن ارباب اقتدار کے بہرے کانوں تک قوم کی کوئی آواز نہیں پہنچ رہی اور وہ ملت اسلامیہ کی آواز کو سنی ان سنی کر رہے ہیں۔ مسلمانان پاکستان نے تاج و تخت ختم نبوت کے تحفظ کے سلسلہ میں مرزائیوں کو اقلیت قرار دینے اور مرزائی وزیر خارجہ کو وزارت سے

برطرف کرنے کے متعلق حکومت سے جو مطالبات کئے تھے ارباب اقتدار ان مطالبات کو تسلیم نہیں کر رہے ہیں اور مختلف حیلوں بہانوں سے تحفظ ختم نبوت کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

مجھے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا خواجہ ناظم الدین بھی مرزا بشیر الدین محمود کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ جبھی تو مرزائیوں کے متعلق پوری قوم کے مطالبات کو درخور اعتنا نہیں سمجھ رہے۔ مجھے خصوصی حلقوں سے معلوم ہوا ہے کہ خواجہ ناظم الدین اور مرزائیوں کے درمیان کوئی رشتے ناطے بھی ہو چکے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو مسلمان کسی قیمت پر بھی برداشت نہیں کریں گے، کیونکہ مسلمان قوم کے حکمران وہی ہو سکتے ہیں جو مسلمان ہوں اور محمد عربی کے غلام۔ محمد عربی کے باغی کافر اور مرتد مسلمان قوم کے حکمران نہیں رہ سکتے۔"

تقریر کے آخر میں آپ نے غصے اور جذباتی لہجے میں فرمایا:

"آل مسلم پارٹیز کنونشن نے حکومت کو ایک ماہ کا نوٹس دیا جس کی میعاد چار دن ہوئے ختم ہو چکی ہے۔ ایک ماہ کے مسلسل صبر آزما اور توجہ کے باوجود حکومت نے جس بے اعتنائی کے ساتھ مسلمانان پاکستان کے متفقہ مطالبات کو ٹھکرایا یہ اس حکومت کے زوال کی نشانی ہے۔"

عوام سے خطاب کرتے ہوئے:

"آپ حضرات میری زندگی کے گزشتہ تینتیس سالوں کو جانتے ہیں"

میں نے جس کام میں ہاتھ ڈالا اپنے ضمیر سے مطمئن ہو کر ڈالا، پھر چاہے

سامنے ہی تاج جو آئے میں نے اُسے ہمیشہ ٹھکرا دیا، انگریز جیسی جابر

سلطنت جب میرے مطالبہ کے سامنے نہیں ٹھہر سکی تو اس ملک کے

حکمران، جنہوں نے یہ ملک اللہ اور رسولؐ کے نام پر حاصل کیا تھا

اور آج اُسی ملک میں وہ اپنے قوانین اور حکومت کے زور پر

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کے مرتکب ہو رہے ہیں، کیوں کر

ٹھہر سکتے ہیں۔

۲۷ر فروری کے بعد تا ایں ہم حکومت کے فیصلے کے منتظر

رہے، مگر وہ خاموش تماشائی کی طرح ہمارے جذبات کا امتحان

لیتی رہی۔ اس رات کے بعد قوم جو قدم اٹھائے گی، اس کی

ذمہ داری پھر حکومت پر ہو گی۔ مسلمان ناموسِ مصطفیٰ کے تحفظ کے لئے

اپنی جان تک کی بازی لگانے سے دریغ نہیں کریں گے۔“

اس اجتماع میں غیر ملکی پریس اور فوٹو گرافرز کے علاوہ امریکن ایمبیسی کے

ارکان بھی موجود تھے۔ امیر شریعتؒ کے اندازِ خطابت، طرزِ تکلم کو دیکھ کر انہوں نے

بے ساختہ کہا:

”اگر یہ شخص امریکہ میں ہوتا تو تمام عمر امریکہ کا صدر رہتا۔“

آرام باغ کی اسی تقریر سے متاثر ہو کر سندھ کے ایک وڈیرے نے سعودی عرب کے

اپنے ایک دوست کو خط کے ذریعے اطلاع دی۔

”اگر ہو تاریخ کو آرام باغ میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی

تقریر نہ سنتا، تو شاید میں گمراہ ہو جاتا۔ الحمدللہ کہ اُن کی تقریر نے مجھے گمراہی سے بچا لیا ورنہ قریب تھا کہ میں مرتد ہو جاتا"

رات دو بجے کے قریب یہ اجتماع ختم ہوا۔ تمام رہنما دفتر تحفظ ختم نبوت (بندر روڈ کراچی) میں آرام کرنے کے لئے چلے گئے، ابھی وہ نیند سے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے کہ پولیس کی بھاری جمعیت نے دفتر کی تمام عمارت کو اپنے محاصرے میں لے لیا۔ کراچی کے ذمہ دار پولیس افسروں نے رہنماؤں کو جو اس وقت دفتر میں موجود تھے گرفتار کر لیا۔ یہ ۲۷ فروری صبح چار بجے کا واقعہ ہے، جس میں حضرت امیر شریعت اور اُن کے رفقاء مولانا سید ابوالحسنات قادری، ماسٹر تاج الدین انصاری، صاحبزادہ فیض الحسن، مولانا لعل حسین اختر، سید مظفر علی شمسی اور مولانا عبدالرحیم جو اکبر قابل ذکر ہیں۔ امیر شریعت کی گرفتاری کے بعد مغربی پاکستان سے سینکڑوں افراد کو گرفتار کر لیا گیا سارے ملک نے بغاوت کی سی شکل اختیار کر لی۔ ہر شہر میں حکام اور عوام کے درمیان تصادم ہوا، منڈیاں بند ہو گئیں، شہروں میں ہڑتال کر دی گئی، سرکاری عمارات کو نقصان پہنچایا گیا، ریل کی پٹڑیاں اُکھاڑ دی گئیں، ان حالات کو دیکھتے ہوئے ۶ مارچ ۱۹۵۳ء کو لاہور فوج کے حوالے کر دیا گیا۔

کراچی جیل

زندگی کا سفر طویل ہو کہ مختصر، انسان اس راستے سے گزرتے وقت اُن موڑوں یا صعوبتوں سے ناواقف ہوتا ہے، جہاں کبھی تو اس کا دامن تار تار ہوتا ہے اور کبھی خود آبلہ پا ہو کر صحرا کی ویران وخشک وادیوں کو گلہائے رنگا رنگ سے

موجزن کر دیتا ہے۔ اسکا چمن زار کی بہاریں پھر نسیم صبحگاہی کو جب زندگی کا پیغام دیتی ہیں تو نہ صرف گل بوٹوں میں نکھار پیدا ہوتا ہے بلکہ آشیانوں میں طیور بھی لوگوں سے ہمکلام ہو کر فضاؤں میں جھومنے لگتے ہیں۔

یہ سارا کچھ انسان کے عزم پر موقوف ہے۔ اگر اس میں پختگی نہ ہو تو حوصلے کی بلندی بھی انسان کو پستی کی طرف لے جاتی ہے۔

۳۳ برس ہوئے کہ امیر شریعتؒ صرف ایمان کو زادِ راہ بنا کر عزم و ارادے کے پیرہن میں گھر سے نکلے تھے، اس طویل سفر میں قدم قدم پر جن سنگلاخ وادیوں سے اُن کا گذر ہوا، اُس منزل کا ہر موڑ گواہ ہے اور اس راستے کی ہر شئے شہادت دے گی کہ بادِ سموم کے تند و تیز جھونکے بھی اس مردِ درویش کے عزم و استقلال کی دیواریں نہ گرا سکے ۔

سفینۂ برگِ گل بنا لے گا، قافلہ مورِ ناتواں کا
ہزار موجوں کی ہو کشاکش مگر یہ دریا سے پار ہو گا

تحریکِ ختمِ نبوت سے پہلے کئی سال ہو گئے امیر شریعتؒ کے تمام جسمانی اعضاء اُن سے بغاوت کر چکے تھے، آنکھوں کی بینائی مدھم پڑ چکی تھی کہ عینک لگانے کے عادی ہو گئے ـــ دانت ایک ایک کرکے جواب دے گئے اور اُن کی جگہ اجنبی دانتوں نے سنبھال لی، درد گُردہ کے ایسے مریض ہوئے کہ معالجوں نے خوراک سے چاول ہمیشہ کے لیے نکال دیئے، تبخیرِ معدہ کے باعث کئی کئی گھنٹے پریشان پڑے رہتے، پھر ان سب کی بڑھاپے نے اس قدر حوصلہ افزائی کی کہ ہر مرض بذاتِ خود بغاوت کا علم لے کر اُٹھ کھڑا ہوا، اور

نقاہت کے آثار اس تیزی سے اُبھرے کہ چہرے کی ہڈیاں صاف دکھائی دینے لگیں، اور امیرِ شریعتؒ تاریخ ماضی کے کھنڈرات کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔ ان حالات میں وہ کراچی جیل خانہ میں لائے گئے۔

ستارے رات بھر کے سفر سے تھک ہار کر ڈگمگا رہے تھے، کائنات کی سیاہ چادر پر آسمان کی روشن قندیلیں صبح صادق کے اجالے سے منہ چھپا رہی تھیں کہ مؤذن نے اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْم کا اعلان کر کے مسجد کے مینار دل کو گواہ بنا لیا کہ اس نے سوئی ہوئی انسانیت کو تلاشِ صداقت کا راستہ تجویز کر دیا ہے وہ انسان ہے کہ اپنا اثاثہ حیات ضائع کر سکے ایسا سویا ہے کہ صور اسرافیل سے پہلے اس کا بیدار ہونا مشکل نظر آ رہا ہے۔

مولانا ابوالحسنات کی امامت میں اسیرانِ ختمِ نبوت نے جیل خانہ میں صبح کی پہلی نماز ادا کی اور پروردگارِ عالم کے حضور دعا کی۔

"اے ربِ التوصلہ! ہمارا کوئی جرم اس کے سوا نہیں کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی آبرو باقی رہے، ہم رہیں یا نہ رہیں مگر تیرے دنیا دار لوگوں نے ایوانِ سلطنت میں بیٹھ کر ہماری فردِ جرم پر ہمارے باغی ہونے کی مہر ثبت کی ہے، مگر تو دلوں کا جاننے والا ہے کہ ہماری لڑائی اپنی ذات، اپنے کسی منصب کے لیے نہیں بلکہ تیرے ارشاد کی تعمیل میں ہے کہ

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا ؕ"

رہنماؤں کی آنکھوں میں آنسو، دلوں میں جذبات کا طوفان اُمڈ آیا،
امیر شریعتؒ کی سفید داڑھی پر گر رہے ہوئے آنسو پھولوں پر شبنم کی بہاریں دکھا رہے
تھے۔ سپرنٹنڈنٹ جیل خان عنایت اللہ خان حیدر آبادی نے امیر شریعتؒ اور اُن کے
رفقاء سے کہا: "آپ حضرات جن کوٹھڑیوں میں لائے گئے ہیں، یہ وہی خوش بخت
کوٹھڑیاں ہیں جہاں ۱۹۲۱ء میں مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا شوکت علی
ڈاکٹر سیف الدین کچلو بغاوت کے جرم میں رہ چکے ہیں"۔ یہ سننا تھا کہ انگریزی اقتدار اور
جور و ستم کی ساری تاریخ نقش بہ دیوار ہو کر اُبھر آئی، جیل خانے کی ایک ایک اینٹ
پس دیوار زنداں کی کہانی بیان کرنے لگی۔ امیر شریعتؒ نے جیل خانے کے در و دیوار کو
خطاب کرتے ہوئے کہا:

"اے اُونچی دیوارو، آہنی دروازو! تم گواہ رہنا کہ اگر مولانا
حسین احمد مدنی، مولانا محمد علی جوہر اور اُن کے رفقاء وطن عزیز کی
آزادی کے لئے ۱۹۲۱ء میں تمہارے مصائب جھیل سکتے ہیں، تو
۱۹۵۳ء میں عطاء اللہ شاہ اور اُس کے ساتھی بھی حضور ختم الانبیاء
علیہ الصلوٰۃ والسلام کی آبرو کے لیے تمہارے مصائب و آلام سے
خائف نہیں ہوں گے۔"

امیر شریعتؒ کے ان الفاظ پر سپرنٹنڈنٹ جیل اور دوسرے افسران بہت متاثر ہوئے
کراچی جیل میں گو سرکاری طور پر کلاس کا اعلان نہیں کیا گیا تھا تاہم خورد اک
اُونچے درجے کی ملتی رہی اور سپرنٹنڈنٹ جیل کے بہتر رویہ سے وقت اچھا گزرتا رہا۔
امیر شریعت دیوبندی، ابوالحسنات قادری بریلوی، شیخ الحسن بریلوی، تاج الدین انصاری

دیوبندی اور مظفر علی شمسی شیعہ ، عقیدہ ختم نبوت کی طفیل یہ سب اسیران ختم نبوت پانچ وقت کی نماز مولانا ابوالحسنات کی امامت میں پڑھتے رہے ، نہ تو کسی کا مذہب ضائع ہوا اور نہ ہی کسی کے عقیدے میں فرق آیا ، بلکہ ان کی باہم رفاقت نے اکثر شبہات کا ازالہ کر دیا ۔

امیر شریعتؒ کے اخلاق اور تواضع نے مولانا ابوالحسنات کو اُن کا اس قدر گرویدہ کیا کہ وہ بے اختیار کہنے لگے :

"شاہ جی ! آپ تو اس دور کے ولی ہیں ، مجھے تو آپ سے متعلق بہت کچھ کہا سنا گیا تھا ، لیکن آپ سے قرابت داری نے میری ساری غلط فہمیاں دُور کر دیں ، الحمدللہ"

امیر شریعتؒ یہ سُن کر مسکرائے اور "استغفر اللہ" پڑھتے رہے ۔

حکام کے پیغامات

اس دوران ایک روز سپرنٹنڈنٹ جیل ، وزیر اعظم پاکستان خواجہ ناظم الدین کا پیغام لے کر آئے ۔

"آپ کی گرفتاری کے بعد ملک بھر میں تشدد کی جو تحریک چل نکلی ہے اور اس کے نتیجے میں سرکاری اور غیر سرکاری املاک کو جو نقصان پہنچ رہا ہے آپ اس سے لاتعلقی کا اظہار کریں ، تاکہ ملک میں امن قائم ہو"

اس کے جواب میں امیر شریعتؒ نے کہا :

خواجہ صاحب کو میری طرف سے کہہ دو، مسجد پر قبضہ کر لینے کے بعد آپ جسم کو تڑپنے کی اجازت بھی نہیں دیتے۔"
یہ سن کر سپرنٹنڈنٹ جیل اپنا سا منہ لے کر چلے گئے۔
گرفتاریوں سے قریباً پندرہ دن بعد لاہور سے سی، آئی، ڈی کے دو ذمہ دار افسر کراچی جیل میں راہنمایانِ ختمِ نبوت سے ملنے آئے اور کہا
"اگر آپ حضرات یہ کہہ دیں کہ تحریک ختمِ نبوت، دولتانہ کے ایما پر چلائی گئی ہے تو حکومت آپ کو رہا کرنے کے لیے تیار ہے۔"
ممکن ہے نکہتِ بادِ بہاری کی اس پیش کش پر نو اسیرانِ بلاقفس کی تہلیوں سے آزادیِ پرواز کے شوق میں موسمِ گل سے نامہ و پیام کرتے، کہ امیرِ شریعتؒ درمیان میں بول اُٹھے:
"یہ جھوٹ ہے، دولتانہ ایک دُنیادار انسان ہے، اور تحریکِ ختمِ نبوت پاک جذبات کی محرک، اس کی ذمہ داری کسی فاسق و فاجر پر نہیں ڈالی جا سکتی، جاؤ اپنی حکومت سے کہہ دو یہ تحریک میں نے چلائی ہے، اور اس کا ذمہ دار بھی میں ہوں۔"
امیرِ شریعتؒ کے یہ تیور دیکھ کر سی، آئی، ڈی کو اپنے ارادے کی ساری بساط اُلٹنی پڑی۔

سکھر جیل

تحریک اپنے شباب پر تھی، عوام اور حکومت کے درمیان کھچاؤ بڑھ

رہا تھا۔ محلاتی سازشوں کے جال صوبائی سیاست کو اپنی لپیٹ میں لے چکے تھے۔ پاکستان کے گورنر جنرل ملک غلام محمد جو تحریک ختم نبوت سے پیشتر خواجہ ناظم الدین کی حکومت کے گرد سازش کا ایک مضبوط ہالہ تیار کر چکے تھے جس کے باعث سندھ مسلم لیگ پارلیمانی پارٹی کے ممبران صوبائی مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے محمد ایوب کھوڑو، خواجہ ناظم الدین سے بغاوت کر چکے تھے، سرحد پہلے سے باغی تھا، تحریک ختم نبوت نے پنجاب کے حالات بھی گورنر جنرل کے حق میں ہموار کر دیے اور خواجہ ناظم الدین کے خلاف اُن کی اندرونی سیاست بھی کامیاب ہو کر رہی کہ انہوں نے ۱۷ اپریل ۱۹۵۳ء کو یکایک خواجہ ناظم الدین کی حکومت کو برخاست کر دیا، اس سے پیشتر پنجاب کے وزیر اعلیٰ مسٹر دولتانہ کی معزولی پر خواجہ ناظم الدین سے دستخط کرا لیے گئے تھے۔

خواجہ ناظم الدین کی جگہ مسٹر محمد علی بوگرہ کو جو اُن دنوں امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے، نیویارک سے بلوا کر پاکستان کا وزیر اعظم مقرر کر دیا۔

یہ سارا کچھ اس ڈرامائی انداز میں ہوا کہ خود حاکموں کو بھی اپنی معزولی کا علم نہ ہو سکا، جیسے خواجہ ناظم الدین نے اپنی برطرفی کا اعلان ریڈیو پر سُنا۔

حکام بالا ان کھیل تماشوں میں مصروف تھے۔ شہری عوام، پولیس اور فوج سے دست و گریباں تھے کہ ۲۹ اپریل ۱۹۵۳ء کو حضرت امیر شریعت اور اُن کے ساتھ مولانا ابو الحسنات، صاحبزادہ فیض الحسن، مظفر علی شمسی، عبدالرحیم جوہر کو کراچی سے سکھر جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

مغربی پاکستان میں جن جیل خانوں کو اپنے اندرونی ماحول کے باعث خوفناک

ہر اس کا مرکز قرار دیا گیا ہے یا جن کے ناز کو جرائم پیشہ عناصر نے قبول کر کے پناہ مانگی، ان میں سرحد کی ہری پور جیل، پنجاب میں ساہیوال اور میانوالی کے جیل خانے، بلوچستان میں مچھ جیل اور سندھ میں سکھر کا جیل خانہ مشہور ہیں۔

آخر الذکر جیل خانہ کو دریائے سندھ سے نکلی ہوئی نہر پر تعمیر کیا گیا ہے، جس کی وجہ سے مچھر اور کھٹمل اس بندی خانے کی خاص سوغات ہیں۔ موسم گرما میں سندھ کی تپتی ہوئی ریت بادِ سموم کے دنوں جب آگ اگلتی ہے تو سارا سندھ جہنم کدہ معلوم دیتا ہے اس پر بھی سکھر جیل کی پیداوار (کھٹمل اور مچھر) محدود نہیں ہوتی۔ حالانکہ پنجاب کی گرم ہوائیں ان بلاؤں کا خاتمہ کر دیتی ہیں۔ لیکن سکھر کا جیل خانہ اپنی ان خصوصیات کے ساتھ نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ اور اُن کے رفقاء جب اس جیل میں داخل کئے گئے تو موسم گرما اپنے شباب میں قدم رکھ رہا تھا، سندھ کے ریگستانوں میں بالو ریت کے گھروندوں سے بادِ سموم کی اٹھکیلیاں ستی کے قدموں کی تلاش میں سرگرداں تھیں، لیکن پنوں کو لے جانے والے اونٹ ان نشانوں کو بھی سمیٹ کر لے گئے تھے مگر عشق ہے کہ ہنوز تلاشِ محبوب میں بگولوں کا روپ دھار کے صحراؤں کے دامن تار تار کر رہا ہے۔

موسم کے اس جلاؤ میں امیر شریعتؒ کو قانون اور سیاسی انتقام کے ملے جلے جذبات سے سکھر کے جیل خانہ میں ڈال دیا گیا۔

خوراک

غیر ملکی حکمرانوں نے اپنے سیاسی حریفوں سے جیل خانوں میں ہمیشہ شرافت کا

برتاؤ کیا، تعلیم، شہرت، خاندانی رکھ رکھاؤ، سزا دیتے وقت وہ ان سب کے پس منظر میں ایک نظر جھانک لیتے تھے اور سیاسی مجرم کے ذاتی اور اجتماعی حقوق ہمیشہ بحال رکھتے، لیکن ۱۹۵۳ء کے مسلمان حکمرانوں نے مذہبی رہنماؤں سے جو سلوک کیا، ماضی قریب کی تاریخ کا اس قدر گھناؤنا باب ہے کہ اس کی پردہ دری سے سوا اُسے شرمندگی کے اور کچھ نہیں ہے۔

حضرت امیر شریعتؒ ۱۹۲۱ء میں پہلی مرتبہ جیل خانے گئے تو انگریزی قانون نے انہیں اپنے خیال میں بغاوت کا مجرم قرار دیا تھا، اس پر بھی انہیں سپیشل کلاس قیدیوں کی خوراک دی گئی۔ نیز ۱۹۴۷ء تک وہ جب بھی اسیرِ فرنگ ہوئے، انہیں اسی درجے کا مستحق سمجھا گیا، لیکن ۱۹۵۳ء کی تحریک نہ تو حکومت کے خلاف تھی اور نہ ہی اسے ملکی بغاوت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ خالص مذہبی نوعیت کی تحریک کو بغاوت کہنا اسلام کے بنیادی اصولوں سے عدم واقفیت کے مترادف تھا مگر اس دور کے مسلم لیگی حکمرانوں نے صرف ذاتی وقار کے لیے اس تحریک کے قیدیوں سے جیل خانوں میں ایسا برتاؤ کیا کہ جیل مینول (Jail Manual) بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔

سکھر جیل کا بلاک نمبر ۲ جس کا رقبہ اپنی وسعت کے اعتبار سے ان قیدیوں کی حیثیت کے مطابق نہیں تھا، لیکن حکامِ جیل نے انہیں یہیں رکھنا مناسب سمجھا اس کے صحن میں نہ تو سائے کے لیے درخت تھا اور نہ پانی کا معقول انتظام، ہر قیدی کو نہانے کے لیے صرف ایک لوٹا پانی ملتا تھا، نو قیدی نو لوٹے پانی لے کر ایک قیدی کے نہانے کا انتظام کرتے، اور اس طرح ایک آدمی کی باری نو دن کے بعد آتی تھی۔ خوراک میں چاول کے آٹے کی روٹی، گھاس پھوس کی تیل کے

ترٹکے کی سبزی مسور کی دال ، قریباً پندرہ دن یہی خوراک دی جاتی رہی کیونکہ بی کلاس کے کاغذات آنے میں دیر ہو گئی تھی ، حالانکہ قیدی کی ایک جیل سے دوسری جیل میں تبدیلی کے ساتھ ہی اس سے متعلقہ کاغذات بھیج دیے جاتے ، مگر ختم نبوت تحریک کے قیدیوں سے امتیازی سلوک کے پیش نظر حکام کی یہ حرکت بھی اپنی جگہ عجیب رہی ، اس غفلت اور سی کلاس خوراک کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت امیر شریعتؒ کی بیماری (شوگر اور دردِ گردہ) میں اس قدر اضافہ ہوا کہ آخر کو یہی امراض جان لیوا ثابت ہوئیں۔ کیونکہ حکماء کی تاکید تھی کہ چاول کبھی استعمال نہ کریں۔ لیکن چاول کے آٹے کی روٹی بہر حال کھانی پڑی ، اور بہتر خوراک کے کاغذات پہنچنے تک ، امیر شریعتؒ اپنی رہی سہی توانائی بھی ضائع کر بیٹھے اور مسور کی دال کا بینائی پر بھی اثر ہوا۔ ان دنوں سکھر جیل کا درجہ حرارت ۱۲۴ ڈگری تک پہنچ چکا تھا۔ جیل میں پانی کی قلت ، سایہ کی کمی اور خوراک کی بے ضابطگی ، ایسی بے اعتدالیوں کو دیکھ کر حضرت امیر شریعتؒ سکھر کے جیل خانہ کو سقر (جہنم) کہا کرتے تھے۔

محمد علی بوگرہ کی آمد

تحریک ختم نبوت کے باعث پاکستان کی سیاست میں عاجلانہ طور سے اکثر ایسی تبدیلیاں آئیں کہ عوام اور خود حکمران پارٹی کو بھی اس کا یقین نہیں تھا مثلاً صوبہ سرحد کے خان برادران کا وجود مسلم لیگی حکمرانوں کے لیے دشمنی کا انتہائی بلند مقام رکھتا تھا۔ لیکن سیاسی ضرورت نے اس دشمنی کو دوستی میں راتوں رات

بدل دیا۔ ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان نے اپنی کابینہ کے رُکن سکندر مرزا کے مشورے سے ڈاکٹر خان کو حکومت کے قریب کر لیا۔ عبدالقیوم خان پہلے سے ہی محمد علی بوگرہ کی وزارت میں داخل ہو چکے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صوبہ سرحد کی سیاسی چپقلش ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ لیکن پنجاب کے امن کی باگ ڈور تحریک ختم نبوت کے رہنماؤں کے ہاتھ میں تھی، اور وہ سب کے سب جیل خانوں میں تھے۔ چنانچہ اس کام کے لیے گورنر جنرل پاکستان نے اپنے نامزد وزیر اعظم محمد علی بوگرہ کو سکھر جیل میں بھیجا۔

"آپ حضرات اگر اپنی تحریک کے سلسلے میں حکومت کے رُوبرُو معذرت کر دیں تو آپ کو رہا کر دیا جائیگا میں اسی کام کے لیے آپ سے ملنے آیا ہوں"

وزیر اعظم پاکستان کے یہ الفاظ حضرت امیر شریعتؒ اور اُن کے ہم اسیرانِ قفس کے لیے نئے نہیں تھے، اس سے پیشتر اس قسم کی پیشکش کراچی جیل میں سابق وزیر اعظم کی طرف سے بھی ہو چکی تھی۔

امیر شریعتؒ نے محمد علی بوگرہ کو نہایت مختصر جواب میں فرمایا:

"آپ حضرات کو ہماری اس قدر فکر کیوں ہے؟ ؎

سبُو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا
کیے جاؤ میخوارو! کام اپنا اپنا"

وزیر اعظم پاکستان امیر شریعتؒ کا یہ شعر سُن کر تھوڑی دیر ٹھہرے اور واپس چلے گئے۔

بھوپت ڈاکو

جب بُرائی اپنی منزل پر پہنچ کر دم توڑ دیتی ہے، تو نیکی اپنے سفر کا آغاز کرتی ہے۔

بُرائی گفتار میں ہو کہ کردار میں، انسانیت کے لیے سم قاتل ہے، جب اس میں پنہاں گی سرایت کرتی ہے تو اچھا بھلا آدمی بھی آدمیت سے محروم ہو کر سماج کی نظر میں آدمی نہیں رہتا۔ بلکہ اس کا ہر کردار سوسائٹی میں بُرائی کی تخم ریزی کرتا ہے، اور پھر ایک وقت آتا ہے کہ بُرائی کا ہر بیج کانٹا بن کر اس کے اپنے حلق میں پیوست ہو جاتا ہے اور یہی نیکی اور بُرائی کا سنگم ہے، اگر کانٹا حلق سے نیچے اتر جائے تو بگھیں آدمی بُرائی کا خالق بن کر ابلیس کے بھی پر کترنے لگتا ہے ورنہ برشت اچھی ہو تو کانٹا اُگل دینے میں دیر نہیں لگتی۔

۱۹۴۷ء کے بعد بھارت کی سرزمین کو وہاں کے دانش وروں نے اپنی غلط کاریوں کے باعث انسانوں کے لیے جہنم کدہ بنا دیا۔ بھوک، افلاس اور فرقہ پرستی نے آدمی کو آدمیت سے اس قدر بیگانہ کر دیا کہ پھر اس دھرتی کی کوکھ سے چور، ڈاکو اور قاتلوں نے جنم لینا شروع کیا۔ بھوپت ڈاکو اسی دور کی پیداوار ہے، راجپوتانہ کا علاقہ اس کی زد میں تھا۔ آس پاس کی خشک پہاڑیاں اس کی آماجگاہ تھیں۔ دولت مندوں کو لوٹ کر اُن کا سرمایہ غریبوں میں تقسیم کرنا اور اس کے لیے اس کی قتل و غارت گری نے تمام راجپوتانہ کے افراد کو ہراساں کر دیا تھا۔ بھارت کا قانون، پولیس اور فوج اپنی ساری قوت کے باوجود بھوپت ڈاکو کو اُس کی

غیر آئینی حرکات سے روک نہ سکی۔ حالانکہ راجپوتانہ کے پتھر اور ریت کے ذرات تک حکومت کے معاون تھے، اونچے پہاڑوں کی چوٹیاں بھوپت ڈاکو کی چغلی کھا رہی تھیں، مگر برائی عزم انسانی کی ہمراہی میں اس قدر توانا ہو چکی تھی کہ حکومت کے ذرائع بھی اُسے شکست دینے میں ناکام رہے۔

۱۹۵۳ء کے شروع میں بھوپت ڈاکو اپنے غیر آئینی افعال کے باعث بھارت سے بھاگ کر تھرپارکر کے راستے پاکستان میں داخل ہوتے ہی سرحد پر گرفتار کر لیا گیا، اسے سکھر جیل میں امیر شریعت کے برابر والے احاطے میں رکھا گیا تھا۔

جیل خانے کی...... آہنی دیواریں توڑ کر بھوپت ڈاکو ہر روز امیر شریعتؒ سے کسی نہ کسی طرح ملنے آجاتا اور پہروں بیٹھا رہتا، اس کی مسلسل اور پیہم بیٹھک نیز حضرت امیر شریعتؒ کے اخلاقی اور روحانی اثر نے بھوپت ڈاکو کو امیر شریعتؒ کا گرویدہ بنا دیا۔

سکھر جیل کے مصائب نے امیر شریعتؒ کو اس قابل نہیں رہنے دیا تھا کہ وہ اپنی صحت کے سوا کسی دوسرے کی فکر کرتے، مگر اسلام کے اس عظیم مبلغ نے اس جہنم کدہ میں بھی اپنے فرائض سے کوتاہی نہیں کی۔ قرآن کریم اور حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روزانہ درس نے بھوپت ڈاکو کو انسانیت کی وہ راہیں دکھائیں جس سے بھٹکے، اُسے برسوں گذر چکے تھے۔ گناہوں کی وہ آگ جس نے بھوپت کی آدمیت کو جلا کر راکھ کر ڈالا تھا، اور اُسے اپنے انسان ہونے پر شبہ ہونے لگا تھا، اسی آگ کی ایک ایک چنگاری رُشد و ہدایت کے پھول برسانے لگی، وہ اسلام کا

اس قدر سمجھ چکا تھا کہ ممکن ہے مسلمان ہو جاتا، مگر بھارت گورنمنٹ نے اپنے مجرم کا پاکستان گورنمنٹ سے مطالبہ کر لیا، اور بین الاقوامی قانون کے مطابق بھونیت ڈاکو کو بھارت سرکار کے حوالے کر دیا گیا۔

لاہور سنٹرل جیل

مسلم لیگی حکمرانوں کی ناعاقبت اندیشی اور عوام کے مذہبی جذبات کے باعث ۱۹۵۳ء میں جو کچھ ہوا، وہ تمام تاریخ کے دامن میں محفوظ کر دیا گیا ہے امروز و فردا میں جب بھی یہ گرہ کھلے گی تو حقیقت شفاف پانی کی طرح نظر آئے گی۔

۱۹ جون ۱۹۵۳ء کو گورنر پنجاب نے آرڈی ننس نمبر ۳، ۱۹۵۳ء صادر کیا جس کی رو سے ان واقعات کی تحقیقات مقصود تھی، جن کے باعث ۱۹۵۳ء میں مسلمان اور مرزائیوں کے درمیان ہنگامہ ہوا تھا۔ چنانچہ چیف جسٹس مسٹر محمد منیر (صدر تحقیقاتی عدالت) اور مسٹر ایم۔ آر۔ کیانی (ممبر تحقیقاتی عدالت) پر مشتمل ایک ڈویژن بنچ مقرر کیا جس نے یکم جولائی ۱۹۵۳ء کو اپنی کارروائی کا آغاز کیا۔

تحقیقاتی عدالت نے دیگر جماعتوں کی طرح مجلس احرار کو بھی فریق قرار دیا، احرار رہنماؤں نے جو ان دنوں لاہور سنٹرل جیل میں محبوس تھے، تحقیقاتی عدالت کے ذریعے حکومت مغربی پاکستان سے مطالبہ کیا کہ مجلس احرار کے ممتاز رہنما چونکہ مختلف جیلوں میں بند ہیں ان سے باہم مشورہ ضروری ہے، لہٰذا ان سب کو لاہور سنٹرل جیل میں اکٹھا کیا جائے تا کہ تحقیقاتی کمیشن کے راستے میں الجھاؤ پیدا نہ ہو۔ زعمائے احرار کے اس مطالبے میں جیسے جیسے تاخیر ہوتی گئی، تحقیقاتی کمیشن کا اصرار بڑھتا رہا،

تا آنکہ ۲۵ جولائی ۱۹۵۳ء کو سکھر جیل کے اسیران جن میں امیر شریعتؒ کے علاوہ مولانا ابو الحسنات، مظفر علی شمسی، صاحبزادہ فیض الحسن اور دوسرے رہنما شامل تھے۔ لاہور سنٹرل جیل میں لائے گئے۔

لاہور کا یہ تاریخی جیل خانہ جس کی جگہ اب "شادمان کالونی" آباد ہے، اپنی تاریخ کا واحد جیل خانہ تھا، اس کی ایک ایک کوٹھڑی ایک ایک بارک حریت پسندوں پر کیے جانے والے ظلم و جور کی داستانیں سنا سکتی تھیں۔ اس کی آنکھوں نے ان نوجوانوں کو پھانسی چڑھتے دیکھا تھا جن کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ غیر ملکی سامراج کے خلاف صف آرا تھے، اس کے کانوں نے بیبنری کی وہ آوازیں سنی تھیں، جو رضاکاروں کو ٹکٹکی سے باندھ کر صرف اس جرم میں مارے جاتے کہ وہ اپنے ملک میں غیر ملکی راج پسند نہیں کرتے تھے۔ لاہور سنٹرل جیل کی اونچی دیواروں نے اُن نوجوانوں کو بھوک سے سسکتے اور...... مرتے ہوئے دیکھا تھا جو جیل خانے کے غلط نظام کی اصلاح چاہتے تھے، آزادئ وطن کے جرم میں تڑپ تڑپ کر مرنیوالوں کا تماشہ دیکھنا تو اس بندی خانے کا روز کا شغلہ بن گیا تھا۔

اگر برِ صغیر کی تقسیم میں انگریز کا دخل نہ ہوتا تو لاہور سنٹرل جیل قومی عجائبات کیلئے مخصوص کر لی جاتی، مگر........ ع

منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے

۱۹۴۰ء کے مشہور مقدمۂ بغاوت کے بعد امیر شریعتؒ پہلی بار اس جیل میں آئے تھے، قفس کے دیوار و در دیرینہ مجرم کو دیکھ کر اس قدر بے قابو ہو کر اسیرانِ قفس بھی اپنی تیلیاں توڑ کر موسم بہار کا مزہ لینے لگے۔ امیر شریعتؒ نے

اکثر رفقا بیشتر سے اس جیل میں موجود تھے، جن میں شیخ حسام الدین، مولانا محمد علی جالندھری، مولانا محمد حیات ان سب کو دیوانی احاطے میں رکھا گیا تھا۔ امیر شریعتؒ اور مولانا ابوالحسنات بھی یہیں رہے۔

سنٹرل جیل میں امیر شریعتؒ کی آمد سے محفل عشاق میں رونق آگئی، گو امیر شریعتؒ کے پاس دلِ زندہ کے سوا اب کوئی دولت باقی نہیں تھی۔ صحت عمر رفتہ کے..... ساتھ رخصت ہوچکی تھی .... رہی سہی کسر سکھر جیل نے پوری کردی نقاہت کے باعث امیر شریعتؒ کا پُربہار چہرہ پت جھڑ کے موسم کی طرح اپنا رنگ و روغن ضائع کرچکا تھا، تاہم وہ اپنی گراں بہا دولت کہ "زندگی زندہ دلی کا نام ہے" کے سہارے جنگل میں منگل بنا کر اسیرانِ ہم قفس کے ساتھ وقت گزارنے لگے۔

موقف اور اعتماد

عوامی زندگی میں ہمسفروں پر اعتماد اسی قدر لازمی ہے جس قدر انسانی اعضاء پر بھروسہ کرنا ضروری ہے، ورنہ نہ تو گھر کا نظام چل سکتا ہے اور نہ ہی سیاسی جماعتیں زندہ رہ سکتی ہیں۔

امیر شریعتؒ نے صاحب رائے اور ذاکر الکلام ہونے کے باوجود... جماعتی زندگی میں رفقا کار و ں تک کو اپنے بھروسے میں لیا اور قافلہ ہائے حیات کے ایک ایک فرد پر اعتماد کی ایسی عمارت استوار کی کہ ہر آدمی کو اپنے اعتماد کا وارث قرار دے دیا۔

تحقیقاتی عدالت کے روبرو مجلسِ احرار اور مجلسِ تحفظِ ختم نبوت کا موقف

واضح کرنے کا سوال آیا، تو مشترک رہنماؤں کا ایک خصوصی اجلاس جیل میں منعقد ہوا جس میں مختلف احباب نے اپنا اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے تحقیقاتی کمیشن کے ساتھ تعاون پر زور دیا، اجلاس میں دوستوں کی رائے سُن کر امیر شریعتؒ نے ایک سرد آہ کے ساتھ فرمایا:

"آپ دوست جو فیصلہ چاہیں، کریں میں اس سے انحراف نہیں کروں گا، آپ حضرات کی باتوں نے میرے دماغ کو متاثر کیا ہے، لیکن میں اپنے دل کو کیا کروں، یہ میرا ساتھ نہیں دے رہا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ کمیشن ہمارے ساتھ انصاف نہیں کرے گا بلکہ ارباب حکومت نے ہمیں رُسوا کرنے کے لیے ایک خوبصورت چال چلی ہے۔

اگر میری مانو، تو ہمیں کمیشن سے عدم تعاون کا اعلان کر دینا چاہیئے، پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

ویسے آپ لوگوں نے شہید گنج اور ۱۹۴۶ء کے انتخاب کے موقع پر بھی میری بات نہیں مانی تھی اور آخر وہی ہو کر رہا جس کا میں نے اظہار کیا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اب بھی آپ میری بات نہیں مانیں گے۔ تاہم اگر آپ حضرات اس پر مُصر ہیں، تو پھر ہمیں مشروط تعاون پر آمادگی ظاہر کرنی چاہیئے کہ ہمارا اصل فریق مخالف چونکہ قید و بند سے باہر ہے، اس لیے بانو اُسے بھی ہمارے ساتھ یہاں لایا جائے تاکہ مقدمہ کی پیروی کے لیے ہم

ہم دونوں کے وسائل اور ذرائع یکساں ہوں، یا پھر ہمیں آزاد کر دیا جائے تاکہ ہم بھی اپنا موقف آزادانہ ماحول میں واضح کر سکیں۔ ایک فریق کو آزاد اور دوسرے کو سلاخوں میں بند کر دینے کی عملی صورت ہی اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ارباب حکومت اپنا فیصلہ صادر فرما چکے ہیں۔ میری مانو، تو اپنی زندگی کا بقیہ حصہ قید و بند کی نذر کر دو، اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کر دو۔ وہ بہتر کارساز ہے۔ لیکن اگر آپ حضرات اس کے لیے آمادہ نہ ہو سکیں تو میں آپ کے فیصلے کا پورا پابند رہوں گا اور ان شاء اللہ اس پر عمل کروں گا۔ ہمارے ہاں تو جماعت نام ہے چند دوستوں اور ساتھیوں کی رفاقت کا۔"

امیر شریعتؒ کی اس تقریر کے باوجود اجلاس نے فیصلہ کیا کہ مجلس احرار کو متوقع نتائج سے بے پروا ہو کر من حیث الجماعت تحقیقاتی عدالت کے سامنے اپنا موقف پیش کر دینا چاہیے۔

سکھر جیل کا تذکرہ

جیل کی زندگی اسیرانِ بلا کے لیے عجیب و غریب ہوتی ہے، گاہ یہ لوگ خزاں میں بھی بہاروں کا سا سماں پیدا کر لیتے ہیں، اور گاہ ان کی زندگی میں ایسا موڑ آتا ہے کہ گھروں کی یاد بہاروں کا موسم بھی ویران کر دیتی ہے۔ اسی قسم کی ایک محفل آرائی میں امیر شریعتؒ نے دوستوں کے اصرار پر سکھر جیل کے واقعات بیان

کرتے ہوئے فرمایا :۔

"کراچی کے ارباب اختیار نے ہم بوڑھوں (مولانا ابوالحسنات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کے ساتھ کیا سلوک کیا، اور پھر سکھر جیل کے افسروں کی اخلاق باختگی اور ان کی سرد مہری کے واقعات سنائے اور کہا کہ جون جولائی کی ہلاکت خیزیاں، سکھر جیل، پھر اس کے رحم دل اور ذرہ نواز ارباب اختیار، بس یہ تو میرے اللہ میاں کا فضل و کرم ہوا کہ ہم وہاں سے زندہ اور سلامت آ گئے ہیں، ورنہ ان لوگوں نے اپنی جانب سے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔

چاول اور نامعلوم اشیاء کے امتزاج سے جو سخت سے سخت ردی تیار ہو سکتی تھی وہ ہمارے لئے مہیا کی جاتی تھی۔ ساگ پات کی جگہ گھاس پھونس اور مسلسل مسور کی دال، یہ ہمارے لئے سب سے بہتر خوراک تھی اور یہ تھا صحت افزا مقام۔ تپتے ہوئے مختصر قبر نما کمرے جن سے معمولی ہوا کا گزر بھی مشکل سے ہو سکے، یہ تھی ہماری قیام گاہ۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان تکلیف دہ اور دلگداز حالات میں میری صحت کا ستیاناس ہو گیا۔ جسم پر پہلے گرمی سے دانے نمودار ہوئے پھر وہ سخت پھوڑے بن گئے، جنہوں نے میرے بدن میں اس طرح آگ لگا دی جس طرح کہ دہکتے ہوئے انگارے جسم پر رکھ دیئے گئے ہوں۔ متحدہ ہندوستان میں میں نے سخت سے سخت جیلخانے دیکھے ہیں

اور سفاک سے سفاک جیل کے انگریز افسروں سے بھی واسطہ پڑا ہے اور بعض افسروں سے تو ایسی ٹھنی کہ رہائی تک اکھاڑہ جما رہا ہے لیکن سکھر جیل میں ہمارے ساتھ کچھ ایسا نرالا ہی سلوک ہوا ہے۔

میں قید و بند کے مصائب بیان کرنے کا عادی نہیں ہوں، بلکہ ان کا تذکرہ معیوب سمجھتا ہوں۔ لوگ حوالات میں ایک رات کاٹ آئیں تو باہر آ کر اخبارات کے نمبر نکال لیتے ہیں اور زنداں کی ساعتیں منٹوں میں حساب لگا کر بیان کی جاتی ہیں۔ بابو! یہ پروپیگنڈے کی دنیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے تو ہمارے لئے جیل خانہ ایک گلشن بنا دیا ہے۔ پھولوں تک رسائی کانٹوں سے اُلجھنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ ایسے ہی گلشن زندگی میں ہم تلخیوں اور تنگیوں کے بعد ہی ثمر مُراد پا سکتے ہیں۔ سبحان اللہ! انہوں نے کتنی بلند بات کی ہے۔ رَبِّ السِّجْنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدْعُوْنَنِیْٓ اِلَیْہِ (اے میرے پروردگار یہ قید خانہ مجھے اس سے کہیں زیادہ محبوب ہے جدھر وہ مجھے بُلا رہے ہیں۔)

یوسف علیہ السلام کے ذکر سے مجھے ڈسٹرکٹ جیل یاد آ گئی، ۱۹۳۰ء کے ایام اسیری میں ایک رات میں سورۃ یوسفؑ کی تلاوت کر رہا تھا، چاندنی رات پورے نکھار پر تھی، فضا میں سناٹا اور ماحول دم بخود۔ ایسے میں تلاوت قرآن مجید میں رات کا کچھ سماں بیت گیا۔ اتنے میں داروغہ جیل پنڈت رام جی لال نے مجھے

پیچھے سے پکارا۔ مڑ کر دیکھا تو اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی۔ کہنے لگا "شاہ جی! خدا کے لئے بس کر دو، میرا دل قابو سے باہر ہو رہا ہے۔ اب مجھ میں رونے کی سکت نہیں ہے"

بھائی! قرآن پڑھا جائے تو آج بھی اس کے اعجاز دکھائی دیتے ہیں

خیر! ـــ تذکرہ سکھر جیل کا ہو رہا تھا، میری تو بھلی پوچھئے میں تو سرد گرم چشیدہ تھا اور پوری زندگی جیل یا ریل کی نذر ہو گئی ہے، یہ بڑے میاں (مولانا ابوالحسنات) بے چارے اس وادیٔ پُرخار میں پہلی بار قدم رنجہ ہوئے تھے، مجھے ان کا بڑا احساس رہا لیکن ماشاء اللہ ان کو تو میں نے اپنے سب ساتھیوں سے صابر و شاکر پایا۔"

مولانا مجاہد الحسینی کا کہنا ہے کہ شاہ جی کے ان ارشادات کے بعد میں نے استفہاماً شاہ جی کی خدمت میں عرض کیا، "آپ حضرات کے ساتھ اس قسم کے افسوسناک سلوک کا محرک کہیں انسپکٹر جنرل جیل خانہ جات (جو مرزائی تھا) کا انتقامی جذبہ تو نہیں ہے؟" اس پر شاہ جی نے ایک بار میری جانب دیکھا اور پھر خاموش ہو گئے۔

اسیرانِ مارشل لاء

تحریک ختم نبوت میں جن لوگوں کو مارشل لاء کے تحت سزائیں ہوئیں وہ سب کے سب لاہور سنٹرل جیل میں ہی میعادِ اسیری گزار رہے تھے ان کی خواہش ہوئی کہ حضرت امیر شریعتؒ سے ملاقات کریں، چنانچہ ایک دن صبح ناشتے پر

بیٹھے ہی تھے کہ دیوانی احاطہ کے انچارج نے امیر شریعتؒ سے عرض کی کہ ——
اسیرانِ مارشل لاء شوقِ دید میں حاضر ہونا چاہتے ہیں۔ امیر شریعتؒ ننگے پاؤں اور ننگے سر ان لوگوں سے ملنے کے لیئے بے محابہ احاطہ کے دروازے پر پہنچ گئے۔ قیدیوں نے ہتھکڑیوں اور بیڑیوں کی جھنکار سے امیر شریعتؒ کا استقبال کیا۔

امیر شریعتؒ نے اسیران کو گلے لگایا، اور اُن کے آہنی زیورات کو بوسہ دیا اور پھر اشک بار آنکھوں اور غمناک لہجے میں فرمایا:

"آپ لوگ میرا سرمایۂ نجات ہیں، میں نے دُنیا میں آپ سے کچھ روٹی اور پیٹ یا کسی مادی مفاد کے لیئے نہیں پکارا۔ لوگ اس کے لیئے بھی بڑی بڑی قربانیاں کرتے ہیں، میں نے تو آپ کو اپنے نانا حضرت خاتم النبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی عزت و ناموس کے تحفظ کی دعوت دی ہے۔ اور آپ لوگ صرف اور صرف اسی مقدس مقصد کے لیئے قید و بند اور طوق و سلاسل کی یہ صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں۔

آپ میں سے ایسا کوئی نہیں، جو سیاسی شہرت یا ذاتی وجاہت چاہتا ہو۔ آپ جیل میں بھی غیر معروف ہیں، اور جب اس دیوانہ زنداں سے رہا ہوں گے، تو باہر آپ کا استقبال کرنے والا اور پھولوں کے ہار ڈال کر نعرے لگانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔

نیت اور ارادے کے اعتبار سے جس کی آمد اس مقصد کے لیئے ہوئی ہے وہ یہی مقصد لے کر واپس چلا جائے گا۔ میرے لیئے اس سے بڑا سرمایۂ افتخار اور کیا ہو سکتا ہے۔"

کسی ایک قیدی نے ایک دوسرے قیدی کا تعارف کراتے ہوئے کہا،
"شاہ جی! تحریک میں اس کا بھائی گولی کا نشانہ بن چکا ہے،
اس کے لیے دعا فرمائیں"
امیر شریعتؒ نے تحریک کے دوران حکومت کی طرف سے تشدد وانہ کارروائیوں کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:
"بھائی! ہم ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت یا عوام تشدد پر اُتر آئیں، اور کوئی ناخوشگوار صورت نمودار ہو جائے۔ میں نے کراچی جیل میں جب لاہور اور دوسرے مقامات پر گولی چلنے کے واقعات سُنے، اور معلوم ہوا کہ کئی بوڑھے بابوں کی لاٹھیاں ٹوٹ گئی ہیں، ماؤں کے چراغ گُل ہو گئے ہیں اور کئی سہاگ اُجڑ گئے ہیں تو مجھے اس کا بڑا صدمہ پہنچا اور میں نے وہاں کہا تھا۔
"کاش! کوئی مجھے باہر لے جائے، یا ارباب اقتدار تک میری یہ آرزو پہنچا دی جائے کہ تحفظِ ناموسِ رسولؐ کے سلسلہ میں اگر کسی کو گولی مارنا ضروری ہو تو وہ گولی میرے سینے میں مار کر ٹھنڈی کر لو، کیونکہ میں اس جرم کا سب سے بڑا مجرم ہوں۔ اور کاش! اس سلسلہ میں اب تک جتنی گولیاں چلائی گئی ہیں وہ مجھے ٹکٹکی پر باندھ کر ماری جاتیں۔ مگر... ع ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں!"

داستانِ پارینہ

جیل خانے کی محدود دنیا میں بھی حضرت امیر شریعتؒ اپنی انجمن آپ تھے۔

عبادتِ الٰہی جیل خانے میں ان کا سب سے بڑا مشغلہ تھا۔ چنانچہ نمازِ فجر سے فارغ ہو کر قرآنِ حکیم کی تلاوت کرتے یا درود و وظائف اور ذکرِ الٰہی میں منہمک رہتے۔ تہجد کے وقت جب کبھی آپ اللہ اللہ کا ذکر بالجہر کرتے یا دوسرے اوقات میں تلاوت قرآن مجید کرتے تو خود ہی وجد میں آجاتے اور اپنا روایتی لب و لہجہ اختیار کرتے تو سکوتِ زنداں میں ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا۔ ریاضت سے فراغت پاتے تو داستانِ پارینہ کے ورق الٹنے لگتے ــــ اسی طرح ایک دن جیل کے باورچی فتح دین کا ذکر آگیا۔ اس باورچی نے اگرچہ کھانا پکانے میں خاصی مہارت حاصل کر لی تھی، لیکن مولانا ابو الحسنات جنہیں امیرِ شریعتؒ "ہر فن مولا" کہا کرتے تھے باورچی کی ایک نہ چلنے دیتے اور ہر روز نئی ہدایت جاری فرما دیتے تھے۔ اس موقعہ پر امیرِ شریعتؒ نے مختلف باورچیوں کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ :

"میں نے ایک بار انگریزوں کے خلاف خانساماؤں کی تحریکِ عدمِ تعاون بھی چلائی تھی۔ مجھے جہاں کہیں سے اطلاع ملتی کہ اس انگریز افسر کے ہاں کوئی مسلمان ملازم خانساماں کی خدمات انجام دے رہا ہے تو میں اسے عدمِ تعاون پر آمادہ کرتا، چنانچہ اس سلسلے میں امرتسر میں ایک خانساماں کانفرنس بھی منعقد کی جس کے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔"

"تحریکِ خلافت کے دنوں امرتسر میں میں نے زنانِ بازاری کے خلاف مہم چلائی تھی، جس کے نتیجے میں "اس بازار کی" اکثر عورتوں نے شادی کر لی، اور کچھ نے گناہ کے کاروبار سے تائب ہونے کا

اعلان کر دیا۔ اس طرح سے کٹڑہ رام باغ جہاں دن سوتے اور راتیں جاگتی تھیں، گندگی سے پاک ہو گیا"

دوسری ایک محفل میں فرمایا:

"ایک دفعہ کسی سفر کے لیے امرتسر ریلوے اسٹیشن پر پہنچا تو گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی، اور ایک ڈبے کے سامنے عوام کی خاصی بھیڑ جمع تھی۔ دیکھا تو چار گورے (فرنگی) پورے ڈبے پر قابض ہیں۔ حالانکہ اس میں پچاس مسافروں کی گنجائش تھی مگر وہ کسی ہندوستانی کو اس میں بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔

ان دنوں میرے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا ہوتا تھا، اور اس نسبت سے لوگ مجھے بخاری ڈنڈے والا کہا کرتے تھے، میں نے آگے بڑھ کر ڈنڈے کے زور سے ڈبے کا دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر وہی ڈنڈا گورے سپاہیوں پر اس انداز سے لہرایا کہ وہ خوف زدہ ہو کر چاروں کے چاروں ایک کونے میں سہم کر بیٹھ گئے اور پھر میں نے تمام مسافروں کو اس ڈبے میں بٹھا دیا، اور خود برابر والے کمرے میں جا بیٹھا۔ غالباً مجھے انبالہ تک جانا تھا۔ اس دوران ہر اسٹیشن پر جہاں گاڑی رکتی میں نیچے اتر کر ایک نظر گوروں پر ڈالتا، اور ساتھ ہی ڈنڈا ہوا میں لہراتا۔ مگر وہ اسی کونے میں دبکے پڑے رہے میں انگریزی نہیں جانتا تھا، وہ پنجابی نہیں سمجھتے تھے، مگر ڈنڈے کے قربان

جا ہیے کہ اُس نے بگڑے ہوئے کام کو سنوار دیا۔"

کبھی کبھار صحت اجازت دیتی اور موڈ ہیں ہوتے تو گراؤنڈ ہیں والی بال یا کوئی دُوسری IN DOOR GAME کھیلنے چلے جاتے۔ بہر طور موسم بادِ بہاری سے بے نیاز ہو کر خزاں کے یہ دن بھی بہار کی طرح کٹتے رہے۔

ساون بھادوں کے بھیگے ہوئے دن اسیرانِ قفس کے لیے بہاروں کی ساری یادیں تازہ کر دیتے ہیں۔ برستے ہوئے بادلوں سے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہونے لگتی ہیں۔ ایسے میں نکہت بادِ بہاری کی تمام آرزوئیں اُونچی دیواروں سے سر ٹکرا کر رہ جاتی ہیں۔ بہارِ لالہ و گل جب صحنِ چمن میں اٹھکیلیاں کرتی ہے تو نسیم سحر گاہی قفس کی اوٹ سے جھانکنے والوں کا مذاق اُڑاتی رہے، لیکن اسے کیا خبر کہ یہ دیواریں گر بھی سکتی ہیں، یہ تیلیاں ٹوٹ بھی سکتی ہیں۔ جن کے حوصلے بلند ہوتے ہیں اُن کے مقام سوا ہوتے ہیں۔ وہ قفس کی تیلیاں اور جیل خانے کی دیواروں کو اپنے راستے کی رکاوٹ نہیں سمجھتے، ہاں! زمانے کی آزمائشیں ہیں جو وقت کے ساتھ ساتھ ڈھلتے سورج کی طرح اپنا مقام بدلتی رہتی ہیں مگر دوام انہیں کو حاصل رہا، جن کے عزم کی دیواریں کوتاہ نہیں ہوتیں۔

ایسے ہی برسات کے موسم میں ایک دن کا ذکر ہے کہ امیر شریعتؒ ایکا ایکی کتابِ زندگی کے ورق پلٹنے لگے۔ خستہ یادوں کی بھولی بسری کہانیاں ایک ایک کر کے یاد آنے لگیں تو امیر شریعتؒ مسکرا دیے، بوڑھے جسم کی جوان آنکھوں میں روشنی کا سیلاب آمڈ آیا، اور اپنے اردگرد دیکھنے لگے، جیسے وہ کسی واقعہ کا گواہ تلاش کر رہے ہوں، پھر آپ سے آپ گویا ہوئے:

"۱۹۴۳ء میں میری زندگی میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا، نواب جان کے معصوم بیٹے افضل کو میری گود میں دیا گیا۔ ناپاک دامن میں پرورش پانے والا معصوم، گناہوں کی بستی سے بغاوت کر کے ایمان کی اوٹ میں امان چاہتا تھا"

نواب جان اُس بازار کی جنس تھی جہاں عورت ناش کے پتوں کی طرح تقسیم ہوتی ہے، حسن اُس کے چہرے پر ہی نہیں آواز میں بھی تھا، جب وہ لاہور سے آواز کا جادو بکھیرتی تو ہوائیں جھولیاں بھر کر اُسے کائنات میں پھیلاتیں۔ اُس حسن بے پروا کی بلائیں لینے والوں میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں" افضل نواب جان کی تمناؤں کا آخری سہارا تھا۔ اگرچہ دو لڑکیاں بھی نواب جان کی دولت میں شامل تھیں لیکن تیرہ سالہ افضل اب ماں کے گندے اور ناپاک دامن پر پاؤں رکھنا بھی گناہ سمجھتا تھا، اسے خاندانی بغاوت کے جرم میں گھر سے نکال باہر کیا گیا، اور وہ امیر شریعتؒ کی جھولی میں آگرا۔

انسان بھی کیا شئے ہے! برائی کا رُخ کرتا ہے تو راستے کی ہر شئے معاونت کرتی ہے، اور جب نیکی کی طرف مڑتا ہے تو اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں۔

امیر شریعتؒ کا کہنا ہے کہ:۔

"جب مَیں اس سنڈاس کے قریب پہنچا تو گناہ آلود دامن میرے گرد جال بننے لگے، انتقامی نگاہیں میرے تعاقب میں اُٹھنے لگیں۔ بُرائی اپنے تمام وسائل سمیٹ کر میری دشمنی پہ آمادہ ہو گئی، لیکن افضل اولاد کی طرح دل کے حرم میں مقیم رہا"

بیٹیوں کی ناراضگی نے ماں کی مامتا کو بیدار کر دیا۔ لیکن افضل کا ماں سے مطالبہ تھا کہ وہ یہ دھندا ترک کر کے شرافت کی پناہ میں بیٹھ جائے، اور میری دونوں بہنوں کو بھی ازدواجی زندگی سے منسلک کر دے۔

کئی برسوں سے تھکی ہاری زندگی شاید نیکی کی اس آواز پر لبیک کہتی، مگر برسوں سے خاندانی پیشہ قدم قدم پر رکاوٹیں ڈال رہا تھا، جنہیں راستہ سے ہٹانا عورت کے بس کا روگ نہیں تھا۔

ماں کی مامتا اور خاندانی وقار، نواب جان اس دوراہے پر کھڑی تھی، کہ حالات بگڑتے چلے گئے۔

امیر شریعتؒ فرماتے ہیں :

"ایک دن میں میلسی (ضلع ملتان جہاں نواب جان کا گھر تھا) سے دس میل دور قصبہ فتح پور سے واپس آ رہا تھا، مجھے اطلاع ملی کہ میلسی کے پولیس تھانے میں علاقے کے زمیندار، وکلاء اور نواب جان کے رشتہ دار جمع ہیں کہ جیسے ہی میں میلسی میں داخل ہوں، مجھے افضل کے اغوا میں معہ گھر کے زیورات اور پارچہ جات چوری کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا جائے۔

مولانا خدا بخش نے جو شہر کی جامع مسجد کے امام تھے مجھے یہ قصہ سنایا تو میں نے کوچوان سے کہا "تانگہ تھانے لے چلو" سب دوست حیران ہوئے، جیسے ہی تانگہ تھانے کے قریب پہنچا۔ انچارج تھانہ، وکلاء، علاقے کے رؤسا میرے مذہبی اور سیاسی

حریف، جن میں ضلع کا مال افسر بشیر احمد تارڈ بھی تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سب کے سب سلام کرنے تھانے سے باہر چلے آئے، میں نے کہا۔ "مجھے منافق قسم کا سلام قبول نہیں۔ میں آگیا ہوں، تم اپنی کارروائی جاری رکھو۔" یہ کہہ کر میں اپنے میزبان کے گھر جو نواب جان کے گھر کے برابر تھا، چلا گیا، افضل اس وقت بھی میرے ساتھ تھا۔"

جب واقعات اس موڑ تک آن پہنچے تو نواب جان نے اپنے عزیز و اقارب سے کہا۔ "میں شاہ صاحب کے خلاف تھانے میں کوئی رپورٹ درج کرانا نہیں چاہتی، وہ سید ہیں اور درویش بھی۔" یہ کہہ کر نواب جان نے امیر شریعتؒ کے نام ایک دستی خط لکھا، جس کا مفہوم کچھ اس طرح سے تھا۔

پیر سائیں!

السلام علیکم۔ میں اور میرا خاندان برسہا برس سے گناہوں کی زندگی گزار رہا ہے، افضل بھی میری اسی گناہ کی کمائی کا نتیجہ ہے۔

جس دامن پر گندگی کے چھینٹے پڑ چکے ہوں وہ دامن اس قابل ہے کہ آپ تک رسائی حاصل کر سکے۔

امیر شریعتؒ نے اسی وقت جواب میں کہا:

"عیب و ثواب انسانی زندگی کا خاصہ ہیں، موت و حیات کے درمیان کئی موڑ آتے ہیں، جہاں انسان پھسل کر سنبھلتا ہے اور سنبھل کر پھسلتا ہے۔ ثبات صرف اسی ایک ذات گرامی کیلئے ہے۔

میں تیرے حالات سے ناآشنا ہوں ۔ اتنا ہی جانتا ہوں

اور وہ بھی تیرے بیٹے کی زبانی سُنا ہے کہ تُو گناہ کی زندگی میں

مبتلا ہے ، اور اپنی اولاد کا مستقبل بھی خراب کر چکی ہے ۔

حاشا وکلا مجھے اس کا کوئی علم نہیں ۔ ندامت کے آنسوؤں سے

بھیگی ہوئی چادر میں لپیٹ کر اگر تو میرے مولا کریم کے سامنے

توبہ کی بھیک مانگے گی تو تیری جھولی خالی نہیں آئے گی میں بھی

تیرے لئے دُعا کروں گا ۔"

اس خط کے جواب میں دوسرے دن نواب جان کا ایک اور دستی خط آیا ۔

پیر سائیں ! السلام علیکم

اگر ندامت کے آنسوؤں سے گناہ کے داغ دُھل سکتے

ہیں تو میں ساری رات گھر والوں سے چوری باوضو روتی رہی

ہوں ۔ میرے ایسے گناہ کی گٹھڑی کون اٹھائے گا تاہم آپ

حکم کریں کہ میں کسی سے نکاح کر لوں ، جبکہ میرے گرد حرص و ہوس

کے انسانوں کی بے شمار دولت جمع ہے اور میرے خاندان

کے لوگ اس دولت کے پجاری ہیں ۔

پیر سائیں ! مجھے ان کے چنگل سے نجات کیلئے وقت

کی ضرورت ہے ، میں کوشش کرتی ہوں ۔ آپ دُعا کریں ۔ میرے

افضل سے کہنا ، وہ بھی ماں کا گناہ معاف کر دے ۔ میری مجبوریوں

سے وہ واقف ہے ۔"

اس خط کا امیرِ شریعتؒ نے مختصر جواب دیا:-

"انسان کو نیکی کرنے کی توفیق تو اللہ تعالیٰ ہی دیتے ہیں۔ اسلام کا
ایک ادنیٰ مبلغ ہونے کی حیثیت سے میں تیرے لیے دعا کرتا ہوں
پروردگار تجھے نیکی کی راہ پر چلنے کی توفیق دے (آمین)

تو میں گندا ہے، چشمہ یا زندگانے
آدمی کیا کرے کی ٹھوکری ڈالا کے دن!"

(خطوط کے یہ مفہوم یادداشت پر مبنی ہیں، نہ تو ان کی نقل امیرِ شریعتؒ کے پاس تھی اور نہ ہی کسی دوسری جگہ بیان گزشتہ گو یہی انداز تھا جو امیرِ شریعتؒ نے بیان کیا، جس پر خطوط کی عبارت ترتیب دی گئی ہے۔)

نواب جان کی یہ کہانی دو ڈھائی اور تین مہینوں میں نہیں، سالوں میں جا کر ختم ہوئی اور اس میں کئی موڑ آئے۔ آخر ہوا یہ کہ امیرِ شریعت کی دعا جس کام آئی کہ شیخ علاقہ کی اس مشہور طوائف نے جینے کا بہانہ کر اپنی سابقہ زندگی سے توبہ کر کے تحصیل میلسی کے ایک زمیندار خدا بخش بھٹہ سے شادی کر لی جس سے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ زمیندار ۱۹۶۷ء میں انتقال کر گیا۔ نواب جان نے اپنی دونوں لڑکیوں کے نکاح بھی شریعت کے مطابق کیے۔ افضل نامی ان کے پاس واپس چلا گیا اور آج کل دونوں ماں بیٹا میلسی میں مقیم ہیں، افضل محکمہ نہر میں پٹواری ہے۔۔۔ اور اسی ضلع میں کہیں تعینات ہے۔

اختری سازشش

ایام اسیری کی پرانی یادوں کے انہیں کھنڈرات پر سے گزر رہے تھے ہم

ی اپنے بیتے دنوں کی کہانیاں سنانے میں مصروف تھا کہ انہیں دنوں حضرت
مولانا احمد داؤد غزنوی ایک تحریری بیان لے کر لاہور سنٹرل جیل میں رہنماؤں سے ملے
اور کہا: "مجھے وزیر اعلیٰ صوبہ مغربی پاکستان ملک فیروز خاں نون نے بھیجا ہے اگر آپ
حضرات اس بیان پر دستخط کر دیں تو حکومت آپ کو رہا کرنے کو تیار ہے۔"

بیان کا متن:

"تحریک ختم نبوت کو چلانے کا ہمارا اس طرح کا کوئی ارادہ نہیں
تھا اور نہ ہی آئندہ ہم ایسی کسی تحریک کے چلانے کا ارادہ رکھتے ہیں ماضی
قریب میں جو کچھ ہوا اس میں عوام کا زیادہ دخل تھا۔
ہم حکومت کو یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ ہم ایسی کوئی تحریک
نہیں چلائیں گے جس سے ملک کا امن خطرے میں پڑ جائے۔"

مولانا داؤد غزنوی سے یہ تحریر لے لی گئی اور جواب کے لئے انہیں دوسرے
دن کو کہا گیا۔ مولانا ابوالحسنات، صاحبزادہ فیض الحسن اور تحریک کے دوسرے
رہنما مولانا داؤد غزنوی کی اس تحریر کو اپنے انداز سے سوچتے اور پڑھتے رہے لیکن
امیر شریعت کا انداز الگ رہا۔ انہوں نے رات بھر اسیران قفس سے مشورہ کے بعد
فیصلہ کیا کہ اس تحریر پر دستخط کرنے سے بہتر ہے کہ ہم جیل کے غیر اخلاقی قیدیوں کے ہاتھوں
قتل ہو جائیں۔ یہ تحریر ہماری سیاسی اور مذہبی موت کے مترادف ہے چنانچہ دوسرے
دن مولانا داؤد غزنوی تشریف لائے تو حضرت امیر شریعتؒ نے اُن سے کافی
تلخ کلامی کی۔

تحریک ختم نبوت کے خلاف اپنے اور بیگانوں نے جو سازشیں کیں یہ سازش

اُس کی آخری کڑی تھی۔ دُشمنوں کا یہ جال جو دوست کے ہاتھ سے پھیلایا گیا تھا، اپنے ہی زور پر تار تار ہو کر رہ گیا، اور ہر مخالف جس نے تحریک ختم نبوت کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی۔ آپ سے آپ بندھنوں میں اُلجھتا چلا گیا۔

جماعتِ اسلامی کے رہنما جو تحریک کی نیو اُٹھانے میں برابر کے شریک تھے، جب عتاب ملوکیت نظر آیا تو عزیز مصر کی بیوی کی طرح سارا گناہ حضرت یوسف کی جھولی میں ڈال کر اپنی پاک دامنی کے گواہ تلاش کرنے لگے۔ مجلس احرار کو اس تحریک کا مجرم ٹھہرا کر جماعت اسلامی کے بزدل رہنماؤں نے اپنی جرأت کو اس بُری طرح داغدار کیا کہ تحریک کے ساتھ اپنی عاقبت پر بھی چھینٹے ڈال لیے۔

اسی طرح تحریکِ ختم نبوت میں پنجاب کے ہر سیاستدان نے خواہ اس کا تعلق حکومت سے تھا یا دوسری سیاسی جماعتوں سے، عوام کے دباؤ کی وجہ سے اس تحریک سے ملوث ہونے کی کوشش کی۔ چنانچہ ان دنوں سید حسین شہید سہروردی سابق وزیر اعظم پاکستان اپنی جماعت (عوامی لیگ) کو عوام میں متعارف کرانا چاہتے تھے اور اس غرض سے انہوں نے اس تحریک کے رہنماؤں سے جیل میں رابطہ قائم کیا تاکہ تحقیقاتی عدالت میں احرار کی قانونی امداد کر سکیں۔ لیکن ان کا محنتانہ اس قدر زیادہ تھا کہ مجلس احرار اس کی متحمل نہیں تھی اور دوسری طرف مولانا مظہر علی اظہر تھے جنہوں نے معمولی رقم پر سارا مقدمہ لڑا۔

یہ قصہ چل رہا تھا کہ میاں محمود علی قصوری بار ایٹ لا، رہنما نیشنل عوامی پارٹی کو خیال آیا اور وہ بھی اس ٹوہ میں رہے کہ آیا حکومت نے تحریک ختم نبوت کے نظر بندوں پر ان کی ابتدائی میعاد نظر بندی (چھ ماہ) کے ختم ہونے پر دوسرے نوٹس کی

تعمیل کرائی ہے ؟ اور جیسے ہی انہیں حکومت کی اس آئینی کمزوری کا علم ہوا، اور ساتھ ہی پتہ چلا کہ کراچی میں گرفتار ہونے والوں سے بھی دوسرے نوٹس کی تعمیل نہیں کرائی گئی تو انہوں نے آگے بڑھ کر اپنا سیاسی داؤ کھیلا، مولانا ابوالحسنات، صاحبزادہ فیض الحسن اور ماسٹر تاج الدین کی طرف سے لاہور ہائیکورٹ میں ایک رٹ دائر کر دی جس کی سماعت جسٹس رحمان نے کی اور نظربندوں کو انتظامیہ کی کمزوری کا فائدہ دیتے ہوئے ۸ فروری ۱۹۵۴ء کو رہا کر دیا۔ اسی ضابطے کے تحت ۱۰ فروری ۱۹۵۴ء کو حضرت امیر شریعت بمعہ اپنے دوسرے رفقاء کے لاہور سنٹرل جیل سے رہا کر دیے گئے۔

نئے سفر کا آغاز

بلاشبہ زندگی جہد مسلسل کا نام ہے اور مبارک ہیں وہ لوگ جنہوں نے اس کارگاہ عالم میں اپنے وجود تک کو اس راہ میں صرف کر دیا اور سنگ میل بن گئے رہروئے منزل کے لیے!

امیر شریعتؒ آپ کے بار جیل خانے سے رہا ہوئے تو یقین تھا کہ عمر رواں کا ماندہ حصہ سکونِ قلب، تنہائی اور یادِ الہٰی میں گزار دیں گے صحت تمام جسم سے بغاوت کر چکی تھی۔ خاص کر سکھر جیل کی چند دنوں کی "سی کلاس" خوراک نے رہا سہا بھرم بھی گنوا دیا تھا۔ انہیں دنوں عزیز بیٹی نے بھی اکثر اصرار کیا کہ "ابا! اب آپ آرام کریں۔" تو بڑے جلال میں فرمایا:

"بیٹی! تم یہ پسند کرتی ہو کہ تمہارا باپ چارپائی پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر

مرے، یہ پسند نہیں کرتی کہ میں حضورؐ کی ختم نبوت کے لیے جان دے دوں۔"

نقاہت، بڑھاپا اور بیماری کے باعث کچھ دن گھر میں آرام کیا، لیکن شب و روز ملنے والوں کے ہجوم میں آرام کہاں، دن بھر محفلیں جمتیں، ادب پر بات چل نکلی تو گفتگو میں اسی پہ بحث ہو رہی ہے۔ سیاسیات کی بات آگئی تو بڑے بڑوں کے بخیئے ادھیڑتے جا رہے ہیں۔ ان دنوں کراچی میں ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان کی بساط پر اپنی ضرب رستہ کے مہرے کھلا رہے تھے۔ لاہور اور کراچی میں اٹھا پٹخ کا ایک لامتناہی سلسلہ جاری تھا۔ انہیں واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسی دوست نے سوال کیا "شاہ جی! یہ سب کچھ کیا ہو رہا ہے؟"

بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"بھیا! کتے بھونک رہے ہیں، جن کو راتب مل گیا ہے وہ کھا کر سو گئے ہیں اور جن کو نہیں ملا وہ بھونک رہے ہیں۔"

اس پر تمام محفل کشت زعفران بن گئی۔

اسی طرح راقم ایک دن لائل پور سے ملتان حاضر ہوا تو حسب معمول بڑے تپاک سے ملے۔ اھلاً وسھلاً مرحبا کے بعد فرمایا:

"جانباز! ایک کیبنٹ پاکستان کی میں نے بھی بنائی ہے اس میں ایک آدمی کی کمی تھی۔ تمہارے آنے پر وہ نام یاد آگیا۔ دیکھو، اگر ان لوگوں پر مشتمل کیبنٹ بن جائے تو کتنے دن چلے؟"

کیبنٹ: ۱ : مولانا ظفر علی خان

۲ : مولانا ابوالاعلیٰ مودودی

۳ : علامہ عنایت اللہ المشرقی

۴ : مولانا عبدالستار نیازی

۵ : قاسم رضوی (حیدرآباد دکن)

۶ : غازی محمد منیر (اوکاڑہ)

۷ : حافظ سید عطاء المنعم شاہ بخاری۔ (میرے آنسے پہ یہ نام یاد آیا)

مندرجہ بالا حضرات کی اکثریت اپنی انفرادی زندگی میں اخلاص و قربانی کا مجسمہ رہی ہے۔ ان کے خلوص پر بھی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ گذشتہ نصف صدی کی تاریخ ان کے سیاسی و مذہبی کردار کو نحز و مباہات کے دامن میں گرہ دیئے ہوئے ہے۔ لیکن اجتماعی زندگی میں یہ لوگ اپنے چلن کے خلاف مظاہرہ کرتے رہے۔

مولانا ظفر علی خان نے اتحاد ملت بنائی، علامہ عنایت اللہ المشرقی نے خاکسار تنظیم، مولانا مودودی نے جماعت اسلامی ترتیب دی، اور خود ہی یہ لوگ ان جماعتوں کے صدر یا ڈکٹیٹر بنے رہے اور کبھی بھی اپنے منصب کی انتخاب کی، جیسے ہی جماعت کے اندر سے ان کے اس فعل پر کوئی معترض ہوا، تو پہلے تو ٹالتے گئے، اس پر بھی بات نہ بنی تو جماعتی پالیسی سے انحراف کے جرم میں متعلقہ ممبر کو جماعت سے الگ کرنے کی کوشش کی، اس پر بھی اگر کچھ لوگوں نے متعلقہ ممبر کے موقف کو درست قرار دیا تو جماعت توڑ تاڑ کر بیٹھ گئے۔

ان دنوں پاکستان کی ہر حکومت کی عمر ڈوبتے سورج کی طرح ہر شام

غروب ہو رہی تھی۔ ایسے وقت میں امیر شریعتؒ نے مندرجہ بالا تلوّن مزاج حضرات پر مشتمل پاکستان کی گھریلو کیبنٹ (کابینہ) ترتیب دے کر حکومت وقت پر ایک ایسا بھرپور طنز کیا کہ طنز و مزاح کی دُنیا میں یہ نشتر ہمیشہ پیوست رہے گا۔

دھوپ کے ساتھ ڈھلتے اور ان محفلوں کے رسیا اپنی اپنی راہ لیتے، امیر شریعت سر شام کندھے پر چادر اور ہاتھ میں بید کا کھونٹا لیے سلیمی دواخانہ پر آ بیٹھتے، یہاں روح اور جسم دونوں کا علاج ہوتا تھا۔ بزم لطائف اور شعر و شاعری کا بازار نمازِ عشاء تک گرم رہتا۔

مجلس تحفظ ختم نبوّت کی صدارت

اسی سال (۱۴ ستمبر) امیر شریعتؒ کو اکثر احباب کے اصرار پر ملتان کے ایک خصوصی اجلاس میں مجلس تحفظ ختم نبوت کا صدر منتخب کیا گیا، آپ نے صدر منتخب ہوتے ہی حسب ذیل بیان پریس کے نام جاری کیا:

"مسئلہ ختم نبوّت جانِ اسلام اور روحِ قرآن ہے۔ اگر مسلمان عقیدۂ ختم نبوت سے بال برابر اِدھر اُدھر ہو جائیں گے تو پھر نہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا قرآن باقی رہتا ہے اور نہ ہی خدا تعالیٰ کا وہ تقدس اور توحید باقی رہتی ہے، جس پر آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ختمی المرتبت تک تمام انبیاء علیہ السلام متفق ہیں۔

مرزائیت اس روح پر اس جان قرآن اور جانِ اسلام پر مرتدانہ ضرب ہے۔ پس اس کے استحصال کو ہر مسلمان کے لئے فرض

جانتا ہوں اور اپنی زندگی کی آخری بازی۔ پاکستان کے جسم میں یہ سیاسی ناسور ہے۔ اگر حکومت نے اس کا اپریشن نہ کیا تو یہ ناسور سارے جسم کو تباہ کر کے رکھ دے گا۔"

مبلّغین کو وصیّت

تحفظِ ختم نبوت کے تمام مبلّغین کو امیرِ شریعت نے اپنے مکان کی بیٹھک میں بلا کر حسبِ ذیل وصیّت فرمائی:

"عزیزو! اسلام کی تبلیغ کانٹوں کا تاج پہننے کے مترادف ہے، جدھر منہ کرو گے مخالفت ہی مخالفت نظر آئیں گے حتیٰ کہ ایسے ایسے مقامات سے گزر ہوگا اور مخالفت ہوگی جہاں تمہارا گمان بھی نہیں پہنچ سکتا۔ اگر تم اس عزم پہ پکے اور پختہ رہے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ (پھر تھوڑا مسکرائے اور فرمایا) احرار بظاہر کسی تحریک میں کامیاب نہیں ہوئے لیکن اس عزم کو لے کر اٹھے اور ڈٹے رہے تو نتیجہ یہ ہے کہ برسرِ اقتدار آنے والا ہر گروہ احرار کے نام سے لرزتا ہے۔

۲۔ وعظ کرنے کے لیے جانے سے پہلے داعی سے کرایہ کبھی وصول نہ کرنا۔ اگر اتنا بھی کرو گے تو منہ کھائے گا، آنکھ شرمائے گی، حق بیان نہ ہوگا۔ (فرمایا) آمد و رفت کا کرایہ گھر سے لے کر چلنا۔ تقریر و بیان کے بعد اگر داعی کچھ خدمت کرے تو اس کے سامنے شمار نہ کرنا۔ اور اگر کچھ بھی نہ دے تو اپنی زبان سے طلب بھی نہ کرنا، بلکہ

عشاء سے پہلے گھر واپس آجانا۔ (فرمایا) ساری زندگی میرا یہی عمل رہا ہے جب کہیں جانا ہوتا تو پہلے تمہاری اماں سے پوچھا کرتا تھا کہ مجھے فلاں جگہ وعظ کہنے جانا ہے کرایہ ہے؟ اگر ہوتا تو آمد و رفت کا خرچ گھر سے لے کر چلتا۔

(فرمایا) کبھی بھی خدمت نہ کرنے والا، اگر پھر بھی بلالے اور دعوت دیدے تو جانے سے انکار نہ کرنا۔ (فرمایا) اب اگر پچھلی اور پہلی مرتبہ ہدیہ، حق الخدمت وغیرہ نہ مل سکنے کے سبب جانے سے رک جاؤ گے تو للہیت نہیں ہوگی بلکہ نفسانیت ہوگی، اور داعی کے سامنے شمار کرنے سے روکنے میں یہ حکمت فرمائی: ہو سکتا ہے داعی غریب اور مفلس ہونے کے سبب حق الخدمت یا کرایہ کچھ بھی نہ دے سکے۔ اس سے خود کو بھی تردد ہوگا اور داعی کے دل میں ہوک اٹھے گی۔ ہائے! میں غریب تھا، کہ کرایہ بھی نہ دے سکا اور اس سے اس غریب کے دل سے ایک آہ نکلے گی۔ لہٰذا یہ نصیحت یاد رکھنا کہ غریب کی آہ اور دل دکھانے کے ہر پہلو سے پرہیز کرنا۔ اگر ان باتوں پر عمل کرو گے تو ان شاء اللہ کبھی بھوکے نہیں رہو گے اور یہی باتیں دنیا و عقبیٰ کی فلاح و بہبود اور ترقی اور سربلندی کا موجب ثابت ہوں گی۔

ذیابیطس اور روحانی علاج

انسان جب جوانی کے نشے میں ہوتا ہے تو اپنے جسم پر بھی رحم نہیں کھاتا،

اس دور کی غلطیاں اور نسیم سے نا انصافیاں جب بڑھاپے میں علم بغاوت بلند کرتی ہیں تو انسان مختلف بیماریوں کا بہانہ کرتا ہے، حالانکہ ان بیماریوں کا موجب وہ خود ہوتا ہے ۔ امیر شریعتؒ فرماتے ہیں:

"انسان کے اندر ایک مستقل سلطنت آباد ہے، دل اور دماغ اس کے بادشاہ اور وزیر ہیں، جب یہ دونوں اپنی رعایا کو تنگ کرتے ہیں تو آخر کو بغاوت کا احتمال تو ہوگا! یہی میں نے بھی کیا ہے میں نے اپنے جسم پر کوئی رحم نہیں کھایا، رات دن کا سفر، مسلسل دس دس بیس بیس گھنٹے تقریریں، بے وقت کی خوراک، وہ بھی میزبان کی مرضی پر، یہاں سے فرصت ملی تو جیل خانہ، یہ کوئی سال دو سال کا عمل نہیں، بلکہ میری زندگی کے چالیس سال اسی دشت کی سیاحی میں گذرے ہیں۔ ان حالات میں اپنی صحت کا گلہ میں کس پر کروں"

۱۷ نومبر ۱۹۵۵ء کو نماز عشاء کے لئے گھر میں وضو کر رہے تھے کہ دائیں جانب فالج کا ہلکا سا حملہ ہوا۔ ذیابیطس کی شکایت پیشتر سے چلی آرہی تھی۔ فالج کے حملے نے اس بیماری کو بھی توانائی دے دی۔ حضرت امیر شریعتؒ کا اپنا بیان ہے کہ

"جب مجھ پر فالج کا حملہ ہوا تو تمام جسم بیکار معلوم ہونے لگا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا، جیسے اب موت کا وقت قریب آگیا ہے چنانچہ میں نے کلمہ پڑھنا شروع کر دیا، اور چارپائی پر جا کر لیٹ گیا لیکن تھوڑی دیر بعد بیماری کا اثر زائل ہو گیا۔"

پھر آپ بے اختیار رونے لگ پڑے اور خوب روئے۔ اس دوران حضور خاتم الانبیاء کی یاد ذہن میں آئی اور یہ شعر بار بار پڑھتے رہے ؎

اس وقت تیرا مستی سے کیا حال ہوا ہوگا
جب تُو نے یہ مے ساقی شیشے میں بھری ہوگی

حج بیت اللہ کی دعوت

غلام شخصیت کا ہو یا سلطنت کا اُس کی رائے اور مذہب اپنے آقا کے محکوم ہوتے ہیں۔ قریباً ڈیڑھ سو سالہ برطانوی سامراج کی غلامی نے برصغیر کے مذاہب کو اپنی سیاسی ضرورت کے تابع رکھا۔ اسلام جیسا عظیم فطرتی مذہب بھی ایک وقت آیا کہ انگریزی حکمرانوں کا پابند ہو گیا۔ مثلاً حج اسلام کے پانچ ارکان میں سے ہے ایک مسلمان کو اللہ تعالیٰ ہمت دیتے ہیں کہ وہ حج بیت اللہ کے لیے جا سکے لیکن انگریز بطور حاکم ملک اپنی سیاسی ضرورت کے تحت انہیں اس کی اجازت نہیں دیتا، جیسے کہ دوسری جنگِ عظیم میں ہوا۔ اسلام فوٹو اتروانے کی ممانعت کرتا ہے، لیکن غیر ملکی قانون کہتا ہے کہ حج کی درخواست کے ساتھ فوٹو کا ہونا لازمی ہے۔

ایسی ہی کچھ پابندیاں تھیں کہ امیر شریعتؒ نے ہمیشہ حج بیت اللہ جانے سے پہلو تہی کی۔ حالانکہ بڑے بڑے رؤسا اور اُمراء نے دعوتیں دیں، لیکن طرح دیتے گئے، مگر اندر کی بات وہی تھی کہ جاؤں تو اللہ کے گھر کی زیارت کے لیے اور اجازت مانگوں فرنگی سے، یہ نہ تو میرا ضمیر گوارہ کرتا ہے اور نہ ایمان اجازت دیتا ہے چنانچہ دسمبر ۱۹۵۸ء حاجی دین محمد صاحب نے امیر شریعتؒ کو حج بیت اللہ کیلئے دعوت دی

جواب میں فرمایا :-

"حاجی صاحب ! ارادہ تو ہے مگر چاہتا ہوں کہ گھر کے تمام افراد ساتھ چلیں، اور اس سفر میں کسی کی امدادی رقم شامل نہ ہو"

اس پر حاجی صاحب نے کہا" آپ کا ارادہ ہے کہ آپ گھر بار سمیت وہاں چلے جائیں اور پھر واپس نہ آئیں۔ مگر اللہ تعالیٰ نے آپ سے اگر کوئی کام لینا ہوا تو۔؟"

اس پر امیر شریعتؒ مسکرا دیئے۔

رُوحانی صدمہ

منزل سے پیشتر کاروانِ منزل، سالارِ کارواں کو غبارِ کارواں میں لپٹا چھوڑ کر الگ راہ اختیار کرلے تو امیرِ کارواں پر کیا گزرتی ہے؟ اس کا اندازہ وہی کرسکتا ہے جس کی کشتی طوفان میں ہو، اور منجدھار موجوں کے تھپیڑوں سے ٹوٹ جائے، اور وہ بے دست وپا ہو کر رہ جائے۔

رہائی کے بعد راہنمایانِ احرار ستمبر ۱۹۵۴ء کے دوسرے ہفتہ ملتان امیرِ شریعتؒ کے مکان پر جمع ہوئے، تاکہ آئندہ کے لیے راہیں سوچ سکیں۔ حسین شہید سہروردی تحریک ختم نبوّت کے دنوں احرار رہنماؤں کے قریب آ چکے تھے۔ بنا بریں کچھ ممبران کی رائے تھی کہ احرار کو سہروردی سے تعاون کر لینا چاہیئے، اس پر تین دن کی بحث کے بعد یہ فیصلہ ٹھہرا کہ مسٹر سہروردی پر اپنا مؤقف واضح کر دیا جائے، اگر وہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دلوانے کے مسئلے پہ ہمارے فیصلے سے اتفاق کریں، تو جماعت اُن سے تعاون کے لیے تیار ہے۔

چنانچہ ورکنگ کمیٹی نے اس کام کے لیے شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری کو کراچی بھیجا۔

احباب جواب کے منتظر تھے کہ ۲۱ دسمبر ۱۹۵۴ء کو اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی:

"کراچی، ۱۹ دسمبر۔ مجلس احرار کے سابق رہنما شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری نے آج اعلان کیا ہے کہ انہوں نے جناح عوامی لیگ میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا ہے۔ انہوں نے ایک بیان میں کہا ہے کہ وہ مسٹر سہروردی سے بات چیت کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ جناح عوامی لیگ میں شامل ہو کر جمہوریت کی خدمت کر سکتے ہیں، وہ عوامی لیگ کے سیاسی نظریات سے متفق ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ملک کو مسٹر سہروردی کی خدمات کی ضرورت ہے، جو ایک تجربہ کار رہنما ہیں۔ جمہوریت کے قیام کے لئے انہوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔

شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین نے کہا ہے کہ ان کا یہ اقدام پارٹی کے کسی فیصلے کا نتیجہ نہیں ہے۔

مجلس احرار ۱۹۳۹ء میں سیاسیات سے علیحدہ ہو چکی ہے۔ انہوں نے اپنے دوستوں اور حامیوں سے اپیل کی ہے کہ وہ عوامی لیگ میں شامل ہو کر پاکستان اور جمہوریت کے استحکام کے لیے کام کریں۔" (روزنامہ "تعمیر" راولپنڈی، ۲۱ دسمبر ۱۹۵۴ء)

اسی اخبار میں یہ خبر بھی شائع ہوئی کہ حسین شہید سہروردی کو پاکستان کی
بینہ میں شامل کر لیا گیا ہے۔

اچانک ان راہنماؤں کے عوامی لیگ میں شامل ہونے کے اعلان نے
حلقوں کو پریشان کر دیا۔ نیز امیر شریعت نے جب یہ خبر پڑھی تو سر پکڑ کر بیٹھ
ے اور ایک سرد آہ کے ساتھ پنجابی زبان کے یہ دوہے بار بار دہراتے رہے۔

چھڈ کے میدان نس گئے بھیڑے کہندے سی مراں گے نال تیرے

(جن کا یہ دعویٰ تھا کہ ہم تیرے ساتھ مریں گے وہ لوگ میدان چھوڑ کر
گئے)

یاری توڑ گئے بکریاں والے ڈیگ گھنٹ دودھ دے لئے

یوں کا دودھ دوہنے والے فقط دو گھونٹ دودھ کے لیے یارانہ توڑ گئے)

رفیقوں کی اس جدائی سے امیر شریعت کو جو روحانی صدمہ ہوا اسے انہوں
مدتوں محسوس کیا، اس سلسلے میں جب کوئی سوال کرتا تو ہلکی سی آہ کے ساتھ
لب مسکرا دیتے۔

گو یہ لوگ بعد میں عوامی لیگ سے مایوس ہو کر دوبارہ مجلس احرار میں
ل ہو گئے لیکن امیر شریعت کے دل میں تادم واپسیں یہ کسک باقی رہی۔

۱۹۵۵ء

یہ سال بھی پاکستانی سیاستدانوں کے لیے انقلابی سال تھا۔ صوبائی
ر مرکزی حکومتیں صبح و شام تبدیل ہو رہی تھیں، مسٹر محمد علی بوگرہ جنہیں امریکہ سے

ہُوا کر پاکستان کے راج سنگھاسن پر بیٹھا دیا گیا تھا، ملک غلام محمد گورنر جنرل پاکستان کے اشارۂ ابرو پہ رقص کناں تھے۔ اس سے پیشتر ۲۲ر نومبر ۱۹۵۴ء کو ریڈیو پر اعلان کیا گیا کہ پورے مغربی پاکستان کو ایک وحدت کی شکل دیدی جائے گی۔ اس خبر نے صوبائی سیاستدانوں میں کھلبلی مچا دی اور سبھی کو اپنی لیڈری خطرے میں نظر آنے لگی۔ چنانچہ ایسی افراتفری پیدا ہوئی کہ حکمران لوگ اپنی کرسیوں کی حفاظت میں عوام سے غافل ہو گئے۔ نتیجۃً ملک میں جرائم بڑھنے لگے، بجرم ضمیر لوگ اور شہر کی عزت و آبرو کے ڈاکو بن گئے۔ یہی دن تھے کہ گجرات شہر میں حسین نامی ایک عورت اپنی عزت کے ساتھ جان بھی گنوا بیٹھی، مظلوم اور معصوم عورت کے ساتھ رات کے اندھیرے میں کیا کچھ ہوا؟ پھر اس کا قتل کیونکر ان سوالوں کے جواب میں قانون آج تک خاموش ہے۔

گجرات کا دل مٹی کے برتنوں کی طرح خوبصورت ہے، لیکن سوہنی۔ گھڑے کی طرح دریا کے درمیان فریب دے دیتا ہے۔

امیر شریعتؒ کو جب اس واقعہ کی اطلاع اخبارات کے ذریعہ ملی تو کچھ دیر خاموش رہ کر فرمایا" قانون اپنی ضرورت کے لیے چُپ ہے لیکن عصمت مآب خاتون کا بے گناہ خون آج نہیں تو کل ظالموں کی آپ نشاندہی کرے گا، اور دامن جس پر حسین بی بی کا خون چمک رہا ہے گجرات کے کوچہ و بازار میں رسوا ہو گا۔

حکومت کی اپنی پالیسی میں جب تضاد ہو، تو ملک کی دوسری جماعتیں کیونکر راہِ عمل متعین کر سکتی ہیں۔

پاکستان کے دانش وروں نے ۱۹۵۳ء کے بعد سے جو ڈرامہ شروع

کھا تھا۔ اس میں تماشائی کے علاوہ کوئی کردار بہتر نہیں تھا۔ حضرت امیر شریعت
ی اجتماعات کے علاوہ کسی دوسرے جلسے میں شمولیت سے اجتناب کرتے رہے
سے بھی ان کی صحت، بیماری جو بڑھاپے کے دوش پر آگے بڑھ رہی تھی، اس کی
ازت نہیں دیتی تھی۔ انہیں حالات میں ایک دوست نے سوال کیا "شاہ جی!
پ کو یہ مرض ذیابیطس کب سے ہے؟"۔ جواب میں کہا

"سکھر جیل سے اس مرض نے رفاقت شروع کی تھی، اور اب تک
سنگت نبھا رہا ہے۔ خیال ہے کہ کم بخت موت تک ساتھ دے گا"

ڈسٹرکٹ جج کیمبل پور

۱۹۵۳ء کے بعد تحریک مرزائیت کو ہر پاکستانی نے سمجھ لیا تھا، اور اس کے
ودساختہ فوائد جو فرنگی سانچے میں ڈھل کر حقیقت اسلام کی برابری کر رہے تھے
فسانہ ہو کر عوام کے سامنے آ گئے تھے۔

ایک (مرزائی) عورت مسمات آمنۃ الکریم کا نکاح کیپٹن نذیر (مسلمان)
سے ہوا۔ اس انکشاف پر کہ عورت کا مذہب اسلام نہیں ہے کیپٹن نذیر احمد
نے اسے طلاق دے دی۔ اس پر عدالت میں مقدمہ چلا اور ۲ جون ۱۹۵۵ء کو
شیخ محمد اکبر ڈسٹرکٹ جج کیمبل پور نے میاں محمد سلیم سول جج راولپنڈی کے
سابقہ فیصلے کی تصدیق کر دی، کہ قادیانی مسلمانوں کا فرقہ نہیں، اس لئے قادیانی
عورت کا نکاح مسلمان مرد سے نہیں ہو سکتا۔

گو اس سے پیشتر سیشن جج بہاول پور اور سیشن جج گورداسپور کے

فیصلے عوام میں آچکے تھے لیکن تقسیم ملک کے بعد ڈسٹرکٹ جج کیمبل پور کے فیصلے نے ۱۹۵۳ء کے واقعات کی تائید کر دی۔

حضرت امیر شریعتؒ کو جب اس فیصلے کی اطلاع ملی تو خوشی میں آنسو نکل آئے اور اسی وقت شکرانہ کے چار نفل ادا کئے اور ساتھ ہی کہا:

"سو سنار کی، ایک لوہار کی، میری گذشتہ محنت سے ممکن ہے مرزائیت پر اس قدر ضرب کاری نہ لگی ہو جس قدر کیمبل پور کے ڈسٹرکٹ جج کے قلم نے مرزائیت کو فنا کر دیا ہے، کیونکہ یہ فیصلہ حکومت کے اپنے آدمی نے رائج الوقت قانون کے تحت دیا ہے۔ اب میرے کہنے کی ضرورت نہیں۔ حکومت خود سوچے کہ سیشن جج کیمبل پور کے اس فیصلے کے بعد مرزائیت کے متعلق اس کی کیا پالیسی ہے۔"

رہائی کے بعد پہلی تقریر

مئی (۱۹۵۵ء) کے آخری پندرھواڑے میں سر فیروز خاں نون پنجاب وزارت عظمیٰ سے الگ کر دیئے گئے تو حالات نے نئی کروٹ لی، پیشتر اس کے آنے والے کل کو حالات مزید بگڑ جائیں، مرکزی جماعت تحفظ ختم نبوت ۳ سے ۴ جون (۱۹۵۵ء) تک اپنا مرکزی اجلاس لائلپور میں بلانے کا فیصلہ کیا۔ تحریک ختم نبوت کے دنوں مولانا داؤد غزنوی کی زعمائے احرار سے ملاقات، جماعت اسلامی کے لیڈر مولانا مودودی کا اس تحریک میں کردار، احرار رہنماؤں

عوامی لیگ میں شمولیت سے عوام میں اکثر غلط فہمیاں پھیل رہی تھیں، ان کی وضاحت کے لیے لائل پور کا اجلاس بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

لائل پور میں ان دنوں دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ تھا، لہٰذا اجلاس میونسپل حدود سے باہر ملیانہ کالونی میں رکھے گئے اور آخری دن امیر شریعتؒ نے تقریر کی۔ تحریک ختم نبوت کے بعد امیر شریعتؒ کی یہ پہلی تقریر تھی۔ عوام اور حکام دونوں کے کان اس تقریر کے منتظر تھے۔

آئرلینڈ کے مشہور محب وطن مسٹر ڈی ولیرا کے متعلق یہ روایت ہے کہ ایک دفعہ تقریر کر رہے تھے اور پولیس نے انہیں دوران تقریر گرفتار کر لیا دو سال کے لیے جیل بھیج دیے گئے۔ رہائی کا دن آیا تو پارٹی کو اطلاع دی کہ میں رہا ہو کر سیدھا اسی جگہ پہنچوں گا جہاں سے گرفتار کیا گیا تھا۔ لہٰذا آپ جلسے کا انتظام وہیں کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ہجوم منتظر تھا، مسٹر ڈی ولیرا کار سے اُترے اور جلسہ گاہ میں چلے گئے انہوں نے بغیر کسی تمہید کے کہا "تو حضرات میں یہ عرض کر رہا تھا"—— گرفتاری کے وقت جہاں سے بات چھوڑی تھی، دو سال کے تعطل سے بات میں کوئی فرق نہ آنے دیا۔

حضرت امیر شریعت کچھ دن گھر میں سستا نے تازہ دم ہو کر نئے سفر کے لیے پھر نکل کھڑے ہوئے تو سب سے پہلے آپ نے اہل لائل پور کو خطاب کیا۔ خطبہ اور نہ سے پہلے فرمایا:

"اٹلی کے مشہور رہنما مسٹر مسولینی نے پہلے پہل یہ دعویٰ کیا کہ

میں دیکھ رہا ہوں زمین متحرک ہے، اس پر اُس وقت کے قانون دانوں نے اُسے مجرم قرار دے کر گرفتار کر لیا اور عدالت کے سامنے پیش کیا:

عدالت: کیا تم نے یہ کہا ہے کہ زمین متحرک ہے؟

گلیلیو: ہاں! میں نے کہا ہے کہ زمین متحرک ہے۔

عدالت: تو پھر بطور سزا کے یہ زہر کا پیالہ پی لو!

گلیلیو نے زہر کا پیالہ اُٹھایا اور منہ کے قریب لے جا کر پھر زمین پر رکھ کر عدالت سے مخاطب ہوا۔

"اگر میں یہ کہہ دوں کہ زمین متحرک نہیں تو پھر؟"

عدالت: تو پھر جا سکتے ہو۔

گلیلیو اُٹھا اور عدالت کے دروازے تک جا کر پھر پلٹ کر کہنے لگا۔ "مجھے تو اب بھی زمین متحرک معلوم ہوتی ہے" یہ کہا اور زہر کا پیالہ پی لیا۔ امیر شریعت اس قصے پر مسکرائے اور فرمایا، ارشاد خداوندی ہے۔ ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین اور حدیث رسول اللہ انا خاتم النبیین لا نبی بعدی کے بعد میں کیسے کہہ دوں کہ کوئی دوسرا نبی بھی آ سکتا ہے، میری تو اب بھی یہی رائے ہے کہ حضور خاتم الانبیاء ہیں اور اُن کے بعد جو نبوت کا دعویٰ کرے گا میں اسے انسان بھی کہنے

کے لیے تیار نہیں۔ تمہارا قانون جو چاہے مجھے کر لے، میں اُس پر بھی یہی کہوں گا کہ حضورؐ خاتم النبیین ہیں، تمہارا قانون میرا کیا بگاڑ سکتا ہے، اب رہ بھی کیا گیا ہے جو بگاڑ لوگے ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہ بھی میاںؐ کی عزت پر نثار ہوجائے تو جان چھوٹے"۔

اس کے بعد آپ نے خطبہ مسنونہ پڑھا اور فرمایا:

"مجھے آپ سے تین باتیں کہنا ہیں۔ پہلی یہ کہ جس عقیدہ کو ہم لے کر بیٹھے ہیں، یہ کیا چیز ہے؟ مثال کے طور پر عرض کرتا ہوں، کسی کے مکان کی چھت ٹپکنے لگی تو اُس نے اپنے مکان کو پچھلی طرف سے لیپنا شروع کیا۔ جب لیپ کر فارغ ہوئے تو دیکھا کہ یہ تو ہمسایوں کا ہی مکان لیپا گیا ہے یہ آج کی نئی بات نہیں ہے، چودہ سو برس سے اُمت اسی پر ڈٹی ہوئی ہے۔ اس وقت دُنیا کی آبادی میں مسلمان تقریباً پچھتر کروڑ ہیں حضورؐ کے عہد سے لے کر اس وقت تک کتنے پیوندِ خاک ہوگئے۔ ان میں کتنے صحابی، تابعی، ولی، غوث، قطب، فقیہہ، امام اور بزرگ گزرے۔ تمام اُمت کے اولیا لاکھوں صحابہ سب اسی عقیدہ سے پر ڈٹے رہے کہ حضورؐ کے بعد نبوّت کسی کو نہیں ملی، کوئی ماں نہیں ہے جو نبی جننی۔

اللہ ایک ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں، ہم سب اس کے

محتاج ہیں۔ یہ بنیادی عقیدہ ہے، آمنہ کا بیٹا، عبداللہ کے گھر کا چاند، عبدالمطلب کا پوتا، صدیق اکبرؓ اور عمر ابن خطابؓ کا داماد، عثمانؓ اور علیؓ کا خسر، حسنینؓ کا نانا، فاطمہؓ کا ابا، جن کا نام نامی ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، جن کے بعد کوئی نبی نہیں، پچھتر کروڑ مسلمان اس وقت اس عقیدے پر کھڑے ہیں اور اربوں پیوند خاک ہو چکے ہیں، صاحب فکر و عقل، علم و ہمت، صاحب فہم و فراست پیدا ہوئے اور پیوند خاک ہو گئے۔ وہ سب اسی عقیدے پر قائم رہے۔

اللہ نے فرمایا، ہم نے آپ کو تمام آدمیوں کیلئے خوشخبری سنانے اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے، اور فرمایا کہ اسے نبی! اعلان کر دو کہ مسلمان، جہاں کہیں بھی ہوں اور جس زمانے میں بھی ہوں اور جب بھی ہوں زمین پر، چاند پر، مریخ پر، مشرق میں، مغرب میں، نیچے اوپر، تحت الثریٰ میں، اعلان کر دیجئے، اسے نبی! (صلی اللہ علیہ وسلم) کہ میں تم سب کی طرف پیغمبر بن کر آیا ہوں، جی چاہے مانو، جی چاہے نہ مانو یہ ہے اصل عقیدہ۔

اب اگر قرآن میں خاتم النبیین کی آیات نہ بھی ہوں تو بھی یہ لفظ کافی تھا۔

عقیدہ عقد سے ہے، اور عقد کہتے ہیں دل کی گرہ کو ـــ قرآن سینہ بسینہ حضورؐ سے صحابہ تک پڑھتے پڑھاتے تھے ہمیں وراثت میں ملا ہے عقیدے کے بغیر عمل کچھ نہیں ہوتا، بُرا ہو

یا بھلا، اور عشق کا نام ہی عقیدہ ہے۔ نماز کی توفیق دل میں نہ ہو تو وضو کیوں کرے، توحید بڑی چیز ہے، لیکن ختمِ نبوت، اگر اس سے نکال دو تو یہ بھی کچھ نہیں رہتی۔ ماننے کو تو مکے کے لوگ بھی خدا کو مانتے تھے، چاہے عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا اور یہودی عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا، کعبے میں تین سو ساٹھ خدا رکھے تھے اور ننگے ہو کر طوافِ کعبہ کرتے تھے۔

جب اللہ کی رحمت جوش میں آئی تو اللہ کے گھر میں چاند نکلا، کعبہ میں جھاڑو دی، اللہ کا نام بلند کیا اور فرمایا کہ تم جو بُول بڑھ چڑھ کر ان کو خدا بناتے ہو، یہ سب جھوٹے ہیں۔

نبوت کا مقام تو بہت ہی بڑا مقام ہے، ذرا ایک بزرگ تو دیکھو حیا کے مارے کبھی نگاہ نہیں اُٹھی، یہ تو نبوت کی بات تھی، میرے مرشد حضرت مولانا نے پوری دس سال کے بعد ضلع سرگودھا میں اپنے گھر آئے تو اپنی بڑی حقیقی ہمشیرہ کو نہ پہچانا، جب تک کہ اُنہوں نے بات نہ کی۔ حضرت فرماتے تھے کہ بچپن ہی سے میں نے انہیں نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا، یہ شرم و حیا کی بات ہے۔

ہم خدا کو جانتے ہی نہیں، محمدؐ کو جانتے ہیں۔ ابو جہل صدیق اکبرؓ کے پاس آیا اور کہا کبھی کوئی آسمان پر گیا ہے۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا "نہیں"! ابو جہل نے کہا "تیرا یار کہتا ہے میں وہاں سے ہو آیا ہوں"۔ صدیق اکبرؓ نے فرمایا "تو وہ سچ کہتا ہے

اُس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا۔"

تیرہ سال کی بات ہے، ایک آدمی کی وساطت سے مرزائی عرب شریف چلا گیا تھا اور مدینہ منورہ جا کر مرزا کی نبوّت کی تبلیغ کی جو مَیں اس شخص کا نام نہیں لیتا جس کی وساطت سے مرزائی گیا۔ مَیں نے اُس سے آج تک کلام نہیں کی اور نہ کروں گا یہ مرزائیوں کا تبلیغی نظام ہے۔

مَیں اکتوبر ۱۹۲۳ء میں رہا ہو کر امرتسر آیا تو معلوم ہوا مولوی نور احمد سرحدی نے قادیان میں جلسہ کیا۔ بہت سے علماء کرام آئے اور وعظ کر کے چلے گئے۔ تب سے ہم نے فکر کی کہ یہ انفرادی تبلیغ جماعتی تنظیم کے مقابلے میں کچھ نہیں، جماعت کا مقابلہ جماعت سے ہونا چاہیئے۔

۱۹۳۱ء میں ہم نے سوچا، حضور علیہ السلام کی نبوّت کو مٹانے کا نظام بن رہا ہے، تب سے جماعت بنی اور اس کا شعبۂ تبلیغ مقرر ہوا جس کا تعلق مُلک کے سیاسی معاملات سے نہیں تھا۔

اسلام کی بنیاد مسئلہ ختم نبوّت پر ہے، جب حضورؐ نے فرمایا لانبی بعدی، لارسول بعدی ولا امت بعدکم شروع سے لے کر آج تک اور آج سے لے کر حشر کے گرم ہونے تک کوئی نہیں جو عقیدہ بدلے، ہم اس کو لے کر اُٹھے ہیں، اس کا

کسی ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہیں۔

بعض لوگوں کو شک ہے کہ ہم اس تحریک میں حکومت کے سامنے جھک گئے ہیں، ارے تم ہمیشہ انگریزوں کے سامنے جھکتے رہے ہو، تو ہم اگر مسلمان حکومت کے سامنے جھک گئے تو کیا ہوا۔ ارے میرے اپنے میرا ساتھ چھوڑ گئے تو میں کسی کو کیا کہوں، آپ کسی پارٹی میں جاہیں جائیں لیکن ادھر بھی توجہ رکھیں۔

اگر آپ کی سمجھ میں میری بات نہیں آتی تو سر ظفر اللہ سے ہی سمجھ لو، وہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے لے کر پاکستان کی وزارت خارجہ تک جہاں رہا قادیان نہیں چھوڑا۔ آپ کو سرکار کا ملازم ہو کر تحفظ ختم نبوت سے شرم کیوں آتی ہے؟ سو دفعہ جاؤ عوامی لیگ میں یا مسلم لیگ میں، لیکن تمہاری جوانیوں کا صدقہ تحفظ ختم نبوت کی طرف بھی نگاہ کرم ڈالتے رہو۔

کفر کا یہ پروگرام کوئی آج کا نہیں ہے، جب سے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تشریف لائے، تب سے مسیلمہ کذاب پیدا ہونے شروع ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ نے سات ہزار حافظ قرآن صحابہ کو ختم نبوت کی خاطر شہید کروا دیا تھا۔

کہتے ہیں نتیجہ کچھ نہیں نکلا، ارے نتیجہ تو نکل آیا۔ راولپنڈی کے سیشن جج کا فیصلہ تمہارے سامنے ہے۔

تحریک ختم نبوت میں جو کچھ ہوا، اس کا میں اکیلا

ذمّہ دار ہوں، تمام ذمہ داری میرے سر ہے، اور قیامت تک اس مسئلہ پر جس قدر لوگ مریں گے اُس کی ذمہ داری بھی میرے سر ہے گی، میں مودودی نہیں ہوں کہ بددیانت ہو جاؤں مجلس عمل کے اجلاس کراچی میں مودودی صاحب میرے زانو کے ساتھ زانو ملائے بیٹھے تھے، ریزولیوشن میرے جانے سے پہلے پاس ہو چکا تھا۔ میں کیا کروں کسی کی کتابوں کو اور لٹریچر کو۔

میں اس سے پہلے اجلاس میں نہیں گیا تھا۔ دوسرے دن (مولانا) محمد علی میرے پاس آئے، اور کہا کہ آج تم چلو۔ میں نے کہا جو پاس کرنا ہے کر لو میں عمل کروں گا۔ جب گیا تو داؤد غزنوی کے پاس جا بیٹھا، مودودی بھی پاس بیٹھے تھے، انہوں نے مجھے اپنے دائیں طرف جگہ دی، ریزولیوشن پاس ہو چکا تھا، محمد علی رجالندھری لوگوں سے دستخط کرا رہے تھے اور میرا نام بھی لکھوایا، اُن کا نام بھی لکھا آج وہ (مودودی) کہتے ہیں میں تحریک میں شامل نہیں تھا۔ میں کہتا ہوں شامل تھا۔ اگر مودودی شامل نہیں تھا تو میں اُن سے حلفیہ بیان کا مطالبہ نہیں کرتا ہوں، بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ اپنے لڑکوں کے سروں پر ہاتھ رکھ کر اعلان کر دیں کہ میں شامل نہیں تھا۔ ورنہ میں اعلان کرتا ہوں کہ میں ذمہ دار ہوں، میں تحریک میں شامل تھا۔ اور سے جو تحریک میں شامل تھا اُس نے سال کاٹی اور جو نہیں شامل اُس نے دو سال کاٹی۔ جب میں رہا ہونے لگا،

تو ڈیوڑھی میں آ کر مودودی نے کہا کہ جنہوں نے تقریریں کیں، وہ رہا ہوئے اور جنہوں نے فقط سر ہلایا وہ پھنسے رہے، یہ ہے دیانت، ہزاروں شہید ہوئے، ماؤں کے سہاگ لٹے، کئی یتیم ہوئے، کئی اجڑ گئے۔"

آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے،

"اللہ! میں ذمہ دار ہوں، آج بھی ذمہ دار ہوں اور آیندہ کل کو بھی ذمہ دار ہوں گا، میں نے یہ سب کچھ تیرے نبی کے نام کی خاطر کیا تھا۔

ہزاروں کو مروا کر کہہ دوں کہ میں قائل نہیں تھا، کیا یہی دین ہے؟ کیا کروں ظلم کو اور ادب کو، میرا کلیجہ پھٹتا ہے، میں بولنے پر آؤں تو ادھار کیوں رکھوں، ارے تم سے کافر کلیبیو ہی اچھا تھا جس نے زہر کا پیالہ پی لیا۔

جوہر آ ہے ہوئے، اللہ تعالیٰ ہم سے غلط قدم نہ اٹھوائے کیا جیل میں میں نے وہ بیان نہیں دکھایا جس پر سلطان احمد کے دستخط موجود ہیں، جب کہا تو کہنے لگے یہ اصلاح کیلئے کیا تھا۔

وہی مولانا داؤد غزنوی کی بات کہ وہ مجھ سے جیل میں ملے تو اتنی ہی بات کہہ کے ختم کرتا ہوں، لعنۃ اللہ الا الکاذبین، وہ نیک آدمی ہیں، خدا جانے کسی سیاسی مصلحت کی وجہ سے ملک صاحب (فیروز خان نون وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان) نے اُن سے یہ کام لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرمائے۔

خدا میری بھی لاج رکھے جو کیا ہے اور جو کر رہا ہوں اسی پہ
قائم رکھے۔ آمین!"

جلسہ رات سوا دو بجے ختم ہوا۔ حاضری ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی۔

اسی موضوع پہ امیر شریعتؒ نے سارے مغربی پاکستان میں تقریریں کیں، جس سے غلط فہمی کے بہت سے بادل چھٹ گئے، چنانچہ اسی طرح کا اجتماع گوجرانوالہ میں بھی ہوا۔ شیرانوالہ باغ عوام سے بھرا ہوا تھا۔ جیسے ہی امیر شریعتؒ تقریر کے لئے کھڑے ہوئے، مغرب کی جانب سے کالی گھٹائیں اٹھیں۔ "یا ربالیں پہ جو آیا تو قضا بھی آئی" عوام کا اضطراب بڑھا۔ دو طوفان آمنے سامنے کھڑے تھے بادل اور بخاری، دیکھیں کس کی جیت ہوتی ہے۔

امیر شریعتؒ نے عوام سے سوال کیا۔

"کیوں بھئی کیا ارادے ہیں؟ اگر تو بارش سے ڈر کر بھاگ جانا ہو تو ابھی کہہ دو۔ ورنہ بخاری تو کھڑا ہے، حالانکہ میں اس وقت بخار سے ہوں۔"

اس پہ عوام نے بیک زبان کہا "ہم بیٹھیں گے شاہ صاحب!" بس پھر کیا تھا، بارش بھی ہو رہی تھی اور امیر شریعتؒ بھی برس رہے تھے۔ ایک رضاکار امیر شریعتؒ پر چھاتہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ آپ نے غصے میں کہا۔

"کتنے چھاتے لاؤ گے میاں! یہ جو سامنے انسانوں کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا ہے، ان میں جان نہیں؟ یا تو ان کے لیے بھی چھاتے لاؤ، ورنہ بیٹھ جاؤ۔"

آخر موسلا دھار بارش کا پانی عوام کی کمر کمر تک آن پہنچا۔ مگر اس پر بھی لوگ اسی طرح جمے رہے، جیسے کہ ان کے سروں پر پرندے بٹھا دیئے گئے ہوں جب عوام پانی میں تیرنے لگ پڑے تو امیر شریعت نے کہا:

"بس بھائی! اب میں آپ کا اور امتحان نہیں لیتا، یہ بھی ایک ریکارڈ رہے گا میری زندگی کا۔"

انہیں دنوں مریدکے ضلع شیخوپورہ میں دوران تقریر کہا:

"اگرچہ اب میں بوڑھا ہو گیا ہوں، مگر اپنے مقصد کے لئے اب بھی جوان ہوں۔"

اس سفر میں ایک ذمہ دار پولیس افسر نے سوال کیا "شاہ جی! اجازت ہو تو ایک بات پوچھوں"؟

"ہاں بیٹا! کیوں نہیں!"

"دوسری جماعتوں کے سیاسی اور مذہبی رہنما آئے دن مختلف شہروں میں آتے رہتے ہیں، مگر حکومت کی طرف سے ہمیں کوئی ایسی ہدایت نہیں ملتی کہ ہم ان کو واچ کریں۔ لیکن جیسے ہی آپ کسی شہر میں پہنچتے ہیں، ایک دم سے ناکے لگنے لگتے ہیں، یہ کیوں؟" آپ نے برجستہ کہا:

"بھائی! جب کوئی ہیجڑا گھر میں آ جائے تو کوئی عورت اس سے پردہ نہیں کرتی۔ مگر جیسے ہی کوئی مرد آ جائے تو تمام گھر میں پردہ پردہ کا شور مچ جاتا ہے۔"

اس پر متعلقہ افسر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔

وصیّت

مولانا محمد علی جالندھری جو اُن دنوں مجلس تحفظ ختم نبوّت کے ناظم اعلیٰ تھے، اور روز و شب سفر پر رہتے تھے، جیسے کہ اب بھی ہیں۔ مولانا کی انتھک مصروفیت دیکھ کر امیر شریعتؒ نے انہیں وصیّت کی اور ناراض ہوئے۔

"بھائی محمد علی تم میری ریس نہ کیا کرو، میرے پر اللہ کی خاص رحمت ہے۔ تم زیادہ سے زیادہ پانچ سات سال اس طرح چلو گے اور پھر ختم ہو جاؤ گے، یا کسی نہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جاؤ گے، جبکہ مجھے چالیس برس ہو چکے ہیں سفر کرتے، اور میں نے اپنے جسم سے وفا نہیں کی، جس کی وجہ سے اب مر رہا ہوں۔"

سیاسی انتقام

مسلم لیگ کی اندرونی کشمکش پاکستان کے عالمی وقار پر بھی اثر انداز ہوئی، یہ وقار ہر آن تبدیل ہونے والے واقعات کے ساتھ اس قدر اپنا اعتبار کھو بیٹھا کہ اپنی ساری بیتائی کے باوجود غیر ممالک میں پاکستان کی تجارتی ساکھ کو بھی نقصان پہنچا۔ محمد علی بوگرہ کے بعد چودھری محمد علی وزیر اعظم بنا دیئے گئے۔ نئے وزیر اعظم مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کی جماعت سے دلی لگاؤ رکھتے تھے، ان دنوں بھی پاکستان کی خارجہ پالیسی امریکہ اور برطانیہ کے ہاتھوں میں تھی۔ غیر ملکی سامراج تمام امور اپنی مرضی سے حل کر رہا تھا اس طرح جماعت اسلامی اور چودھری محمد علی کا گٹھ جوڑ بڑی آسانی سے سمجھ آ رہا تھا۔ حضرت امیر شریعتؒ نے اپنی حالیہ تقریروں میں جماعت اسلامی کے لیڈروں کو

جس بڑی طرح لتاڑا چودھری محمد علی نے ۔ ۱ اگست کو اقتدار پر آتے ہی اس کا انتقام لینا شروع کر دیا۔ چنانچہ ۱۱ ستمبر ۱۹۵۵ء کو حضرت امیر شریعتؒ سے ایک نوٹس کی تعمیل کرائی گئی:

"۱۴ ستمبر کو آپ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ملتان کی عدالت میں حاضر ہوں۔"

مولانا محمد علی جالندھری سے بھی اسی طرح کے نوٹس پر تعمیل کرائی گئی۔

ان احکام کی تعمیل کے سلسلے میں امیر شریعتؒ جب عدالت میں گئے تو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے صرف اتنا کہا کہ "آپ اپنی تقریروں کا لہجہ نرم رکھیں"، اور بس!

امیر شریعتؒ نے مسکراتے ہوئے یہ حکم سنا اور عدالت سے باہر چلے آئے۔

کاروانِ حریت بدستور چلتا رہا۔ لیکن جولائی ۱۹۵۶ء میں امیر شریعتؒ کو ملتان کی میونسپل حدود میں نظر بند کر دیا گیا۔

اس طرح امیر شریعتؒ کی تمام مذہبی سرگرمیاں کچھ وقت کے لئے رک گئیں۔

یہ نظر بندی امیر شریعتؒ کے لئے کارآمد ثابت ہوئی کہ ان دنوں وہ اپنی بیماری کے علاج میں یکسوئی سے مصروف ہو گئے لیکن دلِ بے قرار کو چین کہاں! دل بیماری میں اور دماغ حق کے راستے میں حائل دیواروں کو توڑنے کی فکر میں۔

ان دنوں مرکزی اور صوبائی سیاست کے گھوڑے سرپٹ دوڑ رہے تھے سکندر مرزا گورنر جنرل بن چکے تھے اور ڈاکٹر خان صاحب مغربی پاکستان کے وزیر اعلیٰ۔ ان دونوں کے درمیان چودھری محمد علی کی وزارت دو خاوندوں کے درمیان بیوی کی طرح وقت گزار رہی تھی۔ اس کشمکش میں دم توڑتی ہوئی تحریک ختم نبوت کی صدائے بازگشت کبھی کبھار امیر شریعتؒ کی تقریروں سے سنائی دیتی رہی۔ اقتدار

پسند سیاستدان اس سے بھی غافل نہیں تھے چنانچہ ۴؍ اپریل ۱۹۵۶ء کو خانیوال (ضلع ملتان) کی ایک تقریر کی بنا پر امیر شریعتؒ کو سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۱ کے تحت گرفتار کر لیا گیا، اور اسی روز نواب زادہ عبدالرحیم ڈپٹی مجسٹریٹ ملتان نے تین ہزار روپے کی ضمانت پر آپ کو رہا کر دیا۔

یہ مقدمہ چودھری غلام مرتضیٰ کی عدالت میں ۲؍ جولائی کو شروع ہونا تھا، مگر ملتان میں نظر بندی کے باعث امیر شریعتؒ عدالت میں حاضری سے قاصر رہے۔

یہ مقدمہ ہنوز شروع نہیں ہوا تھا کہ ۲۹؍ جون ۱۹۵۶ء کو سیفٹی ایکٹ کی دفعہ ۲۱ کے تحت دوسری گرفتاری کے وارنٹ بھی آن پہنچے۔ یہ گرفتاری جلال پور پیروالا (ضلع ملتان) میں ۹-۱۰؍ مارچ ۱۹۵۶ء کی درمیانی رات کی ایک تقریر کی بنا پر عمل میں آئی۔ یہ مقدمہ راجہ محمد ایوب کی عدالت میں شروع ہوا۔ امیر شریعتؒ اپنی پیرانہ سالی، بیماری اور جون کے تپتے ہوئے موسم میں مقررہ تاریخ پر احاطہ عدالت سے باہر جا بیٹھتے اور مشتاقانِ دید ان کے گرد جمع رہتے۔

امیر شریعتؒ کی نظر بندی اور گرفتاریوں کے خلاف سارے پاکستان میں احتجاجی اجتماع ہوئے، اخبارات نے نوٹ لکھے، جلسوں میں مختلف سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے رہائی کا مطالبہ کیا۔

اسی دور میں مرکزیہ مجلس تحفظ ختم نبوت نے امیر شریعتؒ کی سرپرستی میں روزنامہ "نوائے پاکستان" کو از سر نو چلانے کا فیصلہ کیا۔ اس موقع پر امیر شریعتؒ نے حسب ذیل الفاظ میں اس اخبار کا خیر مقدم کیا۔

"نوائے پاکستان" جن عزائم و مقاصد کو لے کر اپنا دورِ جدید شروع

کر رہا ہے۔ میں ان عزائم و مقاصد کی کامیابی کے لیے بارگاہِ رب العزت میں دعا کرتا ہوں۔

ہمیں ملک کے سیاسی بکھیڑوں میں اُلجھنے اور پھنسنے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پیشِ نظر صرف ایک ہی موقف ہونا چاہیئے اور وہ حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت کا تحفظ۔ اس کے علاوہ جو باتیں ملحوظ رکھنی ضروری ہیں۔ وہ پاکستان کی عمومی خدمت اور جمہور المسلمین کو ان گمراہیوں سے نکالنا ہے جو ان کے عقائد و اعمال میں جڑ پکڑ چکی ہیں۔

ان الفاظ کے ساتھ میں "لوائے پاکستان" کی کامیابی کے لیئے دعا گو ہوں"

یہ ۳ جولائی ۱۹۵۰ء کا واقعہ ہے۔

رہائی

پابندیوں کے سرکاری احکام کو لاہور ہائی کورٹ میں اس موقف کے تحت چیلنج کیا گیا:

"اسلامی مملکت کے کسی باشندے کی نقل و حرکت پر پابندی عائد نہیں کی جا سکتی اور نہ ہی اُسے کسی خاص علاقہ میں پابند کیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا عدالتِ عالیہ گورنمنٹ کے نام نوٹس جاری کر کے ہر دو

رہنماؤں (مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولانا محمد علی جالندھری)
کی نقل و حرکت پر سے پابندی اٹھانے کے احکام جاری کرے۔"

ہائی کورٹ میں اس مقدمے کی پیروی کے لئے میاں محمود علی قصوری ایڈووکیٹ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ مقدمہ ابھی ابتدائی مراحل میں تھا کہ ۱۳ جولائی ۱۹۵۶ء کے اخبارات میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی۔

"ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ مغربی پاکستان نے امیر شریعتؒ سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر عائد کردہ تمام پابندیاں اٹھا لیں۔ حکام نے یہ قدم حضرت امیر شریعت کی خرابی صحت کی بنا پر اٹھایا ہے۔"

لیکن مقدمات بدستور قائم رہے۔

ان دنوں امیر شریعتؒ کی صحت خاصی کمزور ہو چکی تھی۔ رات کو اکثر بے خوابی رہتی۔ بھوک کی کمی، اختلاج قلب اور تبخیر کی بھی شکایت تھی۔ اس موقعہ پر اکثر احباب صحت کے بارے میں پوچھتے تو بڑی سادگی سے فرماتے:

"بھائی! اب طبیعت ہی نہیں ہے، حال کیا بتاؤں؟ کل جگر مراد آبادی کی غزل ان کے بیاض میں پڑھی تو تین شعر ہو گئے تھے"

وہ اٹھنا ہوا اک دھواں اول اول
وہ بجھتی سی چنگاریاں آخر آخر

قیامت کا طوفاں وہ صحرا میں اول
غضب رہ وہ کارواں آخر آخر

ہمن میں بیدا عشق دل کا میہود اول

گیا وہ رہ گئی حسرت آخر آخر ا"

امیر شریعتؒ کی صحت مندرجہ بالا اشعار سے واضح ہے۔

امیر شریعتؒ کا ان دنوں لاہور آنے کا ارادہ تھا تاکہ طبی مشورہ لیا جاسکے لیکن نظر بندی کے علاوہ جلال پور پیروالا اور خانپوال کے مقدمات راستہ روکے ہوئے تھے۔

مخلوط انتخاب

سیاسیات میں جھوٹ بولنا، فریب دینا اور فریب کھانا، کسی قانون کی زد میں نہیں آتا۔ سیاستدانوں کی ساری زندگی انہیں پگڈنڈیوں پر چلتے چلتے گذر جاتی ہے اس راستے میں دادی خاندار بھی ہے اور لالہ وگل کی بزم آرائیاں بھی۔

سیاست میں ضرورت کے لیے حرام کو حلال قرار دے لینا بھی جرم نہیں۔

۱۹۴۷ء سے بیشتر کے سیاسی موڑ پر نظر ڈالی جائے، تو ہندو مسلم اتحاد کا نعرہ اگر ملکی ضرورت کے باعث نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیے درست تھا تو رجعت پسند اور ٹوڈی مسلمانوں کے لیے سم قاتل۔ انگریز حکمران آخر الذکر طبقہ کی پشت پناہ تھے مخلوط انتخاب کے ذریعہ ہندو مسلمان اتحاد کی دیواروں کو استوار کرنا ان کے نزدیک سؤر کے گوشت کو حلال قرار دینے کے مترادف تھا اور ایسا مسلمان مسلم لیگ کے نزدیک بھی گردن زدنی تھا جنہوں نے آزادیٔ وطن کے لیے مخلوط طرز انتخاب کا سلوگن (SALOGAN) دیا۔ تقسیم ملک کے بعد مسٹر حسین شہید سہروردی نے بطور وزیر اعظم پاکستان جب نیشنلسٹ مسلمانوں کے منہ کا جھوٹا نوالہ خود کھانا چاہا اور پاکستان میں مخلوط انتخاب رائج کرنے میں اپنے کو حق بجانب قرار دیا تو وہ لوگ جن کے نزدیک

گزرے ہوئے کل، یہ نعرہ جرم تھا، آج وہی سہروردی کے ہتھیار تھے۔ کیوں کہ آج انہیں اس کی ضرورت تھی۔

شہید سہروردی نے یہ نعرہ مشرقی پاکستان کے غیر مسلموں کے ووٹ حاصل کرنے کے لیے لگایا تھا، لیکن مغربی پاکستان کی سیاست بالکل جدا تھی۔ ۱۹۵۳ء کی مرزائی اور مسلمان کشمکش نے عوام کے دلوں میں یہ شبہ ڈال دیا کہ ۱۹۵۰ء کے انتخاب میں چونکہ آٹھ مرزائی بری طرح ناکام رہے تھے، حالانکہ مسلم لیگ نے انہیں اپنا نمائندہ منتخب کیا تھا۔

اب مخلوط انتخاب کے ذریعے انہیں اسمبلی میں لانے کے لیے چور دروازہ کھولا گیا ہے، یہ بحث سارے ملک میں جاری تھی کہ الجزائری رہنماؤں کا ایک وفد علامہ بشیر الابراہیمی کی قیادت میں پاکستان کے دورے پر آیا۔

ملتان کے معزز شہریوں کے علاوہ مجلس تحفظ ختم نبوت نے بھی انہیں استقبالیہ دیا۔ اس موقعہ پر حضرت امیر شریعت[7] نے مترجم کے ذریعہ وفد کے لیڈر سے گفتگو کی، اور الجزائر کی آزادی کے لیے لڑنے والے مجاہدین کو خراج تحسین پیش کیا، نیز الجزائری رہنماؤں کی درازی عمر کے لیے دعا کی۔

متحدہ ہندوستان میں انگریزی اقتدار میں غلام ہندوستانیوں پر تشدد کا ذکر کرتے ہوئے اقوام یورپ کی مختلف سیاسی چالوں کا وضاحت سے ذکر کیا، اور قادیانیوں کی غیر ملکی سرگرمیوں سے بھی الجزائری رہنماؤں کو خبردار کیا۔

لاہور میں آمد

حالات کی ناسازگاری جسمانی کمزوری اور دماغی پریشانی کے باعث امیر شریعت[7]

یہاں دوبارہ فالج کا ایک اور ہلکا سا حملہ ہوا جس کے اثرات گو دیرپا نہیں تھے تاہم پریشان کن ضرور تھے۔ اس کے نتیجے میں امیر شریعتؒ نے لاہور آنے کا فیصلہ کیا چنانچہ پابندیاں ختم ہوتے ہی اگست کے پہلے پندرھواڑے میں بذریعہ کار بغرض علاج لاہور تشریف لے آئے اور حاجی دین محمد کے ہاں ٹھہرے۔

گو بیماری کی وجہ سے بے حد کمزور تھے، مگر زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ملنے والوں کا استقبال خندہ پیشانی سے کرتے۔ اس دوران آپ نے دوستوں سے معذرت کے انداز میں کہا:

"بیماری کے متواتر حملوں اور ضعیفی کی وجہ سے میں اکثر احباب کے خطوط کا جواب بھی نہیں دے سکا۔ لہٰذا میں اُن تمام احباب کا ممنون ہوں، جو میری بیمار پرسی کے دوران خطوط لکھتے رہے۔ ان تمام کو میری صحت کے لئے دُعا کرتے رہنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اسلام کی مزید خدمت کے لیے تندرستی عنایت فرمائے۔"

ملتان کے حکیم عطار، اللہ مریض اور مرض دونوں سے آشنائی کے بعد علاج کے عادی ہیں۔ امیر شریعتؒ سے انہیں دِلی لگاؤ تھا، حکیم صاحب کی طبیعت کی پاکیزگی کی وجہ سے امیر شریعتؒ بھی ان کے معترف تھے۔ لیکن "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" تو دوستوں کے اصرار پر لاہور آ گئے۔ یہاں سب سے پہلے شفاء الملک حکیم اجمل خان مرحوم کے پوتے حکیم نبی جمال سویدا کا علاج شروع کیا ——— ایک ہفتہ علاج سے جب .... افاقہ نہ ہوا، تو ڈاکٹر کرنل محمد ضیاء اللہ کا علاج شروع کیا۔ ایک روز امیر شریعتؒ نے ڈاکٹر سے

سوال کیا :

" آپ کی تشخیص نے مرض سے متعلق کیا فتویٰ دیا ہے "

کرنل ضیاء اللہ نے یاس و نا امیدی کے لہجے میں کہا ،

" شاہ جی ! اب آپ اپنا کوٹہ ختم کر چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے

آپ کو دو سو سال کی زندگی عطا کی تھی ، جسے آپ نے پچاس سالوں

میں ختم کر لیا۔ اب تو کوشش ہی ہے "

شاہ فطرت نے حضرت امیر شریعتؒ کو کچھ اس انداز سے سنوارا تھا کہ وہ جہاں بیٹھ جاتے تھے ، بہاریں اُن کے قدم لیتیں ، کئی انجمنیں اُن کے اپنے وجود میں تھیں۔ وہ مسکراتے تو آسمان سے بجلیاں کوندتیں ، اُن کی پیشانی پر بل آجاتا ، تو سلطنتیں کانپ اُٹھتیں۔ ستارے راستہ بھر اپنی قندیلیں روشن کر کے اُن کی محفل میں بیٹھنا سعادت سمجھتے۔ ویرانوں میں اگر وہ شب و روز فروزاں کرتے ، تو پروانے وہاں بھی آموجود ہوتے سے

حسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لیے

ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن

اہلِ لاہور کو جب اطلاع ہوئی کہ امیر شریعتؒ بغرضِ علاج یہاں آئے ہیں ، تو دن بھر احباب کی آمد و رفت سے ایک میلہ سا لگا رہتا ، گو مرض کے لیے یہ ہجوم مفید نہیں تھا ، لیکن مریضِ محبت کے ہاتھوں مجبور تھا کہ دوست اور دشمن کا استقبال کرے۔ آخر ڈاکٹر کے مشورے پر عصر اور مغرب کے درمیان کا وقت ٹھہرا لیا گیا۔ جیسے جیسے مرض سنبھالا لیتی گئی ، مریض آپ سے آپ سنبھلتا چلا گیا۔ حضرت

مولانا احمد علیؒ روزانہ عصر کے بعد تشریف لاتے، اور امیر شریعتؒ کے دل پہ کافی دیر تک ہاتھ رکھ کر دم کرتے۔ اس دوران امیر شریعتؒ کا گریبان کھلا رہتا

نماز عصر کے بعد جو محفل لگتی اُن میں شیخ حسام الدین، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا ابوالحسنات، مظفر علی شمسی اور ان کے علاوہ شعراء کرام، ادیب صحافی اور کاروباری حضرات کا ہجوم بھی رہتا۔

اسی طرح کی ایک مجلس میں مولانا ابوالحسنات نے سوال کیا :۔

"شاہ جی! آپ کو میٹھا زیادہ پسند ہے یا نمک؟"

امیر شریعتؒ: "جو چیز میرے رب کو پسند ہو"

مولانا ابوالحسنات: "رب کو تو پھر میٹھا زیادہ پسند ہے"

امیر شریعتؒ: "اگر میٹھا پسند ہوتا تو پہاڑ نمک کے نہ بنائے ہوتے"

اس پر تمام مجلس میں قہقہہ بلند ہوا۔ ایک دوسری مجلس میں سوال ہوا۔

"پردہ اسلام میں کیوں رائج ہے؟"

امیر شریعتؒ نے تھوڑی دیر چپ رہ کر فرمایا:۔

"میاں بیوی کے درمیان رغبت کو مزید بڑھانے کے لیے پردہ رائج کیا گیا ہے۔ اگر بے حجابی عام رواج پکڑ جاتی تو میاں بیوی کے درمیان محبت کا سلسلہ بھی ختم ہو جاتا۔"

مخدوم محترم حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ (امیر شریعتؒ کے مرشد) اُن دنوں لاہور ہی میں تشریف فرما تھے۔ انہیں جب اطلاع ہوئی تو ملنے کے لیے خود تشریف لائے۔ پیر اور مرید کے مابین کافی دیر محفل رہی۔ حضرت لاہوریؒ بھی

اس مجلس میں موجود تھے۔ امیر شریعتؒ نے دونوں حضرات سے دُعا کے لیے درخواست کی، تو حضرت رائے پوریؒ نے فرمایا "آپ کے لیے دُعا نہیں کریں گے شاہ جی! تو اَور کس کے لیے کریں گے؟ آپ تو ہمارے لیے آخرت کا سرمایہ ہیں!" یہ سُن کر امیر شریعتؒ زار وقطار رونے لگے، اور کافی دیر تک روتے رہے۔ اس دِن کی یہ مجلس آنسوؤں کے طُوفان میں بہہ گئی۔

شیخوپورہ کے کچھ دوست ملنے آئے تو اُن سے گفت گو طویل ہو گئی۔ اس دَوران حضرت انور شاہ صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کا ذکر آ گیا، تو امیر شریعتؒ نے رقت انگیز لہجے میں کہا:

"مولانا سیّد انور شاہ صاحب اپنے دَور کے بہت بڑے محسن تھے اور ان کی زندگی اسلاف کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔"

اس گفت گو کا رُخ مُڑ کر جب شیعہ و سُنّی مناقشات کی طرف آیا تو امیر شریعتؒ نے ایک آہ بھر کر کہا:

"قوم کن راستوں پر چل نکلی ہے، جب میں ایسی باتیں سُنتا ہوں، تو رات بھر سوچتا رہتا ہوں، کہ آخر کیا بنے گا؟ کیونکہ اس مُلک کا اور خود مسلمانوں کا فائدہ اُن کے باہمی اتحاد میں ہے، اور صحیح اسلامی نظریات بھی تبھی ہمہ گیر ہو سکتے ہیں۔"

ایک دن مولانا ابوالحسنات نے تحریک تحفظ ختم نبوّت کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"شاہ جی! لوگ بھی عجیب ہیں۔ ایسی ایسی غزلیں کہتے ہیں کہ جن کا نہ مطلع درست ہوتا ہے نہ مقطع۔ ایک دوست نے مجھ سے

سوال کیا "حضرت! یہ درست ہے کہ عطاء اللہ شاہ نے حکومت سے روپیہ لے کر تحریک ختم نبوت کو ختم کیا ہے؟" تو میں نے غصے میں اُس سے کہا "بیوقوف! تیرے جیسے لوگوں نے تو مجھے ان نیک لوگوں سے برگشتہ کیا ہوا تھا۔ جب میں ان کے نزدیک ہوا، تو انہیں دین کی خدمت کرنے میں بہت مخلص پایا۔ باقی رہی تحریک ختم نبوت، تو وہ میری رہنمائی میں چل رہی تھی۔ اگر کوئی بات ہوتی تو میرے علم میں ہوتی۔ رہی روپیہ لینے کی بات، تو مجھے یاد ہے ایک دفعہ سکھر جیل میں شاہ جی کا داماد (سید وکیل احمد شاہ) میرے سامنے انہیں ملنے آیا، اور اس نے گھر کی پریشان حالی کا ذکر کیا، تو شاہ جی نے حاجی دین محمد صاحب کی طرف رقعہ لکھا، کہ رقعہ ہذا کو دو صد روپیہ قرض دے دیں۔ انشاء اللہ رہا ہو کر آپ کو ادا کر دوں گا۔" ان واقعات کی موجودگی میں میں تمہاری بات پر کیسے یقین کر لوں۔ اس پر معترض بہت شرمسار ہوا۔

مولانا ابوالحسنات کی زبانی یہ سارا کچھ سن کر امیر شریعتؒ نے ایک آہ بھری اور فرمایا

"زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں"

اس شعر پر مولانا ابوالحسنات نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"سبحان اللہ! کیا تعریف ہوئی ہے ہماری۔"

اس پر محفل کے تمام لوگ بے اختیار ہنس پڑے۔

حفیظ جالندھری

انہیں محفلوں میں ایک دن حفیظ جالندھری بھی آ شامل ہوئے اور دیر تک اپنے اشعار سے امیر شریعتؒ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش میں لگے رہے لیکن اس روز امیر شریعتؒ کو جس قدر بیزار اور پریشان دیکھا، اس سے پیشتر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ شکن آلود پیشانی پر غصے کے ہزاروں نقشے ابھر کر بپھرے ہوئے دریا میں موجوں کی طرح طوفان بپا کرنے لگے۔

اصول کے معاملے میں امیر شریعتؒ جب بگڑ جاتے تو دوست کو بھی دشمن بنا لیتے لیکن اخلاق کے بازار میں اُن کے ہاں جو سودا تھا، اُس کے لیے وہ دونوں میں امتیاز نہیں کرتے تھے۔ مگر حفیظ جالندھری سے اس روز کی یہ اعتنائی حیرت انگیز تھی۔ غصے میں کہا "حفیظ صاحب! آپ اپنے ارادوں میں نہ پہلے کامیاب ہوئے ہیں نہ آئندہ، انشاء اللہ کامیاب ہوں گے۔ بہتر ہے کہ آپ مجھے اپنی طرف متوجہ نہ کریں۔"

امیر شریعتؒ کے یہ مختصر جملے ساری محفل کا مزہ کرکرا کر گئے۔ ایسا کیوں ہوا؟ یہ سوال دلوں سے نکل کر زبانوں پر آتے ہی دالا تھا کہ حفیظ صاحب اٹھ کر چلے گئے۔

"شاہنامہ اسلام" کی پہلی جلد طبع ہو کر جب بازار میں آئی، تو امیر شریعتؒ ان دنوں تحریک شاتم رسولؐ میں مصروف تھے۔ "تاریخ اسلام" کو پہلی بار منظوم کیا گیا تھا۔ اور انداز بھی خوب تھا، جسے مصنف کے ترنم نے مزید جلا دی تھی۔ امیر شریعتؒ کو شاعر کا یہ طریق النظم پسند آیا، اور وہ "شاہنامہ اسلام" کے

مطالعہ کے لئے مسلم نوجوانوں کو دعوت دینے لگے۔ اس کے دو ردِ عمل ہوئے اوّل کتاب مذکور کا پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا، اور مصنف کا نام پنجاب کی فضاؤں میں تیرنے لگا۔ دوسرا یہ کہ امیر شریعتؒ اور رضیہ صاحب کے درمیان قرابتداری کو غنیمت جان کر فرنگی حکمرانوں کے ایجنٹوں نے امیر شریعتؒ کو رام کرنے کے لیے مفید سمجھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کھلاڑی اپنی بازی میں مات کھا گیا۔ لیکن کوشش تو دلِ ناتواں نے خوب کی۔

مذکورہ بالا واقعات کی ساری عمارت قیاس یا گمان پر نہیں بلکہ امیر شریعتؒ کے اپنے یقین پر استوار ہے۔ ورنہ محبت اور اصول کی دنیا میں پرورش پانے والا انسان ریت کی دیوار پر اپنے دعویٰ کا اعلان نہیں کر سکتا۔

مولانا حبیب الرحمٰن کا انتقال

احباب کی آمد و رفت کے باعث مجالس گرم رہتیں۔ حاجی دین محمد کا مکان ادیبوں، شاعروں، سیاسی رہنماؤں اور مذہبی لوگوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ امیر شریعتؒ بیماری سے نجات کے لیے دل بہلانے میں مصروف رہتے۔ اس طرح سے مریض اپنے مرض سے آہستہ آہستہ صحت یاب ہو رہا تھا کہ ۲ ستمبر ۱۹۵۶ء کو بھارت ریڈیو پر مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کے انتقال کی خبر سُنی۔ امیر شریعتؒ پر اس غم کا اس تیزی سے اثر ہوا، جیسے پھول پر خزاں کا موسم آ پہنچا ہے اور اس کی تمام پتیاں جھڑ کر گر جاتی ہیں۔

جماعتی زندگی کے علاوہ مولانا حبیب الرحمٰن کو امیر شریعتؒ بھائی کہا کرتے تھے، اور یہ

رشتہ دونوں حضرات کے گھروں تک جا پہنچا تھا۔

مولانا حبیب الرحمٰن کی موت ایک قافلہ سالار کی موت تھی۔ شبر پیشۂ حریت کا رروان زندگی کی مہار تھامے جب میدان کارزار میں پہنچتا، تو برطانوی سامراج کا دل دہل جاتا۔ ان کی رہنمائی میں مجلس احرار نے کئی اہم فیصلے کیے۔ جنہیں تاریخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکے گی۔

مولانا کی موت کی خبر سن کر امیر شریعتؒ دن بھر خاموش رہے اور کبھی کبھار ایک آہ سرد کے ساتھ اپنی اس خاموشی کو توڑ کر فرماتے۔

"ایک اچھے رفیق، مونس و غمخوار اور سراپا ایثار ساتھی کی جدائی نے میرے سینے میں ایک اور زخم کا اضافہ کر دیا ہے"

ایک غلط خبر

سیاسی راہنماؤں کو اخبارات میں اپنے نام شائع کرانے کی عام بیماری ہے لیکن امیر شریعتؒ اخبارات میں بیان دینے سے ہمیشہ اجتناب کرتے، اگر کبھی نامہ نگاروں کے نرغے میں آجاتے، تو انہیں بڑی حکمت عملی سے ٹال دیتے۔ حالانکہ بعض دفعہ ان کی ذات سے متعلق بہت سی غلط سلط خبریں شائع ہوتی رہیں، لیکن وہ انہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ مگر شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین کے عوامی لیگ میں چلے جانے پر بہت سی بے بنیاد خبریں تراشی جانے لگیں، ادھر ان دنوں عوامی لیگ، پاکستان میں مخلوط انتخاب کی حامی تھی جس کے باعث تحریک ختم نبوت کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا

چنانچہ جیسے ہی یہ بے بنیاد خبر اخبارات میں شائع ہوئی کہ

"امیر شریعتؒ حضرت مولانا سید عطاء اللہ صاحب بخاری کو وزیر اعظم پاکستان جناب حسین شہید سہروردی نے عوامی لیگ میں شمولیت کی دعوت دی ہے، اور راولپنڈی روانہ ہونے سے قبل وزیر اعظم نے حضرت شاہ صاحب کو گورنمنٹ ہاؤس میں ملاقات کیلئے بلایا ہے۔"

حضرت امیر شریعتؒ کو جب اس خبر کی طرف متوجہ کیا گیا تو فقط اس قدر فرمایا:

"نامعلوم اس اخبار نے میرے متعلق ایسی بے بنیاد خبر کیوں شائع کی، جبکہ میں مدت ہوئی ان سیاسی بکھیڑوں سے الگ تھلگ ہو چکا ہوں، اور نہ ہی میں اپنی نجی مجلسوں میں سیاسی گفتگو کو پسند کرتا ہوں۔ پھر عوامی لیگ! جو کہ مخلوط انتخاب کو پاکستان کی بقا کے لیے بہتر سمجھتی ہے، اور میں اسے مسئلہ ختم نبوت کے لیے زہر قاتل سمجھتا ہوں۔

مقدمات کی واپسی

مولانا حبیب الرحمٰن کی موت کے صدمے نے امیر شریعتؒ کی طبیعت پر خاصا اثر کیا تھا، اس سے ذرا سنبھالا لیا تو قریباً تین ماہ لاہور میں گذار کر اپنے معالج ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ کی اجازت سے ۱۳ نومبر ۱۹۵۶ء کو ملتان واپس چلے گئے۔

ان دنوں بیماری میں قدرے افاقہ تھا اور گھر سے نکل کر سلیمی دواخانہ پر

آ بیٹھتے۔ احباب بھی یہیں آجاتے، نمازِ مغرب تک محفل جمتی۔

۱۵ ر نومبر ۱۹۵۶ء کو اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ حکومت مغربی پاکستان نے حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری پر دائرکردہ تمام مقدمات واپس لے لیے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی دوسری پابندیاں بھی اٹھالی ہیں۔"

اس خبر کو پڑھ کر امیر شریعتؒ کو حکومت کے خلاف سخت غصہ آیا اور برہم ہوکر اخبارات کو حسبِ ذیل بیان دیا:

"حکومت نے صرف میرے مقدمات اور میری پابندیاں اٹھاکر میری سخت توہین کی ہے۔ حکومت کے اس اقدام سے مجھے بڑا صدمہ پہنچا ہے۔ میری پوری زندگی میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ حکومت نے مجھے جیل بھیج دیا ہو اور میرے ساتھی جیل سے باہر رہیں یا میرے ساتھی تو جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں محبوس ہوں اور میں اکیلا جیل سے رہا ہو جاؤں۔ یہ بات میری جماعت کی تاریخ اور روایات کے خلاف ہے کہ حکومت صرف میرے مقدمات واپس لے لے، اور مجھ پر عائدکردہ پابندیاں اٹھالے، لیکن میرے تمام ساتھی طرح طرح کے مقدمات میں جکڑے رہیں۔

یہ کیا مذاق ہے کہ جن تقاریر کی بنا پر ہم سب پر پابندیاں عائد کی گئیں اور مقدمات دائر کئے گئے۔ انہیں تقاریر کی بنا پر جماعت کے رفقاء تو بدستور معتوب رہیں اور صرف مجھے آزاد کردیا جائے، حکومت کے اس اقدام سے میری جس قدر بے عزتی ہوئی ہے

اتنی بے عزتی کبھی نہیں ہوئی۔ اس سے بڑھ کر ستم ظریفی اور کیا ہو سکتی ہے کہ خانیوال کے مقدمے میں ہم سب ایک ہی جرم کی پاداش میں ماخوذ تھے، اس کا عنوان تھا "سرکار بنام سید عطاء اللہ شاہ بخاری وغیرہ"۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اس مقدمہ سے صرف مجھے خارج کر دیا گیا ہے اور میرے باقی ساتھیوں کو جدا جدا کر کے اُن کے خلاف مقدمات دائر کر دیے گئے ہیں۔

ایک مقدمہ کو مختلف مقدمات میں تبدیل کرنے میں ارباب حکومت کی نیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔"

مولانا ظفر علی خان

۲۷ نومبر ۱۹۵۶ء کی یہ خبر جب اخبارات میں آئی کہ مولانا ظفر علی خان وفات پا گئے ہیں تو امیر شریعتؒ کے دل پر ایک چوٹ سی پڑی، کچھ دیر خاموش رہ کر فرمایا:-

"تاریخ ماضی کی ایک اور دیوار گر گئی!"

خلافت تحریک کے دنوں میں امیر شریعتؒ صرف "زمیندار" اخبار ہی پڑھا کرتے تھے، اور اسی سے متاثر ہو کر وہ سیاسی میدان میں آئے، اس تعلق سے امیر شریعتؒ کے دل میں مولانا ظفر علی خان کے لیے بے پناہ احترام تھا، پھر دونوں ایک ہی ڈگر پر چلنے لگے جیل خانوں کی اکثر راتیں مشترک گزریں۔ اسی محبت اور تعلق کی بنا پر ۱۹۳۴ء کو جب قادیان میں احرار کانفرنس منعقد کرنے کا فیصلہ ہوا، تو امیر شریعتؒ نے اس کی صدارت کے لیے مولانا ظفر علی خان کا نام پیش کیا لیکن

مولانا حبیب الرحمٰن کی رائے تھی کہ اس کی صدارت امیر شریعتؒ کریں، اس پر چاشنی تکرار رہی۔ آخر مولانا حبیب الرحمٰن نے لدھیانہ سے امیر شریعتؒ کے نام پیغام بھیجا کہ — "میرا حکم ہے کہ قادیان کانفرنس کی صدارت آپ کریں، بس!"

اس حکم پر سر تسلیم خم کر دیا گیا۔ تاریخ کا یہی وہ موڑ ہے جہاں مولانا ظفر علی خاں مجلس احرار سے علیحدہ ہو گئے، آگے چل کر دونوں رہنما سر راہ ملتے تو رہے لیکن یہ ملاقات صرف زبان اور نگاہوں کی ہوتی۔ دل دونوں کے روٹھے رہے۔ ۱۹۵۳ء میں جب امیر شریعتؒ تحریک ختم نبوتؐ کے سلسلے میں کراچی جانے سے پیشتر لاہور میں آخری تقریر کرنے دہلی دروازے آئے، تو مولانا ظفر علی خان کو بھی وہاں لایا گیا۔ ان دنوں مولانا ظفر علی خان کی صحت جواب دے چکی تھی۔ دونوں ہاتھوں میں رعشہ طاری تھا۔ دونوں رہنما جب آمنے سامنے آئے تو دونوں کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

ایک ہی راستے کے دو مسافر، ایک ہی منزل کے دو راہی، جب انہیں واقعات نے ایک دوسرے سے بیگانہ کر دیا، تو دونوں اپنی اپنی تاریخ بنانے میں مصروف ہو گئے۔ برس ہا برس کے بعد جب دونوں ایک دوسرے سے ملے تو تاریخ مکمل ہو چکی تھی۔ مورخ نے دونوں کے آنسو تاریخ کے دامن میں گرہ دینے کے لیے محفوظ کر لیے۔

مولانا ظفر علی خان کی موت کا سن کر امیر شریعتؒ نے دل برداشتہ ہو کر کہا "کچھ دوست زندگی میں ساتھ چھوڑ گئے، اور کچھ کو موت چاٹ گئی"

اب میں تنہا رہ گیا ہوں، دیکھیں اب میری باری کب آتی ہے۔"

امیر شریعتؒ نے یہ فقرے اس انداز سے کہے کہ احباب کی آنکھیں بھی نمناک ہوگئیں۔

یہ سال بھی گذر گیا، اور اس سال کے واقعات بھی۔ امیر شریعتؒ کی عمر اس سال کے اختتام تک پینسٹھ سال ہو چکی تھی۔ اس دوران کے واقعات تاریخ کی مسلسل زنجیر بنتے جا رہے تھے، اور اس زنجیر کی ایک ایک کڑی دیانتدار مورخ کے مستقبل کا ایسا سرمایہ تھی، جس کے ضائع ہو جانے پر تاریخ کے ادھورے رہ جانے کا ڈر ہے۔

حضرت لاہوریؒ کا فتویٰ

مودودی جماعت کی اکثر تحریریں آئین اسلام سے انحراف کرتی ہیں۔ اسی طرح کی ایک تحریر "خطبات مودودی" میں درج ہے، جس سے توہین کعبہ کا پہلو نکلتا تھا۔ جب حضرت مولانا احمد علی صاحبؒ لاہوری نے اس تحریر کا محاسبہ کیا، تو اس جماعت کے کارکن بے قابو ہو کر جواب کی تلاش میں مصروف ہو گئے۔ اتفاق سے انہیں دنوں حضرت امیر شریعتؒ کا اردو اور فارسی کلام کا مجموعہ "سواطع الالہام" شائع ہوا تھا۔ اس میں ایک شعر تھا۔

زکافِ کعبہ تا کافِ کراچی
سراسر کفر در کفر دون کفر

اس شعر کی آمد کا پس منظر ۱۹۵۱ء کا وہ زمانہ ہے، جب پاکستان کی

صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے درمیان کھینچاتانی اور چپقلش کا سلسلہ جاری تھا، حضرت امیر شریعت نے اس غیر آئینی ہاتھاپائی کا ذکر احباب کی محفل میں کرتے ہوئے کہا:

"تم ایک پاکستان کو روتے ہو، باقی مسلمان ممالک کا کیا حال ہے، سب کے سب ایک دوسرے سے بدتر ہیں۔ کونسی جگہ ہے جہاں ملعون انگریز نے اپنا کام نہیں کیا۔ اس نے مسلمانوں کو تباہ کر کے رکھ دیا ہے، اور آج تو نقیب بھی یا امریکہ ہے یا برطانیہ۔ بہرحال ملوکیت ہے، اسلام وہاں بھی نہیں۔ اور میں تو بلاخوف کہتا ہوں کہ کعبہ سے کراچی تک ہر جگہ قانون کفر ہی مسلط ہے۔ کہلاتے تو سب مسلمان ہیں مگر کہیں انگریز کے ٹوڈی، اور کہیں نمک حرامان محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہیں کہ جس محسن انسانیت کی جوتیوں کے صدقے میں ان عیاشوں کو حکومتیں ملیں، عین وقت پر اسی کو فراموش کر بیٹھے (اور پھر اپنے مخصوص جلال آمیز انداز سے مندرجہ بالا شعر پڑھا)۔"

اور اس شعر کو خانیوال کے ایک نونہایندہ وکیل جس کا مودودی جماعت سے تعلق تھا، اپنے لیڈر کی تحریر کے جواب میں لکھ کر مولانا احمد علی صاحب کی خدمت میں بھیج دیا کہ مودودی پر تو آپ نے اعتراض کر دیا، مگر اس شعر کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟ خیانت یہ کی کہ یہ نہیں بتایا کہ یہ شعر کس کا ہے۔

اس تحریر کے جواب میں حضرت لاہوری نے فرمایا کہ یہ بھی کوئی مودودی

چھوٹا بھائی ہے اور گمراہ ہے۔" حضرت لاہوری کا یہ جواب اور اپنا سوال دونوں روزنامہ "کوہستان" لاہور میں شائع کرا دیئے۔

امیر شریعتؒ نے جب یہ سارا کچھ پڑھا تو اُسی وقت حضرت لاہوریؒ کو حسب ذیل خط لکھا:۔

"مکرمی و محترمی حضرت مولانا احمد علی صاحب زید مجدہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

روزنامہ "کوہستان" لاہور میں مَیں نے دو خط پڑھے ہیں، ایک میں میرے کسی شعر پر اعتراض ہے اور دوسرے میں آپ کا فتویٰ۔

میرے وہم میں بھی ذم کا یہ پہلو نہیں تھا۔ چونکہ آپ فرماتے ہیں کہ شعر سے ذم کا پہلو نکلتا ہے، آپ کے ارشاد کے بعد مَیں اس شعر کی کوئی تاویل کرنا نہیں چاہتا، اور استغفر اللہ پڑھتا ہوں، آپ بھی میرے حق میں دعا کریں، اللہ مجھے معاف کرے۔

ہاں! ایک عرض ہے کہ آپ نے اپنے خط میں مجھے مودودی کا چھوٹا بھائی قرار دیا ہے۔ مولانا! آپ مجھے تقریباً تیس چالیس برس سے جانتے ہیں۔ آپ نے کبھی مجھ کو جھوٹ بولتے دیکھا یا سُنا؟ جہاں تک اپنے متعلق مجھے خود یاد پڑتا ہے، جھوٹ بولنے کا اتفاق مجھ سے کبھی نہیں ہوا۔ آپ نے مجھے مودودی صاحب کا چھوٹا بھائی کیسے کہہ دیا؟

چھوٹے بھائی [illegible] آپ واپس لے لیجئے، شعر مَیں نے

قلمزن کردیا۔ محتاج دُعا

سید عطاء اللہ شاہ بخاری

ملتان ۔ ۵ جمادی الثانی ۱۳۷۶ھ"

اِس کے جواب میں حضرت لاہوریؒ نے امیر شریعتؒ کو حسب ذیل خط لکھا۔

"مخدومی و مکرمی!

حامی حق و ماحی باطل امام المجاہدین حضرت مولانا

سید عطاء اللہ شاہ صاحب زیدۃ برکاتہم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ کئی دن سے والا نامہ کے شرف سے مشرف ہو چکا تھا، بے حد عدیم الفرصت ہونے کے باعث ارسال جواب میں تاخیر ہوئی۔ آپ کی حق پرستی کی آپ کو مبارک باد دیتا ہوں، کہ آپ نے اس شعر کو جو مفہوم توہین بیت الحرام ہو سکتا تھا، میری گرفت پر اُسے اپنے دیوان سے قلمزن کر دیا ہے۔

آپ جیسی بلند پایہ، شہرہ آفاق اور قبولِ عوام و خواص شخصیت کا اپنے ایک موہوم شعر کو قلمزن کرنے سے اہلِ حق کے دلوں میں آپ کی عزت نسبتاً زیادہ بڑھ گئی ہے۔ آپ نے اپنے خط میں دوسری چیز یہ تحریر فرمائی ہے کہ میں نے آپ کو مودودی کا چھوٹا بھائی قرار دیا ہے۔ اس شعر سے قطع نظر کر کے اصلیت یہ ہے کہ آپ کے پاؤں مبارک میں جو جوتا ہے، میرے دل میں اُس کی اتنی عزت ہے کہ مودودی صاحب کے وجود کی بھی

اتنی نہیں ہے، چونکہ مودودی صاحب نے ہمارے تمام اسلاف

کی توہین کی ہے، جن میں مفسرین، مجددین، صوفیائے کرام، صحابہ کرام

حتیٰ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں چھوڑا۔ اسی لیے

مجھے اس سے بے حد نفرت ہے۔ خدا اُسے اس گمراہی کے

گڑھے سے نکالے۔

میں نے آپ کے متعلق جس عقیدت کا اظہار کیا ہے،

وہ حقیقت پر مبنی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تا دیر سلامت رکھے،

اور بدستور سابق حق و صداقت کا جھنڈا آپ کے ہاتھ میں رہے،

اور آپ کی جماعت آپ کے جھنڈے کے سائے میں ہمیشہ

کامیاب و بامراد رہے۔ آمین یا الٰہ العالمین

احمد علی - امیر انجمن خدام الدین لاہور

۱۹ر جنوری ۱۹۵۷ء

پولیس کی نگرانی

بیماری کے باعث امیر شریعت اس قابل نہیں رہے تھے کہ پہلے کی طرح سفر کرتے۔ نقاہت نے ہر طرح کی سرگرمیوں سے معذور کر دیا تھا۔ البتہ دوستوں کے اصرار پر کبھی کبھار مقامی جلسوں میں آ بیٹھتے تھے۔ چنانچہ اسی طرح کے ایک اجتماع میں جو تحفظ ختم نبوت کے تحت ہوا، تشریف لائے۔ پاؤں میں درد تھا طوعاً و کرہاً جلسہ گاہ میں پہنچ گئے، صدارت بھی کی، اور چند منٹ تقریر بھی، اس

میں کہا :-

"عزیزو! اب میرے میں وہ جان نہیں رہی کہ تمہیں گھنٹوں بٹھائے رکھوں، اب تو چراغِ سحر ہوں، اس ٹمٹماتے ہوئے دیئے کی لَو میں چند گھڑیاں بیٹھ کر اگر تمہیں زندگی کا کوئی نشان مل سکتا ہے تو اُسے تلاش کر لو۔

اس حالت میں بھی پولیس میرا پیچھا نہیں چھوڑتی، دن رات چوروں کی طرح میری نگرانی کرتی رہتی ہے۔ مگر سی، آئی، ڈی کا ربوہ کی طرف کوئی دھیان نہیں، حالانکہ وہاں سے یہ خبریں آ رہی ہیں کہ مرزا محمود نے اپنا سرمایہ ہندوستان منتقل کرنا شروع کر دیا ہے ۔ کیا ہی اچھا ہو کہ مرزا محمود کی خواہش کے مطابق اسے ہندوستان ہی بھیج دیا جائے تاکہ پاکستان کی سالمیت کو کوئی گزند نہ پہنچے۔

جب یہودیوں کو جرمن سے نکالا گیا اور عربوں کو بے خانماں کرکے یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا جانے لگا تو ہم دیوانوں کی جماعت نے اُس وقت ہندوستان اور دیگر ممالکِ اسلامیہ کے مسلمانوں کو خبردار کیا تھا کہ انہیں وہاں آباد ہونے سے روکا جائے۔ ہماری یہ آواز ایک غلام ملک کی جماعت کی آواز تھی اور انگریزی مظالم کا تختۂ مشق جماعت کی پکار تھی، جو نہ مصر نے سُنی اور نہ ہی کسی دوسرے مسلمان ملک نے، اب وہی اسرائیل

حکومت اور وہی یہودی مشرقِ وسطیٰ کے لیے سرطان کا پھوڑا ثابت ہو رہے ہیں۔

اسی طرح آج پھر بولا کہتا ہوں کہ ربوہ کی خبر لو، ربوہ کا وجود پاکستان میں اسرائیل سے زیادہ خطرناک ہے۔ تمہیں میری نگرانی تو کرنی آتی ہے لیکن ربوہ میں مرزا محمود کی اپنی عدالتیں اور اپنا نظامِ حکومت ہے، یہ تمہیں کیوں دکھائی نہیں دیتا؟ میرا وجود جو صرف ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا ہے یہ تمہاری نظر میں کھٹکتا ہے اور ربوہ جو پاکستان میں ایک ریاست کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا ہے انہیں دکھائی ہی نہیں دیتا، مملکت در مملکت کا وجود آخر کیوں برداشت کیا جا رہا ہے۔ تمہاری یہ غفلت ایک دن بڑے نتائج پیدا کرے گی۔

صحیح النسب

لاہور میں علاج سے مایوس ہو کر ملتان واپسی پر حکیم حنیف اللہ خلف الرشید حکیم عطاء اللہ خان کے زیرِ علاج رہے۔ حکیم حنیف اللہ قرآن کریم اور دوسرے دینی علوم سے فارغ ہیں۔ گھر کے قریب ہونے کی وجہ سے بھی ان سے قرابت زیادہ رہی۔ شب و روز انہیں کے ہاں بیٹھک رہتی۔

حکیم حنیف اللہ کا کہنا ہے کہ شاہ جی کی بیماری اس قدر جڑ پکڑ چکی تھی کہ اس کے لیے قیمتی دواؤں کی ضرورت تھی جس کا میں متحمل نہیں تھا۔ شاہ جی سے

اس لئے پیسے مانگتے ہوئے بھی عار محسوس ہوتی تھی۔ اسی پریشانی میں تھا کہ ایک رات خواب میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ میں نے دیکھا کہ حضورؐ کے ایک جانب شاہ جی ہیں اور دوسری طرف ایک برقعہ پوش عورت بیٹھی ہے۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اس خواب کی تعبیر تلاش کرنے لگا۔ مجھے اس فن پر ملکہ ہے۔

پریشانی اس پر تھی کہ خاتم الانبیاء کے دربار میں عورت کون ہو سکتی ہے، آخر تعبیر سے یہ پتہ چلا کہ برقع پوش عورت شاہ جی کی بیوی تھی۔

اس سے میں نے اندازہ لگایا کہ ایک تو شاہ جی کا خاندان (میاں بیوی) عالی نسب سید ہیں۔ دوسرا یہ کہ مجھے علاج کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کے بعد میں نے بلا جھجک شاہ جی کا علاج کیا، اور قیمتی سے قیمتی دوائیاں استعمال کرائیں۔

بہاروں میں رہ کر زندگی گزارنے والا انسان جب خزاں کے پیٹے میں آتا ہے، تو ہر موسم کا نشیب و فراز اس کے جسم کی حرارت کو اکساتا ہے، اگر اردگرد کے کانٹے اُس کی ساری شگفتگی کو کرکرا کر دیتے ہیں۔

حضرت امیر شریعتؒ اپنے پیچھے جن راہوں کو چھوڑ کر آئے تھے، اُن کے ایک ایک موڑ پر آرزوؤں کے ہزاروں ہجوم اُن کے سامنے تھے، لیکن جس موڑ پر وہ آج کھڑے ہیں وہاں تمناؤں کے جنازے اُٹھتے نظر آ رہے تھے۔ مایوسیوں اور نامرادیوں نے انہیں اس بازار کی بے کار جنس بنا دیا تھا، جس کا اقرار وہ خود اپنے معالج کے سامنے کرتے ہیں۔

"حکیم صاحب! میں فالج اور ذیابیطس کا مریض نہیں

ہوں۔ اصل یہ ہے کہ میری محفلیں اُجڑ گئی ہیں، دیکھیے استاد عظیم آبادی کیا کہہ گئے ہیں ؎

کانٹوں میں گھرا ہوا ہے چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے!"

ملکی حالات، حکمران طبقہ سے مایوسی، دوستوں کی بے وفائی، بیماری، اور بڑھاپا، ان تمام کے پیش نظر امیر شریعتؒ نے اپنی انجمن اپنے گھر سجھا لی تھی، اور حسب ذیل تحریریں اس محفل میں نمایاں نظر آتی تھیں۔

۱ : حدیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ اذا وُسِّدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ
(جب حکومت نااہل لوگوں کے سپرد ہو، تو قیامت کا انتظار کرو")

(رواہ البخاری)

۲ : پیر وارث شاہ کے چند اشعار (پنجابی)

۱۔ ڈِٹھا کھنڈ نے کھیر دا ہویا راکھا رنڈا ہُنجیا ساک کراونے نوں
۲۔ انہاں زہر دے واسطے سد آندا سکوں آیا سی زہر دیکھاونے نوں
۳۔ جنہیں اپنی زہر سہیڑ لوئی ٹھگا چوڑ چپٹ کراونے نوں
۴۔ سرہوں ڈھک کوڑیاں کول رکھی واسنے کگڑاں پا سکاونے نوں
۵۔ گدڑ کھیراں نے جمعدار ہویا اُٹھ چلیا باغ لگاونے نوں
۶۔ بیڑی کاغذی باندر ملاح بنیا انہاں کھلیاں پور لنگھاونے نوں

۷۔ راکھا مال وادھاڑوی رکھیو نے پور سدّیا کھوج لگاونے نوں
۸۔ راکھا جواں دے ڈھیر دا گدھا ہویا انہاں گھلّیا حرف لکھاونے نوں

(ترجمہ) ۱۔ بھُو کے آدمی کو بھینی اور کھیتی کی رکھوالی دے دی اور جس کی اپنی بیوی فوت ہو چکی تھی، اُس کو کسی کے رشتہ کیلئے بھیجا گیا۔

۲۔ جسے زہر کے علاج کے لیے لائے تھے، وہ خود زہر ثابت ہوا، گویا یہ کام انہوں نے اپنے ہاتھ سے کیا

۳۔ اپنے گھر کی بربادی کے لیے انتظام آپ کیا۔

۴۔ کیڑے مکوڑوں کے پاس سرسوں کا ڈھیر لگا دیا، اور مرغیوں کے سامنے دانے خشک کرنے کے لیے ڈال دیئے۔

۵۔ گیدڑ کو خربوزوں پر نگہبان کر دیا اور اونٹ کو کہا کہ تو باغ لگانے جا۔

۶۔ کاغذ کی بیڑی بنا کر بندر کو ملاّح بنا دیا، اور اندھے سے کہا کہ تم جاؤ اسے کنارے پر چھوڑ آؤ۔

۷۔ خزانے کی نگہداری کے لیے چور کو مقرر کیا اور چوہی سے کہا کہ تم چور کی تلاش کرو۔

۸۔ دھان کے ڈھیر پر گدھے کو رکھوالا کر دیا اور اپنا بیٹے کو خط لکھوانے بھیجا۔

وارث شاہ نے یہ بات خدا جانے اپنے دور کے حاکموں سے کہی ہو یا نہ، لیکن امیر شریعت[7] نے وارث شاہ کے اشعار سے اپنے دور کے حاکموں

پر ایسی پھبتی کہی کہ امیر شریعتؒ کی ذہانت کی داد دیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ انہوں نے وارث شاہ کے اشعار کو کیسے وقت پر استعمال کیا جب کہ پاکستان کے حکمران جوتیوں میں دال بانٹ رہے تھے، اور اپنے اقتدار کی کرسیوں کے لیے وطن عزیز کو رسوا کر رہے تھے۔

جب کوئی دوست گھر آ کر پاکستان کے موجودہ حالات پوچھتا تو امیر شریعتؒ ان تحریروں کی طرف اشارہ کر کے فرماتے "بھائی! یہ پڑھ لو! —— بس یہی کچھ ہو رہا ہے"

شیعہ سُنّی فساد

قید سے آزاد ہوتا ہے جب کوئی محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے بعد برسر اقتدار لوگ اتحاد بین المسلمین کو پریشان کرنے کی تجویزیں کرنے لگے۔

شیعہ، اہل سنت والجماعت، اہل حدیث، بریلوی یا دیوبندی کا باہم مل بیٹھنا پاکستان کی زندگی میں پہلا واقعہ ہے۔ ۱۹۵۳ء میں یہ تمام فرقے پیغمبرِ اسلام کی آبرو کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن گئے تھے، اور یہ امیر شریعتؒ کے خلوص کی زندہ مثال تھی کہ انہوں نے آگ اور پانی کو ایک جگہ جمع کر دیا تھا لیکن حکومت کے اپنے مستقبل کے لیے یہ اتحاد سود مند نہیں تھا۔

چنانچہ اگست ۱۹۵۷ء کو مغربی پاکستان کے اکثر شہروں میں شیعہ سنی فساد

ہوتے، ان دنوں مرکز پر جنرل سکندر مرزا جو عقیدۃً شیعہ تھے، اور مغربی پاکستان میں ڈاکٹر خان صاحب وزیر اعلیٰ تھے جو سکندر مرزا کے سیاسی مُرید تھے۔ انہوں نے سکندر مرزا کی خوشنودی کے لیے مغربی پاکستان کے تمام ڈپٹی کمشنروں کو ہدایت بھیجی کہ شیعہ فرقہ کو مذہبی آزادی ہے، وہ جہاں مناسب سمجھیں محرم کے لیے لائسنس حاصل کر سکتے ہیں۔ اس حکمنامے کا انکشاف لاہور کے شیعہ رہنما قیصر مصطفیٰ ایڈووکیٹ نے اپنے ایک بیان میں کیا جو ۱۵ ستمبر ۱۹۵۷ء کے اخبارات میں شائع ہوا۔

اس فساد سے امیر شریعتؒ اس قدر متاثر ہوئے کہ اس کا اندازہ حسب ذیل تقریر سے ہوتا ہے جو انہوں نے ۲۷ اگست ۱۹۵۷ء کو ملتان کے قریب ایک بستی (کنڈا سرگانہ) میں کی۔

"ملک کے مختلف حصّوں میں شیعہ سُنّی فساد کی اطلاع نے مجھے بے حد دُکھ پہنچایا ہے۔ مسلمانوں نے معمولی باتوں پر اپنے بھائیوں کا خُون بہا دیا، اور میری چالیس برس کی اتحاد و اتفاق کی کوششوں کو برباد کر دیا۔

شیعہ سنی تنازعات کی اصل جڑ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ چوتھے خلیفہ کیوں ہوئے؟ پہلے خلیفہ کیوں نہ بنائے گئے؟ شیعہ سُنّی تنازعات، تعزیہ وغیرہ کی رسوم اُن کے آئمہ یا سلف کا عمل یا قول نہیں ہے، یہ ایک رسم ہے، جیسے کہ سُنّی مسلمانوں میں کئی ایک رسمیں رائج ہو چکی ہیں۔ مَیں کل سے یہاں بیٹھا ہوں، لیکن آپ نے مجھے پہلے

تقریر کا موقعہ نہیں دیا۔ کیا یہ میری بے عزتی نہیں؟ مجھ سے پہلے مولانا عبدالستار نے تقریر کی، وہ انصاری ہیں۔ ہمارے ناظم اعلیٰ ارائیں ہیں، اور میں اہلِ بیت کا فرد ہوں، سید اور ہاشمی ہوں۔ مجھ سے قبل ان لوگوں کو وقت دیا گیا ہے جو ہندوؤں سے مسلمان بنے۔ کیا یہ آلِ رسول کی توہین نہیں؟ ——

(مجمع پر اس وقت سکوت طاری تھا، آپ نے سامعین سے جواب طلب کیا۔ مجمع کے اس سکوت کو اور اپنے سوالوں کا خود ہی جواب دیتے ہوئے کہا)

آخر میں تقریر کرنا میری بے عزتی نہیں۔ مولانا عبدالستار تقریر کر رہے تھے۔ میں نے کہا، اگر آپ کو تکلیف نہ ہو تو میں تقریر شروع کروں، تو مولانا عبدالستار نے کہا۔ اگر آپ پہلے تقریر کر دیں گے تو آپ کے بعد ہمیں کون پوچھے گا۔ (امیر شریعت نے مجمع سے سوال کیا) کیا یہ عزت ہے یا بے عزتی؟ بعد میں آنا بے عزتی کی دلیل نہیں۔

معراج کی رات تمام انبیاء کرام علیہم السلام کا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں نماز ادا کرنا بھی میرے دعوے کی دلیل ہے۔ ان انبیاء کرام میں سے حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے آخر مبعوث ہوئے، کیا یہ رسول کریم کی عزت ہے یا (معاذ اللہ) آپ کی بے عزتی؟

مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے آخری نبی ہیں، اور آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آنے گا۔ اس نسبت سے چاہیئے تو یہ تھا کہ جس طرح نبوت کا خاتمہ خاندانِ ہاشم پر ہوا، خلافت کا خاتمہ بھی ہاشمی خاندان پہ ہو۔

اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ سیدالانبیاء پہ نبوت ختم ہوئی، اور حضرت علیؓ پر خلافت۔ حضرت رسولِ کریم نبوت کے خاتم ہوئے اور حضرت علیؓ خلافت کے خاتم۔ اس کے بعد سلطنت اور بادشاہت شروع ہو گئی۔ بادشاہ اچھے بھی ہوتے ہیں اور بُرے بھی۔

یہ اور بات ہے، میں چونکہ اولادِ علیؓ ہوں، اس لیے خواہش کروں گا، کہ میرے ابا کو پہلی خلافت ملتی، یا اُس وقت میں ہوتا تو خود اپنے لیے خلافت کی خواہش کرتا، جیسے سرسیّد سے کسی نے پوچھا تھا کہ اُس وقت اگر آپ ہوتے تو کیا کرتے؟ تو سرسیّد نے جواب دیا کہ میں خود خلافت حاصل کرنے کی کوشش کرتا، لیکن اصل بات یہ ہے کہ خاتمِ خلافت کا اعزاز حضرت علیؓ کو ملنا تھا۔

اگر سب مسلمان اسی عقیدے پر متفق ہو جائیں تو اختلاف کیا رہ جاتا ہے۔ یہ نعرہ اور جلوس تو معمولی باتیں ہیں، یہ کوئی دین نہیں مسلمانوں کو معمولی باتوں پر توجہ نہ دینی چاہیئے، لیکن

افسوس کہ یہی معمولی باتیں اب خوفناک صورت اختیار کر رہی ہیں اور اب نوبت خون خرابے تک پہنچ گئی ہے۔ (آخر میں آپ نے مسکراتے ہوئے فرمایا)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نبوت نہیں۔ حضرت علیؓ کے بعد کوئی خلافت نہیں اور اس جلسے میں میری تقریر کے بعد کوئی تقریر نہیں۔"

ڈاک پر سنسر

۲۷ جون ۱۹۵۷ء کو صوبائی گورنر نے کریمنل لاء اینڈ منجمنٹ ایکٹ (Criminal Law and Management act) مجریہ ۱۹۰۸ء کی دفعہ ۱۶ کے تحت مجلس احرار کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ اس کے کچھ دنوں بعد حکومت مغربی پاکستان نے حضرت امیر شریعتؒ کی ذاتی ڈاک پر سنسر بٹھا دیا۔ نیز ان کے ٹیلی فون بھی سنے جانے لگے۔ حکومت کی اس حرکت پر مغربی پاکستان اسمبلی کے بجٹ سیشن میں ۴ ستمبر ۱۹۵۷ء کو مسلم لیگ پارٹی کے قائد سردار بہادر خان نے نکتۂ استحقاق پیش کرتے ہوئے حکومت سے سوال کیا۔ جس کے جواب میں وزیر اعلیٰ سردار عبدالرشید نے قائد حزب اختلاف کو یقین دلایا کہ حکومت سید عطاء اللہ شاہ بخاری اور دوسرے سیاسی کارکنوں پر سے اس قسم کی پابندیاں جلد دور کر دے گی۔

بیماری کے باوجود کبھی کبھار حلقۂ احباب کے اصرار پر صرف ضلع ملتان کے تبلیغی اجتماعات میں شرکت کرتے لیکن معالج کے اصرار پر یہ سلسلہ بھی منقطع کر دیا۔

جسم ناتواں ہو چکا تھا، سفر کرنے بھی تو بادل نخواستہ۔ مگر ۱۹۵۸ء کے شروع میں سفر سے مکمل اجتناب کیا۔ اب لے دے کر حکیم حنیف اللہ کا مطب تھا یا گھر کی چاردیواری نظر کی کمزوری اور جسم کی نقاہت کے باعث راستے میں کئی سہارے لینے پڑتے۔

مجلس احرار کا احیاء

۱۹۴۹ء میں سیاسیات سے لاتعلقی کے بعد امیر شریعتؒ نے اپنے کارکنوں سے کہہ دیا تھا کہ تم میں سے اگر کوئی ملکی معاملات میں دلچسپی لینا چاہے، تو مسلم لیگ میں شامل ہو جائے، اس اعلان کے بعد احرار کارکنوں نے مسلم لیگ میں شامل ہونا شروع کر دیا، لیکن لیگی رہنماؤں نے اپنے غیر مخلص ارادوں کے پیش نظر احرار کے خلوص کو مشتبہ نظر سے دیکھا اور ان کے لیے اپنے تمام دروازے بند کر دیے۔ اس عدم تعاون کا نتیجہ یہ ہوا کہ احرار رہنما اپنے فیصلے پر از سر نو غور کرنے پر مجبور ہوئے۔ انہیں دنوں شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین عوامی لیگ سے الگ ہو کر اپنے پرانے گھر واپسی کے لیے سوچ رہے تھے کہ ۸ راگست ۱۹۵۸ء کو صوبائی وزیر اعلیٰ نواب مظفر علی قزلباش نے مجلس احرار پر سے تمام پابندیاں اٹھا لینے کا اعلان کر دیا۔

صدر سکندر مرزا کی خواہش

اس سے پیشتر ۹ رمئی ۱۹۵۸ء کو صدر پاکستان میجر جنرل سکندر مرزا ملتان آئے تو انہوں نے حضرت امیر شریعتؒ سے ملاقات کی خواہش کی۔ اس ملاقات

کے مہتمم شیعہ رہنما مظفر علی شمسی تھے۔ جب امیر شریعتؒ کو اس کی اطلاع ہوئی، کہ گیلانیوں کی دعوت کے موقعہ پر صدر مملکت مجھ سے ملنا چاہتے ہیں، اور اس کے لیے شمسی صاحب امیر شریعتؒ کو لینے آئے تو امیر شریعتؒ نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا:

"شمسی! تم میرے عزیز ہو، میں تمہارا حکم نہیں ٹال سکتا۔ لیکن یہ سوچ لو کہ تم دونوں کی اپوزیشن کو خطرے میں ڈال رہے ہو۔ سکندر مرزا ملک کے صدر ہیں اگر وہ فقیر کے جھونپڑے میں آئیں، تو یہ اُن کی حیثیت کے خلاف ہے، اور اگر میں انہیں ملنے جاؤں تو اپنی عمر بھر کی کمائی برباد کر بیٹھوں گا۔ لہٰذا یہی بہتر ہے کہ میری طرف سے معذرت کر دو۔"

ابھی اس پر بحث ہو رہی تھی کہ لاہور میں ڈاکٹر خان صاحب پر قاتلانہ حملہ کی اطلاع پہنچ گئی اور اس طرح سے یہ کہانی ادھوری رہ گئی۔

مجلسِ احرار کا اجلاس

مجلس احرار پر سے پابندیاں ختم ہوتے ہی ۲۵ ستمبر ۱۹۵۸ء کو امیر شریعتؒ کے دولت کدہ پر احرار ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا، تاکہ جماعت پھر سے سیاسیات میں دخل انداز ہو سکے۔ اس موقعہ پر امیر شریعتؒ نے احرار رہنماؤں سے فرمایا:

"دوستو! آپ سب کو یہ حق ہے کہ جس طرح چاہیں اپنے لیے فیصلہ کر لیں۔ لیکن اپنی بیماری اور ملک کے موجودہ حالات

کے پیشِ نظر ہیں نے اپنے لیے ۱۹۴۷ء میں جو فیصلہ کیا تھا، اب بھی میں اُسی پر قائم ہوں۔ میرا جی نہیں چاہتا کہ پھر سے ان بکھیڑوں میں اُلجھوں۔ لیکن میں آپ حضرات کو نہیں روکتا۔ میری دُعائیں بہرحال آپ کے ساتھ ہیں۔ مگر میری ایک ہی خواہش ہے کہ حضورؐ کی نبوّت پر اس وقت جو ڈاکہ پڑ رہا ہے، آپ اس کا خیال رکھیں۔ بس! میری یہی آرزو ہے۔ باقی آپ اپنے معاملات میں آزاد ہیں۔"

فوجی انقلاب

سیاسی جماعت ہو یا مذہبی، اگر اُس کے کارکنوں میں خلوص، دیانت، اور محنت کا جذبہ نہیں، تو وہ جماعت نہیں بلکہ ایک بھیڑ ہے۔

۱۹۴۷ء میں جو لوگ مسلم لیگ پر قابض ہوئے، ان میں اکثریت ایسے لوگوں کی تھی، جن کے ہاں خلوص اور دیانت کا فقدان تھا، ورنہ مسلم لیگ بلاشرکت غیرے پاکستان پر پچاس سال تک حکمران رہ سکتی تھی۔

لوٹ مار، چھینا جھپٹی اور حکومت میں ٹکموں کی بندر بانٹ نے اس جماعت کے کارکنوں کو بُری طرح اُلجھایا کہ نوزائیدہ مملکت کا سانس اُکھڑنے لگا مغربی پاکستان میں نواب افتخار حسین خاں ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ کی جنگِ اقتدار سے بڑھ کر مشرقی پاکستان کے مولوی فضل الحق اور حسین شہید سہروردی کی کشمکش نے پاکستان کو ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا کہ ملک کی خارجہ پالیسی بھی بازیچۂ اطفال

بن کر رہ گئی تھی۔ حکومت کے اندر وزراء کی اپنی کرسیوں کی حفاظت میں جماعتی وفاداریاں روز و شب مشکوک دکھائی دینے لگیں۔ اندریں حالات قریب تھا کہ پاکستان اپنے ایک ہمسایہ ملک کی مذہبی کالونی بن جاتا۔ ۲۷ اور ۲۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی درمیانی رات کو میجر جنرل سکندر مرزا کو حکومت سے الگ کر دیا گیا اور اُن کی جگہ ملک کے تمام اختیارات جنرل محمد ایوب خان نے سنبھال لیے۔ اس فوجی انقلاب سے متعلق حضرت امیر شریعتؒ سے جب ان کے احباب نے سوال کیا، تو برجستہ فرمایا:

بُلبُل نے آشیانہ چمن سے اُٹھا لیا
اپنی بلا سے بُوم رہے یا ہُما رہے

باقی گیارہ سال پیشتر سے جس طرح جُوتیوں میں دال بٹ رہی تھی وُاس کا نتیجہ یہی ہونا تھا۔

دُعا کرو یہ فوجی انقلاب پاکستان کے لیے بہتر ہو"

احباب کی محفلیں

انسان بھی ایک کھلونا ہے۔ جب تک اس پر رنگ و روغن کی جلوہ آرائیاں رہتی ہیں، ہر ہاتھ اس کی خریداری کے لیے بڑھتا اور ہر آنکھ اس پر اُٹھتی ہے، لیکن جیسے ہی اس کا ملمع اُترتا ہے، پھر نہ کوئی آنکھ اُٹھتی ہے اور نہ کوئی خریدار آتا ہے۔

امیر شریعتؒ جب توانا تھے زمانے کی ہوائیں اُن سے اٹکھیلیاں کرتی تھیں،

بہاریں اُن کے قدم لیتیں، ان کی آواز کے زیر و بم سے حکومتوں کے عروج و زوال وابستہ رہے، لیکن جب کچھ بھی نہ رہا، تو پھر گلی کے موڑ بھی سہارا نہ دیتے تھے۔ اپنے تیمارداری کو آنے لگے، سما۔ آہ زمانہ کس قدر بے وفا ہے، اُن دنوں صرف گھر میں محفلیں ہوتیں یا شام کے وقت حکیم صاحب کے ہاں۔ اسی طرح کی ایک محفل میں فرمایا:

"میری دوستی اور دشمنی صرف ایک ہی دفعہ ہوتی ہے۔ (اس پر ایک شعر پڑھا) ؎

دل نیست، کبوتر کہ پرد باز نشیند
از گوشۂ بامے کہ پریدیم پریدیم

با تجبر شما بہ سلامت!

بس اسے کنارہ کشی سمجھئے یا دشمنی، میری طرف سے صرف اتنا ہوتا ہے۔ الحمدللہ کہ میں نے آج تک کسی کے متعلق برا سوچا ہے اور نہ ہی برا کیا ہے۔ ہاں انگریز اور مرزائی کے متعلق جہاں تک بس چلا برا سوچا اور کیا بھی۔"

اس پر مولانا یٰسین نے کہا "یہ تو پھر ضد ہے۔"

امیر شریعت نے فرمایا،

"ہاں! ضد نہیں یہ ایمان ہے۔ حدیث میں کیا پڑھا ہے، کہ مومن ایک سوراخ سے دو دفعہ ڈسا نہیں جاتا"

انہیں دنوں روزنامہ "امروز" (ملتان) کے نامہ نگار نے امیر شریعت سے

سے ملاقات کی۔ اس نے اپنے تاثر یوں بیان کیے ہیں۔

"ڈیڑھ برس پہلے کی بات ہے مجھ سے امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ پر ایک مصوّر فیچر تیار کرنے کو کہا گیا۔ میں ٹوٹر گرافر کو لے کر محلہ ٹبی شیر زمان پہنچا۔ شاہ جی کا پتہ معلوم کیا، مسجد کے عقب میں ایک کچّا سا مکان جس کے باہر لیٹر بکس لگا ہوا تھا۔ گلی کی طرف کھلنے والے کمرہ میں شاہ جی موجود تھے، وہ اُن دنوں بیمار تھے۔ خیر و عافیت پوچھ چکا، تو اپنا مدّعا بیان کیا۔ شاہ جی بات ٹال گئے، کہا کہ "اب زندگی کے آخری سانس گن رہا ہوں، اب تو آرام کرنے دو۔ اخبار کے کالم بھرنے کے لیے میرے ماضی کے بخئے اُدھیڑتے ہو" چند لمحے خاموش رہے، پھر کہا، "ایک بات پوچھوں؟" میں نے کہا، "ضرور، ارشاد فرمائیے" کہنے لگے "یہ جو چلّی ہے اس کا بادشاہ شیخ چلّی ہوگا۔" ان دنوں چلّی کی تباہی کے متعلق اخبارات میں خبریں آرہی تھیں۔ میں نے محسوس کیا کہ شاہ جی مجھے اِدھر اُدھر کی باتوں میں ٹال رہے ہیں۔ اس پر میں نے انہیں پھر اپنے مطلب کی بات کہہ دی۔ "شاہ جی! آپ کب سے اس کرائے کے مکان میں رہ رہے ہیں" فرمانے لگے۔ "۱۹۴۸ء میں یہاں آگیا تھا، اب تک یہیں پڑا ہوں۔" "آپ نے کوئی مکان الاٹ نہیں کرایا؟ آپ کا کلیم تو ہے؟" جواب میں فرمایا۔ "آپ مکان کی الاٹمنٹ کی بات کرتے ہیں

جانے قبر کے لیے چند گز زمین ملے گی یا نہیں ؟ ایک دفعہ ایک مرکزی وزیر صاحب مجھ سے ملنے ملتان تشریف لائے، انہوں نے بھی فرمایا تھا کہ اگر میں انہیں کہوں تو وہ مجھے مکان الاٹ کرا دیں گے، اور ساتھ ہی یہ ارشاد بھی فرما گئے کہ فلاں تاریخ کو فلاں صاحب ملتان سے گزر رہے ہیں، اُن سے مل لینا۔" میں نے پوچھا "پھر شاہ جی! آپ نے اُن سے ملاقات کی ؟" کہا "نہیں بالڑ میرے پاس کالی اچکن اور مزرائی ٹوپی نہیں تھی۔"

"شاہ جی! آپ کو ذیابیطس کی شکایت کب سے ہے ؟"

جواب دیا "یہ مرض سکھر جیل میں میرے ساتھ آ لگا تھا۔ ابھی تک سنگت نبھا رہا ہے۔"

"ان دنوں جب کہ آپ اس قدر بیمار ہیں، اور پبلک لائف سے بھی ریٹائر ہو چکے ہیں، کبھی دیرینہ رفقا میں سے کوئی ملنے آیا ہے ؟" جواب میں مسکرائے اور کہا "بیٹا! جب تک یہ کتیا (زبان) بھونکتی تھی، سارا برصغیر ہند و پاک ارادت مند تھا۔ اس نے بھونکنا چھوڑ دیا ہے تو کسی کو پتہ ہی نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں۔ ہاں دیرینہ میں سے ایک آدھ کو چھوڑ باقی میرے ہاں آتے جاتے ہیں۔" پچھلے دنوں ایبٹ آباد سے ایک دوست ملنے آئے، انہوں نے ایبٹ آباد جانے پر اصرار کیا، میں نے انکار کر دیا۔" میں نے کہا "شاہ جی! آپ اُن کے ہاں چلے جاتے،

ایبٹ آباد صحت افزا مقام ہے۔ ملتان کی گرمی میں آپ کیوں تڑپ رہے ہیں؟" جواب دیا، "بیٹا! اب عمر کی اُس سطح پر آ گیا ہوں کہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ کتنے لوگ میرے ہاں آتے ہیں، ساری عمر لوگوں کی مہمانی میں گذاری۔ اب میزبان بن کر بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔"

مَیں نے دیکھا کہ شاہ جی اب کھلنے لگے ہیں۔ چنانچہ کاغذ پنسل سنبھال لی تاکہ یادداشت کے لیے کچھ لکھ لوں، شاہ جی نے میری تیاری دیکھی، تو انہوں نے بات روک لی مَیں نے ایک اَور سوال کر دیا، جواب میں کہا، "اخبار والوں سے ڈر لگتا ہے۔ آپ لوگ اکثر واقعات مسخ کر دیتے ہیں۔ پھر غلط بیان دوسرے سے منسوب کر دیتے ہیں۔ اس ضمن میں مولانا عبدالمجید سالک مرحوم کا ایک واقعہ بھی سُنایا" یعنی ایک دفعہ سالک مرحوم نے یو۔ پی کے ایک جلسے کی تقریر میرے نام سے منسوب کر کے اپنے اخبار "انقلاب" میں چھاپ دی حالانکہ مَیں نے یو۔ پی میں کوئی ایسی تقریر نہیں کی تھی۔ جب اُن سے اس غلط تقریر کی شکایت کی تو اُنہوں نے خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ اس پر مَیں نے ۲۵ سال تک سالک صاحب سے بات نہیں کی۔

ایک دن صوفی تبسم مجھے پطرس بخاری کے ہاں دعوت

پہ لے گئے۔ پطرس نے مجھے مدعو کیا تھا۔ اس دعوت میں سالک بھی شریک تھے، وہاں ہم دونوں کی صُلح کرائی گئی۔ سالک نے میری پیٹھ پہ ہاتھ مار کر کہا" آپ نے میرے پچیس برس تباہ کر کے رکھ دیے ہیں "

یہ واقعہ بیان کرتے ہوئے شاہ جی کے چہرے پر غم کی پرچھائیاں پھیل گئیں، ایک لمبی سانس لی پھر کہا" سب یارِ کہنہ بچھڑتے جاتے ہیں۔ ایک دن مَیں بھی اُن میں جا ملوں گا"

"پطرس بخاری کے مکان پر ہم چاروں ساتھی ماضی فسانے بیٹھے سُناتے رہے۔ نماز کا وقت ہو گیا تو مَیں نے پطرس سے کہا،" آپ سیّد ہیں، قرآن پاک آپ کے گھر میں اُترا آپ بھی نماز نہ پڑھیں تو کتنی بُری بات ہے"۔ پطرس نے یہ سُن کر سالک مرحوم کو آواز دی،" سالک! اُٹھو، شاہ جی ہمیں زبردستی جنّت میں لے جائیں گے"

شاہ جی نے سالک مرحوم کا ایک اور واقعہ سُنایا، فرمانے لگے" مَیں حاجی مولا بخش سمرو کے مکان پر تھا۔ نمازِ مغرب کے بعد وردِ وظیفہ میں مصروف تھا کہ سالک اور مجید لاہوری وہاں پہنچ گئے۔ سالک نے مجھے وظیفہ پڑھتے دیکھ کر یہ شعر پڑھا۔

بر زبان تسبیح در دل گاؤ خر
ایں چنیں تسبیح کہ دارد اثر

جب درود سے فارغ ہوا تو کہا "مَیں یقیناً تم دونوں کے خیال میں نہیں تھا"

دن کے گیارہ بج چکے تھے۔ شاہ جی بیٹھے بیٹھے تھک گئے تھے، اُٹھے اور یہ شعر پڑھا ؎

پُرانی صحبتیں یاد آ رہی ہیں
چراغوں کا دھواں دیکھا نہ جائے

اور پھر اندر چلے گئے۔ اس ملاقات کے بعد مجھے شاہ جی سے باتیں کرنے کا چسکا پڑ گیا۔ اب مَیں تقریباً ہفتہ میں ایک آدھ بار ضرور شاہ جی سے ملنے اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا۔ ہر ملاقات میں شاہ جی سے مَیں نے اخبار کے رپورٹر کی حیثیت سے سوال پُوچھے۔ دو چار ملاقاتوں کے بعد مَیں نے ایک مختصر فیچر لکھ مارا۔ جب وہ شائع ہوا، تو کچھ مخالفوں نے اُسے مسخ کر کے اپنے اخبار میں نقل کیا۔ اس فیچر میں راقم نے اپنے اِن جذبات کا اظہار کیا تھا۔

"جس مجاہد اور خطیب اعظم نے مُلک کی آزادی کے لیے اتنی لمبی عمر انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی، اور ساتھ ساتھ دین کی خدمت بھی کی، وہ کرائے کے مکان میں رہ رہا ہے۔ حکومت اور سوسائٹی نے اُن کی خدمات کی قدر نہیں کی" شاہ صاحب ناراض ہو گئے، بہر کیف ان کی ناراضگی عارضی تھی۔ ایک دن

فرمانے لگے "بیٹا! میں اپنوں سے ناراض ہوتا ہوں تمہاری نیت پر شک نہیں کرتا، تم نے تو میرے حق میں اچھا نہیں کیا"
میں نے دیکھا کہ شاہ جی نے مجھے معاف کر دیا ہے تو ملاقاتوں کا سلسلہ پھر شروع کر دیا، چنانچہ ایک دن خود ہی فرمانے لگے۔
"ایک دفعہ دہلی جیل میں مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر انصاری اور میں اکٹھے ہو گئے۔ مولانا آزاد چائے کے بڑے رسیا تھے۔ ایک صبح بڑے اہتمام سے چائے تیار کر کے مجھے پلائی۔ میں چائے پی چکا، تو مولانا نے داد طلب نظروں سے پوچھا "شاہ جی! چائے کیسی بنی؟" میں نے کہا "حضرت ایک کمی رہ گئی" مولانا ایسے بھنّائے جیسے دماغ پر بجلی گری ہو، پوچھا "وہ کیا میرے بھائی؟" میں نے کہا "اس میں دو پتی زعفران کی بھی ہونی چاہیئے تھی"۔ "ہاں میرے بھائی! آپ تو اضافے کی بات کرتے ہیں۔ اچھا میرے بھائی! کل آپ کو زعفران پلاؤں گا۔"
چنانچہ دوسرے روز مولانا نے جیل کے ایک ملازم کو پانچ روپے دے کر زعفران منگوایا اور مجھے زعفران پلائی۔
ایک دفعہ مولانا حبیب الرحمٰن کے ہمراہ مولانا آزاد سے ملنے گیا۔ استفادہ کے لیے چند آیات تفسیر کے لیے پیش کیں۔ مولانا نے اپنے انداز میں اُن کی تفسیر بیان کی۔ ہم بہت متاثر ہوئے، تو میں نے کہا "مولانا! خدا آپ کو بہت عمر نصیب کرے"

مولانا نے کہا "نہیں میرے بھائی! تھوڑی ہو مگر قرینے کی ہو"

ایک دفعہ میں میرٹھ کے جلسے میں تقریر کر رہا تھا، پرشوتم داس ٹنڈن صدر کانگرس بھی جلسے میں موجود تھے۔ انہوں نے کہا "شاہ جی! تلاوت قرآن پاک کریں تاکہ آتما کو سکون ہو"

پھر میں نے اس جلسے میں ساڑھے آٹھ گھنٹے تقریر کی۔ صبح قریب آ گئی تو یہ شعر پڑھ کر سٹیج سے اُتر آیا ؎

؎ شب وصال بہت کم ہے آسماں سے کہو
کہ جوڑ دے کوئی ٹکڑا شب جُدائی کا

ایک دفعہ میں نے لاہور موچی دروازہ کے باہر تقریر کرتے ہوئے کہا "میں حکومت سے کہتا ہوں کہ وہ مفلسی اور بیکاری کے مسئلے کو حل کرے۔ جو حکومتیں اس مسئلہ کو حل نہیں کرتیں، یہ مسئلہ اُن حکومتوں کو حل کر دیا کرتا ہے" اس تقریر میں یہ بھی کہا کہ "استبداد کی چکی کا دستہ گورے کے ہاتھ میں ہو یا کالے کے ہاتھ میں، چکی وہی رہتی ہے، اور میں اس چکی کو توڑ دینا چاہتا ہوں"

۱۹۳۱ء میں میں نے مسئلہ میراث پر ملک بھر میں تقریریں کیں، جن کا ردِ عمل یہ ہوا کہ آریہ سماج وچھو والی شاہ عالم لاہور میں ہندوؤں کے ایک اجتماع میں کماری ودّیا وتی نے کھڑے ہو کر وراثت کا مطالبہ کر دیا۔ ڈی اے وی کالج کے پرنسپل

چھبیل داس جلسے کے صدر تھے۔ کماری وِدّیا وتی نے کہا "اگر آپ اپنی بیٹیوں اور بہنوں کو وراثت میں سے حصّہ نہیں دیں گے تو ہم مسلمان ہو جائیں گی۔"

اس پر صدرِ جلسہ نے کہا "ہمارے لیے یہ مشکل ہے کیونکہ ہم دُور جا کر شادیاں کرتے ہیں، لہٰذا جائیداد منتقل نہیں ہو سکتی۔" اس پر کماری وِدّیا وتی نے کہا۔ "آپ جگر گوشہ کو بیاہ کر دُور بھیج دیتے ہیں، لیکن زمین کے ٹکڑے منتقل نہیں کر سکتے۔"

میری ان تقریروں سے ہندوؤں میں کافی دیر کھلبلی رہی۔

۳۲-۱۹۳۱ء میں تحریکِ کشمیر کے دنوں میں میں نے جس مؤثر انداز میں ریاستی عوام کے لیے کام کیا، اس سے متاثر ہو کر گول میز کانفرنس لندن میں وزیرِ ہند نے کہا تھا کہ "ہندوستان میں ایک ایسی سحر بیان شخصیت موجود ہے جو بیک وقت دو حکومتوں کے نظام کو معطل کر کے رکھ دیتی ہے۔"

"بیٹیا! زندگی کے کتنے واقعات ہیں جو تمہیں سناؤں۔ تم جب آ جاتے ہو تو کتابِ زندگی کا ایک ایک ورق سامنے آ جاتا ہے۔ اب اتنی ہمت بھی نہیں کہ ان اوراق کو اُلٹوں۔"

لندن آنے کی دعوت

ضابطۂ حیات کی طرح اصولِ آدمی بھی ایک آئین ہے، جسے انسان

احساس کے سانچے میں ڈھلتا ہے، اگر یہ سانچہ ٹوٹ جائے تو آدمیت واغلاد ہو جاتی ہے۔

۱۹۵۵ء کے آخر میں انٹرنیشنل تبلیغی مشن لندن کے سیکرٹری راؤ شبیر علی نے حضرت امیر شریعت اور حضرت مولانا لاہوری کو لندن آنے کی دعوت دی، اور اس کے لیے تمام امکانی سہولتیں بہم پہنچانے کا وعدہ کیا، یہاں تک کہ خود انجمن کے افراد بھی لندن سے دونوں حضرات کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ لیکن حضرت امیر شریعتؒ نے ان حضرات کی درخواست کے جواب میں فرمایا۔

"بھائی! اول تو میں اپنی صحت کے پیش نظر اس سفر کے قابل نہیں ہوں۔ اگر ہوتا بھی تو جس (انگریز) نے ڈیڑھ سو برس میرے ملک کو غلام رکھا، اس کا خون چوسا، اور جاتی دفعہ فتنہ و فساد کا ایسا تخم چھوڑ گئے کہ برصغیر پاک و ہند کے انسانوں کے مابین کبھی امن قائم ہو ہی نہیں سکتا۔

دوسرا میں نے اپنی زندگی کے قریباً چالیس برس ان کی مخالفت کی ہے، اس بنا پر میرا ضمیر اس ملک میں جانے کی اجازت نہیں دیتا۔"

اس پر ان لوگوں نے مزید اصرار کیا، تو فرمایا:

"بھائی! میں اصول کا آدمی ہوں، اور اسی اصول پر زندگی کے چالیس برس گذارے ہیں۔"

حضرت لاہوریؒ کو جب امیر شریعتؒ کی اس رائے اور فیصلے کا علم ہوا، تو

انہوں نے بھی اسی قسم کا جواب دیا۔

اراضی کی پیش کش

ملتان کے ڈپٹی کمشنر مختار مسعود نے اپنے ایک قریبی دوست کی وساطت سے امیر شریعتؒ سے ملنے کی خواہش کی۔ اُس کے امیر شریعتؒ سے بھی گہرے مراسم تھے۔ اس بھروسے پر متعلقہ شخص نے ڈپٹی کمشنر سے وعدہ کر لیا کہ وہ امیر شریعتؒ کو کسی دن اُن کے پاس لے آئے گا چنانچہ اُس نے امیر شریعتؒ سے ڈپٹی کمشنر کی خواہش کا اظہار کیا تو فرمایا کہ "کسی دن چلیں گے۔" آخر اتوار کا دن مقرر ہوا، امیر شریعتؒ حسب وعدہ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی پہنچے مسٹر مختار مسعود بڑے خوش ہوئے اور امیر شریعتؒ کی آمد پر اپنے کمرے کو خاص انداز سے آراستہ کیا، امیر شریعتؒ جیسے ہی کار سے اُترے، ڈپٹی کمشنر پذیرائی کے لیے آگے بڑھے۔ کمرے میں بیٹھتے ہی ہمہ اقسام مشروبات سامنے لائے گئے۔ لیکن امیر شریعتؒ نے فرمایا:

"بھائی! میرے لیے تو سادہ اور ٹھنڈا پانی منگوا دو، بڑی مہربانی ہوگی۔"

ڈپٹی کمشنر نے باصرار کہا۔ "یہ سارا کچھ بھی تو سادہ ہے۔" اس پر امیر شریعتؒ نے کہا:

"اس سادگی پہ مجھے غالب کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا!
لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

میز مشروبات سے سجا رکھی ہے، ساغر و مینا کا ساماں باندھ

رکھا ہے، اور ابھی یہ سارا کچھ سادہ ہے، سبحان اللہ!"

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد فرمایا،

"آپ کا حکم نامہ ملا تو سوچا، چلو اسی بہانے اپنا ایک کام ہی کرتا آؤں"

اِس فقرے سے ڈپٹی کمشنر کو گمان ہوا کہ شاہ جی کوئی ذاتی بات کہنے لگے

ہیں چنانچہ بڑی بیتابی سے ڈی، سی نے کہا، "فرمایئے!"

امیر شریعتؒ نے چند کاغذات نکال کر اُن کے سامنے رکھے اور کہا:

"سارے مغربی پاکستان میں تحفظ ختم نبوّت کے دفاتر

حکومت نے واگزار کر دیے ہیں، لیکن ملتان کا دفتر ہنوز سر بمہر

ہے، اگر آپ یہ دفتر کھولنے کی اجازت دیدیں تو مَیں ممنون ہوں گا"

اس کے جواب میں ڈی، سی نے کہا "شاہ جی! یہ کام تو صوبائی حکومت کی

پالیسی سے تعلق رکھتا ہے۔ البتہ میرے بس میں تو یہ ہے کہ مَیں آپ کو چھ سات

مربعے اراضی دے سکتا ہوں، اور اس میں ٹیوب ویل کا انتظام بھی کرا سکتا ہوں"

اس پر امیر شریعتؒ مسکرائے، اور فرمایا،

"مختار صاحب! مَیں اپنی ذات کے لیے حاضر نہیں ہوا، باقی رہے

آپ کے مربعے اور اس کی پیش کش تو اس کے لیے شکریہ!"

یہ کہا اور وہاں سے چلے آئے ــــــ یہ اگست ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔

دُعائے صحت کے لیے

۱۹۶۰ء میں امیر شریعتؒ کے معالج حکیم حنیف اللہ نے حج بیت اللہ کا

ارادہ کیا، اور اُس کے لیے درخواست دی۔ امیرِ شریعتؒ کو جب اس کا علم ہوا تو حکیم صاحب سے کہا:

"جب آپ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلّم کے روضۂ اطہر پر حاضر ہوں تو میرا سلام عرض کریں اور میری صحت کے لیے دُعا کی درخواست کریں۔"

حکیم حنیف اللہ اس پر خاموش رہے، لیکن امیرِ شریعتؒ نے انہیں دِنوں ان کے والد حکیم عطاء اللہ خان سے اس بات کا ذکر کیا، تو بڑے حکیم صاحب نے کہا:

"شاہ جی! گذشتہ دِنوں مَیں نے آپ کی یہ درخواست خاتم الانبیاءؐ کی خدمت میں پیش کر دی ہے۔"

امیرِ شریعتؒ۔ (تعجب سے) "وہ کیسے؟"

حکیم صاحب: "مجھے پچھلے دِنوں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔ مَیں نے دیکھا کہ سرورِ کائنات کے گرد ایک حلقہ بیٹھا ہے، مَیں بھی اُس میں شامل ہوں۔ مَیں نے حضورؐ کی خدمت میں عرض کیا، "سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کی صحت کے لیے دُعا فرمائیں"۔ مگر حضورؐ نے دُعا کے لیے ہاتھ نہیں اُٹھائے، بلکہ ایک کاغذ کی طرف اشارہ کیا، جس پر لفظ "صحت" لکھا تھا۔"

امیرِ شریعتؒ یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور حکیم حنیف اللہ سے آ کر کہا۔

"آپ نے تو میری درخواست حضورؐ کی خدمت میں لے جانے کی حامی نہیں بھری تھی، مگر بڑے حکیم صاحب نے یہ کام کر بھی دیا۔"

یہ کہہ کر تمام واقعہ بیان کر دیا۔

والد صاحب کا خواب سُن کر حکیم حنیف اللہ نے اس کا ذکر اپنے اُستاد حضرت مولانا عبدالرؤف سے کیا، جن سے انہوں نے حدیث اور فقہ پڑھی تھی۔ انہوں نے فرمایا "اس خواب کی یہ تعبیر نہیں جو شاہ جی سمجھے ہیں، بلکہ یہ ہے کہ شاہ جی کو رُوحانی صحت ہوگی یعنی اُن کے وصال کا وقت قریب آگیا ہے" لیکن مصلحتاً امیر شریعتؒ کو یہ تعبیر نہیں بتائی گئی تھی۔

شعروشاعری

۱۹۱۳ء سے ۱۹۱۹ء تک امیر شریعتؒ امرتسر میں زیرِ تعلیم رہے، انہیں دنوں شعر و شاعری کا ذوق بھی اُبھرا، اور اس کے لیے مولوی محمد دین جن کا تخلص غریب تھا، کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنے اس ذوق کی تکمیل کرتے رہے اور اپنا تخلص "ندیم" تجویز کیا۔ کبھی کبھار مولوی محمد دین غریب انہیں کوئی مصرعہ دے دیتے کہ اس پر گرہ لگاؤ۔ چنانچہ ایک دفعہ مصرعہ طرح دیا کہ

ع "وہ آنکھوں میں موجود اور چشم حیراں"

اس مصرع پر امیر شریعتؒ نے یوں گرہ لگائی ؎

"وہ آنکھوں میں موجود اور چشم حیراں
اِدھر ڈھونڈتی ہے اُدھر ڈھونڈتی ہے"

اس گرہ پر مولوی محمد دین غریب بہت خوش ہوئے۔

عمرِ رواں کے ساتھ ساتھ جب کبھی طبیعت موزوں پاتے، فارسی

اور اُردو میں شعر کہتے۔ چنانچہ ان کے اُردو اور فارسی کلام کا مجموعہ ۱۹۵۵ء میں "سواطع الالہام" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔

گرتی ہوئی دیوار کی طرح امیر شریعتؒ کی صحت کو بڑے سہارے دیئے جاتے رہے، لیکن پھول اپنی بہاریں ضائع کر چکا تھا، اب گھر میں محفلیں قائم ہوتیں، احباب صبح و شام جمع رہتے، اور شعر و شاعری کا دربار لگتا۔ ان محفلوں میں جو لوگ شریک ہوتے، ان میں فیض احمد فیضؔ، صوفی تبسمؔ، علامہ لطیف انور گورداسپوری، مولانا عبدالرشید نسیمؔ (جو اخبارات میں علامہ طالوتؔ کے نام سے معروف تھے) عبدالحمید عدمؔ اور ساغرؔ صدیقی خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

اسی دوران حکیم صاحب نے ایک دن سوال کیا "شاہ جی! ایسا لگتا ہے جیسے آپ قوم سے مایوس ہو چکے ہیں" جواب میں ایک سرد آہ کے ساتھ فرمایا:

"آپ طبیب ہو کر ایسا سوال کرتے ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں سکرات کا عالم طاری ہو جاتے، تو آپ مریض کی زندگی سے مایوس نہیں ہو جائیں گے؟ بس یہی حال قوم کا ہے، اس سے مایوس نہ ہو جاؤں تو اور کیا؟"

اگر کوئی ان دنوں گھر آ کر پوچھتا "شاہ جی! کیسی طبیعت ہے؟" تو جواب میں اکثر یہ دو شعر پڑھتے ؎

نہ جانے لوگ کیوں ہنستے ہیں میرے چاک داماں پر
جنوں میں جیسا ہونا چاہیئے ویسا گریباں ہے

یا — بے دلی ہائے تمنّا، کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنّا، کہ نہ دُنیا ہے نہ دیں !

ایک نامہ نگار سے !

روزنامہ "کوہستان" (ملتان) کا نامہ نگار انہیں حالات میں ملاقات کے لیے حاضر ہوا، اور اُس نے واپسی پر حسبِ ذیل تاثرات ۸ ستمبر ۱۹۶۰ء کے "کوہستان" میں اس طرح بیان کیے :

"میں شاہ جی کو ملنے اُن کے مکان پر پہنچا، تو وہ کسی کام سے باہر گلی میں کھڑے تھے، علیک سلیک ہوئی اور ہم بیٹھک میں جا بیٹھے۔ انہوں نے چارپائی کا سہارا لے کر زمین پر دھرنا مار لیا، اور مَیں بھی اُن کی تقلید میں اسی طرح بیٹھ گیا۔ بیٹھک میں ایک چارپائی، ایک الماری اور چند کتابیں بکھری پڑی تھیں مَیں نے شاہ جی سے اُن کی صحت کے بارے میں پُوچھا، تو کہنے لگے کہ ذیابیطس کے ساتھ فالج کی بھی شکایت زور پکڑ رہی ہے ذیابیطس کی شکایت پہلے بھی تھی، لیکن ۱۹۵۳ء میں جیل گیا تو بیماری زور پکڑ گئی۔ ۱۹۵۶ء سے آج تک اسی چارپائی پر پڑا ہوا ہوں۔ پھر کہنے لگے۔ آج آپ کا اخبار پڑھ رہا تھا، ایک خبر تھی "اگر روس نے امریکہ کے کسی حلیف ملک پر راکٹ پھینکا تو روس پر راکٹوں کی بارش کر دی جائے گی" ارے! ان کم بختوں سے

کوئی پُوچھے کہ تم موت کا علاج کر رہے ہو، زندگی کا علاج کرو۔ غالب شاہ جی کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اُس کا یہ شعر پڑھا ؎

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہر چند کہیں ہے کہ نہیں ہے

اس کے بعد سر پکڑ کر بیٹھے رہے۔ میں نے بات کرنا چاہی، تو کہنے لگے، دُعا کرو قبر کے لیے زمین نصیب ہو جائے، رہنے کے لیے گھر تو نہیں ملا، متعدد بار قرعہ اندازی میں حصہ لیا لیکن قرعہ نہیں نکلا۔ ۱۹۴۸ء سے اسی کرائے کے مکان میں رہ رہا ہوں۔ ہندوستان میں دو مکان چھوڑ کے تھے۔ یہاں آکر کچھ بھی نہیں ملا، اور نہ ہی میں نے کوشش کی ہے۔ کلیم منظور ہو گیا ہے، قرعہ اندازی میں کچھ ملا نہیں۔ اب نقد معاوضے کی آس لگائے بیٹھا ہوں شاید مل جائے۔

ایک زمانہ تھا کہ شاہ صاحب کے گرد ہر وقت عقیدتمندوں کا ہجوم رہتا تھا، اب زورِ بیان ختم ہو گیا تو سب احباب دُور ہو گئے ہیں۔ اب صرف وہ دیہاتی ملنے آتے ہیں جو اُن کے مُرید ہیں اور اُن سے گہری عقیدت رکھتے ہیں۔ کچھ احباب ساون کے بادلوں کی طرح چھٹ گئے اور کچھ اللہ کو پیارے ہو گئے جو باقی رہ گئے وہ زمانے کے تقاضوں کے ساتھ ہو لیے۔ اب شاہ جی اور بڑھاپے کا یارانہ رہ گیا ہے وہ بھی نہ جانے کب ٹوٹ جائے!!

فالج کا دوسرا بڑا حملہ

۱۷ جنوری ۱۹۶۱ء کو فالج کا دوسرا بڑا حملہ ہوا، تو اس سے رہی سہی صحت بھی برباد ہو گئی۔ پیشتر کبھی کبھار اگر معالج کے مطب تک چلے بھی جاتے تھے، تو اس حملے نے وہ ہمت بھی چھین لی۔ اب تو گھر کی چار دیواری کے سوا کوئی ٹھکانہ نہ تھا، معالج خود مریض کے ہاں آتے، ان دنوں امیر شریعتؒ نے حکیم عطاء اللہ خان سے کہا:

"آپ کے زیر علاج اس لیے نہیں ہوں کہ آپ بڑے قابل حکیم ہیں، بلکہ اس لیے ہوں کہ آپ بہت نیک آدمی ہیں۔ شاید آپ کی نیکی کی وجہ سے میرے گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔"

ایسا لگتا ہے کہ امیر شریعتؒ اس حملے کے بعد اپنی روحانیت سے محسوس کر چکے تھے کہ آخری وقت آن پہنچا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اپنے ہر تیماردار سے کچھ عجیب سی گفت گو کرتے، مولانا لیٰین نے ایک دفعہ کہا۔ "شاہ جی! بیماری کے دنوں میں بھی چہرے کی سرخی نہیں گئی، ہلکی سی مسکراہٹ سے فرمایا:

"یہ سرخی تو میرے مرنے کے بعد بھی رہے گی۔ یہ ہمارے خاندان کی ریت رہی ہے کہ مرنے کے بعد بھی عارض کی سرخی نہیں جاتی۔"

فالج کا آخری حملہ

۱۶ مارچ ۱۹۶۱ء کو فالج کا تیسرا شدید حملہ ہوا، جس کا اثر زبان اور گلے پر پڑا۔

اس حملے نے تمام احباب کو پریشان کر دیا۔ اکثر شہروں میں تو امیرِ شریعتؒ کی موت کی خبر بھی مشہور ہو گئی۔ اخبارات کے دفاتر سے ٹیلی فون اور برقی پیغامات کے ذریعے اس خبر کی تحقیق اور دریافت ہونے لگی۔ لیکن چند گھنٹوں کے بعد طبیعت نے ذرا سنبھالا لیا تو احباب کو خیریت کی اطلاع دی گئی۔ لیکن اس حملے سے امیرِ شریعتؒ کی زبان گفت گو سے عاری ہو گئی، گلا بند ہو چکا تھا، بڑی مشکل سے آواز سمجھ میں آتی تھی، وہ بھی کان منہ کے سامنے لگانے پر۔ انہیں دنوں لاہور سے دوسرے احباب کے علاوہ الشیخ حسام الدین بیمار پرسی کے لیے ملتان آئے تو امیرِ شریعتؒ نے شیخ صاحب کے کان میں کہا۔

"میری زندگی میں مجھے اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ عطاء اللہ یہ زبان
بھی تیری نہیں میری ہے، میں جب چاہوں، اسے چھین
بھی سکتا ہوں۔"

ماہنامہ "تبصرہ" کا "بخاری نمبر"

امیرِ شریعتؒ کے اس شدید حملے کے باعث جہاں اُن سے سیاسی اور مذہبی اختلافات رکھنے والوں کو پریشانی ہوئی، وہاں ملک کے اخبارات نے بھی نوٹ لکھے اور امیرِ شریعتؒ کی قومی اور ملّی خدمات کے پیشِ نظر حکومتِ پاکستان کو ان کی تیمارداری کی طرف متوجہ کیا۔ اس ضمن میں جون ۱۹۶۱ء میں ماہنامہ "تبصرہ" لاہور نے اپنا "بخاری نمبر" نکالا، جس میں برصغیر کے تمام اہلِ قلم نے امیرِ شریعتؒ کو نظم و نثر کے ذریعے خراجِ تحسین ادا کیا، جن میں

مولانا غلام رسول مہر، دیوان سنگھ مفتون، مولانا نصر اللہ خاں عزیز، احسان دانش،
علامہ لطیف انور، احمد ندیم قاسمی، قاری محمد طیب مہتمم دارالعلوم دیوبند، حافظ علی بہادر
(بمبئی) ان کے علاوہ اس عظیم نمبر کے لیے آندھرا پردیش (بھارت) کے گورنر لالہ
بھیم سین سچر کا خط بھی قابلِ مطالعہ ہے:

راج بھون۔ حیدر آباد، ۹ راپریل ۱۹۶۱ء

پیارے شری غلام نبی صاحب جانباز جی آداب عرض،

آپ کا گرامی نامہ ملا، یاد آوری کا شکریہ!

آپ نے شکوہ کیا ہے کہ میں نے آپ کے پہلے خط کا جواب نہیں دیا۔
لیکن مجھے تو آپ کا اور کوئی خط ملا ہی نہیں۔ صرف زیرِ جواب خط ہی
مجھ تک پہنچا ہے، اور اب شاید آپ کے خاص نمبر کے لیے میرا
پیغام بعد از وقت ہو گا۔

جہاں تک سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا تعلق ہے، وہ ان
چند بے خوف شخصیتوں میں سے ہیں، جن کے لیے میرا دل بے پناہ
احترام کے جذبات سے معمور رہا ہے۔

میں جب ان سے پہلی بار متعارف ہوا تھا تو میرا تاثر یہی تھا
کہ شاہ جی شمع حریت کے سرفروش پروانے اور جدوجہدِ آزادی کے
جانباز سپاہی ہیں۔ جرأت، ذہانت اور تبحرِ علمی کے ساتھ ساتھ خدا نے
انہیں فصاحت و بلاغت کے نایاب جوہر سے بھی نوازا ہے۔

جب ہم ان کی تقاریر سنا کرتے تھے تو ہماری دلی آرزو ہوتی

کہ شاہ صاحب موتی بکھیر رہے ہیں اور ہم قلب و نظر کو اُن سے منور کرتے ہیں۔ وہ سامعین کو مسحور کرنا جانتے تھے، کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ اُن کی تقریر کب ختم ہو۔ کیونکہ نہ تو شاہ صاحب کے ہاں متنوع مضامین کی کمی ہوتی اور نہ اُن کی جسمانی تھکاوٹ ہی سلسلۂ تقریر میں حائل ہوتی۔ شاہ جی جیسے بہادر انسان جو انسانیت کی اعلیٰ اقدار کے حامل ہیں، ہمارے دلی احترام کے مستحق ہیں۔

میں صدقِ دل سے دُعا گو ہوں کہ خدا شاہ جی کو جو یقیناً ایک ناقابلِ تسخیر شخصیت کے مالک ہیں صحتِ کاملہ عطا فرمائے، اور تادیر سلامت رکھے کہ ایسے نادرِ روزگار لوگ بار بار پیدا نہیں ہوتے۔

آپ کا مخلص : بھیم سین سچر"

نشتر ہسپتال

دستِ فطرت انسان کو جب عقلِ کامل سے نواز کر کارگاہِ عالم میں چھوڑتا ہے تو آسمان سے زمین تک کی ہر شے اُس کے قدموں میں ہوتی ہے، پھر کبھی توانا ہو کر انسان ناتوانوں کی بے بسی کا تماشہ کرتا ہے اور کبھی خود اپنے زوال کی کہانی گلیوں کے موڑوں پر بیان کرتا پھرتا ہے، یہی قانونِ فطرت ہے۔ عروج و زوال کی اسی داستان کا مصنف انسان خود ہی ہے۔

حضرت امیرِ شریعتؒ توانا تھے، جوانی اور صحت اُن کی بلائیں لیتی۔ گلے کی حلاوت، زبان کا طرزِ تکلم اُن کے غلام رہے۔ جب وہ سلطنت کے ظلم و جور کی

دھجیاں بکھیرتے اور بغاوت کا علم لے کر پہاڑوں کو اپنے ساتھ آنے کی دعوت دیتے، تو وہ پانی پانی ہو کر اُن کے ساتھ بہہ نکلتے۔ سمندروں کو آواز دیتے تو اُن کی گہرائیاں اُبھر کر سامنے آجاتیں۔ رات کی سیاہی اور دن کے اُجالے انہیں اپنے جلو میں لے کر چلتے، جس آواز کی ہیبت سے ایوانِ برطانیہ لرز جایا کرتے تھے، جب اُس کا کام ختم ہو گیا اور اس کے عروج کی پرچھائیاں ڈھلنے لگیں تو فضائیں گنگنائیں،

ڈوبتے سورج کو وقتِ شام دیکھ
حسن والے حسن کا انجام دیکھ

فالج کے اس حملے نے ملک بھر میں تشویش پیدا کر دی اور احباب نے فیصلہ کیا کہ امیرِ شریعتؒ کو نشتر ہسپتال میں داخل کر دیا جائے، لیکن امیرِ شریعتؒ کو جب اس فیصلہ کا پتہ چلا تو فرمایا:

"آپ لوگ مجھے فاسق اور فاجروں کے ہاتھوں میں سونپ رہے ہیں۔"

وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے، مگر اس کے باوجود مارچ کے آخری دنوں انہیں نشتر ہسپتال (ملتان) میں داخل کر دیا گیا۔ ڈاکٹروں نے اپنی ذمہ داری کو پوری طرح نبھایا۔ انہیں دنوں صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے ہسپتال کے انچارج ڈاکٹر عالمگیر کو ہدایت بھیجی، کہ

"حضرت شاہ صاحب کی صحت کا خیال کریں، اور اُن کے علاج پر پوری ذمہ داری سے توجہ دیں۔ اگر پاکستان کے باہر سے بھی کسی معالج کی یا دوا کی ضرورت محسوس ہو، تو فوراً اور آمد کریں،

نیز اس کا بل میرے نام گورنمنٹ ہاؤس بھیج دیں"

امیر شریعتؒ کے دوسرے بڑے لڑکے سید عطاء المحسن کے علاوہ مولانا ذرین احمد خان (یہ مولانا گل شیرؒ کے قریبی عزیز ہیں) اور ایک رضاکار غلام محمد دیکھ بھال کے لیے اُن دنوں ہسپتال میں رہے۔ یہاں ہر روز مغربی پاکستان سے آنے والے تیمارداروں کا ہجوم رہتا۔

بیماری کے دنوں امیر شریعتؒ اپنے دائیں ہاتھ کی اُنگلی ہمیشہ کھڑی رکھتے۔ بعض دوستوں نے اس کی وجہ پوچھی تو فرمایا:

"مَیں نے تمام عمر توحید پر وعظ کیا ہے، اور عمر کے آخری حصے میں بھی اس تصور کو قائم رکھنا چاہتا ہوں"

ہسپتال میں امیر شریعتؒ کی دیکھ بھال کے انچارج ڈاکٹر بشیر احمد نے ایک دن ایسا ٹیکہ لگا دیا جس کے باعث نبضیں ڈوبنے لگیں، دل بیٹھنے لگا، بڑھتے بڑھتے یہ تکلیف اس حد تک بڑھی کہ امیر شریعتؒ کو اپنی موت کا گمان ہونے لگا، اور انہوں نے اپنے خادم مولانا ذرین احمد خان سے فرمایا،

"اس ٹیکے سے میرا کام ہو چکا ہے، لہٰذا آپ گواہ رہیں۔۔۔
(یہ کہہ کر آپ نے تین دفعہ کلمہ شہادت، تین دفعہ "لانبی بعدی" کی حدیث پڑھی، اور اس کا ترجمہ کیا، نیز فرمایا) تمام دوستوں سے میرا سلام کہنا اور کہنا کہ دین کا کام بہرحال کرتے رہیں"

یہ تکلیف نمازِ عصر سے شروع ہو کر ساری رات رہی لیکن ہسپتال کے انچارج کو اس واقعہ کی اطلاع رات ایک بجے دی گئی، جیسے ہی انہوں نے آکر امیر شریعتؒ کی

حالت دیکھی کہ چہرے کی رنگت سیاہ پڑ چکی ہے اور پاؤں پر ورم آگیا ہے تو انہوں نے زور سے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا، اور غصے میں کہا جب یہ حالت تھی تو مجھے کیوں اطلاع نہ دی۔ اس پر دونوں ڈاکٹروں کے درمیان انگریزی میں کافی دیر تلخ کلامی رہی، جس کا مفہوم یہ تھا کہ امیر شریعتؒ کو یہ ٹیکہ کیوں لگایا گیا؟ آخر رات اڑھائی بجے دوسرا ٹیکہ لگایا تو صبح ہونے تک طبیعت سنبھلی۔

کچھ دنوں بعد ڈاکٹروں نے مشورہ دیا کہ شاہ جی تھوڑی دیر کے لیے اپنے کمرے سے باہر تفریح کیا کریں، اس ہدایت پر بڑی مشکل سے آمادہ ہوئے۔ حالانکہ چل نہیں سکتے تھے، لیکن جیسے ہی صحن میں ٹہلنے لگے، گردن اونچی کرلی اور چھاتی تان کر فرمایا:

"عمر بھر دشمنوں کے سامنے سر اونچا کر کے چلتا رہا ہوں لیکن آج اگر دشمنوں کو پتہ چل گیا کہ میں بیماری کے باعث کمزور ہوگیا ہوں، تو وہ خوش ہوں گے، اس لیے نقاہت کے باوجود میں چھاتی تان کر رکھنا چاہتا ہوں تاکہ دشمن سمجھے کہ بخاریؒ ابھی زندہ ہے۔"

ہسپتال میں بعض دفعہ کافی دیر تک بیہوش رہتے، لیکن تیمارداروں کو اور خادموں کو تاکید تھی کہ "مجھے نماز کا وقت اور رُخ بتا دیا کریں۔"

ذیابیطس کی وجہ سے کثرتِ بول کا عارضہ تھا، مگر اس کے باوجود وضو کر کے نماز پڑھتے رہے یا پھر کبھی کبھار تیمم کر لیتے، مگر نماز نہیں چھوڑی، البتہ خادموں کو رکعتیں بتانی پڑتی تھیں۔

ہسپتال میں مولانا الیکن نے سوال کیا، شاہ جی! حضرت مولانا حسین احمد مدنی کی

عمر اس وقت اسّی نوّے سال کے قریب ہے اور حضرت لاہوری کی عمر بھی آپ سے زیادہ ہے لیکن آپ بہت جلد کمزور ہو گئے ہیں۔ جواب میں فرمایا:

"بھائی! اُن لوگوں کے گھر آباد ہیں اور میں اپنا گھر اُجڑا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ یہی صدمہ مجھے موت کے قریب کر رہا ہے۔"

اپریل کے آخری دن تھے کہ سیّد سبطِ حسن (سابق ایڈیٹر ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور) معہ چند احباب کے عیادت کے لیے ہسپتال آئے۔ تعارف کے بعد ایک نوجوان نے کہا "شاہ جی! میرا نام ذوالفقار علی ہے اور میں پطرس بخاری کا بھائی ہوں۔" امیر شریعتؒ یہ نام سنتے ہی بے اختیار رونے لگے، اور اس قدر روئے کہ تمام محفل اُن کے ساتھ رونے لگ پڑی۔ سیّد سبطِ حسن کی بیوی نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بھی امیر شریعتؒ کے کسی دوست کی لڑکی نکلی۔ اس پر وہ بچی بے اختیار امیر شریعتؒ سے لپٹ گئی۔ آخر یہ محفل شعر و شاعری میں منتقل ہو گئی۔

مارچ کے کچھ دن اور مئی کا ابتدائی حصہ گذار کر امیر شریعتؒ نشتر ہسپتال سے واپس گھر آگئے، لیکن بیماری سے کوئی افاقہ نہ ہوا۔

دنیا سے رحلت

نشتر ہسپتال سے واپسی کے بعد ملک بھر میں مایوسی پھیل گئی۔ دلوں میں کئی قسم کے وسوسے اُبھرے۔ برصغیر کا عظیم خطیب، کروڑوں انسانوں کے دلوں کا حکمران زندگی کے اس موڑ پر آن پہنچا، جہاں زندگی مستعار ملتی ہے نہ بیچی موت سے کوئی سودا نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقام پر پاکستان کے اخبارات نے

امیر شریعتؒ کی صحت پر عوام اور حکومت دونوں کو متوجہ کیا۔ مساجد میں دعائیں مانگی گئیں
عارت کے مسلمانوں نے بھی امیر شریعتؒ کی صحت کے لیے دُعائیں مانگیں، ان
نوں کے اخبارات کے اقتباس حسب ذیل ہیں۔

"بھرنو استخلاصِ وطن کے عظیم کارنامے کی انجام دہی سے عہدہ برآ ہونے والوں میں مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ایک ممتاز مقام کے حامل خطیب ہیں۔ ان کی سیاست اور ان کے کام میں غلطیوں کی نشاندہی کی جاسکتی ہے۔ اور پھر انبیاء کے سوا کون ہے جو غلطیوں سے مبرا ہو؟ لیکن شاہ جی کی جرأت، قربانی، ایثار اور اسلام دوستی سے انکار ممکن نہیں، اور اُن کی ساحرانہ خطابت نے باطل کے خلاف لڑنے کا جو ولولہ ملّتِ اسلامیہ میں پیدا کیا، اس کی قدر افزائی شرطِ نجات کے مترادف ہے۔

برِصغیر کے یہ خطیب ایک عرصے سے علیل ہیں، مرض بھی ایسا ہے جو اعضاء ہی کو شل نہیں کرتا، اعصاب، ذہن اور دل کو بھی ماؤف کرسکتا ہے۔ پچھلے دنوں سے مرض میں شدید اضافہ ہوا ہے، ہم سب کو اپنے خالقِ حقیقی سے اس عظیم انسان کی زندگی کی بھیک مانگنی چاہیئے۔ اللہ تعالیٰ انھیں عمرِ خضر عطا فرمائے۔"

ہفت روزہ "المنبر" لائل پور

"یہ خبر کئی ماہ سے عوامی حلقوں کی پریشانی کا موجب بنی ہوئی ہے کہ امیر شریعتؒ حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب

بخاری سخت بیمار ہیں۔ اُن کی زبان میں جس کی سحر طرازی کی کبھی سے زمانے میں دھوم تھی، لکنت پیدا ہو چکی ہے، اور ایسا لگتا ہے جیسے خدانخواستہ یہ چراغ آخر شب ہیں چند لمحوں کا مہمان ہو۔

حضرت شاہ صاحب کے سیاسی نظریات سے اختلاف کیا جا سکتا ہے، لیکن اتنی بات تو اُن کے دشمن بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ اُن کی ذات جدوجہدِ آزادی کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، انہوں نے اپنے طرزِ فکر کے مطابق ملک کو آزاد کرانے کے لیے ایک عمر قید و بند میں بسر کی، اور اس راستے میں ہر مصیبت کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کیا۔ قادیانیت کے خلاف اُن کا جہاد باللسان تو بالخصوص اُمت پر ایک عظیم احسان ہے۔ ایسے لوگ روز روز پیدا نہیں ہوتے۔ پاکستانی قوم کا فرض ہے کہ وہ بیماری کے زمانے میں اس بطلِ جلیل کے علاج معالجے کیلیے ہر طرح کے ذرائع اور وسائل فراہم کرے، بعد میں کفِ افسوس ملنے سے کیا فائدہ؟ اب وقت ہے کہ حکومت اور شاہ جی کے معتقدین اور دوسرے عوامی حلقے اپنا فرض ادا کریں ؎

ہمارے بعد اندھیرا رہے گا محفل میں
بہت چراغ جلاؤ گے روشنی کے لئے"

روزنامہ "امروز" لاہور

"امیر شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کی علالت کے تازہ

حالات نے جذبات کی دنیا میں ایک تلاطم برپا کر دیا ہے، ان پر فالج کا ایسا حملہ ہوا کہ ان کی قوتِ گویائی متاثر ہو چکی ہے۔ معاً یہ خیال ہوتا ہے کہ اس عظیم ہزار داستان کی یہ قوت تو سیاسی کشمکش نے پہلے ہی چھین لی تھی، یا دوسرے الفاظ میں مفلوج کر دی تھی۔

انڈو پاکستان کے وہ بہترین خطیب ہیں۔ کاش! زندگی میں پھر اُن کی تقریر ہو، اور اس میں کبھی زار و قطار روئیں اور کبھی بے اختیار ہنسیں۔

قرآن میں موسیٰ علیہ السلام کی دعا ہے۔ اے اللہ! میری زبان کھول دے تا کہ لوگ میری بات سمجھ لیں۔

معلوم نہیں حضرت شاہ صاحب نے کبھی یہ دعا مانگی تھی یا نہیں۔ مگر اللہ نے اُن کی زبان میں یہ طاقت ضرور عطا فرمائی تھی کہ دشمنوں کا مجمع بھی تقریر سُن کر رام ہو جاتا تھا۔ پاک و ہند کی آزادی کے لیے اُن کے طوفانی دورے اور اُن کی خطیبانہ فتوحات تاریخ کے صفحات میں زریں حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔

کلام میں عجیب سحر تھا، جہاں چاہتے رُلا دیتے، جہاں چاہتے ہنسا دیتے۔ بسا اوقات اُن کی تقریر کا سلسلہ مؤذن کے نعرۂ تکبیر پر ہی ختم ہوتا تھا۔ لیکن مجال ہے کہ ہزارہا حاضرین میں سے کوئی اُٹھ جائے یا اُونگھ جائے۔

ایسا عدیم المثال خطیب پاکستان میں خاموش زندگی گزار رہا ہے۔ حضرت شاہ صاحب کے ہم جیسے عقیدت مندوں اور رفیقوں کیلئے

یہی حقیقت کافی دردناک ہے کہ اُن کے مرض میں کوئی افاقہ نہیں ہوا، اور وہ ہسپتال سے مایوس واپس آئے ہیں۔

"آؤ! ہم دل کی گہرائیوں سے دُعا مانگیں کہ اے پروردگار! اپنے حبیب کے صدقے میں حضرت شاہ صاحب کو صحت عطا فرما، اور ہماری یہ حسرت پوری کر دے کہ ایک بار پھر اُن کی خطابت سے ملت میں نئی زندگی آئے۔"

روزنامہ "انجام" کراچی

پھر لاہور میں

حالات سے پریشان ہو کر جون کے ابتدائی ہفتہ میں امیرِ شریعتؒ کو پھر لاہور میں لایا گیا۔ اب کے وہ مالکانِ سلطان فونڈری کے ہاں، ماڈل ٹاؤن بلاک بی کوٹھی نمبر ۷۶ میں ٹھہرائے گئے۔ لاہور میں اُن کے علاج کے لیے دو الگ الگ بورڈ تجویز ہوئے۔ میڈیکل بورڈ ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ اور ڈاکٹر محمد یوسف پر مشتمل تھا، جبکہ اطباء کے بورڈ میں حسب ذیل لوگ شامل تھے، حکیم محمد حسن قرشی، حکیم نیّر واسطی، حکیم نبی احمد سوّیدا (پوتا حکیم اجمل خاں) حکیم شیدائی اور حکیم محمد اسمٰعیل جگراؤں والے۔

یہ سب معالج مشورے سے علاج کرتے رہے، ان دنوں امیرِ شریعتؒ کی تیمارداری کے لیے اُن کا لڑکا سیّد عطاء المحسن پاس رہا، کبھی کبھار امیرِ شریعتؒ کے حرمِ محترم اور دوسرے بچے بھی آتے رہے۔

امیر شریعتؒ ۱۹۲۱ء میں پہلی دفعہ لاہور انجانے عالم دین کی حیثیت سے آئے تھے اور ۱۹۶۱ء میں جب آخری بار لاہور لائے گئے تو سارا لاہور اُن کو دیکھنے اُمڈ آیا، اور کیوں نہ آتا جبکہ امیر شریعتؒ نے لاہور کے سامنے اپنا دل اُلٹ کر رکھ دیا تھا۔ جوانی کی بہاروں سے موت کی پرچھائیں تک وہ انہیں کے لیے سارا کچھ کہتے سنتے رہے۔ اہلِ لاہور نے بھی امیر شریعتؒ سے محبت، رفاقت اور عداوت کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہیں رکھی تھی۔ بنا بریں امیر شریعتؒ اہلِ لاہور کو کوذ کہا کرتے تھے۔

ان دنوں ماڈل ٹاؤن کی اس کوٹھی میں عوام کے علاوہ سیاسی رہنماؤں، صحافیوں، ادیبوں، شاعروں اور کاروباری لوگوں کی آمد آمد سے شب و روز ایک بھیڑ لگی رہتی۔ امیر شریعتؒ سب کو پہچانتے تھے، لیکن بات نہیں کر سکتے تھے۔ لوگ آتے دو منٹ چارپائی کے نزدیک کھڑے ہو کر زیارت کرتے اور چلے جاتے۔ فارسی کے مشہور شاعر علامہ محمد حسین عرشی امرتسری بھی انہیں دنوں امیر شریعتؒ کو ملنے آئے مگر حالات دیکھ کر بے اختیار کہہ اُٹھے ؎

برق در رعد آسودہ بستر شدہ
شعلۂ جوالہ خاکستر شدہ

نماز

ان حالات میں بھی نماز سے غافل نہیں رہتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اُن پر خاص نوازش تھی۔ حالانکہ بول نہیں سکتے تھے، لیکن عین نماز کے وقت اگر کوئی آس پاس

نہ بھی ہوتا تو کسی چیز سے زمین پر کھٹکا کر دیتے تھے۔ اس آواز سے اہلِ خانہ فوراً حاضر ہوتے تو امیرِ شریعتؒ ہاتھ کے اشارے سے انہیں نماز کے لیے کہتے، اور نماز باجماعت ہوتی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا کہ نماز کے دوران ان پر بے ہوشی طاری ہو جاتی اور ان کے صاحبزادے عطاء المحسن انہیں دوبارہ نماز لوٹانے کو کہتے۔

انہیں دنوں کا ذکر ہے کہ سرگودھا کے مفتی محمد شفیع امیرِ شریعتؒ سے ملنے آئے، تو کوٹھی کے مالک مولانا محمد اکرم (مالک سلطان فونڈری) نے مفتی صاحب سے گزارش کی۔

"حضرت! یہ فرمایئے کہ شاہ جی اس حالت میں نماز پڑھتے ہیں، اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ نماز میں بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ عزیزم عطاء المحسن شاہ جی پر زور دیتے ہیں کہ وہ اپنی نماز لوٹائیں۔"

اس پر مفتی صاحب نے فرمایا:

"نہ میرے عزیز! شاہ جی کی بے ہوشی کی نمازیں ہماری ہوشمندی کی نمازوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں۔"

اس کے بعد پھر کبھی انہیں نماز لوٹانے کو نہیں کہا گیا۔

مولانا نور محمد جالندھری ملنے آئے تو دورانِ گفتگو ان کے منہ سے مولانا مفتی محمد حسنؒ کی موت کی خبر نکل گئی، اور یہ بات امیرِ شریعتؒ نے بھی سن لی؛ حالانکہ وہ کافی فاصلے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ان کو اشارے سے بلایا اور کاغذ پنسل مانگی، اس پر لکھا "یہ میرے استاد تھے"! اور پھر سب کو اشارہ کیا اور رونے لگ پڑے، اور کافی دیر تک روتے رہے۔

اس طرح کے لیل ونہار میں قریباً ڈیڑھ ماہ گذار کر امیر شریعتؒ کے حرم
محترم کے ارشاد پر امیر شریعتؒ کو جولائی کے آخری دنوں میں واپس لایا گیا، اور
ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ کی تجویز کردہ ادویات کا استعمال ہوتا رہا۔ لیکن مرض مریض پر
اس قدر غالب آچکا تھا کہ ڈاکٹروں اور حکماء کے تمام نسخے بیکار ہو گئے۔ اس
طرح سے عقلِ انسانی جب اپنی رائے پر مات کھا چکی تو اب قدرت کے فیصلے کا
انتظار باقی تھا۔

ماضی کی پچاس سالہ تاریخ کا معمار، افواجِ آزادیٔ وطن کا سپہ سالار،
جس کی گھن گرج میں شیروں کا سا وقار، گفتار میں بجلی کا سا کردار، چلن میں پہاڑ کی
سی بلندی، مقدروں میں سیاروں کا جلوا اور جذبات میں سمندروں کے طوفان
لے کر سلطنتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا لے جانے والا آج چارپائی پر بے حس و
حرکت پڑا اپنے خالق کے فیصلے کا منتظر ہے۔

اِنتقال

لاہور سے ملتان پہنچنے کے پچیس روز بعد ۲۱ راگست رات اڑھائی بجے
اچانک طبیعت خراب ہو گئی اور سانس اکھڑنے لگی ہچکی شروع ہو گئی، گھر میں
پریشانی بڑھی اور موت کے سائے ناچنے لگے۔ یہی منحوس خبر نسیم صبح گاہی ملتان
بھر میں لے اڑی کہ امیر شریعتؒ انتقال کر گئے۔ تمام شہر دیدار کو اُن کے گھر آن
پہنچا، لیکن ہنوز گُل و بلبل کا رشتہ قائم تھا، اور امیر شریعتؒ آخری سانس گن
رہے تھے۔ حکیم عطاء اللہ خان اور اُن کے بیٹے بھی اپنی آخری پونجی آزمانے کو

آ موجود ہوئے، لیکن وہ بھی اپنے آنسوؤں میں الجھ کے رہ گئے۔ امیر شریعت اس وقت بے ہوشی کے عالم میں تھے، اور سانس رک رک کر آ رہی تھی سورج غم آلود چہرے سے تمام دن اس ماتم میں شریک رہا، اور اپنے ڈھلتے سائے کو کل کے ماتم میں شرکت کے لیے چھوڑ کر مغرب کی چادر میں جا چھپا۔ شفق نے لالہ و گل کا سا لباس پہن لیا، مؤذن مغرب کی اذان کے لیے اٹھا کہ چھ بج کر پچپن منٹ پر برصغیر کا عظیم خطیب زندگی کے قریباً بہتر برس گزار کر اس جہان فانی سے رخصت ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون، ؎

"ادا کر کے فرض اپنی خدمات کا | سحر دم وہ جاگا ہوا رات کا
ابد کے نگر کو روانہ ہوا | مکمل سفر کا فسانہ ہوا"

(علامہ؟)

موت کی خبر

ریڈیو پاکستان نے یہ خبر رات پونے آٹھ بجے نشر کی۔ لیکن جہاں دل کے تاریں پیوست تھیں، وہاں صبح سے اضطراب تھا، لاسلکی کی تصدیق نے دل کی دھڑکنوں کی رفتار مزید تیز کر دی۔ عشاق ہجوم در ہجوم محبوب کی آخری دید کو آنسوؤں کا نذرانہ لے کر گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ کراچی سے پشاور تک کے لوگ، قصبات سے دیہات تک کے عوام جنازے میں شرکت کے لیے آئے

جنازہ

۲۲ اگست نماز ظہر کے بعد امیر شریعت کا جنازہ اٹھانے کا اعلان تھا

اُس دن کا آفتاب اپنے ساتھ تاریخ کا ایسا المیہ لے کر طلوع ہوا، کہ نہ صرف سلطنتیں ہی اس کے غم میں ڈوب گئیں، بلکہ جرأت، انسانی اور دانائی کا چراغ بھی ہمیشہ کے لیے گل ہو گیا۔

اقلیم خطابت کا فرمانروا اپنی تمام رعنائیاں سمیٹ کر جہان بے مروّت سے رُخ موڑ چکا تھا۔ وقت کے نشیب و فراز جس کے قدموں کی چاپ کے منتظر رہتے، آج اُس کی رُوح قریب کھڑی اپنے مہمانوں کی منتظر تھی۔ دھوپ کے سائے مکانوں کی دیواروں سے اُتر کر گلی اور بازاروں میں مہمانوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو گئے۔

کراچی سے پشاور تک کے لوگوں کو ریل گاڑیاں اور ہوائی جہاز جنازے میں شرکت کے لیے تیز رفتاری سے ملتان پہنچا رہے تھے۔ دیہاتیوں کی ٹولیاں اپنے مُرشد کے جنازے کے لیے پہنچ رہی تھیں۔ تانگے، لاریاں، سائیکل سبھی مصروف تھے، کہ ان پر انسانوں کا گلا نہ رہ جائے کہ وہ وقت کے عظیم انسان کی آخری رسم میں شامل نہ ہو سکے۔

نماز ظہر کے بعد جب اس مردِ درویش کا جنازہ محلہ تبی شیر خاں سے اُٹھایا گیا، تو دو لاکھ انسانوں کا سمندر اس کے گرد ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ جنازے کے ساتھ لمبے لمبے بانس باندھ دیے گئے، تاکہ کوئی ہاتھ اس سعادت سے محروم نہ رہ جائے، تاہم ہزاروں سوگواروں کو یہ شکایت رہی۔

جنازہ جیسے جیسے اپنی منزل کی طرف بڑھتا گیا، ہجوم در ہجوم لوگ اس میں شامل ہوتے گئے، کچہری روڈ سے گزرتا ہوا یہ ماتمی جلوس چار بجے کے قریب

ایمرسن کالج کی گراؤنڈ میں پہنچا اور نمازِ جنازہ کی صفیں درست ہونے لگیں۔ تاریخ ماضی اپنی شہادت سے کراہ اٹھی۔

حضرت امام ابو حنیفہؒ کی نمازِ جنازہ کے بعد اس کے دامن میں امیرِ شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) کی نمازِ جنازہ کا دوسرا واقعہ تھا۔ ورنہ اس سے پیشتر اس قدر ہجوم کسی درویش کے جنازہ میں نہیں دیکھا گیا۔

نمازِ عصر سے ذرا پہلے حضرت امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی نمازِ جنازہ ان کے فرزندِ اکبر سید عطاء المنعم شاہ بخاری نے پڑھائی۔

آخری آرام گاہ

ملتان کو اس کے بڑھاپے نے اُسے اپنی تاریخ کی یادداشتوں سے بھی محروم کر دیا ہے۔ ہاں اس قدر یاد پڑتا ہے کہ اس شہر کا تاریخی قلعہ جسے آج قاسم باغ کا نام دیا جا رہا ہے، صدیوں پیشتر راجہ داہر نے تعمیر کیا تھا، اور آج یہ قلعہ اہلِ ملتان کی عظیم تفریح گاہ ہے۔ دن کے اُجالے اور رات کے اندھیرے ہی جانتے ہیں کہ تاریخ کے اس بوسیدہ دامن پر کیا گزری اور کیا بیتی ـــــ کاش! اگرتی ہوئی دیواروں کے مُنہ میں زبان ہوتی اور وہ چیخ چیخ کر اپنی بے بسی کا ماتم کرتیں، لیکن بے آسرا اور لاوارث عمارت اپنی محبت اپنے معماروں کے ساتھ ہی رخصت کر چکی ہے۔ گو اس کے سینے پر حضرت پیر بہاؤ الحق اور حضرت شاہ رُکن عالم (رحمۃ اللہ علیہ) کے مزارات مرجعِ اخلائق ہیں، مگر اس اندھیر نگری میں نیکی اپنا مُنہ چھپا کے ایک طرف بیٹھ گئی تاکہ خدا پرستی اور نیکی کے اسباب مہیا کرنے میں زمانہ حجاب محسوس نہ کرے۔

حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کی آخری آرام گاہ کا سوال جب احباب کے سامنے آیا تو کمشنر ملتان مسٹر بی اے قریشی نے اطلاع دی کہ نواب گورنر مغربی پاکستان نواب امیر محمد خان نے مجھے ہدایت کی ہے کہ حضرت شاہ صاحب کی تدفین کے لیے جو جگہ طلب کی جائے، اس سے انکار نہ کریں، اس پر احباب کی رائے ٹھہری کہ حضرت امیر شریعتؒ کی آخری آرام گاہ کے لیے قلعہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں اور اپنے اس فیصلے سے کمشنر ملتان کو آگاہ کر دیا گیا، اور انہوں نے ایک گھنٹے کے اندر متعلقہ کاغذات مکمل کر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے ہاتھ بھیج دیئے۔ البتہ ایک شرط عائد کر دی کہ حضرت شاہ صاحب کے علاوہ دوسری کوئی قبر وہاں نہیں بنے گی۔ مگر جیسے ہی حضرت امیر شریعتؒ کے حرم محترم کو اس کی اطلاع ہوئی، انہوں نے اس شرط کے علاوہ بھی امیر شریعتؒ کو قلعہ میں دفن کرنے کی مخالفت کی، نیز کہا:

"جو شخص عمر بھر حکومت کے کسی اعزاز کا احسان مند نہیں ہوا، اُسے حکومت کی اجازت سے حاصل کردہ جگہ پر دفن کر کے اُس کی روح کو صدمہ پہنچانا بہتر نہیں۔"

اس بنا پر نماز جنازہ سے فراغت کے بعد حضرت امیر شریعت رحمۃ اللہ علیہ کا جسدِ خاکی دو لاکھ سے زائد انسانوں کے کندھوں پر اپنی آخری آرام گاہ کی طرف روانہ ہوا۔ چند فرلانگ کا فاصلہ طے کر کے بھاگی قبرستان کے ابتدائی کونے پر میونسپل کمیٹی کے دیئے ہوئے وسیع خطہ اراضی کو امیر شریعتؒ کا خاندانی قبرستان قرار دے کر، سورج کی آخری کرنوں کے دیکھتے دیکھتے لاکھوں انسانوں کے

آنسوؤں سے بھیگی ہوئی سینکڑوں من مٹی تلے لحد میں اُتار دیا گیا۔

محمدؐ کی سیرت کا پیغامبر
خدا کے سندیسہ سُناتا ہوا
بڑی منزلیں طے کیے جلے جسلم کی
بڑی دیر چلتا چلاتا ہوا
تو بہت اہم سوچ میں کھو گیا
گھڑی دو گھڑی کے لیے سو گیا (دعاعلم)

مغلی فرمانرواؤں کے زوال کے سانحۂ ۱۸۵۷ء کو جب ہندوستان کے تخت پر فرنگی سُورج انگڑائیاں لینے لگا، اور آہستہ آہستہ یہ سُورج وقت کے تمام ستاروں کو مات دے کر اپنی چمک کے سنگھاسن پر آبیٹھا تو شیخ و برہمن کی تسبیح کے تمام دانے ٹوٹ کر اُس کے قدموں میں آن گرے۔ ہندوستان کا تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرے کی چمک دونوں غلامی کی زنجیریں جکڑے گئے یونین جیک کی اذانیں لال قلعے کی چھت پر چڑھ کر گنگا و جمنا کے پوتر پانیوں میں زہر گھولنے لگیں، مسجد کی اذانیں کلیساؤں کی آوازوں میں دب کر رہ گئیں۔ ایوانِ فرنگی کا ایک ایک قانون حجازی قافلے کے نقش پا پر اپنی نئی عمارت استوار کرنے لگا تو ایمان کی ایک نگاہ اُٹھی، جس نے خونِ جگر کی آمیزش سے اس قدر آنسو بہائے کہ سارا ہندوستان رو پڑا، اور یہ آنسو حضرت شاہ ولی اللہؒ کے آنسو تھے، انہیں آنسوؤں سے پھر ۱۸۵۷ء کے بعد کبھی محمود الحسنؒ نے جنم لیا، اور کبھی قاسمؒ نانوتوی کی پیدائش ہوئی۔ عبیداللہ سندھی اور حسینؒ احمد مدنی بھی اسی کوکھ سے

لعل تھے۔ محمد علی جوہرؒ، ابو الکلام آزادؒ، ظفر علی خانؒ، مفتی کفایت اللہؒ،
اور احمد سعیدؒ بھی اس قافلے میں شامل ہوتے گئے، تا آنکہ اس زنجیر کی آخری کڑی
حضرت امیر شریعت (سید عطاء اللہ شاہ بخاری) رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ یہ زنجیر ایک ایک
کڑی سمیت ۲۱ اگست ۱۹۶۱ء شام چھ بج کر پچپن منٹ کو اپنی تاریخ مکمل کر گئی۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را



اخبارات

۲۲ اگست صبح کے اخبارات جب پاکستانی عوام کے ہاتھوں میں پہنچے تو اُن کے صفحۂ اوّل پر سیاہ حاشیے تھے۔ مُلکی صحافت نے قافلۂ حریت کے بہادر سپوت کو آخری خراجِ عقیدت پیش کیا اور مُلک کے قلم کاروں نے امیرِ شریعت کی موت کو ملکی اور ملّی نقصان قرار دے کر اپنے جذبات کا اظہار کیا۔

روزنامہ "جنگ" کراچی

"حق یہ ہے کہ سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری پاک و ہند کی ایک عظیم شخصیت تھے قوم ایک مخلص راہنما سے محروم ہو گئی ہے، لیکن اُن کی یاد ہمیشہ تازہ رہے گی۔ اُنھوں نے قوم کو آزاد کرانے اور ملک کو ترقی کے منازل تک پہنچانے کے لیے جو کام کیا ہے، وہ دوسروں کے لیے مشعلِ ہدایت کا کام دے گا۔"



روزنامہ "امروز" لاہور

"وہ شعلہ نوا خطیب اُٹھ گیا جس نے نصف صدی تک سپاہ آزادی کا خون گرمائے رکھا۔ اور جو صلیب پر چڑھا سے دیکھا۔ دُنیا نے خطابت کی اس پر ناز تھا، اور اس نے یہ صلاحیت ملک و ملت کی خدمت کے لیے وقف کر دی، لیکن وہ صرف خطیب نہیں تھا، عمل کا دھنی بھی تھا۔"



روزنامہ "کوہستان" لاہور

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے فرنگی استبداد کے خلاف اُس وقت علمِ بغاوت بلند کیا تھا، جب سلطنتِ برطانیہ پر سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ اور آزادی کی خواہش ایک دیوانے کا خواب سمجھی جاتی تھی۔

ہمیں شاہ صاحب کے طریقِ کار سے اختلاف ہو سکتا ہے، لیکن کوئی بھی اُن کی عظمت سے انکار نہیں کر سکتا۔ آنے والی نسلیں جب برصغیر پاک و ہند کی آزادی کی تاریخ کے بکھرے ہوئے اوراق اکٹھا کریں گی تو اُس وقت سید عطاء اللہ شاہ بخاری کو فراموش نہیں کر سکیں گی۔"



روزنامہ "وفاق" لائلپور

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات ایک روایات کے انجام کا اعلان ہے وہ روایات کی پیداوار تھے جس میں لفظ گرمیٔ آواز کے ساتھ آدمی اور آدمی کے درمیان رشتہ گردانا جاتا تھا، انسانی رشتے کے اس تصوّر نے خطابت کو جنم دیا۔ جسے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہندی مسلمانوں کے ایک بھرپور دور میں پیدا ہوئے تھے۔ اس دور میں قد آور رہنماؤں کے ہوتے ہوئے اُنھوں نے اس طرح ایک منفرد مقام پیدا کیا کہ مسلمانوں کی مذہبی زندگی کو سیاسی زندگی سے مربوط کرنے کی کوشش کی او خطابت کو طریقِ اظہار کے طور پر اپنایا، جو مسلمانوں کی مذہبی زندگی اور سیاسی زندگی دونوں میں ایک مقبول اور مؤثر طریقِ اظہار کا مرتبہ رکھتی تھی۔"

روزنامہ "عوام" لائلپور

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات ایک بڑا ملی صدمہ ہے۔ آج ہر پاکستانی کو محسوس ہو رہا ہے کہ شاہ جی کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ کبھی پر نہیں ہو سکے گا ۔

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دیئے
ڈھونڈا تھا آسماں نے جنہیں خاک چھان کر"

ہفت روزہ "لیل و نہار" لاہور

"مرحوم جب یہ کہتے کہ میری تین چوتھائی زندگی ریل میں اور ایک چوتھائی جیل میں گزری، تو حقیقت بھی یہی ہوتی تھی، وہ محض ایک سیاسی رہنما نہ تھے، ایک مکمل شخصیت تھے۔ مجاہد بھی اور رند بھی، جس طرح لاکھوں کے مجمع میں گرجتے، اسی طرح احباب کی محفل میں چہکتے۔ بذلہ سنجی اور خوش گفتاری سے ہر ایک کا دل مٹھی میں رکھتے۔ شعر و ادب کا مذاق نہایت پاکیزہ رکھتے تھے۔ محبت و مروت، اخلاص، ایثار، رواداری اور دوست داری کا پیکر تھے۔ اور یہ صفات اب نایاب ہوتی جا رہی ہیں۔"



ہفت روزہ "اقدام" لاہور

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری اردو اور پنجابی کے بے مثل خطیب تھے، انہوں نے اپنی فصاحت اور بلاغت، خطابت اور علم کلام کی توپوں کے دہانے انگریز

شاہی قلعے پر مرکوز کیے تھے۔ انہیں اختلافات عقیدہ کے علاوہ احمدیوں (مرزائیوں) سے غیب فشانی کد کی بڑی وجہ یہ تھی کہ بانی سلسلہ نے انگریزی سلطنت کو ابرِ رحمت قرار دے رکھا تھا۔ اس وجہ سے انگریزی استعمار اور احمدیت (مرزائیت) دو ایسے نشانے تھے جن پر شاہ صاحب نے ہمیشہ گولہ باری جاری رکھی اور دونوں کو خاصہ نقصان پہنچایا۔"



ہفت روزہ "قندیل" لاہور

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ شاہ صاحب ایک سحر بیان، شعلہ فعال اور آزادیٔ وطن کے ایک جرار سپاہی تھے ان کی تمام زندگی قومی خدمت میں گذری، زندگی کے آخری ایام میں اُن پر فالج کے کئی حملے ہوئے، پھر ملتان میں وہ ایک ایسے بوسیدہ مکان میں رہائش پذیر تھے جو فالج کے مریض کی رہائش کے بالکل ناقابل تھا۔ شاہ صاحب انتہائی صبر و تحمل کے ساتھ بڑے حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ صدر پاکستان کو جب ان کی آخری بیماری کا علم ہوا، تو انہوں نے ماہرین کو ہدایت کی، کہ وہ شاہ صاحب کے علاج میں خاص دلچسپی لیں لیکن ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئیں، اور آخری وقت آن پہنچا۔"



ہفت روزہ "ایشیا" لاہور

"قیام پاکستان کے بعد شاہ صاحب عملاً سیاست سے کنارہ کش

ہو گئے تھے، لیکن تحریک ختم نبوت کے دوران وہ پھر اسلام کی آبرو بچانے کے لیے میدان میں اُتر آئے تھے۔ شاہ صاحب ایسی جامع کمالی شخصیتیں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔ افسوس ہے کہ پرانے بادہ کش ایک ایک کرکے اس محفل ہستی سے اُٹھتے جاتے ہیں، اور کوئی ان کی جگہ پُر کرنے والا نظر نہیں آتا۔"

○

ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور

"۲۱ اگست ۱۹۶۱ء کو یہ جگر خراش خبر سارے ملک نے انتہائی رنج و قلق سے سُنی کہ ملک کے مایہ ناز فرزند بطل جلیل، مجاہد اعظم، جنگ آزادی کے شیر دل رہنما، محبت و محبوب اولیاء اللہ، شمع ختم نبوت کا پروانہ، امیر شریعت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہو گئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔"

○

ہفت روزہ "الاعتصام" لاہور

"شاہ صاحب اپنی ذات سے ایک انجمن اور ایک ادارہ تھے، اُن کی موت تنہا ایک شخص کی موت نہیں، ایک عہد، ایک دور اور ایک جماعت کی موت ہے، جو اسلام اور مسلمانوں کی ہر مصیبت کے وقت مضطرب دل لے کر آتے تھے، اور یہ آواز برصغیر پاک و ہند اور عالم اسلام کے ہر سانحہ پر بے اختیار بلند ہوتی تھی۔"

○

پنجاب یونیورسٹی کا اُردو مجلہ "محور" ستمبر ۱۹۶۱ء

"اک دِیا اور بجھا ......

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات اِس دَور کا سب سے بڑا المیہ ہے المیہ اس لیے کہ نئی نسل یہ تو جانتی ہے کہ برک نے برطانوی پارلیمنٹ میں کیا کچھ کہا۔ انہیں یہ تو معلوم ہے کہ روم میں انطونی نے کس طرح اپنی خطابت سے بروٹس کے اقتدار کا تختہ اُلٹ دیا۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی کہ شاہ صاحب نمازِ عشاء کے بعد تقریر شروع کرتے تھے اور ہزاروں سامعین رات بھر بیٹھنے کے بعد فجر کی نماز ان کی امامت میں پڑھا کرتے تھے۔ اُن کی خطابت کا سحر راہ چلتے لوگوں کو کھینچ کر جلسہ گاہ میں لے آیا کرتا تھا۔

یہ آواز کا جادُو اس لیے تاریخی حیثیت اختیار نہ کر سکا کہ انطونی کی طرح انہیں کوئی شیکسپیئر نہ ملا، اور پھر اس لیے بھی کہ بعد میں ان کا سیاسی مسلک انہیں مسلم لیگ سے دُور لے گیا، اور وہ تحریکِ حصولِ پاکستان سے کٹ گئے۔ وہ غلط راستے پر تھے یا نہیں، مگر اس اختلاف کے باوجود ان کی دیانت، خلوص اور بے غرضی شُبہ سے بالاتر تھی۔

اُن کی دَرویشی اہلِ بصیرت کے لیے آج بھی چراغِ راہ ہے۔"



ہفت روزہ "لاہور" لاہور۔ (مرزائیت کا ترجمان)

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات دراصل سابق علاقہ پنجاب کے دعوامی لفظیات کے ماہر ... یعنی ایسے شعلہ بیان مقرر کی وفات ہے جس کا

بدل شاید ہی پیدا ہو سکے "

○

ماہنامہ "تبصرہ" لاہور

۲۱ر اگست کی شام تاریخ عالم کا ایک مستقل عنوان بن گئی، جب حضرت امیر شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) نے اس جہانِ فانی کی بے اعتنائیوں سے اُکتا کر عالم جاودانی کی راہ لی، اور اپنے گریبان کی پریشان دھجیاں لیے اُس سفر پر چل دیے جہاں نہ کوئی موڑ آتا ہے اور نہ کوئی سنگِ میل، اور نہ ہی کوئی منزل کی رہنمائی کرتا ہے۔ اُس راہ کی ہر شے اُن کے لیے اجنبی ہو گی۔ لیکن شاہ جی کسی کے لیے غیر نہیں ہوں گے، وہ اس جہان کی بھی ہر مخلوق کے پہلے جانے پہچانے ہیں۔ پروردگارِ عالم کے حضور حاضری سے پیشتر یقیناً وہ سب کا سلام لیں گے، اور ختم الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام شاہ جی کی روحِ پاک کو فرشتوں کے دوش پر حوضِ کوثر پر بلا لیں گے تاکہ زندگی کے طویل سفر کی تھکان سے دل کو تسکین ہو سکے۔ ایسے لوگوں سے ایسا ہی سلوک ہوتا ہے۔ حَنَجْزِیَنَّهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوا يَعْمَلُوْنَ۔ (ہم ان کے اعمال کا بہت اچھا بدلہ دیں گے)

○

تعزیت

سابق صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمد ایوب خان

سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی وفات حسرت آیات پر مجھے بے حد صدمہ ہوا ہے

(شاہ صاحب جنگِ آزادی کے زبردست مجاہد تھے۔ قدرت نے آپ کو علم و فصاحت کی نعمتیں ودیعت کی تھیں) موت نے ہم سے ایک عظیم شخصیت چھین لی ہے۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی

(یہ بڑی غمناک خبر ہے۔ آج مسلمان ایک بہت بڑی شخصیت سے محروم ہو گئے ہیں۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنے وقت کے بہت بڑے خطیب تھے، بلکہ یہ کہنا بالکل درست ہو گا کہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے خطیب تھے۔ ان کی وفات نے ایک بہت بڑی جگہ خالی کر دی ہے۔"

شیخ حسام الدین

"امیر شریعت کی خطابت نے چالیس برس تک برِّ صغیر کے عوام کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص متحرک کیا۔ ان کے اندر لڑنے اور ملک کو آزاد کرانے کا جذبہ پیدا کرنے میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ آج ان کی موت سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ صدیوں تک پر نہیں ہو سکے گی۔"

مولانا غلام رسول مہر

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری اسلام اور آزادی کے عظیم مجاہد تھے۔ ان کی پوری زندگی پُرخلوص قربانیوں کا ایک مرقع ہے کہ خود ان کے بلند مرتبت رفیقوں میں ان کی مثال شاید ہی ملے۔"

احمد ندیم قاسمی

"سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے انتقال کے ساتھ برِّصغیر پاک و ہند کی تحریکِ آزادی کا وہ زندگی افروز اور دِلآویز باب ختم ہوگیا، جس میں آزادی کی خاطر جسمانی اور رُوحانی صعوبتیں سہنا عبادت کا درجہ اختیار کرگیا تھا۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا وجُودِ گرامی اس مقدّس جدوجہد کا مجسّم نشان تھا۔"

○

مولانا داؤد غزنوی

"شاہ صاحب بہادر سپاہی، مخلص دوست اور انتھک ورکر تھے۔ اُن کی موت سے جو خلا پیدا ہوگیا ہے، اُس کے پُر ہونے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

○

مولانا مظہر علی اظہر

"امیرِ شریعت نے اپنی زندگی میں ہی اس قاہر و جابر استعمار کا خاتمہ پاک و ہند کی سرزمین میں دیکھ لیا، جو اُس کی جنگِ آزادی کا مطمعِ نظر تھا۔ وہ جس عزم کو لے کر ۱۹۱۹ء میں میدانِ عمل میں آیا تھا، اُس نے ۱۹۴۷ء میں بحکمِ الٰہی اُسے کامیاب دیکھا۔ اللہ تعالیٰ اس بطلِ حریت کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔"

○

مولانا احتشام الحق

"مجھے شاہ صاحب کی وفات سے بےحد رنج ہوا ہے، اُن کی موت برِّصغیر

پاک و ہند بلکہ سارے عالم اسلام کے مسلمانوں کے لیے نقصان عظیم ہے"

○

مولانا مفتی محمد شفیع (کراچی)

"مولانا کی وفات سے علماء کی صف میں جو خلا پیدا ہوگیا ہے وہ عرصہ تک پُر نہ ہو سکے گا۔ ہم آپ کے غم میں پورے طور پر شریک ہیں"۔

○

تاج الدین انصاری

"چالیس برس تک جس کی شعلہ نوائیوں نے مسلمانوں کو گرمایا، وہ آج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ یہ صرف ایک خطیب، ایک عالم، ایک دوست اور ایک بزرگ کی موت ہی نہیں، بلکہ ایک دور، ایک تاریخ کی موت ہے"

○

سید مظفر علی شمسی

"مسلمانوں کے ہر مکتب خیال کو حضرت شاہ صاحب کی موت نے رنج پہنچایا ہے، اور اس عظیم شخصیت کے اٹھ جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ صدیوں تک پُر نہ ہو سکے گا"

○

حافظ حبیب اللہ ڈائس چیئرمین کراچی میونسپل کارپوریشن

"مجھے شاہ صاحب کی وفات پر دلی دکھ ہوا ہے، مرحوم نے برطانوی استعمار کے خلاف جنگ آزادی میں زبردست حصہ لیا تھا"

مولانا کوثر نیازی

"سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری کے سیاسی نظریات سے اختلاف ممکن ہے، لیکن اِس بات سے کوئی شدید سے شدید مخالف بھی اِنکار نہیں کر سکتا کہ برِصغیر پاک و ہند کی جدوجہد آزادی کی تاریخ میں اُن کی زندگی ایک روشن باب کی حیثیت رکھتی ہے۔ اُن کے جانے سے خطابت، سیاست اور مذہب کی دُنیا میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے، جسے قحط الرّجال کے اِس دَور میں پُر کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔



لباس، خوراک اور عادات

انسان، انسان سے راہِ حیات پر سفر کے دوران راستے ہی ہی اختلاف نہیں کرتا، بلکہ اُس کی ہر ادا اور پسند جُداگانہ ہے۔ اس چوراہے پر انسان اپنے ذوق کا تنہا مالک ہے۔ اسی طرح حضرت امیرِ شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) نے بحیثیت انسان اپنی انفرادیت کو قائم رکھا۔

لباس

اوائلِ جوانی میں جب آپ بہار سے پنجاب آئے تو رنگ موری کی بہاری طرز کی شرعی شلوار، گھٹنوں تک گول آستین کا لمبا کرتہ، سبز رنگ کی پگڑی اور پاؤں میں سُرخ بہاری قسم کی جوتی پہن رکھی تھی، پھر جیسے جیسے پنجابی طرزِ تمدن قبول کرتے گئے لباس میں تبدیلی آتی گئی، اسی طرح کبھی تہبند اور کبھی کھدر کی شلوار پہنتے۔ طالب علمی کے زمانے میں سر پر لنگی اور کھدر کا نیلے رنگ کا تہبند عام استعمال کرتے تھے۔ آگے چل کر کھلی آستین کا کھدر کا لمبا کرتہ عموماً شتری رنگ کا پہنتے تھے۔ اس نسبت سے [illegible] زمانے کا کھدر اس قدر مقبول ہوا کہ بخاری کھدر کے نام سے مشہور ہو گیا۔ موسمِ سرما میں کھدر کا لمبا شیروانی نما کوٹ، اس پر کبھی کبھار کابلی گرم عبا پہنتے اور سر پر اتاترک طرز کی ٹوپی پہنتے۔

احرار کانفرنسوں میں شمولیت کے وقت سیاہی مائل سرخ رنگ کا کرتہ پہنتے جو احرار رضاکاروں کا امتیازی نشان تھا۔

ابتداء (۱۹۲۱ء) میں ہاتھ میں موٹا ڈنڈا رکھتے تھے، اس نسبت سے ایک عرصے تک عوام میں "بخاری ڈنڈے والا" مشہور رہے، لیکن جب چودھری افضل حق رحمۃ اللہ علیہ نے پنجاب اسمبلی سے مسلمانوں کے لیے تلوار رکھنے کا عام قانون منظور کرایا تو امیر شریعت نے ڈنڈے کی بجائے تلوار پکڑ لی۔ ۱۹۳۷ء میں جب مجلس احرار نے اپنے رضا کاروں کے لیے کلہاڑی کو اپنا جماعتی نشان قرار دیا تو دم واپسیں سے کچھ عرصہ پیشتر تک ہاتھ میں کلہاڑی رکھتے رہے۔ زندگی کے آخری دنوں میں بید کا کھونٹا بطور سہارا رکھتے رہے۔

خوراک :-

گھر پر تو عموماً چنے کی دال کو دوسرے کھانوں پر ترجیح دیتے، سفر کے دوران خوراک میزبان کی مرضی پر چھوڑ دیتے، سفارش پر کبھی کھانا نہیں پکوایا سادے چاول زیادہ مرغوب تھے، لیکن درد گردہ کے باعث بہت کم استعمال کرتے تھے، بعض دیہاتوں میں پیاز اور باسی روٹی نمکین لسی کے ساتھ بھی پسند کرتے لیکن جسم بلغمی ہونے کے باعث لسی انہیں نقصان دہ تھی، اس لیے گائے کے گوشت سے ہمیشہ اجتناب رہا۔ مرغن غذاؤں سے نفرت نہیں تھی، لیکن پسند نہیں کرتے تھے۔ میزبان کو اکثر اس پر ڈانٹ دیا کرتے تھے۔

جلسوں یا کانفرنسوں کے موقعہ پر صرف ایک کھانا پکانے کی تاکید کرتے۔

سبزیوں میں شلجم، سرسوں کا ساگ، اور گھیا شوق سے کھاتے۔ میٹھی اشیا خاص کر حلوہ مرغوب نہیں تھا۔ فرمایا کرتے، یہ مولویوں کے منہ پر سیمنٹ کا کام دیتا ہے یعنی حلوہ خور مولویوں کے منہ سے حق بات نہیں نکل سکتی۔

پھلوں میں آم سے زیادہ محبت تھی، اور خربوزہ بہت کم کھاتے تھے۔ امیر شریعتؒ کی رائے میں خربوزہ کے بکثرت استعمال سے گلے پر بُرا اثر پڑتا ہے، جب کبھی آواز دب جاتی تو کچا امرود یا امرود کے پتے اُبال کر اُن کا پانی استعمال کرتے۔

عادات:

انسانی عادات قبر تک پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ لیکن حضرت امیر شریعتؒ کو اپنی قوتِ ارادی (WILL POWER) کی وجہ سے اپنی عادات پر خاصا قابو تھا لیکن عام عادات جو اُن کی جزوِ زندگی بن چکی تھیں، اُن کے ہاتھوں مجبور تھے۔ مثلاً جیل میں ہوں یا ریل میں، نمازِ صبح سے پیشتر چائے بغیر دودھ کے ضرور پیتے۔ چونکہ چائے کا سامان (سٹوو، مٹی کا تیل، بہترین چائے کی پتی، چینی، نمک، فنجان، اور ایک چھوٹا پانچ) سفری بکس میں ہمیشہ ساتھ رہتا۔ کبھی کبھار شہروں میں اگر اچھی چائے نایاب ہو جاتی، تو دیہاتوں کے سفر میں اس کی تلاش کرتے جو اکثر مل جاتی۔

یوں تو ہر نماز کے بعد وظیفہ کرتے، لیکن نمازِ فجر کے بعد قریباً ایک گھنٹہ اس کے لیے الگ بیٹھتے۔ پان کھانے کی سخت عادت ہو گئی تھی لیکن بغیر تمباکو کے کھاتے۔ بازار میں چلتے پھرتے نہیں۔ گھر میں یا تقریر سے پیشتر اس کا سامان بھی چائے کی طرح کبھی الگ نہیں ہوا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد قیلولہ کرتے اور نمازِ عصر تک سوتے۔

تقریر کی رات کھانا نہیں کھاتے تھے بلکہ نمازِ عصر کے بعد چائے کے دسترخوان پر بیٹھتے تو اس کے ساتھ نمک پارے یا کوئی دوسری نمکین شے استعمال کرتے، اگر تقریر کا ارادہ نہ ہو، تو سرِ شام کھانا کھا کر سو جاتے۔ پھر لاکھ کوشش کرو، تقریر پہ آمادہ نہیں ہوتے تھے۔ اس رات عشاء کی نماز بھی دیر سے پڑھتے۔

حضرت امیر شریعت (رحمۃ اللہ علیہ) کا دل نہ جانے خالقِ کائنات نے کس مٹی سے بنایا تھا کہ اُس کے کسی گوشے میں نفرت کا شائبہ تک نہیں تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ہر جاندار سے محبت کرتے بخصوصاً خوبصورت انسان ہو کہ حیوان اُن کی نگاہِ کرم کا مرکز ہوتا تھا۔ ایک دفعہ کسی گاؤں سے تانگے پہ ریلوے اسٹیشن تک آنا تھا، اُس کے گھوڑے پر جو نظر پڑی، کہ گردن لانبی، چوڑے سُم، فربہ بدن، دُم زمین تک، بس پھر کیا تھا تمام راستہ کوچوان سے اس گھوڑے کی نسل پر گفتگو کرتے رہے۔ چھ میل کا فاصلہ طے کر کے منزل پر پہنچے تو گھوڑے کا منہ چوما، تھپکی لگائی، اور کوچوان کو کرایے کے علاوہ پانچ روپے زائد دیے کہ گھوڑے کو دانہ کھلا دے۔

ایک زمانہ میں کبوتروں سے بھی عشق ہوا لیکن اس کی عمر مختصر رہی۔ اس دور میں تکمیلِ شوق کے لیے افغانستان سے راس کماری تک اچھی نسل کے کبوتر حضرت امیر شریعتؒ کو تحفہ میں ملے لیکن جب اُن سے تائب ہوئے تو نشان تک مٹا دیا۔

عمر کے آخری حصے میں گھر میں مرغیاں بھی رکھیں، اچھے شعر کی داد دینے میں بخیل نہیں تھے۔ حالانکہ خود اُردو اور فارسی کے بہترین شاعر تھے، ندیم تخلص کرتے تھے، شاعر عموماً دوسرے شاعر کے کلام پر داد دینے میں فراخ دل نہیں ہوتا لیکن حضرت امیر شریعتؒ کی عالی حوصلگی پر متحدہ ہندوستان کے اکثر معروف شعراء انہیں اپنا کلام سنانے میں فخر محسوس کرتے، اور جس شعر پر امیر شریعتؒ داد دیتے وہ اُردو ادب میں سند بن جاتا تھا ——— زندگی بھر انگریز اور مرزائی کے علاوہ کسی کو اپنا ذاتی دشمن نہیں سمجھا، اور اگر اصولی طور پر کسی سے بگاڑ ہو گیا تو پھر اس میں منافقت نہیں ہوتی تھی۔ دشمن دشمن ہے اور دوست دوست۔ دوست کے عیب کی پردہ دری گناہ سمجھتے، آنکھوں دیکھتے

اور کانوں سن کر بھی مسکرا دیتے۔ ہزار اختلاف کے باوجود اگر کوئی گھر آجاتا تو ایسا برتاؤ کرتے کہ اس پر اختلاف کا گمان تک نہ گزرتا۔

تصویر اور آواز:۔ ۱۹۳۰ء میں پہلی مرتبہ حضرت امیر شریعتؒ کی تصویر اخبارات میں شائع ہوئی۔ بمبئی کانگریس میں مس سروجنی نائیڈو کی تقریر سن رہے تھے کہ کیمرے کی آنکھ نے انہیں غافل پاکر چوری کر لیا۔ اور پھر یہی تصویر متحدہ ہندوستان کے ہفتہ وار انگریزی اخبار "بمبئی کرانیکل" اور روزنامہ "امرت بازار پتریکا" میں شائع ہوئی۔ دوسری تصویر "ڈمڈم" کے جیلخانہ میں کشمیر کے کیپٹن عبدالرشید کے ساتھ اُن کے اصرار پر بنگالی نوجوانوں نے اُتاری، جو ملاقات کے لیے آئے تھے۔

امیر شریعتؒ بذاتِ خود تصویر کے خلاف تھے، اس کے باوجود ان کی تصویریں گاہے بگاہے دیکھنے میں آئیں۔ مگر یہ واقعہ ہے کہ ان میں اُن کی رضا شامل نہ تھی۔ ۱۹۳۵ء میں ملتان کے مشہور عکاس چودھری بشیر احمد نے چوک حسین آگاہی میں جب اپنا نگارخانہ ترتیب دیا تو کسی بہانے حضرت امیر شریعتؒ کو وہاں لے گیا۔ چودھری بشیر احمد کے والد ڈاکٹر رحیم بخش مرحوم کی تصویر آویزاں تھی۔ مرحوم اگرچہ حضرت امیر شریعتؒ کے مرید نہیں تھے، پھر بھی انہیں حضرت امیر شریعتؒ سے بڑی عقیدت تھی، حضرت امیر شریعتؒ کی نظر بے اختیار اُن پر جا پڑی، اور دیر تک تصویر کو دیکھتے رہے۔ اس موقعہ پر کیمرہ مین نے بڑی حکمت سے کیمرہ کو تصویر کی پناہ میں رکھ کر وقت کا تعین کر دیا تھا اچانک ٹِک کی آواز پر امیر شریعتؒ چونک پڑے، اور بڑی حیرت سے پوچھا، "یہ کیا؟" آخر انہیں پتہ چل گیا کہ میری تصویر اُتار لی گئی ہے۔ اس پر سخت ناراض ہوئے، اور فوٹوگرافر سے وعدہ لیا، یا تو اسے ضائع کر دینا، یا عام نہ کرنا، لیکن اس کے باوجود یہ

تصویر راقم کے ہاتھ آگئی، اور یہ وہی تصویر ہے جو اخبارات میں عام شائع ہوتی رہتی ہے۔ اس پر حضرت امیر شریعتؒ جب کبھی فوٹوگرافر سے ملتے تو اُسے "میرے آذر" کہہ کر پکارتے تھے۔

۱۹۵۷ء میں راقم نے روزنامہ "آزاد" کے لیے حضرت امیر شریعتؒ کی تصویر بنانا چاہی، لیکن انہیں پتہ چل گیا اور اس قدر بگڑے کہ دو سال تک راقم سے بات نہیں کی۔

۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۴ء میں مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنر مسٹر مسعود (موجودہ ایڈمنسٹریٹر محکمہ اوقاف) کی خواہش پر مولانا مجاہد الحسینی نے ایک اجتماع میں ٹیپ ریکارڈر لگا دیا، تاکہ امیر شریعتؒ کی تقریر ریکارڈ کی جاسکے۔ اس جلسے کی صدارت بھی ڈپٹی کمشنر ہی کر رہے تھے، اور ٹیپ ریکارڈر بھی انہیں کا تھا۔ ان دنوں مسٹر مسعود شاید واحد آدمی تھے جن کے پاس یہ آلہ تھا۔ مسٹر مسعود باوجود سرکاری گزیٹڈ آفیسر ہونے کے ہمیشہ کھدر پوش رہے اور یہی وجہ تھی کہ امیر شریعتؒ نے ہمیشہ اُن سے محبت کی۔

تقریر سے دوسرے دن انہوں نے امیر شریعتؒ کو چائے پر بلایا، اور دوسرے کمرے میں تقریر کا ریکارڈ لگا دیا۔ امیر شریعتؒ نے اپنی آواز پہچان لی اور بڑے حیران ہوئے جب انہیں اس نئی ایجاد کا علم ہوا تو اسے بڑا پسند کیا۔ اس پر گھر میں آکر کہا:

"آج میں نے اپنی تقریر سنی ہے، میں بہت اچھا بول لیتا ہوں۔"

یہ کہہ کر استغفراللہ پڑھا اور رونے لگ گئے۔

عقیدہ:۔ سیاسی اختلاف کے علاوہ مذہبی عقائد میں بھی امیر شریعتؒ سے اختلاف کیا گیا، اُن کے جذبۂ توحید کے پیش نظر ان پر غیر مقلد ہونے کا الزام بھی لگایا گیا، مگر اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہ حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مقلد تھے۔

ابتداء میں حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی (رحمۃ اللہ علیہ) کے مرید ہوئے، ان کے انتقال پر حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوری (رحمۃ اللہ علیہ) کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا اور تادم واپسیں حضرت رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر رہے۔

اس واضح حقیقت کے باوجود برصغیر کے مخصوص عوام نے انہیں ایک طرف اگر اپنا سیاسی حریف خیال کیا، تو دوسری طرف صحیح عقیدے پر بھی یقین نہیں کیا۔ عوام کی انہیں باتوں پر حضرت امیر شریعتؒ نے فرمایا تھا:-

"ایک وقت آئے گا کہ تم ہماری قبروں پر
آکر روؤ گے اور کہو گے کہ انہیں لوگ
سچے تھے۔"

سرزمینِ ملتان سے!



اے شہنشاہوں کی بستی اولیاؤں کے دیار!
ذرّے ذرّے پر ہے تیرے رحمتِ پروردگار

ہر خزاں کے دور میں قائم رہی تیری بہار
تیرے دامن میں ہیں اب بھی نیک بندوں کے مزار

تُو شہیدوں کی ہے مٹی تُو امانت دار ہے
تیری اک تاریخ ہے اور تیرا اک کردار ہے

آج پھر پہلو میں تیرے ہے عطاء اللہ شاہ
جو امیرِ وقت تھا ڈرتے تھے جس سے کجکلاہ

ہاں کہ وہ باغی رہا برطانوی سرکار کا
وہ محافظ تھا وقارِ احمدِ مختار ﷺ کا

ہے یہی دار و رسن نے آزمایا تھا جسے
آئینِ افرنگ نے باغی بنایا تھا جسے

یہ خزانہ دفن کرتے ہیں تمہاری خاک میں
تاکہ یہ محفوظ رہ جائے زمینِ پاک میں

یہ امانت قوم کی اور سیّدِ احرار ہے
حشر تک ہے تجھ میں یہ، تُو اس کی چوکیدار ہے

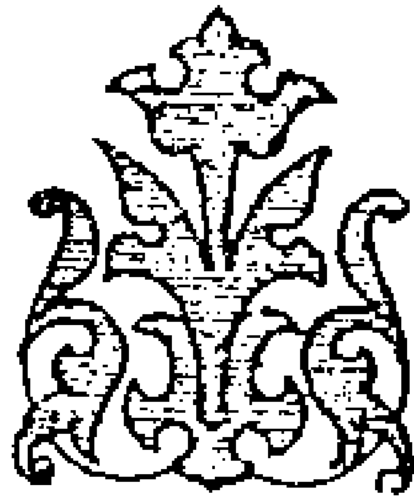
دیکھنا ضائع نہ ہو جائے وطن کا بانکپن
داغ تک آنے نہ پائے اور نہ ہو میلا کفن

قبر کی مٹی سے کہہ دو، لحد کو آواز دو
باادب آئیں فرشتے روک دیں حشرات کو

پاک رہنا چاہیئے محشر تلک تیرا ضمیر
سو رہا ہے تیرے دامن پر شریعت کا امیر



حیاتِ امیرِ شریعت رحمۃ اللہ علیہ



گذشتہ ربع صدی کی سیاسی اور مذہبی تحریکات کے

پس منظر میں

حضرت امیرِ شریعت سید عطاء اللہ شاہ بخاری (رحمۃ اللہ علیہ)

کی پہلی مکمل اور مستند

سوانح حیات